مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

معارف

خصوصی شمارہ

ہندوستانی مسلمان
شذرات معارف کے آئینہ میں

(جولائی ۱۹۵۶ء۔جون ۲۰۱۶ء)

حصہ دوم

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

معارف

خصوصی شمارہ

جلد ۱۹۸ ماہ شوال المکرم ۱۴۳۷ھ مطابق ماہ جولائی ۲۰۱۶ء عدد ۱

مجلس ادارت

مولانا سید محمد رابع ندوی، لکھنؤ

پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی، علی گڑھ

مرتبہ

اشتیاق احمد ظلی

عمیر الصدیق ندوی

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یو پی) پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

قیمت: ۴۰۰ روپے

فہرست

ہندوستانی مسلمان شذرات معارف کے آئینہ میں

حصہ دوم

موضوع	صفحہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

اس شمارہ کے ساتھ معارف کی زندگی کی دوسری صدی کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ کو ان اسباب کا کسی قدر اندازہ ہو چکا ہوگا جن کی وجہ سے یہ شمارہ ایک عام شمارہ کے بجائے خصوصی شمارہ کی حیثیت سے شائع کیا جارہا ہے۔ چنانچہ اس میں اس کی زندگی کے اس نئے مرحلہ کے بارے میں کچھ کہنے کے بجائے نئی صدی کی دہلیز پر کھڑے ہو کر ہندوستانی مسلمانوں کے سلسلہ میں گذری صدی پر ایک نظر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ گذشتہ صدی ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک ایسی صدی رہی ہے جو مسائل اور مشکلات سے پُر تھی۔ زندہ قوموں کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ ہر گھڑی اپنا محاسبہ کرتی رہتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک ماضی پر گہری نظر اور حال کا صحیح ادراک نہ ہو، مستقبل کے لیے کوئی موثر اور قابل عمل لائحہ عمل تیار نہیں کیا جاسکتا۔ ہم نے آپ کے ہاتھ میں ایک آئینہ دینے کی کوشش کی ہے جس میں آپ گذشتہ صدی میں ہندوستانی مسلمان پر جو کچھ گذری اور پیش آمدہ مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے انہوں نے جو کوششیں کیں اور جو تدابیر اختیار کیں، اس کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ اس کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی ہے جسے ہم معارف صدی کے موقع پر اس کے قدردانوں کی خدمت میں پیش کررہے ہیں۔

اس تاریخی دستاویز کا پہلا حصہ آپ کو موصول ہو چکا ہوگا۔ ہمارے لیے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اسے عام طور پر پسند کیا گیا۔ اب تک اس سلسلہ میں جو تاثرات سامنے آئے ہیں وہ بہت حوصلہ افزا ہیں۔ اسے ہماری توقع کے مطابق ایک اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت سے دیکھا جارہا ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ جیسے یگانہ روزگار نے بہت پہلے معارف کے بارے میں اپنے اس تاثر کا اظہار کیا تھا کہ ”وہ ہماری تاریخِ حال کا مستقبل میں ایک وثیقہ، ایک ماخذ ہوگا“۔ اس خصوصی شمارہ کے سلسلہ میں جو تبصرے اور تاثرات سامنے آرہے ہیں ان میں یہ پہلو خاص طور سے بہت ابھرا ہوا ہے۔ حصہ اول معارف کی صد سالہ زندگی کے پہلے چالیس سال کے منتخب شذرات پر مشتمل ہے۔ اب اس کا دوسرا حصہ پیش خدمت ہے جو اگلے ساٹھ سال کے انتخاب پر مشتمل ہے۔ حصہ اول کا بیشتر حصہ آزادی سے پہلے کے عہد سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا کچھ حصہ آزادی کے بعد کے ابتدائی زمانہ سے متعلق ہے۔ آزادی سے پہلے کے حالات اور مسائل کی نوعیت فطری طور پر آزادی کے بعد کے مسائل سے کسی قدر مختلف تھی۔ اگرچہ اس وقت بھی نہ مسائل کم تھے نہ ان کی شدت تھی

لیکن اس وقت جذبات اور احساسات کی نوعیت بالکل الگ تھی۔ اغیار کی طویل اور ظالمانہ حکمرانی سے نجات کا تصور بہت دلفریب تھا اور اس کی سرشاری میں کئی مسائل کی شدت دب سی جاتی تھی۔ اس وقت کی کیفیت کچھ اس طرح تھی:

بلا سے قزاق آ کے لوٹیں ، یہ پاسبانوں کی لوٹ جائے
اچک لے شاہیں تو غم نہیں ہے، قفس تو کمبخت ٹوٹ جائے

لیکن وہ اہل نظر جو وقت کی نبض کو پہچانتے تھے وہ بدلتے ہوئے حالات کے جلو میں صورت پذیر ہونے والی ممکنہ تبدیلیوں کی آہٹ کو صاف طور سے محسوس کر رہے تھے اور اس کے لیے فکر مند تھے۔ ملک جس انقلاب کے دہانہ پر کھڑا تھا اس کے زیر اثر ملک کی تقسیم اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ابتلا و آزمائش کا جو لامتناہی سلسلہ شروع ہونے والا تھا وہ بھی اہل نظر سے پوشیدہ نہیں تھا۔ صبح آزادی کے طلوع کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھوٹ پڑنے والے فرقہ وارانہ فسادات اور مسلسل بڑھتی اور پھیلتی ہوئی خوں ریزی بدلے ہوئے حالات کی سنگینی کا مجسم ثبوت تھی۔ نئے حکمرانوں کے ایک طبقہ کے بدلے ہوئے تیور نے رہی سہی کمی بھی پوری کردی۔ شکست خواب کا یہ مرحلہ بڑا سخت اور جان لیوا تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اور ہندوستانی مسلمان جن مرحلوں سے گذرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں اس دل خراش داستان کو دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ وہ تو ہندوستانی مسلمانوں کے وجود کا ایک حصہ ہے محرومیوں اور حسرتوں کو کہاں تک گنایا جائے کہ: ایک دو زخم نہیں سارا بدن ہے چھلنی۔

علامہ شبلیؒ کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو ان کی ملی دردمندی تھی۔ دنیا میں کہیں بھی مسلمانوں کو کوئی زک پہنچے، اسلام، حضور رسالت مآبؐ، قرآن مجید اور تاریخ اسلام پر کہیں بھی کوئی حملہ ہو، وہ تڑپ اٹھتے تھے اور اس کے دفاع میں سینہ سپر ہو جاتے تھے اور اس سلسلہ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ ان کی تربیت کے زیر اثر ملی دردمندی کی یہ گراں بہا وراثت ان کے تلامذہ میں منتقل ہوئی اور دارالمصنّفین اس کی ایک علامت بن گیا۔ چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں پر جب بھی ابتلا کی کوئی گھڑی آئی، جب بھی ان کے مذہب، تاریخ، تہذیب، زبان، اداروں اور ان کے تشخص پر کوئی آنچ آئی، دارالمصنّفین میں اس کو پوری شدت سے محسوس کیا گیا اور پوری جرأت، دل سوزی اور مضبوطی سے اور بغیر کسی مسلکی یا کسی اور تحفظ کے اس کا نوٹس لیا گیا اور اس سلسلہ میں کسی اندیشۂ سود و زیاں کو پاس پھٹکنے نہیں دیا گیا۔ ملی مسائل پر جس بے خوفی اور تسلسل سے

معارف میں لکھا گیا ہے اور ملت کے موقف کو جس طرح موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کی مثال برصغیر کے دوسرے رسائل میں ملنی مشکل ہے۔ البتہ معارف میں خالص سیاسی امور پر کم لکھا گیا ہے لیکن جب بھی لکھا گیا ہے پوری قوت سے ملت کے موقف کو پیش کیا گیا ہے۔

اس انتخاب کو ہندوستانی مسلمانوں کی آپ بیتی بھی کہا جا سکتا ہے اور ان کا اعمال نامہ بھی۔ اس کے اوراق میں گذشتہ ایک صدی کے طویل عرصہ میں ہندوستانی مسلمانوں پر جو کچھ گذری اس کی ایک تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی کامیابیوں، ناکامیوں اور محرومیوں کی پوری داستان بھی اس میں رقم ہے۔ اس دوران اس نے کیا کھویا اور کیا پایا اس کی تفصیل بھی اس میں موجود ہے۔ جب ہم اس کا ایک میزانیہ تیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو پانے کے مقابلہ میں کھونے کی فہرست کہیں زیادہ طویل ہے۔ بحیثیت مجموعی جو منظرنامہ ابھر کر سامنے آتا ہے اسے حوصلہ افزا کہنا مشکل ہے۔ بلاشبہہ آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں نے مختلف میدانوں میں بہت کچھ ترقی کی ہے۔ بدلے ہوئے حالات میں انہوں نے اپنی شناخت کو قائم رکھنے اور ملی عزت و وقار کی بازیافت کے لیے بڑی قابل قدر کوششیں کی ہیں اور ان میں نمایاں کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں۔ اس کے باوجود ان کے سامنے مسائل کا ایک کوہ گراں ہے جس سے کامیابی سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جس بصیرت، اتحاد عمل اور اتحاد قیادت کی ضرورت ہے وہ عنقا ہے۔ ان کے اندر نہ اتحاد و اتفاق ہے اور نہ موثر قیادت۔ وہ مختلف مسالک اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اور سر پر منڈلاتے ہوئے مسلسل اور شدید خطرہ کے باوجود ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ اب بھی پس ماندہ ہیں بلکہ ان کی پس ماندگی میں وقت کے ساتھ ساتھ کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوا ہے۔ تعلیم کے میدان میں، جو کامیابی کی شاہ کلید ہے، بہت کچھ ترقی کے باوجود وہ اپنے ہم وطنوں سے بہت پیچھے ہیں اور منزل مراد سے بہت دور۔ ملک کی موجودہ سیاسی صورت حال نے پرانے مسائل کے ساتھ بہت سے نئے مسائل کھڑے کر دیے ہیں۔ ان کا مذہبی تشخص، شناخت، تاریخ اور تہذیب مسلسل حملوں کی زد میں ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی ان کے ردعمل اور طرز عمل سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ان کو ان مسائل کی شدت اور نزاکت کا ادراک ہے۔ اگر اس انتخاب کے وسیلہ سے کچھ لوگوں کے اندر بھی ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح صورت حال کے فہم اور اس سلسلہ میں کچھ کرنے کی ناگزیر ضرورت کا احساس بیدار ہو جائے تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری یہ کوشش کامیاب ہوگئی۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ

ریاستوں کی تشکیل اور اردو

ریاستوں کی نئی تشکیل و تنظیم کے مسائل پر غور کرنے کے لیے پارلیمنٹ نے جو سلیکٹ کمیٹی مقرر کی تھی۔اس نے لسانی اقلیتوں کے حقوق کے سلسلہ میں مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کے حق کو دستور میں شامل کرنے کی سفارش کی ہے۔اس کے علاوہ ثانوی تعلیم، سرکاری اور دفتری کاموں میں ان کے استعمال اور دوسرے حقوق و مطالبات کے لیے دستوری تحفظ کے بجائے ایک افسر کے تقرر کی تجویز کی ہے جو ریاستوں کو ان حقوق کی جانب توجہ دلاتا رہے۔یہ تجویز ان حقوق کے تحفظ کے لیے بالکل ناکافی ہے۔چنانچہ کمیٹی کے بعض ارکان نے بھی اپنے اختلافی نوٹ میں ان حقوق کو دستور میں شامل کرنے کی سفارش کی ہے۔

اگرچہ اردو بھی لسانی اقلیتوں میں ہے اور ان کے مطالبات میں برابر کی شریک ہے مگر اس کی حیثیت دوسری لسانی اقلیتوں سے تھوڑی سی مختلف ہے۔دوسری ریاستوں کو اپنی لسانی اقلیتوں سے وہ عناد نہیں ہے جو اتر پردیش کی حکومت اور اس کے پورے عملہ کو اردو کے ساتھ ہے۔اس کی اردو دشمنی سب کو معلوم ہے۔ایسی حالت میں جب تک تمام حقوق کا دستوری تحفظ نہ ہوجائے اس وقت تک محض ان کی سفارش یا کسی افسر کے تقرر سے اردو کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا اور اس خطرہ سے دوسری زبانیں بھی محفوظ نہیں ہیں، بلکہ دستوری تحفظ کے بعد بھی اس کے عملی نفاذ کے لیے کوشش اور نگرانی کی ضرورت ہوگی۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ اردو والوں کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کو اتر پردیش کی علاقی زبان تسلیم کیا جائے اور اس کا میمورنڈم عرصہ ہوا صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کیا جاچکا ہے لیکن اردو بھی ایک لسانی اقلیت ہے۔اس لیے انجمن ترقی اردو کے وفد نے سلیکٹ کمیٹی کے ارکان سے مل کر اردو کے

مسئلہ کو سمجھایا اور پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی گفتگو کی۔ پنڈت جی کے خیالات اردو کے بارہ میں بالکل ظاہر ہیں۔ وہ بار بار ان کا اظہار کر چکے ہیں، مگر وہ تنہا اپنی رائے سے کسی فیصلہ کے مجاز نہیں ہیں۔ اور اب لسانی اقلیتوں کے حقوق کا فیصلہ پارلیمنٹ کے اختیار میں ہے۔ اگر اس نے ان کو دستوری حیثیت سے مان لیا تو اردو والوں کا مطالبہ بڑی حد تک پورا ہو جائے گا، ورنہ اردو کو علاقائی زبان تسلیم کرانے کا مطالبہ اپنی جگہ پر قائم رہے گا اور اس کے لیے آگے قدم بڑھانا پڑے گا، مگر توقع یہی رکھنا چاہیے کہ پارلیمنٹ اقلیتی زبانوں کے حقوق دستوری طور پر مان لے گی۔ (معارف، اگست ۱۹۵۶ء)

کتاب اللہ اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کا سلسلہ

ایک عرصہ سے مسلمانوں کے مذہب، ان کے پیغمبر، ان کی مقدس کتاب اور ان کے اکابر کی توہین کا مستقل سلسلہ قائم ہے۔ ہر تھوڑے دنوں کے بعد اس قسم کا کوئی نہ کوئی واقعہ پیش آجاتا ہے اور مسلمانوں کی دل آزاری مستقل مشغلہ بن گئی ہے۔ حال میں بھارتیہ ودیا بھون بمبئی سے ایک انگریزی کتاب ''بیاگرفی آف ریلیجس لیڈرس'' شائع ہوئی ہے۔ یہ اپنی بیہودگی میں سب سے بڑھ گئی۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ازواج مطہرات کی شان میں ایسے ناشایستہ اور گستاخانہ کلمات استعمال کیے گئے ہیں۔ جن کا استعمال معمولی انسانوں کے لیے بھی نازیبا ہے، نہ کہ ذات پاک نبوی ؐ اور آپ کی ازواج مطہرات کے لیے، جو ساری دنیا کے لیے واجب الاحترام ہیں اور جن کی عظمت و محبت مسلمانوں کی سب سے بڑی ایمانی دولت ہے۔ یہ الفاظ اس درجہ ناشایستہ اور نفرت انگیز ہیں کہ سنجیدہ غیر مسلم بھی اس کو گوارا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ انہوں نے بھی اظہار بیزاری کیا ہے اور مسلمان تو ان کو پڑھ کر مشکل سے ضبط کر سکتا ہے۔ اس فتنہ انگیزی کا مقصد مسلمانوں کی دل آزاری کے سوا اور کچھ نہیں، جو کسی حیثیت سے بھی مناسب نہیں۔

اس قسم کے واقعات برابر پیش آتے رہتے ہیں اور محض احتجاج سے ان کا انسداد نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے جیسا کہ پہلے بھی تحریک ہو چکی ہے، پیشوایان دین کی توہین کی دفعات کو زیادہ وسیع اور سخت بنانے کی ضرورت ہے۔ ابھی چند ہی مہینہ ہوئے جب لکھنؤ میں اس قسم کا ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ یہ سوال اٹھایا گیا تھا، مگر پھر کسی نے اس کی جانب توجہ نہیں کی، یہ تنہا مسلمانوں کا نہیں، بلکہ تمام فرقوں کا

معاملہ ہے۔ اگر آج مسلمانوں کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے، تو کل دوسرے فرقوں کے ساتھ بھی پیش آ سکتا ہے اور اس قسم کی فتنہ انگیزی جس سے مختلف فرقوں میں نفاق اور بدامنی پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، حکومت کے مصالح کے بھی خلاف ہے۔ اس لیے جلد سے جلد ایسا قانون بنانے کی ضرورت ہے، جس سے پھر کسی گستاخ کو اس قسم کی جرأت نہ ہو، ورنہ آئے دن اس قسم کے واقعات پیش آتے رہیں گے، جن کے نتائج خطرناک ہوں گے۔ اس وقت سب سے مقدم کام یہ ہے کہ یہ کتاب فوراً ضبط کرلی جائے اور اس کے ناشرین پر مقدمہ چلایا جائے۔ اس بارہ میں تمام مسلمانوں کے جذبات وخیالات متحد ہیں۔ (معارف، ستمبر ۱۹۵۶ء)

تقسیم ملک کے بعد اسلامی اداروں کی مالی مشکلات

ہندوستان اور پاکستان میں ایک دوسرے کی کتابوں کی طباعت واشاعت کے بارہ میں مؤثر پابندی نہ ہونے سے دونوں ملکوں کے مصنّفین اور تصنیفی واشاعتی اداروں کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ جس ملک کے تاجر کا دل چاہتا ہے دوسرے ملک کی کتابیں چھاپ لیتا ہے اور ان کے مالک کچھ نہیں کرسکتے۔ چنانچہ اب سے چند سال پہلے لاہور کے ایک تاجر نے دارالمصنّفین کی سیرۃ النبی کا پہلا حصہ چھاپ لیا تھا، مگر پنجاب کے باحمیت اخبارات نے اس کو ایسا آڑے ہاتھوں لیا اور بعض اعلیٰ حکام نے بھی دباؤ ڈالا کہ سیرت کے مطبوعہ نسخے تو دارالمصنّفین کو مل گئے لیکن اس کی طباعت کے مصارف اس کو ادا کرنے پڑے اور ان نسخوں کو پاکستان ہی میں خسارہ سے فروخت کرنا پڑا، جس سے اس کو مالی نقصان پہنچا۔ اب لاہور کے مکتبہ مصطفائی نے یہی حرکت کی ہے اور سیرت کا پہلا حصہ چھاپ لیا ہے۔ یہ بددیانت مکتبہ مولانا ابوالکلام کا تذکرہ بھی چھاپ چکا ہے۔

ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے یہاں کے اسلامی ادارے جن مالی مشکلات میں مبتلا ہیں اور جس طرح ان کی زندگی بسر ہورہی ہے۔ اس سے پاکستان کے لوگ خوب واقف ہیں۔ ایسی حالت میں اگر وہ ان کی مدد نہیں کرسکتے تو ان کا کم سے کم یہ فرض تو تھا کہ وہ ان کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرتے۔ لیکن وہاں کے خودغرض تاجروں کو اس میں بھی باک نہیں اور تھوڑے فائدے کے لیے ان کی کتابیں چھاپ لیتے ہیں۔ ہم کو توقع ہے کہ پاکستان خصوصاً لاہور کے اخبارات نے جس طرح پہلے اپنی اسلامی حمیت کا ثبوت دیا تھا۔ اس مرتبہ بھی دیں گے اور اس بددیانت ادارہ کو ایسا سبق

دیں گے کہ پھر کسی کو ایسی جرأت نہ ہو اور اس کو سیرت کے مطبوعہ نسخے واپس کرنے پر مجبور کریں گے، ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو کہ سیرت نبویؐ کا پہلا حصہ جو علامہ شبلی کی تصنیف ہے۔ دارالمصنّفین کی ملکیت نہیں ہے۔ اس لیے اس کو چھاپنے میں کوئی مضائقہ نہیں، تو یہ غلط فہمی دور ہو جانا چاہیے۔ اولاً علامہ شبلی کی تمام تصانیف خواہ وہ قانونی حیثیت سے دارالمصنّفین کی ملک نہ ہوں لیکن اخلاقی حیثیت سے وہی ان کا وارث ہے اور سیرۃ النبیؐ کا پہلا حصہ تو علامہ شبلی کی وفات کے بعد دارالمصنّفین نے شائع کیا تھا اور وہ اسی کے نام رجسٹرڈ ہے۔ اس لیے وہ قانونی حیثیت سے بھی اس کی ملک ہے اور اس کی اشاعت کا کسی کو حق نہیں ہے۔

دارالمصنّفین کی آمدنی کا بڑا ذریعہ کتابوں کی تجارت ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے قیام سے پہلے اس کو حیدرآباد اور بھوپال کی ریاستوں سے بھی مدد ملتی تھی، مگر وہ عرصہ ہوا بند ہو گئی۔ اب اس کی آمدنی کا ذریعہ صرف تجارت رہ گیا ہے۔ اس کی کتابوں کی زیادہ مانگ پاکستان میں ہے، مگر دونوں ملکوں کے درمیان مالی لین دین کی دشواریوں کی وجہ سے متفرق خریدار کتابیں منگا نہیں سکتے اور پرمٹ سسٹم کی وجہ سے وہاں کے تاجروں کو بھی پہلے کے مقابلہ میں بہت محدود تعداد میں کتابیں منگانے کی اجازت ملتی ہے۔ جس سے دارالمصنّفین کی آمدنی بہت گھٹ گئی ہے اور کئی سال سے وہ سخت مالی مشکلات میں مبتلا ہے۔ اگر حکومت ہند نے ساٹھ ہزار کی وقتی مدد نہ کر دی ہوتی تو اس کا چلنا دشوار ہو جاتا۔ اب اگر پاکستان کے تاجر اس کا رہا سہا ذریعۂ آمدنی بھی چھین لینا چاہتے ہیں تو اس کی زندگی کی کیا صورت ہوگی۔ کیا پاکستان چاہتا ہے کہ ہندوستان میں جو اسلامی ادارے بحال تباہ باقی رہ گئے ہیں وہ بالکل ہی ختم ہو جائیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس کو اس کا تدارک کرنا چاہیے اور یہ تنہا دارالمصنّفین یا اسلامی اداروں کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ ہندوستان اور پاکستان دونوں کے مصنّفین اور ادارے اس مصیبت میں مبتلا ہیں۔ اس لیے دونوں حکومتوں کا فرض ہے کہ وہ کوئی ایسا قانون بنائیں جس سے ایک ملک کی کتابیں دوسرے میں نہ چھپ سکیں۔ ہم کو توقع ہے کہ پاکستان کی حکومت اور اخبارات دونوں ہماری اس درخواست پر توجہ کریں گے، جن اخبارات نے خود دارالمصنّفین کی ہمدردی میں پیش قدمی کی ہے۔ ادارہ ان سب کا شکر گذار ہے۔

(معارف، جنوری ۱۹۵۷ء)

ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد اور اردو

ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ایک ایسا ادارہ تھا، جس کا مقصد اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی خدمت اور ترقی تھا۔ گو اب ملک کے حالات اور حکومت کی پالیسی کے اثر سے اس کے کاموں کی نوعیت بدل گئی تھی اور اردو کا کام بہت کم ہو گیا تھا۔ پھر بھی کچھ نہ کچھ ہوتا تھا، مگر ہمارے صوبہ کی حکومت کو یہ بھی گوارا نہیں۔ چنانچہ وہ اکیڈمی کے دستور کی بعض دفعات میں ترمیم کرانا چاہتی ہے۔ ان میں دو ترمیموں کا اثر اردو پر خاص طور سے پڑے گا۔ ایک یہ کہ اکیڈمی کا نام ہندوستانی اکیڈمی کے بجائے اتر پردیش اکیڈمی کر دیا جائے، دوسرے اس کا مقصد ہندی اور اردو کے بجائے ''سرکاری زبان ہندی اور ان زبانوں کی خدمت قرار دیا جائے جو ہندی سے متوسل ہیں''۔ اصل انگریزی لفظ (Dependent) ہے۔ اگرچہ کہنے کے لیے یہ کہا جائے گا کہ ہندی کے متوسلین میں اردو بھی شامل ہے، لیکن اس تبدیلی کا جو اصل مقصد و منشا ہے اس کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے، یہ بلا شبہہ صحیح ہے کہ اردو ہندی ہی سے نکلی ہے، لیکن اس کی حیثیت ایک مستقل زبان کی ہے جو ہندی سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس لیے ہندی سے پیدا شدہ دوسری بولیوں کی طرح اس کو ہندی کا ضمیمہ بنانا صحیح نہیں ہے۔ اسی طرح ہندوستانی کے لفظ سے اردو کی بو آتی تھی۔ اس لیے اس کا بدلنا بھی ضروری تھا۔

اکیڈمی کو صوبہ کی حکومت سے امداد ملتی ہے اور اس کا دار و مدار بڑی حد تک اسی امداد پر ہے۔ اس لیے وہ ان تجویزوں کے ماننے پر مجبور ہے لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی آج کل اردو کے بارہ میں جو ذہنیت ہو رہی ہے، اس میں اس قسم کی تجویز عین جذبات کے مطابق تھی۔ اردو کے ممبروں کی تعداد ہی کتنی ہے، پھر ان کی آواز ہی کیا، اس لیے یہ تجویزیں گذشتہ ۲۱/ دسمبر کے جلسہ میں منظور ہو گئیں۔ اس طرح اکیڈمی میں اردو کا جو نام باقی تھا وہ بھی مٹ گیا۔ آیندہ ۲۷/ جنوری کو پھر اس کی مخصوص میٹنگ ہو رہی ہے۔ دیکھیں اس میں کیا فیصلہ ہوتا ہے۔ (معارف، جنوری ۱۹۵۷ء)

مسلم یونیورسٹی میں ادارۂ علوم اسلامیہ کا قیام

ابھی چند سال ہوئے مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ عربی کے ماتحت ادارۂ علوم و فنون اسلامی کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم ہوا ہے، جس کا مقصد اسلامیات پر تحقیقات ہے۔ اس مرتبہ اس کے لائق صدر ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کے ساتھ اس کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ادارہ کے متعلق ایک کتب خانہ ہے، گو

ابھی مختصر ہے، لیکن اسلامیات کی تحقیقات سے متعلق عربی اور فارسی کی اہم اور ضروری کتابیں موجود ہیں اور ان میں اضافہ کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ ان میں بعض نئی مطبوعات اور پرانی کتابوں کے نئے عمدہ ایڈیشن ایسے نظر آئے جو ہندوستان میں دستیاب نہیں ہوتے۔ ان کو ڈاکٹر صاحب، مصر، ٹرکی اور ایران کے سفر سے ساتھ لائے تھے۔ کئی ریسرچ اسکالر اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقات کا کام کررہے ہیں۔ ابھی یہ ادارہ ابتدائی منزل میں ہے۔ اگر اس سے پورا کام لیا گیا تو امید ہے کہ آیندہ چل کر ایک مفید اور اہم ادارہ بن جائے گا۔

اس سلسلہ میں وقت کی ایک اہم ضرورت کا تذکرہ نامناسب نہ ہوگا۔ جس کا احساس اور لوگوں کو بھی ہے۔ ہندوستان میں کم و بیش ایک ہزار سال سے ہندو مسلمانوں کا ساتھ ہے۔ اس کے باوجود ایک محدود طبقہ کے علاوہ من حیث القوم دونوں قوموں نے ایک دوسرے کے مذہب، ان کے تصور حیات، نظام زندگی اور علوم و فنون کو سمجھنے کی بہت کم کوشش کی، جس سے آج تک ان کے متعلق غلط فہمیاں ہیں۔ گو ہر زمانہ میں مسلمانوں میں ایسے اہل علم موجود رہے ہیں، جن کو اس ضرورت کا احساس تھا اور انہوں نے اس فرض کو انجام بھی دیا۔ چنانچہ قدیم علماء و مصنّفین میں ابو معشر فلکی، ابوریحان بیرونی، امیر خسرو، فیضی اور غلام علی آزاد وغیرہ نے ہندوؤں کے مذاہب اور علوم و فنون کی بڑی خدمت کی اور ان کے متعلق عربی اور فارسی میں معلومات کا بڑا ذخیرہ فراہم کردیا۔ اس دور کے علماء میں مولانا شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مناظر احسن گیلانی نے اس ضرورت کی طرف توجہ کی اور اس پر مضامین لکھے۔ خصوصاً مولانا سید سلیمان ندوی نے تو عرب و ہند کے تعلقات جیسی ضخیم اور فاضلانہ کتاب لکھ دی جو ہندو مسلمانوں کے تعلقات کے مختلف پہلوؤں پر حاوی ہے اور جس میں اس قسم کے بہت سے مسائل آگئے ہیں۔ ہندوؤں میں صرف ڈاکٹر تاراچند کا نام قابل ذکر ہے۔

مگر اب تک جس قدر کام ہوا ہے۔ وہ ضرورت کے مقابلہ میں ناکافی ہے۔ اس لیے ہندو مسلمان اہل علم و قلم اور ان کے علمی اداروں کا یہ فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مذہب، علوم اور تہذیب کے متعلق ایسا مستند اور تحقیقی لٹریچر مہیا کریں جس سے ان کی صحیح شکل نظر آئے، خصوصاً مسلمانوں کو مذہب اسلام، اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ و تہذیب کو ان کی اصلی شکل اور ہندوستان میں ان کے مذہبی اور تمدنی اثرات کو پوری تفصیل سے پیش کرنے کی ضرورت ہے اور اگر ہو سکے تو ہندی

میں، اس سے ان چیزوں کے متعلق غلط فہمیاں بھی دور ہوں گی اور ان کی عظمت بھی لوگوں کے دلوں میں قائم ہوگی۔ یہ کام مذہبی و علمی اور قومی و سیاسی ہر حیثیت سے ضروری ہے۔ دارالمصنّفین کے آیندہ کاموں میں بھی انشاء اللہ اس کا لحاظ رہے گا اور توقع ہے کہ ادارہ علوم وفنون اسلامی بھی اس کو پیش نظر رکھے گا۔ (معارف، اپریل ۱۹۵۷ء)

جماعت اسلامی اور اکابر دیوبند

جماعت اسلامی کے عقائد و خیالات اور ان کے اور اکابر دیوبند کے اختلاف کے بارہ میں ہمارے پاس بھی کبھی کبھی استفسارات آتے رہتے ہیں۔ لیکن معارف اس قسم کے اختلافی معاملات میں نہیں پڑتا، اس لیے ہم نے عمداً اس مسئلہ پر نہیں لکھا مگر حسن اتفاق سے گذشتہ مہینہ رسالہ دارالعلوم اور برہان میں دیوبند کے دو نامور علماء مولانا محمد طیب صاحب اور مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کی تحریریں اس مسئلہ کے متعلق نکلیں۔ ان دونوں کا مقصد اس ناگوار اختلاف کو ختم کرنا ہے۔ خصوصاً مولانا سعید احمد نے جس نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کو پیش کیا ہے اور جن پہلوؤں کی جانب توجہ دلائی ہے وہ کسی حیثیت سے بھی نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ علمائے کرام اس پر غور فرمائیں کہ اس مضر اختلاف کا کسی طرح خاتمہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دور فتن ساری دنیا اور خاص طور سے مسلمانوں کے لیے بڑے ابتلا و آزمائش کا زمانہ ہے۔ پرانے عقائد و خیالات بدل رہے ہیں اور نئے افکار و نظریات پر ایک نئی دنیا تعمیر ہورہی ہے۔ مذہب و اخلاق، سیاست و معاشیات و معاشرت وغیرہ کے متعلق نئے نئے نظریے اور گوناگوں پیچیدہ مسائل پیدا ہوگئے ہیں جن کے حل پر دنیا کا امن و امان اور انسانیت کی فلاح منحصر ہے اور آیندہ وہی نظام مقبول ہوگا جو ان مسائل کا حل پیش کرسکے گا۔ اس لیے جو نئی تحریک بھی اس کا دعویٰ لے کر اٹھتی ہے، دنیا اس کی طرف لپکتی ہے لیکن اب تک کوئی تحریک اور کوئی نظام اس کا حل نہ پیش کرسکا، بلکہ پیچیدگیوں میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔

اسلام کا دعویٰ ہے کہ وہ انسانوں کے لیے سب سے جامع اور بہتر نظام زندگی ہے اور ابد تک کے لیے ان کی جملہ دینی و دنیوی اور مادی و روحانی ضروریات کا کفیل ہے اور آیندہ جس قسم کے مسائل بھی پیدا ہوں گے۔ سب کا حل اس میں موجود ہے اور اس دعویٰ میں وہ بالکل سچا ہے مگر اس کا عملی

ثبوت دینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔اس کام کو وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو دینی علوم میں مہارت کے ساتھ اس زمانہ کے حالات و رجانات اور مسائل و تحریکات سے بھی پوری واقفیت رکھتے ہوں، جو ہمارے پرانے علمائے کرام کے ذوق کی چیز نہیں۔ ہر دور کے خاص مسائل اور اس کے مطابق خاص علم کلام ہوتا ہے اور اس دور کے متکلمین ہی نئے حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔تاریخ اسلام میں ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے اور آیندہ بھی یہی ہوگا۔

ہماری غفلت سے آج حال یہ ہو رہا ہے کہ دوسری قوموں کا کیا ذکر خود مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ تک اسلام کی تعلیمات اور اس کی خوبیوں سے بے خبر ہے۔اس ناواقفیت کی بنا پر نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلام سے کوئی علاقہ نہیں رہ گیا تھا، مگر اس میں ایک طلب تھی اور اس کے دماغ میں مذہب و اخلاق وغیرہ کے متعلق جو شکوک اور سوالات پیدا ہوتے تھے۔ان کا جواب نہ پاکر وہ اپنی تشفی کے لیے ہر سراب کے پیچھے دوڑتا تھا اور اس کا بڑا حصہ لادینی تحریکات کا شکار ہو رہا تھا۔جماعت اسلامی ان حالات کا مقابلہ کر رہی ہے۔اس نے مذہب اسلام اور اس دور کے مذہبی، اخلاقی، علمی، تعلیمی، سیاسی و معاشی اور معاشرتی مسائل وغیرہ کے متعلق اردو، انگریزی اور ہندی میں ایسا متکلمانہ اسلامی لٹریچر مہیا کر دیا ہے، جو تعلیم یافتہ طبقہ کے دلوں کو اپیل کرتا ہے۔اس نے ایک طرف ان میں ایمان و عمل کی روح پیدا کر دی ہے اور آج وہ طبقہ جس کو اسلام سے محض برائے نام تعلق رہ گیا تھا، بلکہ اس نام سے بھی شرماتا تھا، عملاً مسلمان بن گیا ہے اور اس میں دینی و ملی غیرت و حمیت پیدا ہوگئی ہے جس کا مشاہدہ ہر جگہ کیا جا سکتا ہے۔دوسری طرف غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی صحیح اور دلکش تصویر آ گئی ہے۔

جدید طبقہ کی طلب کو جماعت اسلامی پورا کر رہی ہے۔اس لیے اس پر اس کا اثر برابر بڑھتا جاتا ہے، جس کو کوئی قوت نہیں روک سکتی، بلکہ اس کے اثرات دینی مدارس تک پہنچ گئے ہیں، جس سے خود دارالعلوم دیوبند بھی محفوظ نہیں ہے۔اس کے طلبہ کی اچھی خاصی جماعت اس سے متاثر ہے اور اس کے بعض علماء تک جماعت اسلامی کے کاموں کو تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں۔خود برہان کی تحریر اس کی شاہد ہے۔برہان ندوۃ المصنّفین کا رسالہ ہے، جس کے ارکان میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مفتی عتیق الرحمٰن اور مولانا حفظ الرحمٰن جیسے علمائے دیوبند ہیں۔خود مولانا طیب صاحب کا رویہ بھی جماعت کے ساتھ نسبتاً نرم اور مصالحانہ رہا ہے۔یہ اس کا ثبوت ہے کہ وہ علمائے دیوبند جو زمانہ کے حالات سے

باخبر ہیں، جماعت اسلامی کے مخالف نہیں ہیں۔

اس تحریر کا یہ مقصد نہیں ہے کہ اس زمانہ میں جماعت اسلامی ہی صحیح دینی خدمت انجام دے رہی ہے یا وہ نقائص سے بالکل پاک ہے۔ جو جماعتیں کسی حیثیت سے بھی دینی کام کر رہی ہیں۔ ان سب کے خدمات لائق تحسین ہیں، بلکہ بعض دوسری جماعتوں کے کام جماعت اسلامی کے کاموں سے بھی زیادہ اہم اور مفید ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے خدمات قبول فرمائے۔ جماعت اسلامی کی بعض خامیوں سے بھی انکار نہیں۔ اس کے قلم وزبان کی بے باکی کی شکایت بالکل بجا ہے۔ اس کے بعض انتہا پسند اور پرجوش کارکنوں کے قلم اور زبان سے ایسی تحریریں اور مدعیانہ باتیں نکل جاتی ہیں، جو ہر شخص کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں۔ انہی سے ان کے متعلق بدگمانی پیدا ہوتی ہے، مگر اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ جو جماعت بھی اس قسم کے اصلاحی کام کرتی ہے، اس سے اس قسم کی بے عنوانی اور الفاظ کی بے احتیاطی ہو ہی جاتی ہے۔ جس کی بنا پر تاریخ اسلام کے بہت سے اکابر کو مورد طعن بننا پڑا۔ دوسرے اس کے لکھنے والے اکثر نوجوان ہیں، جن کو جذبات اور قلم پر قابو نہیں ہے، مگر تجربہ کے ساتھ یہ خامی دور ہو جاتی ہے۔ تاہم اس قسم کی خامیاں یقیناً قابل اصلاح ہیں، باقی جزوی اور فروعی اختلاف لائق التفات نہیں۔

اس کے علاوہ اگر ان کے عقائد وخیالات میں کوئی اور چیز بھی قابل اعتراض نظر آئے تو دوستانہ اور ہمدردانہ افہام وتفہیم سے اس کی اصلاح ہو سکتی ہے، محض مخالفت سے ضد پیدا ہوتی ہے۔ ہندوستان کی جماعت اسلامی کے امیر سنجیدہ اور سلجھے ہوئے آدمی ہیں۔ ان کا قلم اور زبان دونوں محتاط ہے۔ اگر ان کو معقولیت کے ساتھ کسی خامی کی طرف توجہ دلائی جائے، تو یقین ہے کہ وہ ضرور اس کو قبول کریں گے۔ خود راقم کو اس کا ذاتی تجربہ ہے۔ لیکن کسی فروعی اختلاف کی بنا پر جماعت کے اچھے کاموں کو بھی نظر انداز کر دینا اور اس کو یکسر مطعون قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ **لا یجرمنکم شنان قوم الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی۔**

سب سے بڑا اعتراض جماعت اسلامی کے دستور کی دفعہ ٦ پر کیا جاتا ہے، مگر دونوں فریق اس کی مختلف تعبیر کرتے ہیں۔ جماعت اسلامی جو تعبیر کرتی ہے، اس پر کسی اعتراض کی گنجائش نہیں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ کسی تحریر کی تعبیر وترجمانی کا زیادہ حق صاحب تحریر ہی کو ہوتا ہے۔ جماعت

اسلامی کی تعبیر سے اختلاف کا سب سے بڑا اور بنیادی سبب ختم ہو جاتا ہے۔اس لیے ضرورت ہے کہ اس ناگوار اور تکلیف دہ اختلاف کو بالکل ختم کر دیا جائے۔اس سے ایک مفید دینی کام اور علماء کے وقار دونوں کو صدمہ پہنچا ہے اور دونوں میں دین کا نقصان ہے۔ (معارف،جون ۱۹۵۷ء)

اردو کے مسائل پر انجمن ترقی اردو کی کانفرنس

اردو کے مسائل پر غور کرنے کے لیے شروع جولائی میں انجمن ترقی اردو کی جانب سے علی گڑھ میں جو کانفرنس ہوئی تھی۔وہ اجتماع کی حیثیت سے خاصی کامیاب رہی۔مختلف صوبوں کے ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے اردو کے نمایندے اور ادیب و اہل قلم جمع ہو گئے تھے۔اس کانفرنس میں جن مسائل پر بحث ہوئی اور جو تجویزیں پاس ہوئیں، ان کی تفصیل اخبارات میں شائع ہو چکی ہے۔اس قسم کی کوششوں کا اگرچہ ابھی تک کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا، نہ صدر جمہوریہ نے اردو کے محضر کا کوئی جواب دیا اور نہ ہمارے صوبہ کی حکومت کے رویہ میں کوئی تبدیلی ہوئی، مگر ان کوششوں کو بالکل بے نتیجہ بھی نہیں کہا جا سکتا۔(معارف،اگست ۱۹۵۷ء)

مشرقی پنجاب کے مسلمان

تقسیم ہند کے سلسلہ میں مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر جو تباہی آئی اس سے ہر شخص واقف ہے۔جہاں لاکھوں مسلمان آباد تھے، وہاں اب ان کی آبادی برائے نام رہ گئی۔ان کی ساری املاک ان کے قبضہ سے نکل گئی، مگر وہ ایک ایسا بحرانی دور تھا، جس میں حکومت بھی بے بس تھی، مگر وہ دور عرصہ ہوا ختم ہو چکا۔اس لیے جو مسلمان وہاں باقی رہ گئے ہیں۔ان کی املاک ان کو واپس مل جانا چاہیے تھی، مگر ادارۂ اسلامی پانی پت کرنال کی ایک درخواست سے جو مشرقی پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے نام دی گئی ہے اور جس پر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب، مولانا محمد میاں مرادآبادی اور مولانا لقاءاللہ صاحب عثمانی، جیسی ممتاز شخصیتوں کے دستخط ہیں۔ یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ مشرقی پنجاب کے مسلمان اب تک بے خانماں ہیں۔ان کی املاک، ان کے اوقاف، مساجد، خانقاہوں، درس گاہوں اور مدرسوں تک پر کسٹوڈین کا قبضہ ہے۔اور ان سے ایسا مصرف لیا جاتا ہے، جن سے ان کی بے حرمتی ہوتی ہے۔اور بار بار توجہ دلانے کے باوجود اس کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔اب جبکہ بحرانی دور ختم ہوئے عرصہ ہو چکا۔ہر چیز حکومت کے قبضہ و اقتدار میں آ چکی ہے۔مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی یہ

خانہ خرابی، املاک سے ان کی محرومی، متبرک مقامات کی بے حرمتی، ایک جمہوری حکومت کے لیے شرمناک ہے۔اس سے اس کی سیکولرزم بدنام ہوتی ہے۔اس لیے صوبائی اور مرکزی دونوں حکومتوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کی شکایتوں کو دور کرکے ان کو مطمئن کریں۔(معارف،نومبر ۱۹۵۷ء)

اردو نصاب کی تیاری کا مسئلہ

اردو کی نصابی کتابوں کا مسئلہ بھی کچھ اہم نہیں ہے۔ہم اس پر پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔اول تو اردو کتابوں کا قحط ہے۔کتابیں نصاب میں داخل ہیں،مگر بازار میں نہیں ملتیں اور جو ملتی بھی ہیں وہ کسی حیثیت سے بھی نصاب میں شامل ہونے کے لائق نہیں ہیں۔ان کی زبان اتنی خراب ہے کہ اس کو اردو کہنا اردو کی توہین ہے اور اس کے مقابلہ میں ہندی پڑھنا کہیں بہتر ہے۔ان کے خیالات اور مضامین میں،تمامتر ہندو مذہب اور ہندو کلچر کی ترجمانی ہے۔مسلمانوں کی تہذیب وروایات کا ان پر سایہ بھی نہیں پڑنے پایا ہے۔اور جہاں بھولے سے ان کا ذکر آ گیا ہے وہاں اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے،جس کی شکایتیں اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔اسکولوں میں مسلمان بچے بھی پڑھتے ہیں،جو بچے ان کو پڑھیں گے ان کو اپنی تاریخ وتہذیب سے کوئی واسطہ نہ رہ جائے گا، بلکہ آیندہ نسلوں میں نام کے علاوہ ان میں اسلام کی کوئی نشانی باقی نہ رہے گی۔جس کے نمونے ابھی سے وابستگان حکومت میں نظر آنے لگے ہیں۔

تعلیم کے ذریعہ کسی قوم وملت کی خصوصیات کو مٹانا جبری تبدیلی مذہب سے کم قابل الزام نہیں ہے۔اور ایک سیکولر حکومت کے لیے انتہائی افسوسناک ہے۔تعلیمی کتابوں کو اس قسم کی جانب داری سے بالکل پاک ہونا چاہیے۔ایسا تو انگریزی دور میں بھی نہ ہوا تھا۔ان کا نظام تعلیم بڑی حد تک سیکولر تھا۔انہوں نے اپنی تہذیب وروایات کو اس طرح جبراً مسلط کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔یہ اور بات ہے کہ حاکم قوم کی تہذیب قدرتاً محکوم پر اثر انداز ہوتی ہے اور مغربی تمدن ظاہری اور مادی حیثیت سے اس قدر دل آویز تھا اور اس کی پشت پر علم وسائنس کی ایسی قوت تھی کہ وہ خود بخود پھیل گیا،لیکن اس کا اثر کسی فرقہ کی مذہبی وملی روایات پر زیادہ نہیں پڑنے پایا۔

(معارف،دسمبر ۱۹۵۷ء)

آندھرا میں اردو

آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ نے حال میں اپنی تقریر میں اعلان کیا ہے کہ اردو بھی آندھرا کی ایک زبان رہے گی اور جو اردو بولنے والے تلگو نہیں جانتے۔ ان کو ملازمتوں کے ملنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ یہ منصفانہ اعلان ان تمام صوبوں کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے، جہاں اردو بھی بولتی جاتی ہے۔ آندھرا میں تو یہ روشنی مگر چراغ تلے اب تک اندھیرا بلکہ اندھیر ہے۔ یعنی اس صوبہ میں جو اردو کا اصل مرکز ہے حکومت کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کاش اس کے وزیر اعلیٰ کو بھی یہ توفیق ہوتی۔ اب تو چشم بددور وہ مشاعروں میں غزلیں بھی پڑھنے لگے ہیں، مگر جہاں اردو کے سرکاری حقوق کا سوال آیا کانوں پر ہاتھ دھرتے ہیں، بلکہ اب تو حکومت، اتر پردیش کے نیم سرکاری اداروں سے بھی اردو کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ چنانچہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے دستور میں ایسی تبدیلی کرانا چاہتی ہے، جس سے اکیڈمی خالص ہندی اکیڈمی ہوجائے گی۔ اور ہندی کی ذیلی شاخوں اودھی اور بھوجپوری وغیرہ اتر پردیش کی معمولی بولیوں کے ساتھ محض کہنے کے لیے اردو کا بھی نشان رہ جائے گا۔ چنانچہ اس پر غور کرنے کے لیے گذشتہ مہینہ اکیڈمی کی کونسل کا جلسہ ہوا تھا۔ اردو کے حامی اس کو بھی غنیمت سمجھ کر ضمناً ہی سہی اردو کے نام کی تصریح کرانا چاہتے تھے، مگر ممبروں کی اکثریت حکومت کی تجویز کی موید تھی۔ اس لیے یہ بھی نہ ہوسکا اور اردو کے ممبروں کو چاروناچار اکثریت کا فیصلہ ماننا پڑا۔

(معارف، جنوری ۱۹۵۸ء)

اردو اور ہماری ذمہ داریاں

ہم سب اس کے عادی ہوگئے ہیں کہ ہر معاملہ میں حکومت ہی کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور خود اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے۔ چنانچہ ہم خود اردو کے مسئلہ میں بارہا حکومت کا شکوہ کرچکے ہیں، مگر آج اردو کے بولنے والوں اور اس کے حامیوں سے بھی چند باتیں کہنی ہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ کسی زبان کی ترقی اور اس کے تنزل میں حکومت کی حمایت اور اس کی مخالفت کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ ملک میں جتنی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں، ان کو زندہ رکھنا جمہوری حکومت کا فرض اور ان کے حقوق کے لیے لڑنا ان کے بولنے والوں کا حق ہے۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی زبان کی زندگی اور موت حکومت کے اختیار میں نہیں ہے۔ کوئی حکومت کسی ایسی زبان کو ختم نہیں کرسکتی

جس میں خود زندہ رہنے کی صلاحیت اور اس کے بولنے والوں میں اس کو زندہ رکھنے کا جذبہ ہو۔ اردو کی صلاحیت اس سے ظاہر ہے کہ وہ ہر قسم کی مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود نہ صرف زندہ ہے بلکہ حکومت کے دائرہ کے باہر اس کی ترقی کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اس لیے اب آیندہ اس کی زندگی وموت اس کے بولنے والوں پر منحصر ہے۔

گو یہ نہایت تلخ حقیقت ہے مگر واقعہ ہے کہ اردو کے خدمت گذاروں اور ایک محدود جماعت کے علاوہ اردو کے بارہ میں اس کے حامی اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے اور خود ان کی غفلت اور بے توجہی سے اردو کو کچھ کم نقصان نہیں پہنچ رہا ہے۔ اردو کے بقا کے سلسلہ میں سب سے اہم مسئلہ اس کی ابتدائی تعلیم کا ہے۔ اس بارہ میں اس کے حامیوں پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں، ان کو بہت کم لوگ پورا کررہے ہیں۔ یہ مانا کہ حکومت نے اردو کو جو تعلیمی حقوق دیے ہیں۔ ان میں متعلقہ حکام طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالتے ہیں، لیکن کتنے لوگ ان رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہیں، بلکہ اب تو اس کی مثالیں بہ کثرت ہیں کہ حکومت کی ہندی نوازی اور ہندی کا چلن دیکھ کر خود والدین اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھواتے اور ثانوی تعلیم میں خود طلبہ اردو نہیں لیتے۔ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ سرکاری اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا دروازہ بالکل بند ہوچکا ہے تو گھروں میں بچوں کی اردو تعلیم سے کون سی چیز مانع ہے، جبکہ اس میں کوئی خرچ بھی نہیں ہے اور تعلیم یافتہ والدین خود بچوں کو آسانی سے اردو پڑھا سکتے ہیں۔ اس غفلت اور لاپروائی کا یہ عبرت ناک نتیجہ ہے کہ آج بہت سے ایسے گھرانوں کے بچے جن کی مادری زبان اردو بلکہ اردوئے معلیٰ ہے۔ اردو نہیں لکھ سکتے اور اردو کے مقابلہ میں ان کو ہندی لکھنے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے۔

یہی حال لڑکیوں کی تعلیم کا ہے، جس کے نتائج ان تمام لوگوں کے لیے جن کی مادری زبان اردو ہے اور خاص طور سے مسلمانوں کے لیے اور بھی خطرناک ہیں۔ ہندی کا نصاب محض زبان کی تعلیم کا نہیں بلکہ ہندو کلچر کی تعلیم کا ہے۔ اس کو پڑھنے والی لڑکیاں اردو سے بالکل ناواقف اور خالص ہندی کی تعلیم یافتہ اور ہندو کلچر کی پروردہ ہوں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آیندہ چل کر ان کی گود میں جو نسل پلے گی، اس کی نہ صرف مادری زبان ہندی ہوجائے گی بلکہ وہ تمامتر ہندو تہذیب کے رنگ میں رنگ جائے گی، جس کی ذمہ داری سے والدین قطعاً بری نہیں ہیں۔ اسی پر اردو کی ترقی واشاعت کے

اور وسائل کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔ اردو کے حامیوں نے آج کتنے مدارس شبینہ اور تعلیم بالغاں کے مرکز قائم کیے ہیں۔ کتنے تعلیم یافتہ اردو کے اخبارات، رسالے اور کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں۔ جن میں کچھ ذوق بھی ہے تو ان کا مطالعہ بھی ادنیٰ درجہ کے لٹریچر سے زیادہ نہیں ہے، جب خود ہماری غفلت اور بے توجہی کا یہ حال ہے تو تنہا حکومت کی زیادتیوں کا شکوہ کہاں تک صحیح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کی زندگی خود ان کے بولنے والوں کی کوشش پر منحصر ہے۔ اگر اس کو زندہ رکھنا ہے تو اس کے تمام وسائل اختیار کرنے چاہئیں، خصوصاً اردو کی ابتدائی تعلیم والدین کا اولین فرض ہے اور اس میں ان کا کوئی عذر بھی صحیح نہیں ہے۔ جس گھر کا ماحول اردو ہو اس میں اس کی تعلیم اور بھی آسان ہے، اگر وہ اتنا بھی نہیں کر سکتے تو تنہا حکومت سے اس کا شکوہ بیکار ہے۔ (معارف، فروری ۱۹۵۸ء)

انجمن ترقی اردو اور اردو

انجمن ترقی اردو کا وفد گذشتہ مہینہ ۲۹/اپریل کو صدر جمہوریہ سے ملا اور اردو کے پہلے میمورنڈم کی یاد دہانی کر کے دوبارہ اس کے قانونی حقوق اور مطالبات کی تفصیلی عرضداشت پیش کردی۔ پہلے خیال تھا کہ اس کے فیصلہ کا اختیار صدر جمہوریہ کو ہے مگر ان کے جواب سے ظاہر ہوا کہ حکومت اس کا فیصلہ کرے گی اور وہ بہت جلد اس عرضداشت کو حکومت کے سامنے پیش کردیں گے۔ اس جواب نے ایک نئی شکل پیدا کردی ہے جو غالباً اردو کے لیے زیادہ مفید ہو۔

اردو کا مقدمہ ہر حیثیت سے اس قدر مضبوط اور اتنا کھلا ہوا ہے کہ اس کے فیصلہ میں کوئی تذبذب نہ ہونا چاہیے۔ یہ اردو کی بدقسمتی اور ہماری ذہنیتوں کی خرابی ہے کہ ایسے کھلے ہوئے مسئلہ کو بھی جو دو اور دو چار کی طرح واضح ہے، قابل بحث بنا دیا ہے۔ ارکان حکومت میں سے یہ کس کو نہیں معلوم کہ اردو ہندوستان کی ایک مشترک اور مقبول عام زبان ہے، جس کے بولنے والے کروروں ہیں۔ وہ دلی، اتر پردیش اور بہار کے ایک بڑے طبقہ کی مادری زبان ہے۔ اس کے علاوہ مختلف ریاستوں میں اس کے لاکھوں بولنے والے ہیں اور ان کا سارا کاروبار اردو میں ہوتا ہے۔ یہ اردو کی بدقسمتی اور صوبائی حکومتوں کی تنگ نظری ہے کہ ایسی ہندوستان گیر زبان ان حقوق سے بھی محروم ہے جو بہت سی ادنیٰ ادنیٰ زبانوں کو حاصل ہیں۔

اس موقع پر اردو کے پرانے محسن اور ہمارے صوبہ کے دوربین وزیر اعلیٰ کی یہ پیش بندی

لائق داد ہے کہ اس خطرے سے کہ مبادا مرکزی حکومت اردو کے بارہ میں کوئی ایسا فیصلہ نہ کردے جو ان کی پالیسی کے خلاف ہو۔انھوں نے پہلے ہی یہ واضح کردیا کہ اس عرضداشت سے ان کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی اور اردو اس صوبہ کی علاقائی زبان نہیں بنائی جاسکتی۔ یہ گویا مرکزی حکومت کو ایک طرح کی تنبیہ ہے کہ وہ کوئی ایسا فیصلہ نہ کرے جو ان کے لیے ناقابل قبول ہو۔

صوبائی حکومتوں کا جو حال بھی ہو لیکن مرکزی حکومت حتی الامکان اپنا دامن تعصب وتنگ نظری سے پاک رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔اور اسی سے ہندوستان کی سیکولرزم کا بھرم قائم ہے اور اس میں اتنی قوت بھی ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کو ریاستوں سے منوا بھی لیتی ہے۔جس کا ثبوت وہ ریاستوں کی جدید تشکیل اور دوسرے اہم معاملات میں دے چکی ہے۔مگر یہ عجیب بات ہے کہ اردو کے معاملہ میں وہ بھی بے بس ہوجاتی ہے۔ ورنہ اردو کی حمایت میں پنڈت جواہر لال نہرو کی آواز بے اثر نہ رہتی۔اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو کا مسئلہ مقدمہ کی شکل میں اب تک حکومت کے سامنے پیش ہی نہیں ہوا اور پنڈت جی جو کچھ کہتے تھے۔اس کی حیثیت محض نیک مشورے کی تھی، مگر اب یہ مقدمہ پیش ہوگیا ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ اب حکومت اس کا کیا فیصلہ کرتی ہے۔

درحقیقت اردو کا مسئلہ حکومت ہند کی جمہوریت اور سیکولرزم کا ایک بڑا امتحان ہے، جس کا اثر ہندوستان کے پیچیدہ لسانی مسائل پر بھی پڑے گا۔ اگر اردو جیسی ترقی یافتہ مشترک اور مقبول عام زبان کو بھی حقوق نہیں ملتے تو دوسری زبانوں کے حقوق کے تحفظ کی کیا ضمانت ہوگی۔اور ہندوستان اور اس کے باہر دوسرے ملکوں میں اس کا کیا اثر پڑے گا۔ یہ بھی جمہوریت کا اعجوبہ ہے کہ ہندوستان کی بہت سی ادنیٰ ادنیٰ بولیوں کا جن کی اردو کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ایک وطن ہے جہاں ان کو اپنی نشوونما اور ترقی کے پورے مواقع حاصل ہیں اور اردو جیسی زبان کا اب تک کوئی وطن ہی متعین نہیں ہوا ہے۔حقوق کا سوال تو اس کے بعد کا ہے۔

افسوس ہے کہ اس کھلی ہوئی حقیقت کو بھی فرقہ پرستوں نے قابل بحث بنادیا ہے کہ اردو کا مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں، بلکہ ان تمام فرقوں کا ہے جن کی مادری زبان اردو ہے، یا وہ اردو بولتے ہیں۔اس کا تازہ ثبوت یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو کے وفد میں ہندو ارکان کی تعداد زیادہ تھی، جس میں ڈاکٹر تاراچند، پنڈت ہردے ناتھ کنزو، مرکزی حکومت کے سابق وزیر خارجہ شری راج بہادر گوڑ،

سردار حکم سنگھ ڈپٹی اسپیکر پارلیمنٹ، مسز آرونا آصف علی جیسے ممتاز ہندو اور سکھ شامل تھے۔ گو یہ حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہے لیکن اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ اردو تنہا مسلمانوں کی زبان ہے تب بھی کیا ہندوستان کے ۴ ½ کرور مسلمانوں کی زبان کو ایک جمہوری حکومت میں زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ ایسی حکومت کے متعلق مسلمانوں کے جذبات کیا ہوں گے۔ وہ کس طرح اس پر اعتماد کر سکتے ہیں اور دوسرے ملکوں میں ایسی جمہوریت کے متعلق کیا رائے قائم ہوگی۔ اس لیے اردو کا مسئلہ تنہا کسی فرقہ کا یا محض لسانی نہیں، بلکہ ہندوستان کی جمہوریت کی ساکھ کا ہے۔

ہندی والوں کے استبداد و تنگ نظری نے ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں جو نازک صورت حال پیدا کر دی ہے اس سے حکومت کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔ اس موقع پر یہ بھی یاد دلانا نامناسب نہ ہوگا کہ اگر ارکان حکومت کے دلوں میں کچھ بھی مولانا ابوالکلام کی یاد آتی ہے تو اردو کے بارہ میں ان کی آخری وصیت کی تعمیل ضروری ہے۔ اردو ان کی محبوب زبان تھی، اس کو زندہ رکھنا ان کی سب سے بڑی یادگار ہے۔ اس سے ان کی روح زیادہ خوش ہوگی ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ مولانا سے تعلق کا دعویٰ اور ان کی موت پر اظہار غم محض زبانی ہے۔ اس لیے ہم کو توقع ہے کہ حکومت ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر اردو کے بارہ میں فیصلہ کرے گی۔ (معارف، مئی ۱۹۵۸ء)

فرقہ واریت کا مسئلہ اور حکومت

ہندوستان کے سامنے جو اہم اندرونی مسائل ہیں ان میں ایک بڑا مسئلہ فرقہ واریت کا مقابلہ اور اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ ہے۔ ان کے قانونی حقوق جو بھی ہوں لیکن عملاً وہ بے نتیجہ ہیں۔ خصوصاً مسلمانوں کو حکومت سے بڑی شکایتیں ہیں۔ ہر شعبہ میں ان کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ خاص طور سے اتر پردیش کے مسلمان جن مشکلات میں مبتلا ہیں اس کو وہی جانتے ہیں اور جب وہ اس کا شکوہ کرتے ہیں تو الٹے ان پر فرقہ واریت کا الزام لگایا جاتا ہے۔ کانگریس کے حلقہ سے کبھی کبھی ضرور ان کے ساتھ انصاف کرنے کی آواز اٹھتی ہے لیکن وہ محض رسمی ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اب کانگریس ہائی کمانڈ نے پہلی مرتبہ سنجیدگی سے ادھر توجہ کی ہے اور اس کے لیے زور و قوت کے ساتھ آواز بلند کی ہے اور پنڈت جواہر لال نہرو نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے جلسہ میں کانگریس کی خامیوں پر جس صاف گوئی سے تنقید اور اقلیتوں کے حقوق اور اردو کے مسئلہ پر جس سچائی اور

جرأت کے ساتھ خیالات ظاہر کیے ہیں وہ ان ہی کا حصہ ہے اور اس حق گوئی کی توقع ان ہی سے ہوسکتی تھی۔ اس سلسلہ میں پنڈت جی نے بڑی پتہ کی بات کہی ہے کہ اقلیتوں کے اطمینان کے معنی یہ ہیں کہ خود ان کو اس کا اعتراف ہو۔

اقلیتوں کے جن حقوق پر بحث ہوئی ہے۔ ورکنگ کمیٹی نے تجویز کی شکل میں بھی ان کو منظور کیا ہے اور صوبائی کمیٹیوں کو ان پر عمل کرنے کی ہدایات بھی جاری کردی ہیں۔ اردو کے حق کے بارہ میں جو تجویزیں منظور ہوئی ہیں ان میں قریب قریب وہ سب باتیں آ گئی ہیں، جن کا مطالبہ اردو کے لیے کیا جاتا ہے۔ اگرچہ ورکنگ کمیٹی کا فیصلہ خود ایک باوزن چیز ہے، مگر وہ اسی وقت موثر ہوسکتا ہے جب اس کو قانونی شکل دے دی جائے۔ ورنہ اردو کے مخالفین اور صوبائی حکومتیں مختلف تدبیروں سے بے اثر بنانے کی کوشش کریں گی۔ جیسا کہ اتر پردیش کی حکومت کے رویہ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس کی صورت یہی ہے کہ جن ریاستوں میں اردو بولی جاتی ہے، صدر کی جانب سے اس کو وہاں کی علاقائی زبان ہونے کا اعلان کردیا جائے یا کم سے کم اردو کے لیے جن حقوق کی سفارش ورکنگ کمیٹی نے کی ہے ان ہی کو قانونی شکل دے کر مضبوط کردیا جائے ورنہ تنہا ورکنگ کمیٹی کی تجویز ان کے نفاذ کے لیے کافی نہیں ہے۔

ورکنگ کمیٹی کا یہ فیصلہ بڑا منصفانہ اور جرأت مندانہ ہے۔ فرقہ پرست جماعتیں اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گی۔ وہ کانگریسی بھی جن کے ذہن صاف نہیں ہیں۔ مختلف تدبیروں سے اس کی مخالفت اور اس کو ناکام بنانے کی کوشش کریں گے جس کا اشارہ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کے بیان میں موجود ہے، مگر کانگریس ہائی کمانڈ کے لیے مضبوطی دکھانے کا یہی وقت ہے۔ اس کا کام مخالفت سے ڈر کر عام ذہنیت کے ساتھ بہنا نہیں، بلکہ اس کو درست کرکے صحیح راستہ پر چلانا ہے۔ خواہ اس میں کتنے ہی مشکلات کا سامنا اور کچھ نقصان بھی اٹھانا پڑے۔

کانگریس کے زوال کا بڑا سبب یہی ہے کہ وہ اپنے منصب سے ہٹ گئی ہے۔ اس میں خودغرضوں اور فرقہ پرستوں کا غلبہ ہوگیا ہے جن کا مقصد محض ذاتی منفعت اور حصول اقتدار ہے۔ اس کے لیے وہ فرقہ پرستی کو ہوا دیتے رہتے ہیں یا کم سے کم اس کی مخالفت نہیں کرسکتے۔ کانگریس اس زمانہ تک مقبول رہی اور ملک پر اس کا اثر رہا، جب تک اس کا مقصد ملک کی خدمت تھا۔ اس میں ایثار

وقربانی تھی۔اسی کی بدولت اس نے ہندوستان کو آزاد کرایا اور جب وہ اس راہ سے ہٹ کر خودغرضی اور جاہ واقتدار کی ہوس میں مبتلا ہوگئی تو اس کا اثر جاتا رہا،مگران خامیوں کے باوجود اپنے مقصد،اصول اوراپنی روایات کے اعتبار سے کانگریس ہی ایسی جماعت ہےاوراس میں ایسی شخصیتیں موجود ہیں جو ملک کو صحیح راستہ پر لے جاسکتی ہیں۔اگر کانگریس کی خامیاں دور ہوجائیں تو وہ آج اپنا کھویا ہوا مقام حاصل اور ملک کی صحیح رہنمائی کرسکتی ہے،مگراس کے لیے جاہ واقتدار کی ہوس کو چھوڑنا پڑے گا۔ گاندھی جی کی کانگریس کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ اس کا نصب العین خدمت تھا۔اس میں ایثاروقربانی تھی۔وہ کسی لالچ یا خوف سے اپنے کسی اصول کو قربان نہ کرتی تھی، بلکہ اصول کے لیے ہر چیز قربان کردیتی تھی،حتیٰ کہ گاندھی جی نے اس راہ میں جان تک دے دی۔اگر کانگریس کو زندہ کرنا ہے تو آج بھی یہی نقطۂ نظر پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔اس کے بغیر وہ زندہ نہیں ہوسکتی اور نہ ملک کی صحیح رہنمائی کرسکتی ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ اس راہ میں دشواریاں بھی ہیں۔فرقہ پرست جماعتوں کو کانگریس کو بدنام کرنے کا موقع مل جائے گا۔وہ اس کی مخالفت میں پورا زورصرف کردیں گی،مگران کے پاس کوئی پروگرام،کوئی اصول اوراخلاقی قوت نہیں ہے۔اس کی بنیاد تعمیر کے بجائے مخالفت اور تخریب پر ہے۔ اس لیے آخر میں جیت کانگریس ہی کی ہوگی۔ ہندومہاسبھا نے ان مسجدوں کو جو اس کے خیال میں مندرتوڑ کر بنائی گئی ہیں،دوبارہ مندر بنانے کا جوشوشہ چھوڑا ہے۔وہ بھی اسی قبیل کا ہے۔اس کے پاس کوئی ٹھوس تعمیری پروگرام نہیں ہے۔اس لیے وہ زندہ رہنے کے لیے اسی قسم کے کمزورسہارے ڈھونڈھتی ہے،مگراس تحریک کی لغویت اتنی ظاہر ہے کہ سنجیدہ ہندوبھی اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔اولاً تواس کا ثبوت کیا ہے کہ کسی مسجد کو مندرتوڑ کر بنایا گیا ہے۔محض دعویٰ سے تو کوئی چیز ثابت نہیں ہوتی اور اگر بالفرض کوئی واقعہ ایسا نکل بھی آئے تو آج صدیوں کے بعد یہ حساب کتاب نہیں چکایا جاسکتا۔تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس قسم کے پرانے قضیے اٹھائے گئے ہوں۔ورنہ خودمہاسبھا کو بھی بدھسٹوں سے پرانا حساب چکانا پڑے گا،جن کے سارے مندرہندوؤں نے نیست ونابود کرڈالے اور یہ سودا ان کے لیے بہت گراں پڑے گا۔یہ تحریک اگرچہ بالکل بے جان ہے لیکن حکومت کو بہرحال اس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ فتنہ آگے نہ بڑھنے پائے۔(معارف،جون ۱۹۵۸ء)

مسلم یونیورسٹی پر فرقہ پرستی کا الزام

آج کل مسلمانوں کو ستانے اور بدنام کرنے کا سب سے آسان نسخہ یہ ہے کہ ان کو فرقہ پرست اور پاکستانی کہہ دیا جائے۔ اس کے بعد پھر کسی ثبوت اور دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور اس حربہ کی زد سے اشخاص سے لے کر جماعتوں اور اداروں تک کوئی بھی محفوظ نہیں۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے مسلمانوں کی دوسری چیزوں کی طرح مسلم یونیورسٹی بھی فرقہ پرستوں کی نگاہ میں کھٹک رہی ہے اور وہ اس کو نقصان پہنچانے کے لیے طرح طرح کے الزام لگاتے رہتے ہیں۔ خصوصاً جب سے ہندو یونیورسٹی کی بے عنوانیاں اور اس کے شرمناک واقعات بے نقاب ہوئے ہیں اور حکومت ہند نے اس کو اپنے انتظام میں لے لیا ہے۔ اس کی خفت میں مسلم یونیورسٹی کی مخالفت اور بڑھ گئی ہے اور اس کے خلاف روز ایک نہ ایک افسانہ تراشا جاتا ہے۔ چنانچہ ابھی حال میں بمبئی کے انگریزی اخبار بلٹز نے جو اپنی اعجوبہ پسندی کے لیے مشہور ہے۔ یونیورسٹی کے خلاف ایک نہایت زہریلا مضمون لکھا ہے، جس میں اس کو فرقہ پرست اور پرو پاکستانی ثابت کرنے کے لیے مختلف قسم کے الزام لگائے گئے ہیں۔ ہندو مہا سبھا کے جنرل سکریٹری ویش پانڈے نے اپنے ایک تازہ بیان میں حکومت سے یہاں تک مطالبہ کیا ہے کہ مسلم یونیورسٹی بند کر دی جائے یا اس کی تحقیقات کے لیے کمیشن مقرر کیا جائے۔

مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بشیر حسین صاحب زیدی نے ایک پریس کانفرنس میں بلٹز کے تمام الزاموں کا مدلل جواب دیا ہے اور یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کے اعداد و شمار سے اس کی پوری تردید اور یونیورسٹی کی سیکولر پالیسی کی وضاحت کی ہے۔ اصولی اور صحیح جواب تو یہی ہے جو انہوں نے دیا ہے، لیکن اس کے دوسرے جواب بھی ہیں۔ جو وہ نہیں دے سکتے تھے۔ وہ یہ کہ علی گڑھ کالج اصل میں مسلمانوں کی تعلیمی پستی کو دور کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا اور وہ محض تعلیمی نہیں بلکہ مسلمانوں کا تہذیبی ادارہ بھی تھا، جس کا مقصد ان کی تہذیب و روایات کے مطابق مسلمان نوجوانوں کی تعلیم و تربیت تھی لیکن اس حیثیت سے ہمیشہ سیکولر تھا کہ اس کے دروازے ہر فرقہ کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ چنانچہ ہر زمانہ میں یہاں ہندو طلبہ کی بھی اچھی خاصی تعداد رہی ہے، جن میں سے بعض مشاہیر پیدا ہوئے اور اس لحاظ سے وہ آج بھی سیکولر ہے اور آیندہ بھی رہے گا۔

مگر اس حیثیت کے علاوہ وہ ہر حیثیت سے ایک مسلم ادارہ ہے اور اس کو مسلم یعنی مسلمانوں

کی تہذیبی وملی روایات کا نمایندہ رہنا چاہیے۔ جہاں مسلمان طلبہ اور اساتذہ کو زیادہ سہولتیں حاصل ہوں۔ ہندوؤں کے تو بہت سے کالج اور یونیورسٹیاں ہیں، ایک ہندو یونیورسٹی پر کیا موقوف ہے۔ ہندوستان میں جتنی یونیورسٹیاں بھی ہیں، وہ عملاً ہندوؤں کی ہیں، جن میں مسلمان طلبہ اور اساتذہ کو مختلف قسم کی دشواریاں پیش آتی ہیں، خصوصاً سائنس اور ٹیکنیکل تعلیم میں تو مسلمانوں کا گذر ہی نہیں ہے۔ اس لیے اگر مسلم یونیورسٹی میں بھی مسلمان طلبہ اور اساتذہ کے لیے سہولتیں نہ ہوں تو پھر وہ کہاں جائیں۔

دوسرے مسلم یونیورسٹی انڈین یونین کی سیکولرزم کا ایک بڑا نشان اور اسلامی ملکوں کو دکھانے کے لیے اس کا عملی نمونہ ہے۔ چنانچہ ان ملکوں کا جو بڑا آدمی بھی ہندوستان آتا ہے، اس کو نشان کا یہ ہاتھی ضرور دکھایا جاتا ہے اور وہ انڈین یونین کی سیکولرزم اور مسلمانوں کے ساتھ حکومت کے حسن سلوک کا اچھا اثر لے کر جاتا ہے۔ اگر اس کو اس معنی میں سیکولر بنا دیا جائے کہ اس میں مسلمانوں کی کوئی خصوصیت باقی نہ رہے تو پھر اسلامی ملکوں کے نمایندوں کو کیا چیز دکھائی جائے گی اور وہ اس کا کیا اثر لیں گے۔ اس لیے نہ صرف مسلمانوں کے نقطۂ نظر بلکہ حکومت کے مصالح کا تقاضا بھی یہی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کو مسلمانوں کا خصوصی ادارہ اور ان کی تہذیب و روایات کا مظہر برقرار رکھا جائے۔ افسوس تو اسی کا ہے کہ اب یہ اثرات بھی مٹتے جاتے ہیں۔ کاش اس کے ارباب حل وعقد کو اس کی توفیق ہوتی کہ وہ یونیورسٹی میں اسلامی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ یاد رہے کہ جس دن مسلم یونیورسٹی میں اس کی پرانی تہذیبی خصوصیات باقی نہ رہیں گی، اس میں مسلمانوں کے لیے کوئی کشش اور اس کی کوئی اہمیت باقی نہ رہے گی۔ اور وہ بھی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح محض ایک تعلیمی ادارہ بن کر رہ جائے گی۔

اس موقع پر گاندھی جی کا ایک قابل تقلید نمونہ لکھے بغیر آگے بڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ ایک زمانہ میں جب "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کی مالی حالت زیادہ خراب تھی، گاندھی جی کی تحریک پر سیٹھ جمنا لال بجاج یا کوئی اور ہندو دولت منداس شرط پر مدد دینے کے لیے تیار ہو گئے کہ جامعہ کے نام سے اسلامیہ کا لفظ نکال دیا جائے۔ گاندھی جی نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا جامعہ کو نہ صرف نام کے لحاظ سے بلکہ عملاً بھی اسلامیہ رہنا چاہیے کہ ہندوستان میں ایک تعلیم گاہ تو ایسی رہے کہ اگر کوئی غیر مسلم اسلامی تعلیم وتربیت کے طریقہ اور اس کے عملی نمونہ کا مطالعہ کرنا چاہے تو جامعہ میں دیکھ سکے۔ ایک گاندھی جی

تھے جن کو جامعہ ملیہ کی ''اسلامیت'' پر اصرار تھا۔ایک ان کے نام لیوا ہیں جن کو اسلام اور مسلم کا لفظ تک گوارا نہیں، معلوم نہیں۔اب خود جامعہ والوں کو گاندھی جی کے اس نقطۂ نظر سے کہاں تک اتفاق اور اس کا کہاں تک پاس ہے۔

جو لوگ مسلم یونیورسٹی پر فرقہ پرستی کا الزام لگاتے ہیں۔وہ ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ ہندو یونیورسٹی میں مسلمان طلبہ اور اساتذہ کی تعداد کتنی ہے، بلکہ ہندوؤں میں بھی ہریجن طلبہ کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ہندو یونیورسٹی تو خیر ہندوؤں کی ہے، اگر ان یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبہ کے اعداد و شمار فراہم کیے جائیں جو مشترک کہلاتی ہیں تو ان کی سیکولرزم اور غیر فرقہ واریت کا سارا بھرم کھل جائے گا۔اگرچہ زیدی صاحب نے اس الزام کی پوری تردید کی ہے کہ انجینئرنگ کالج کے طلبہ کی بڑی تعداد پاکستان چلی جاتی ہے،لیکن اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس میں طلبہ کا کیا قصور۔جب ہندوستان میں مسلمانوں پر ملازمت کے دروازے تقریباً بند ہیں تو ان کو جہاں بھی ملازمت ملنے کی امید ہوگی چلے جائیں گے۔اس میں حکومت کا قصور ہے یا مسلمان طلبہ کا۔مشرقی و مغربی پاکستان کو ایک دوسرے سے ملانے کی کوشش کا الزام اتنا مضحکہ خیز ہے کہ اس کی تردید کی بھی ضرورت نہ تھی۔اگر کل کو کوئی صاحب یہ الزام لگادیں کہ ہندوستان کے مسلمان ہمالیہ کو ڈھکیل کر پاکستان لے جانا چاہتے ہیں تو اس کا کیا جواب دیا جائے گا؟(معارف، جولائی ۱۹۵۸ء)

مرکزی وزارت داخلہ اور اردو

حکومت ہند کی وزارت داخلہ نے اردو کے بارہ میں جو ہدایت نامہ جاری کیا ہے اور اس میں اس کے لیے جن حقوق کی سفارش کی گئی ہے۔اس میں قریب قریب وہ سب باتیں آ گئی ہیں، جن کا اردو کے لیے مطالبہ کیا جاتا ہے،مگر اس کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ اس کی قانونی حیثیت نہیں بلکہ صرف ایک ''سرکاری ہدایت نامہ'' کی ہے،جس کو صوبائی حکومتیں مختلف بہانوں سے نظر انداز کرسکتی ہیں۔اگر یہی حقوق صدر کے حکم یا پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے ذریعہ ملتے تو ان کی حیثیت آئینی ہوجاتی۔دوسرے اس میں علاقائی زبان کی تصریح سے گریز کیا گیا ہے،مگر اس خامی سے قطع نظر جہاں تک ممکن ہے، اس کو موثر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔اور پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر تعلیم ڈاکٹر شریمالی نے اس کی تائید مزید کے لیے صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کے نام جو خطوط لکھے ہیں۔ان پر عمل

کرنے کی پوری تاکید ہے۔ اگر ان ہدایات پر واقعی عمل کیا جائے تو اردو والوں کا مطالبہ بڑی حد تک پورا ہو جائے گا۔ ورنہ ان کی حیثیت خوش نما الفاظ سے زیادہ نہیں ہے۔

اتر پردیش کی حکومت نے خلاف توقع ان سفارشوں سے پورا اتفاق کیا ہے مگر اس کا یہ دعویٰ کھٹک پیدا کرتا ہے کہ یہ سفارشیں اس کی پالسی کے عین مطابق ہیں اور وہ ان میں سے چار حقوق کو پہلے سے مانتی چلی آرہی ہے۔ اردو کے بارہ میں اس کی پالیسی ایسی کھلی ہوئی ہے جس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں، اس لیے سوال زبانی ماننے کا نہیں بلکہ عمل کا ہے اور عمل کی جو حالت ہے وہ ظاہر ہے، اس کے بعد یہ دعویٰ کتنا عجیب وغریب ہے۔ یہ عذر بھی کس قدر لغو ہے کہ حکومت تو اردو کے بارہ میں احکام جاری کرتی ہے، مگر ماتحت حکام اس پر عمل نہیں کرتے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ حکومت کے دلی منشا کو سمجھتے ہیں۔ ورنہ کبھی مخالفت کی جرأت نہ کرتے۔ آخر دوسرے انتظامی معاملات میں ان کو مخالفت کی جرأت کیوں نہیں ہوتی۔ بہر حال دیکھنا ہے آیندہ حکومت کیا کرتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ جب تک نئی فضا سے متاثر عہدہ داروں کو اس کا یقین نہ ہو جائے گا کہ اردو بھی قانوناً ان صوبوں کی ایک زبان ہے خواہ وہ کسی درجہ کی سہی اور حکومت بھی اس کو قائم و برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ اس وقت تک اسی قسم کی دشواریاں پیش آتی رہیں گی۔ اس کا واحد حل یہی ہے کہ اردو کو آئینی طور پر علاقائی زبان تسلیم کرلیا جائے یا کم از کم اس کے لیے جن حقوق کی سفارش کی گئی ہے ان کو قانونی شکل دے دی جائے۔ اس کے بغیر اردو کا آئینی تحفظ نہیں ہوسکتا، خصوصاً اس صوبہ میں جس کے وزیر اعلیٰ اور وزیر تعلیم دونوں کی اردو نوازی اظہر من الشّمس ہے، بلکہ اب تو اس معاملہ میں وزیر تعلیم کا نمبر وزیر اعلیٰ سے بھی بڑھ گیا ہے۔ اس بارہ میں ان کے جذبات کا پتہ ان کے ان تازہ بیانات سے بھی چلتا ہے جو انھوں نے اردو کی علاقائی حیثیت کے بارہ میں دیے ہیں۔ ایسی حالت میں مرکزی حکومت کی ہدایات پر عمل کی کیا امید ہوسکتی ہے۔

مرکزی حکومت اردو کے جن پانچ حقوق کو مانتی ہے، آخر ان کو قانونی شکل دینے میں کیا تامل ہے۔ بجز اس کے کہ وہ خود بھی ایسا نہیں چاہتی یا اس کو صوبائی حکومتوں کی مخالفت کا خطرہ ہے اور محض زبانی سفارش میں صوبائی حکومتیں بھی مخالفت نہ کریں گی اور اردو والوں کی بھی تالیف قلب ہوجائے گی۔ بہر حال ان خامیوں کے باوجود مرکزی حکومت کی ہدایات سے اردو کا قدم کچھ نہ کچھ

آگے ضرور بڑھا ہے۔ اس سے اردو کے بارہ میں بعض غلط فہمیاں دور ہوگئیں اور مرکزی حکومت کی زبان سے اس کی حیثیت اور حقوق کی تصریح ہوگئی۔ اردو والوں کو اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے اور آیندہ کے لیے کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ (معارف، جولائی ۱۹۵۸ء)

مسلمانوں کی قومیت کا مسئلہ

یہ مسئلہ کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے یا وطن پر۔ اور اسلامی نقطۂ نظر سے ایک ملک میں رہنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم ہیں یا دو قومیں۔ اتنے شدید اختلاف کا مستحق نہیں ہے جس قدر افراط و تفریط نے اس کو بنا دیا ہے۔ ایک جماعت کا دعویٰ ہے کہ اسلام میں وطنی قومیت کی قطعی کوئی گنجائش نہیں اور مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے۔ اس لیے مسلم اور غیر مسلم کسی حالت میں بھی ایک قوم نہیں ہو سکتے۔ دوسری جماعت کہتی ہے کہ اسلام وطنی قومیت کا مخالف نہیں اور ایک خاص حد تک اس کو مانتا ہے۔ اس لیے اشتراک وطنیت کے رشتہ سے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم ہیں، لیکن مذہب کا رشتہ سب رشتوں سے قوی تر ہے۔ ایک تیسرا گروہ بھی ہے جو وطنی قومیت کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں مذہب کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن یہ قومیت سراسر اسلام کے خلاف ہے اس لیے خارج از بحث ہے۔

البتہ پہلی دونوں رایوں کے متعلق بحث ہو سکتی ہے کہ ان میں کون سی صحیح ہے۔ اس کا صحیح فیصلہ قومیت کی تعریف اور اس کی نوعیت کے اعتبار سے ہوگا۔ قومیت جن عناصر سے بنتی ہے اگرچہ اس میں جزوی اختلاف ہے، مگر اس قدر مسلم ہے کہ قومیت کے لیے اس کے تمام افراد میں ہر حیثیت سے وحدت ضروری نہیں ہے، بلکہ چند چیزوں میں اشتراک قومیت کے لیے کافی ہے اور ایک ملک کے باشندوں میں اس قسم کے اشتراک سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے سیاسی تعریف کے اعتبار سے ایک ملک کے کل باشندے بلا امتیاز مذہب و ملت ایک قوم ہیں۔

اسلام نے بھی وطنی قومیت کا انکار نہیں کیا ہے، بلکہ جائز حدود کے اندر وہ اس کو مانتا ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار عرب کو اپنی قوم فرمایا ہے۔ البتہ اسلام نے وطنیت اور قومیت کے جاہلی تصور یعنی نسل پرستی اور وطن پرستی کی بیشک مخالفت کی ہے کہ نسلی و وطنی عصبیت اس درجہ پر پہنچ جائے کہ اس کے مقابلہ میں مذہب و ملت کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے اور مسلمان اسلامی روایات اور

اسلامی تہذیب کو چھوڑ کر اپنے آباء و اجداد کی جاہلی تاریخ و تہذیب پر فخر کرنے لگیں اور مشترکہ قومیت کے رنگ میں اتنے رنگ جائیں کہ اس کی مذہبی و ملی خصوصیات باقی نہ رہیں۔ یہ تو قومیت نہیں بلکہ ایک قسم کا ارتداد ہے۔ اس لیے اسلام نے اس کو سختی سے مٹایا ہے۔ دین و ملت کی مخالفت میں تو کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی اطاعت کا سوال نہیں تو قوم و وطن کا کیا ذکر ہے۔ لیکن اس دائرے سے باہر مسلم اولاد پر کافر والدین تک کے حقوق ہیں اور کفر سے بھی ان کے بہت سے حقوق ساقط نہیں ہوتے۔ یہی حال قومیت اور وطنیت کے حقوق کا بھی ہے۔

درحقیقت اگر صحیح نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو قومیت و وطنیت اور مذہب و ملت میں کوئی تضاد نہیں۔ ان کے دائرے اور حقوق الگ الگ ہیں۔ اگر ان کو ان حدود میں رکھا جائے تو ان میں کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ تضاد و تصادم تو افراط و تفریط سے پیدا ہوتا ہے، مگر اس زمانہ میں جبکہ یورپ کی نیشنلزم کا سیلاب ساری دنیا کو بہائے لیے جا رہا ہے۔ اعتدال و توازن پر قائم رہنا بہت مشکل ہے، جس پر مصر و عراق کے حالات شاہد ہیں۔

یہ تو مسلمانوں کی قومیت کی اصولی بحث تھی۔ اس سلسلہ میں ایک قابل غور مسئلہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی وطنی قومیت کا سوال ان ہی ملکوں کے لیے اہمیت رکھتا ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں اور غیر مسلموں کی اکثریت اور ان کا غلبہ و اقتدار ہو۔ اسلامی ملکوں کے لیے یہ مسئلہ سیاسی حیثیت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا بلکہ وہاں غیر مسلم اقلیت کا مسئلہ زیادہ اہم ہوگا۔ اور غیر اسلامی ملکوں میں محض سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کی وطنی قومیت کا فیصلہ کافی نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ اہم سوال اس کے حقیقی اور محسوس وجود کا ہے، یعنی مسلمان بھی اپنے کو اس ملک کی قومیت کا جز یقین کریں اور ان کے ہم قوم غیر مسلم بھی ان کو عملاً اپنی قوم سمجھیں۔ اس کی صورت صرف یہی ہے کہ اختلاف مذہب کی بنا پر مسلمانوں کے ساتھ کوئی فرق و امتیاز نہ برتا جائے اور ان کے ساتھ ایسا مساویانہ سلوک ہو کہ وہ اپنے کو غیر اور اجنبی محسوس نہ کریں۔ اس کے بغیر حقیقی قومیت وجود میں نہیں آسکتی، ورنہ اگر اصولاً مسلم اور غیر مسلم ایک قوم بھی ہوں مگر عملاً ایک دوسرے کو اجنبی سمجھیں تو ایسی وطنی قومیت سے کیا فائدہ۔ اس لیے مضبوط متحدہ قومیت کی تعمیر کی ذمہ داری غیر مسلم اکثریت پر ہے اور جن ملکوں میں مسلمان اکثریت میں ہوں وہاں مسلمانوں پر ہے۔ (معارف، اکتوبر ۱۹۵۸ء)

مسلمان اور ہندوستان

ہم نے ان صفحات میں بارہا حکومت اور فرقہ پرست ہندوؤں کی شکایت کی ہے، مگر آج اس سلسلہ میں مسلمانوں سے بھی چند باتیں کہنی ہیں۔ یہ تسلیم ہے کہ حکومت میں فرقہ پرستوں کا غلبہ ہے اور جمہوری حکومت میں فیصلہ اکثریت کے اختیار میں ہوتا ہے۔ اس لیے اصولاً مسلمانوں کے جو حقوق بھی ہوں لیکن حکومت کا عمل اکثر معاملات میں مسلمانوں کے خلاف ہوتا ہے اور اس سے ان کو ہر طرح کی شکایتیں ہیں جو بالکل صحیح ہیں۔ لیکن یہ تسلیم کرنے کے باوجود اس کی ذمہ داری سے مسلمان بھی بری نہیں ہیں۔ ہم ان کو وفاداری اور قوم پروری کا درس نہیں دیتے۔ یہ چیز بہت پرانی اور فرسودہ ہو چکی اور مسلمان اس سطح سے بلند ہو کر اپنی مشکلات کا حل نکال سکتے ہیں۔

جب مسلمان اس ملک میں آئے تھے تو ان کی تعداد چند لاکھ سے زیادہ نہ رہی ہوگی اور اس زمانہ کے ہندو آج کل کے ہندوؤں سے زیادہ کٹر تھے۔ ان کو بیرونی قوموں سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ اور وہ غیر مذاہب والوں کے سایہ سے بھی بھڑکتے تھے۔ پھر مسلمانوں کا مذہب اس زمانہ کے مروجہ ہندو مذہب کے بالکل خلاف تھا۔ اس میں توحید خالص تھی، تو ہم پرستی، انسانوں کی طبقاتی تقسیم اور ان کی غلامی کی مخالفت اور انسانی شرف وعظمت اور اخوت ومساوات کی تعلیم تھی۔ عورتوں کے حقوق تھے۔ مسلمان گائے کا گوشت کھاتے تھے، جس کو ہندوستان میں تقدس کا درجہ حاصل ہے۔ غرض اسلام کی بہت سی چیزیں ہندو مذہب کے بالکل ضد تھیں۔ اس کے باوجود مسلمان نہ صرف ہندوستان پر چھا گئے، بلکہ ہندو معاشرہ اور مذہب تک کو اسلامی اثرات سے متاثر کر دیا۔ گو خود بھی اس کے اثر سے نہ بچ سکے۔

یہ تلوار کی قوت نہ تھی، اگر تلوار کی قوت ہوتی تو کم سے کم اسلامی حکومتوں کے دارالسلطنتوں کے علاقے پورے کے پورے مسلمان ہوتے یا ان میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی۔ حالانکہ آج بھی ان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ پھر ہندو جیسی غیور اور قدامت پرست قوم سے اس کی توقع بھی نہیں کہ وہ تلوار کے خوف سے اپنا مذہب بدل دیتی۔ حکومت کے اقتدار کا بھی اثر نہ تھا، حکومت کا اقتدار صرف تہذیب وتمدن پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہزاروں برس کے راسخ عقائد کو نہیں بدل سکتا، جب تک حکمراں قوم کے مذہب میں اثر ونفوذ کی صلاحیت نہ ہو۔ اس لیے یہ صرف اسلام کی سادہ، فطری اور

سچی تعلیمات کی تاثیر اور اسلامی اخلاق کی قوت تھی جس نے ہندوستان کے ہر شعبۂ زندگی کو متاثر کیا۔ ہندوستان کی سرزمین، توحید اور انسانی آزادی و مساوات کی پیاسی تھی۔ اس لیے اسلام کے ابر کرم کا چھینٹا پڑتے ہی اس کی کھیتی لہلہا اٹھی۔ سینکڑوں استھانوں پر جھکنے والی پیشانیاں ایک خدائے قدوس کے سامنے جھک گئیں اور ہندوؤں کے وہ مظلوم و مقہور طبقے جو ہزاروں برس سے غلامی اور ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتے کرتے تھک چکے تھے۔ اسلامی مساوات کے دامن میں پناہ لینے لگے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی تعداد ان ہی کی یادگار ہے۔

دوسری طاقت جو پہلی طاقت کی عملی شکل تھی۔ اسلامی اخلاق و روحانیت کی تھی۔ دیندار مسلمانوں خصوصاً ان صوفیائے کرام نے جو شریعت و طریقت کے جامع تھے۔ اسلامی اخلاق و سیرت کا ایسا نمونہ پیش کیا جو دلوں میں گھر کر گیا اور ہر دور میں اکابر صوفیہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں اسلامی اخلاق و روحانیت کی روشنی پھیلاتے رہے اور نہ صرف ہندو عوام بلکہ ان کے خواص اور اونچا طبقہ بھی ان کے ہاتھوں پر کثرت سے مشرف بہ اسلام ہوا اور آج ہندوستان میں اسلام کی جو روشنی نظر آتی ہے وہ زیادہ تر ان ہی نفوس قدسیہ کا فیض ہے اور ان کی روحانیت کا آج بھی یہ اثر ہے کہ جس طرح مسلمان ان کے آستانوں پر احترام و عقیدت کی نذر پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ہندو بھی کرتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ آج ہم میں نہ وہ اسلامی روح باقی ہے اور نہ وہ نفوس قدسیہ ہیں، جن کے انفاس گرم سے مردہ دلوں میں حرارت پیدا ہو جاتی تھی، مگر اسلام کی پاکیزہ تعلیمات تو آج بھی ویسی ہی ہیں۔

ع ہنوز آں ابر رحمت در فشاں است

یہ مانا کہ آج ہندوؤں میں کچھ فرقہ پرست جماعتیں ایسی ہیں جن کو کسی حال میں مسلمانوں کا وجود یا کم از کم ان کی باعزت زندگی گوارا نہیں۔ لیکن ہندوؤں کی پوری قوم ایسی نہیں ہے۔ ان میں من حیث القوم انسانیت اور رواداری ہے اور اخلاق کی قوت تو ایسی ہے کہ دشمنوں کے دل بھی مسخر کر لیتی ہے۔ اس لیے اگر مسلمان اسلامی اخلاق کا صحیح نمونہ پیش کریں تو ناممکن ہے کہ فرقہ پرست ہندو بھی اس سے متاثر نہ ہوں، بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے اس زمانہ میں بھی اس کے ذریعہ ہندوستان میں اسلام کی روشنی پھیل سکتی ہے۔

ہندوستان کے مسلمان حکمراں تو مفت میں بدنام ہیں۔ ان کو اپنی سیاست اور حکومت کی بقاو

استحکام کی فکر اور اپنے تعیّشات سے اتنی فرصت اور اس کی توفیق کہاں تھی کہ وہ اسلام کی تبلیغ کرتے۔ اگر انہوں نے اس کی جانب تھوڑی سی بھی توجہ کی ہوتی اور اعلیٰ طبقہ کے ہندوؤں کی دل جوئی کی جتنی کوشش کی اگر اس کی عشر عشیر کوشش بھی ادنیٰ طبقہ کی دل جوئی کے لیے کی ہوتی یا اینٹ اور پتھر کا تاج محل اور لال قلعہ بنانے کے بجائے اسلام کا اخلاق محل اور سبز قلعہ بنایا ہوتا تو آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ یہ مانا کہ آج محل مسلمانوں کی عظمت کا بہت بڑا نشان ہے لیکن اخلاق کا تاج محل اس سے زیادہ پائیدار نشان ہوتا۔

مذہب کی تبلیغ اور جبر متضاد چیزیں ہیں۔ کوئی مذہب بھی جبر وقوت سے نہیں پھیلایا جاسکتا اور اسلام کے متعلق تو اس کا تصور ہی غلط ہے۔ اسلام صرف زبان سے اقرار کا نہیں بلکہ دل وجان سے یقین کا نام ہے اور جبر وقوت سے دل میں یقین نہیں پیدا کیا جاسکتا۔ اس لیے وہ اسلام ہی نہیں جو جبر سے قبول کیا جائے۔ اس لیے جو لوگ تلوار سے اسلام پھیلانے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ نہ صرف اسلام بلکہ مذہب کی حقیقت سے ناواقف ہیں۔

اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ اگر مسلمان ہندوستان میں باعزت مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے حقوق کے حصول کی جدوجہد کے ساتھ اسلامی تعلیمات اور اسلامی اخلاق کا ایسا نمونہ پیش کرنا چاہیے کہ ہندو نہ صرف ان کے حقوق بلکہ ان کا صحیح مقام دینے کے لیے مجبور ہوجائیں۔ یہ محض حصول مقصد کی تدبیر نہیں بلکہ مسلمانوں کا مذہبی فریضہ بھی ہے۔ آج ہندوستان میں اسلام کو صحیح شکل میں پیش کرنے کی اس سے کہیں زیادہ ضرورت ہے جتنی پہلے تھی۔ پہلے وہ حکومت کے سہارے بھی قائم رہ سکتا تھا مگر اب تو اس کو صرف اپنی خوبیوں کے بل پر قائم رہنا ہے۔

مسلمانوں کے صاحب اقتدار اور حکمراں طبقہ نے اپنی قوت اور برتری کے گھمنڈ میں اسلام کی تبلیغ کیا اس کو صحیح شکل میں پیش کرنے کی بھی کبھی کوشش نہیں کی۔ اگر علمائے حق اور صوفیائے کرام کا طبقہ نہ ہوتا تو ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد برائے نام ہی ہوتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بہت سے تعلیم یافتہ ہندو تک اسلام سے پوری طرح واقف نہیں ہیں اور ان کو اس کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں ہیں۔ اس لیے اسلام کو صحیح شکل میں پیش کرنا اور اس کو مختلف طبقوں تک پہنچانا مسلمانوں کا فرض ہے۔ اسلام کو ہندوستان میں نہ صرف قائم رہنا ہے، بلکہ جس طرح اس کی اصلاح و

ترقی میں پہلے اس کا نمایاں حصہ رہا ہے، اسی طرح آیندہ بھی یہ فرض انجام دینا ہے اور یہ مسرت کا مقام ہے کہ بعض جماعتیں خصوصاً مولانا الیاسؒ کی تبلیغی جماعت اس فرض کو حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے رہی ہے اور اس کارخیر میں اعانت ہر مسلمان کا فرض ہے۔ (معارف، دسمبر ۱۹۵۸ء)

ہندوستانی کلچر اور مسلمان

ہندوستان کے مسلمانوں پر یہ اعتراض بہت پرانا ہے کہ انہوں نے ہندوستانی کلچر، اس کی روایات اور اس کے ہیروؤں کو نہیں اپنایا اور یہاں رہ کر بھی ان سے اجنبی رہے۔ یہ آواز اب بھی کبھی کبھی سنائی دیتی ہے، جو نہ تو تمام تر صحیح ہے نہ یکسر غلط۔ اس پر تفصیلی بحث کی ان صفحات میں گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے صرف اجمالی نگاہ ڈالی جاتی ہے۔ دراصل کلچر ایک مبہم اصطلاح ہے، جس کے معنی ومفہوم کی صحیح تعیین وتحدید آج تک نہ ہوسکی۔ ہر شخص اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس کی تاویل کرتا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ کلچر پورے نظام زندگی پر حاوی ہے۔ جس سے اس کا کوئی پہلو بھی خارج نہیں ہے۔ اس بحث کو مختصر کرنے کے لیے اس کی دو موٹی تقسیمیں کی جاسکتی ہیں۔ ایک کلچر کا معنوی اور داخلی رخ، دوسرا ظاہری اور خارجی۔ داخلی رخ سے مراد کسی قوم وملت کے وہ بنیادی عقائد وتصورات ہیں، جن کی روح اس کے سارے نظام زندگی میں ساری رہتی ہے اور جس پر اس کی قومی وملی خصوصیات، اس کی انفرادیت اور اس کے وجود کا مدار ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی قوم بھی جو ایک اعلیٰ کلچر کی مالک ہو، اس کو نہ بدل سکتی ہے اور نہ اس کے داخلی رخ میں کسی دوسرے کا اثر قبول کرسکتی ہے۔ اس کو وہی قومیں بدلتی ہیں جن کا کلچر اصلاح وتکمیل کا محتاج ہوتا ہے اور جو قوم جس حد تک بھی دوسرے کلچروں کا اثر قبول کرے گی اس حد تک اس میں ضم ہوجائے گی اور اس کی اپنی خصوصیات ختم ہوجائیں گی۔ مسلمانوں کے کلچر کا مدار ان کے مذہب پر ہے، جس کے بنیادی عقائد وتصورات ناقابل تغیر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا کلچر اس قدر اعلیٰ اور مکمل ہے کہ اس سے دوسرے کلچروں کو روشنی ملی اور ان کی اصلاح ہوئی۔ اس لیے وہ قدرتاً بھی کسی دوسرے کلچر کا اثر قبول نہیں کرسکتے۔

کلچر کا دوسرا رخ ظاہری یا خارجی ہے، جس کو تہذیب ومعاشرت کہا جاتا ہے۔ گو مسلمانوں کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی مذہب کے دائرے سے خارج نہیں ہے، لیکن تہذیب ومعاشرت کے کچھ پہلوؤں کو مذہب سے کوئی بنیادی تعلق نہیں ہے، مثلاً رہنے سہنے کے طریقے، کھانے پینے اور ملنے جلنے

کے آداب، لباس، ساز وسامان، علوم وفنون وغیرہ۔ اس لیے ان میں سے دوسری تہذیبوں کا اثر قبول کیا جاتا ہے اور یہ اثر پذیری بالکل فطری ہے، جب دوقومیں یا دو تہذیبیں آپس میں ملیں گی تو ان کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا بالکل فطری ہے، خصوصاً ادنیٰ تہذیب اعلیٰ تہذیب کا اثر لازمی قبول کرے گی۔ اس لیے اسلام نے ایک خاص حد تک تہذیبی اخذ واستفادہ کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ مسلمان بھی دوسری تہذیبوں سے متاثر ہوئے، مگر وہ ایک اعلیٰ ترین کلچر کے مالک تھے۔ اس لیے جن تہذیبوں کا اثر انہوں نے قبول کیا ان کو اپنے کلچر کے رنگ میں اتنا رنگ دیا کہ ان کی شکل اور ان کا مزاج بالکل بدل گیا۔

مسلمانوں کا پہلا سابقہ اپنے زمانہ کی سب سے ترقی یافتہ رومی اور ایرانی دو تہذیبوں سے ہوا جو سادہ عربی تہذیب کے مقابلہ میں زیادہ مرصع اور پرکار تھیں۔ اس لیے مسلمان ان دونوں تہذیبوں سے متاثر ہوئے، مگر ان کو اپنے رنگ میں اس قدر رنگ لیا کہ وہ رومی اور ایرانی تہذیب کے بجائے اسلامی تہذیب کہلائیں۔ یہ اپنے دور کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ تہذیب تھی۔ اس کا ایک مرکز اسپین تھا اور دوسرا عراق یا بغداد۔ اسپین کی اسلامی تہذیب صدیوں یورپ میں رائج رہی۔ اسی تہذیب کے بدولت یورپ میں علم وتہذیب کی روشنی پھیلی۔ اگر مغربی قومیں اسپین اور سسلی کی اسلامی تہذیب سے استفادہ نہ کرتیں تو آج تک وحشت وجہالت کی تاریکی میں پڑی رہتیں۔

بغداد کی تہذیب ایرانی اور عربی تہذیب سے مل کر بنی تھی، مگر اس میں بھی اسلامی چھاپ اتنی نمایاں تھی کہ وہ آج تک اسلامی تہذیب کہلاتی ہے۔ یہ مشرق کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ تہذیب تھی جو سارے وسط ایشیا میں رائج تھی۔ اسی تہذیب کو مسلمان اپنے ساتھ ہندوستان لائے۔ یہاں اس نے ہندوستانی تہذیب سے مل کر ایک نیا رنگ روپ اختیار کیا اور وہ مشترک ہندوستانی تہذیب کہلائی، جو آج تک رائج ہے۔ اور پراچین بھارت کے احیا کے تخیل سے پہلے یہی تہذیب ہندوستان کی معیاری تہذیب سمجھی جاتی تھی، جو بلا تفریق مذہب وملت ہندو مسلمانوں کے اعلیٰ اور شایستہ طبقوں میں صدیوں سے رائج تھی اور اب بھی رائج ہے اور اس کے حسن ونفاست کے جلوے آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس تہذیب میں اسلامی آب ورنگ کے ساتھ ہندوستانی اثرات اتنے نمایاں ہیں کہ ان کو ہر شخص پہچان سکتا ہے۔

درحقیقت علمی وتہذیبی اخذ واستفادہ مسلمانوں کی خاص خصوصیت رہی ہے اوراس میں ان کی جیسی وسیع القلبی اور رواداری کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ وہ جہاں بھی گئے مقامی تہذیبوں کے اچھے عناصر کو اسلامی تہذیب میں جذب کر کے ایک نئی مشترک تہذیب پیدا کردی اور ایرانی تہذیب کے بعد وہ سب سے زیادہ ہندوستانی تہذیب سے متاثر ہوئے، جس کے اثر سے ان کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی خالی نہیں ہے۔ اسی خصوصیت کی بنا پر مسلمانوں میں جو تہذیبی رنگارنگی نظر آتی ہے اس کی مثال کسی دوسری قوم میں نہیں مل سکتی، مگر اسی کے ساتھ انھوں نے اپنے کلچر کے داخلی رخ کو جس پر ان کی ملی خصوصیات اور ان کی انفرادیت کا دار و مدار ہے ہر جگہ محفوظ رکھا بلکہ اس سے دوسری قوموں کو متاثر کیا۔ اسی لیے وہ کسی قوم میں ضم نہ ہوسکے اور تہذیبی بوقلمونی کے ساتھ ان کی ملی اور کلچرل وحدت آج بھی قائم ہے۔ ان کے کلچر کے تحفظ اور دوسرے کلچروں میں ضم نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ خود ایک ایسے کلچر کے حامل ہیں جس سے دوسرے کلچروں کو ہدایت و روشنی ملی اور ان کی اصلاح ہوئی۔ اسی لیے دوسرے کلچروں سے اثر پذیری کی ان کو ضرورت ہی نہ تھی۔ اس لیے وہ جہاں بھی گئے ان کا کلچر محفوظ رہا جس میں ہندوستان بھی شامل ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ قدیم ہندوستان میں بھی بہت سے کمالات، علوم وفنون اور قابل استفادہ چیزیں تھیں۔ جن سے مسلمانوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور ان سے اپنے تہذیبی ذخیرہ میں اضافہ کیا، مگر ہندوستان کے داخلی کلچر میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس کی ان کو ضرورت اور طلب ہوتی اور جس سے ان کے افکار و تصورات اور نظام زندگی میں کوئی انقلاب پیدا ہوتا یا اصلاح وترقی ہوتی۔ اس کے مقابلہ میں مسلمانوں نے ہندوستان کو ایسی چیزیں دیں جن کی اس کو ضرورت تھی اور جس سے اس کے پرانے عقائد و تصورات اور نظام زندگی میں تغیر اور اپنے کلچر میں اصلاح وترقی کا احساس پیدا ہوا۔ انھوں نے ہندوستان کو توحید خالص کے تصور سے آشنا کیا۔ انسانوں میں ادنیٰ واعلیٰ کی تفریق مٹا کر اخوت ومساوات کا سبق اور انسانی غلامی سے آزادی کا پیغام دیا اور انسانیت کی عظمت قائم کی۔ اوہام وخرافات کی زنجیروں سے آزاد کر کے حقیقت شناس بنایا اور اس قبیل کے بہت سے نئے خیالات دیئے جس سے ہندوستان کے پرانے تصورات اور نظام زندگی میں انقلاب پیدا ہوگیا اور ان میں اپنی اصلاح وترقی کا احساس پیدا ہوا۔ چنانچہ ہندوستان کی اکثر اصلاحی تحریکیں اسلام ہی کے اثر

کا نتیجہ ہیں، جس کا ہندو مفکرین و مصلحین کو بھی اعتراف ہے۔ ایسی حالت میں مسلمان ہندوستان کے پرانے کلچر کا اثر قبول کر سکتے تھے۔

اس اعتراض کا دوسرا جزیہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کی روایات اور یہاں کے ہیروؤں کو نہیں اپنایا۔ اس کا جواب بھی وہی ہے جو اوپر دیا جا چکا ہے۔ کسی قوم کی روایات درحقیقت اس کی ملت اور کلچر کے داخلی رخ کا جز ہوتی ہیں۔ اس لیے نہ صرف مسلمان بلکہ کوئی قوم بھی دوسری قوم کی روایات کو نہیں اپنا سکتی ورنہ اس کی ملی خصوصیات ختم اور اس کی تاریخ مسخ ہو جائے گی۔ رہا ہیروؤں کا مسئلہ تو مسلمانوں میں ان معنوں میں ہیرو پرستی ہی نہیں ہے، جن معنوں میں دوسری قوموں خصوصاً ہندوستان میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ اسلام نے شخصیت پرستی کی مخالفت کی ہے۔ البتہ مسلمان بڑی شخصیتوں اور اپنے محسنوں کا احترام اور ان کی عظمت ضرور کرتے ہیں اور اس لحاظ سے مسلمانوں کا ہیرو وہی ہو سکتا ہے جس نے کوئی ایسا دینی و ملی کارنامہ انجام دیا ہو جس سے ملت اسلامیہ کو فائدہ پہنچا ہو اور ایسا شخص مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ اس زمانہ کے مسلمانوں نے جن دنیاوی سلاطین اور کشور کشاؤں کو اپنا ہیرو بنا لیا ہے وہ محض دوسری قوموں کی نقل و تقلید ہے، ورنہ کوئی مسلمان حکمراں جس نے دینی و ملی کارنامہ انجام نہ دیا ہو وہ مسلمانوں کا ہیرو نہیں ہو سکتا۔ ایسی حالت میں کسی غیر مسلم کے ہیرو ماننے کا کیا سوال، البتہ جن برگزیدہ شخصیتوں نے انسانیت کی کوئی خدمت کی ہے یا کوئی بڑا روحانی اور اخلاقی انقلاب پیدا کیا ہے، مسلمان ان سب کا احترام کرتے ہیں اور اس میں مسلم یا غیر مسلم کی تخصیص نہیں۔

اس اعتراض کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مسلمانوں نے ارسطو، افلاطون، سقراط و بقراط اور جالینوس، رستم، سہراب، افراسیاب وغیرہ دوسری قوموں کی شخصیتوں کو اپنایا اور ان کو اپنی زبان اور اپنے لٹریچر میں جگہ دی لیکن ہندوستان کی کسی بڑی شخصیت کو اس طرح نہیں اپنایا۔ اس کا جواب خود اسی اعتراض میں پوشیدہ ہے۔ مذکورۂ بالا شخصیتوں میں سے کوئی بھی مسلمان نہیں ہے، بلکہ ان کا زمانہ اسلام سے بھی صدیوں پہلے کا ہے اور مسلمانوں سے ان کا کسی قسم کا رشتہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے ان کو اپنی زبان اور اپنے لٹریچر میں جگہ دی اور ان کا نام تعریف و تحسین کے موقع پر لیتے ہیں۔ اس سے اتنا تو بہرحال ثابت ہو گیا کہ مسلمان نسلی و وطنی اور مذہبی اختلاف کی بنا پر کسی قوم سے کوئی تعصب نہیں رکھتے اور ہر قوم کے اصحاب کمال کی قدر کرتے ہیں۔

درحقیقت مختلف ملکوں اور قوموں میں کچھ شخصیتیں اپنے اوصاف و کمالات کی بنا پر بین الاقوامی شہرت حاصل کرلیتی ہیں اور ان اوصاف کے لیے ان کا نام ضرب المثل ہوجاتا ہے، مثلاً حکمت و دانائی میں ارسطو، کشور کشائی میں سکندر، بہادری میں رستم، عدل و انصاف میں نوشیرواں، سخاوت میں حاتم، ایسی شخصیتیں کسی قوم کی ملک نہیں ہوتیں، بلکہ بین الاقوامی بن جاتی ہیں۔ اسی حیثیت سے ان کا نام مسلمانوں میں رائج ہوا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ مسلمان، حکمائے یونان کے فلسفہ اور علوم کے ناقل اور محافظ تھے۔ اگر انہوں نے ان کو محفوظ نہ رکھا ہوتا تو آج ان کا وجود نہ ہوتا۔ اس لیے ان کی زبان میں ان کا نام رائج ہونا بالکل قدرتی ہے۔ ایران کی شخصیتوں کی شہرت ان کے ہم قوم سلاطین اور فارسی زبان کے ذریعہ ٹھیک اسی طرح ہوئی جس طرح انگریزی زبان اور انگریزوں کی حکومت کے ذریعہ انگلستان بلکہ یورپ کے اہل کمال کا نام ہندوستان میں رائج ہوا اور مذکورۂ بالا ناموں میں سے کوئی نام بھی اسلام کی راہ سے نہیں آیا۔

پھر بھی اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ کسی حیثیت سے بھی سہی آخر ہندوستان کی اہم شخصیتوں کی شہرت مسلمانوں میں کیوں نہیں ہوئی، تو اس کا جواب خود معترضین کو سوچنا چاہیے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستان میں کوئی بڑی شخصیت پیدا نہیں ہوئی، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوؤں کی علاحدگی پسندگی اور دوسری قوموں سے چھوت کی بنا پر ان کے اوتاروں اور قدیم مصلحین کے علاوہ کسی اور صاحب کمال نے کوئی بین الاقوامی شہرت حاصل نہیں کی۔ پرانی ہندو سوسائٹی اپنے اوپر غیر قوموں کا سایہ بھی نہ پڑنے دیتی تھی۔ برہمنوں نے یہاں کے علوم اور علمی زبان سنسکرت کو اپنی ملک بنا رکھا تھا۔ بیرونی اقوام کا کیا ذکر ہے۔ اپنے علاوہ خود ہندوؤں کے دوسرے طبقوں پر علم و تعلیم کے دروازے بند کر رکھے تھے، جس کی تفصیل البیرونی سے معلوم ہوسکتی ہے۔ یہ قدغن تو مسلمانوں کے اثر سے ختم ہوئی اور دوسری قوموں کو ہندوستانی علوم سے واقفیت اور ان کی تحصیل کا موقع ملا۔ مسلمانوں کا یہ احسان بھی کم نہیں ہے کہ سب سے پہلے ان ہی نے ان کی اہم کتابوں کا ترجمہ اور ان کے علوم کو دنیا سے روشناس کیا۔ ایسی حالت میں اگر ہندوستان کی قدیم شخصیتوں کی شہرت دوسری قوموں میں نہ ہوسکی تو اس کی ذمہ داری خود ہندوؤں کے سر ہے۔

(معارف، جنوری ۱۹۵۹ء)

مبارک پور اور بھوپال کے فسادات

ادھر چند سال سے ہندوستان میں کوئی بڑا فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوا تھا اور خیال ہو چلا تھا کہ اب فرقہ پرستی دب رہی ہے اور مسلمانوں کو عزت و آبرو کے ساتھ رہنے کا موقع ملے گا، مگر اس سال ہولی کے موقع پر جو فساد ہوئے، خصوصاً بھوپال اور مبارک پور میں جس طرح مسلمانوں کو ذلیل اور تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی گئی اور پولیس نے ان پر جو مظالم ڈھائے۔ اس نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا اور یہ معلوم ہوا کہ حکومت کے عہدہ داروں اور امن و امان کے محافظ حکام میں بھی فرقہ پرستی سرایت کر گئی ہے اور ان فسادات کی نوعیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اتفاقی نہ تھے، بلکہ سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے مطابق کیے گئے تھے اور ان کا مقصد ہی یہ تھا کہ جہاں مسلمانوں میں کچھ دم باقی ہے۔ ان کو اس قدر پست و پامال کر دیا جائے کہ پھر ان میں سر اٹھانے کی سکت باقی نہ رہے۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمان جس نازک پوزیشن میں ہیں، اس میں وہ اپنی طرف سے فساد کی ابتدا کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ اقلیت میں ہیں۔ عملاً ان کی حیثیت محکوم کی ہے۔ فرقہ پرست جماعتوں کے علاوہ حکومت کے عہدہ داروں میں بھی فرقہ پرستی سرایت کر گئی ہے۔ ان کی طرف سے فسادیوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے اور جہاں بھی فساد ہوتا ہے مسلمان تباہ و برباد کیے جاتے ہیں۔ ان ہی کا جانی و مالی نقصان ہوتا ہے اور الٹے ان ہی کو قید و بند کی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔ ان پر پاکستان سے سازباز کا الزام لگا کر بدنام کیا جاتا ہے۔ ان حالات میں وہ فساد کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے اور ایسے موقعوں پر دب جاتے ہیں، مگر جب کبھی ان کے صبر و تحمل کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ بھی بدرجۂ مجبوری مقابلہ میں آجاتے ہیں۔ بھوپال اور مبارک پور وغیرہ میں ان ہی حالات میں فساد ہوئے اور مبارک پور میں تو معمولی جھڑپ کے بعد معاملہ ختم ہو گیا تھا، مگر اس کے بعد پولیس فریق بن گئی اور اس نے مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے اس کی تفصیل اخبارات میں آچکی ہے۔

یہ تنہا مبارک پور اور بھوپال کا معاملہ نہیں ہے۔ وہ تو کسی نہ کسی شکل میں ختم ہو جائے گا، بلکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آیندہ پر امن اور باعزت زندگی کا مستقل سوال ہے کہ انہیں ایک محکوم اور ذلیل رعایا بن کر رہنا پڑے گا یا باعزت اقلیت کی حیثیت سے۔ اگر ہندوستان کی حکومت واقعی

جمہوری اور سیکولر ہے تو مسلمانوں کے تحفظ اور ان کی باعزت زندگی کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے۔ جسے وہ آسانی سے پورا کرسکتی ہے۔ اگر حکومت کے عہدہ دار اور امن وقانون کے محافظ حکام فرقہ پروری میں مبتلا نہ ہوجائیں اور اپنے فرائض دیانت داری سے ادا کریں تو کبھی فساد نہیں ہوسکتا۔ اگر اتفاقیہ ہو بھی جائے تو زیادہ نہیں بڑھ سکتا اور جس فساد میں ان کی غفلت اور فرقہ پروری ثابت ہو، ان کو پوری سزا دی جائے اگر دو چار کو بھی سزا مل جائے تو بڑی حد تک فسادات کا خاتمہ ہوجائے گا۔ انگریزوں کے زمانہ میں حکام کی فرقہ پروری، غفلت اور ان کے علاقہ میں فساد سے ان کا ریکارڈ خراب ہوجاتا تھا۔ اس لیے جب تک خود حکومت نہیں چاہتی تھی فساد نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر اتفاقیہ ہو بھی جاتا تھا، تو اس پر آسانی سے قابو حاصل کرلیا جاتا تھا۔ اگر آج بھی اس پر عمل کیا جائے تو بڑی حد تک فساد کا خاتمہ ہوسکتا ہے، مگر اس آزادی کے دور میں تو حکام کو بھی آزادی مل گئی ہے۔ ان سے کوئی مواخذہ نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کو اور بھی کھل کھیلنے کا موقع مل گیا ہے۔

فساد کو روکنے کی دوسری تدبیر یہ ہے کہ ہر ضلع میں ایمان دار ہندو مسلمانوں کی امن کمیٹیاں قائم کی جائیں، جن کو حکام کا پورا تعاون حاصل ہو۔ مقامی کانگریس کمیٹیاں بھی اس کام کو انجام دے سکتی ہیں۔ مگر افسوس یہ ہے کہ وہ خود بھی فرقہ پرستی میں مبتلا ہیں اور جن کانگریسیوں میں کسی قدر احساس ہے وہ اپنے اغراض و مقاصد کی بنا پر فرقہ پرستوں کی مخالفت کی ہمت نہیں کرسکتے۔ اس بارہ میں تو کانگریس سے کہیں بہتر دوسری پارٹیاں ہیں جو فرقہ پرستی کے خلاف آواز بلند اور مظلوم فرقوں کے ساتھ عملی ہمدردی کرتی ہیں۔ اگر کانگریس نے کھل کر فرقہ پرستی کا مقابلہ نہ کیا تو اس کو بہت جلد ان پارٹیوں کے مقابلہ میں تخت حکومت چھوڑنا پڑے گا۔ اس لیے دیکھنا ہے کہ حکومت بھوپال اور مبارک پور کے معاملہ میں کیا رویہ اور آیندہ اس قسم کے فسادات کے انسداد کا کیا طریقہ اختیار کرتی ہے۔

مسلمانوں کو ان واقعات سے ہراساں اور بددل نہ ہونا چاہیے۔ وہ اس سے بھی بڑے مصائب جھیل چکے ہیں۔ یہ وقت بھی گذر جائے گا۔ چار کرور مسلمان کو ذلیل بنا کر رکھنا آسان نہیں ہے۔ ان کو ذلیل کرنے والے خود دنیا کی نگاہوں میں رسوا ہوں گے اور اگر مسلمانوں میں صلاحیت ہے تو وہ ہندوستان میں اپنا اصل مقام حاصل کرکے رہیں گے، مگر مسلمانوں کے صاحب فکر طبقہ کو بہرحال یہ سوچنا ہے کہ آخر یہ زندگی کب تک۔ وہ محض حکومت کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتے اور دس

سال کے تجربہ کے بعداس پر بھروسہ کرنا سخت غلطی ہے۔اب کانگریس کی اصل روح اوراسی کے ساتھ اس کا نصب العین ختم ہو چکا۔اب اس کا مقصد محض اپنی حکومت کی بقاواستحکام ہے۔خواہ وہ کسی ذریعہ سے ہو۔اس سے کہیں بہتر دوسری ترقی پسند پارٹیاں ہیں۔اس لیے مسلمانوں کوخوداپنی تنظیم اورطاقت پر بھروسہ کرنا ہے۔اس کے بغیر وہ ہندوستان میں زندہ نہیں رہ سکتے۔اس کے لیے مسلمان رہنما جو شکلیں بھی تجویز کریں، جب مسلمانوں میں قوت اور تنظیم ہوگی اس وقت حکومت بھی ان کو ماننے پر مجبور ہوگی،ورنہ

یہ مفتی تقدیر کا فتویٰ ہے ازل سے ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

(معارف،اپریل ۱۹۵۹ء)

تقسیم ملک کے بعد ندوۃ العلماء

ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے یہاں کے دینی مدارس اوراسلامی ادارے جن مشکلات میں مبتلا ہیں۔وہ سب پرعیاں ہے،مگر یہ شکر ومسرت کا مقام ہے کہ ان مخالف حالات میں بھی الحمدللہ دارالعلوم ندوۃ العلماء روز افزوں ترقی پر ہے۔اس کی تعلیمی شہرت ہندوستان سے نکل کر بیرونی دنیا تک پہنچ گئی ہے۔چنانچہ اس وقت دارالعلوم میں مختلف اسلامی بلکہ خاص عرب ملکوں کے بہت سے طلبہ زیر تعلیم ہیں۔عام طلبہ کی اتنی کثرت ہوگئی ہے کہ پرانی اقامت گاہیں ان کے لیے ناکافی ہورہی ہیں اورشبلی ہوسٹل کی وسیع عمارت کودومنزلہ کیا جارہاہے۔اس کا ایک حصہ رواق رحمانی کے نام سے بن چکاہے اور دوسرے حصہ رواق سلیمانی کی تعمیر عنقریب شروع ہونے والی ہے۔اساتذہ کے لیے چند کوارٹر بن گئے ہیں۔دارالعلوم کی ترقی کے منصوبوں کو پورا کرنے کے لیے تنظیم وترقی کے نام سے ایک مستقل شعبہ قائم کیا گیاہے جونہایت مستعدی اورسرگرمی سے اپنے فرائض انجام دے رہاہے۔

دینی اصلاح وترقی کے لیے یہ سند کافی ہے کہ دارالعلوم تبلیغی جماعت کاایک اہم مرکز ہے۔ ابھی حال میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا گیاہے جس کا مقصد ایسا اسلامی لٹریچر پیدا کرنا ہے، جو موجودہ مادی و لادینی تہذیب کے پیدا کردہ فتنوں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہنی ارتداد کا تدارک اوران میں ایمان ویقین کا نور پیدا کرسکے۔اورجدید نسل کے دماغوں کی تسکین کا سامان فراہم اورعہد حاضر کے تقاضوں کو پورا کرسکے اور جو غیر مسلم اسلام کی

حقیقت کو سمجھنا چاہیں، ان کے سامنے اس کی صحیح تصویر پیش کر سکے۔ اس فرض کفایہ میں شرکت ان تمام اصحاب علم و قلم کا فرض ہے جو اس کام کی اہلیت رکھتے ہیں۔

دارالعلوم کے بعض تعلیم یافتہ نوجوان کچھ عرصہ سے البعث کے نام سے عربی کا ایک رسالہ نکال رہے ہیں۔ یہ ہندوستان میں تنہا عربی کا علمی و دینی رسالہ ہے، جو عرب ملکوں میں بھی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور وہ ان ملکوں سے ربط و تعلق اور ان میں دارالعلوم کے اغراض و مقاصد کی تبلیغ و اشاعت کا موثر ذریعہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے دارالعلوم عنقریب اس رسالہ کو اپنی تحویل میں لینے والا ہے۔ خوبصورت ٹائپ کا ایک پریس قائم کیا گیا ہے جس میں کتابیں چھپنے لگی ہیں اور ابھی اس کی مزید توسیع و ترقی پیش نظر ہے۔ غرض اس وقت دارالعلوم ہر حیثیت سے الحمدللہ ترقی پر ہے اور یہ سب ہماری جماعت کی لائق فخر شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سلمہ اللہ تعالیٰ کے اخلاص و للّٰہیت کا فیض ہے۔ ندوہ کے خدام و متوسلین کا جو کام ہے اس کو وہ پورا کر رہے ہیں، مگر اسی کے ساتھ مسلمان قوم کے بھی کچھ فرائض ہیں۔ سردست رواق سلیمانی کی تعمیر اور بعض ضروریات کے لیے سرمایہ کی بڑی ضرورت ہے۔ ہم کو توقع ہے کہ مسلمان اصحاب ثروت اس کار خیر میں پوری مدد دیں گے۔

(معارف، اگست ۱۹۵۹ء)

مسلم یونیورسٹی ایک ملی ادارہ

مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا محض تعلیمی نہیں، بلکہ قومی و ملی ادارہ بھی ہے۔ اس لیے اس کا شعبۂ دینیات باوقار ہونا چاہیے۔ اس کا کام محض مقررہ نصاب پڑھا دینا نہیں بلکہ یونیورسٹی میں دینی فضا اور دین کا وقار قائم کرنا بھی ہے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب خود یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد اس کی جانب توجہ کریں۔ شعبۂ دینیات کو پوری اہمیت دی جائے اور اس کے لیے ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے جن کی علمی و دینی شہرت مسلم ہو۔ ہم کو خوشی ہے کہ اب اس شعبہ کی صدارت کے لیے ہمارے فاضل دوست مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کا انتخاب کیا گیا ہے، جن میں وہ تمام اوصاف و شرائط موجود ہیں، جو اس عہدہ کے لیے درکار ہیں۔ اس سے نہ صرف اس شعبہ کا وقار قائم ہوگا بلکہ یونیورسٹی کی علمی و دینی فضا پر بھی اس کا اثر پڑے گا۔ شعبۂ فارسی کے ریڈری کے لیے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا انتخاب بھی نہایت موزوں و مناسب ہے۔ وہ صحیح معنوں میں اسکالر ہیں۔ علم کا سچا ذوق رکھتے ہیں اور

مرد مسلمان بھی ہیں۔اور آیندہ محققین کی صف میں وہ ایک ممتاز مقام حاصل کریں گے۔

مسلم یونیورسٹی کو ایسے اساتذہ نہیں چاہئیں جن کا مایۂ فخر محض ڈگریاں، نمود و نمائش کی زندگی اور اپنی دینی و ملی روایات سے آزادی و بیزاری ہو، بلکہ ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے جو علم کا صحیح ذوق رکھنے کے ساتھ قومی و ملی جذبہ بھی رکھتے ہوں اور جن کی زندگی علمی و عملی دونوں حیثیتوں سے نوجوانوں کے لیے نمونہ ہو۔

سر سید احمد خاں نے جس زمانہ میں علی گڑھ کالج قائم کیا ہے۔اس زمانہ میں کالجوں کی کمی نہ تھی، مگر ان کی تعلیم، ان کا مقصد اور ان کا ماحول مسلمانوں کی ملی ضروریات کے مطابق نہ تھا اور سر سید احمد خاں کی دوربیں نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ ہندوستان جس راہ پر جا رہا ہے اگر اس میں مسلمانوں کی جدید تعلیم کے ساتھ ان کی ملی خصوصیات کے تحفظ کی طرف توجہ نہ کی گئی تو ان کا قومی وجود ختم ہو جائے گا۔اسی مقصد کے لیے انہوں نے مسلمانوں کے لیے الگ کالج قائم کیا تھا۔حالانکہ جس زمانہ میں کالج قائم ہوا ہے اس زمانہ میں اگرچہ مسلمانوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی، مگر ان کی ایک حیثیت قائم تھی اور ان کی تہذیبی خصوصیات بھی بہت کچھ باقی تھیں اور اب آزاد ہندوستان کے مستقبل کا جو نقشہ ہے اور مسلمان جن حالات سے گذر رہے ہیں۔ان میں ان کے لیے سر سید احمد خاں کے زمانہ سے کہیں زیادہ خطرات ہیں۔اس لیے مسلم یونیورسٹی کو اس کی ملی خصوصیات پر قائم رکھنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔

یہ نہیں کہا جاتا کہ یونیورسٹی سے پرانی خصوصیات بالکل ختم ہوگئی ہیں یا وہ دینی و ملی جذبہ رکھنے والے اساتذہ سے بالکل خالی ہے۔لیکن ان کے ایک طبقہ میں دین و ملت سے آزادی کے جو رجحانات پیدا ہو رہے ہیں اور جس کا اثر طلبہ پر بھی پڑتا ہے۔وہ یونیورسٹی کی روح اور اس کے مقاصد کے سراسر خلاف ہیں اور ان کو روکنے کی سخت ضرورت ہے۔ورنہ اگر اس کی اصل روح ختم ہوگئی تو مسلمانوں کے لیے اس میں اور دوسری یونیورسٹیوں میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔

(معارف، اگست ۱۹۵۹ء)

سیکولر حکومت اور مذہبی تعلیم

ہندوستان کی حکومت سیکولر ہے۔اس لیے اس کے نظام تعلیم میں مذہبی تعلیم کی کوئی جگہ نہیں

تھی، مگر اب حکومت کو بھی اس ضرورت کا احساس ہورہا ہے۔ چنانچہ اس نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی ہے اور یقین ہے کہ اس کی رپورٹ کے بعد مذہبی تعلیم بھی نظام تعلیم میں شامل کرلی جائے گی۔ اس تجویز سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوسکتا، لیکن ہندوستان میں مختلف مذاہب اور مختلف فرقے ہیں۔ اصولاً ان سب کی مذہبی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے، مگر ایسا نہ ہوسکے گا۔ ایسی صورت میں سوال یہ ہے کہ پھر کس مذہب کی تعلیم دی جائے گی۔ ابھی حال میں حکومت نے مسلمانوں کے ایک وفد کو اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ کسی خاص مذہب کی نہیں بلکہ جملہ مذاہب کی مشترک تعلیمات کی تعلیم دی جائے گی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ صرف اخلاقیات کی تعلیم ہوگی، یہاں تک غنیمت ہے، مگر اندیشہ یہ ہے کہ مذہب کے نام سے ہندو مذہب کی تعلیم دی جائے گی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب سیکولر نظام تعلیم میں ابتدائی تعلیم تمام تر ہندو تاریخ اور ہندو تہذیب وروایات کی دی جارہی ہے تو جب مذہبی تعلیم باقاعدہ نظام تعلیم میں شامل کرلی جائے گی۔ اس وقت جس مذہب کی تعلیم ہوگی اس کا قیاس ابتدائی تعلیم پر کیا جاسکتا ہے۔

اس کی صحیح شکل جو سب فرقوں کے لیے قابل اطمینان ہوتی یہ تھی کہ جو کمیٹی مقرر کی گئی ہے اس میں ماہرین تعلیم کے ساتھ ہر فرقہ کے مذہبی تعلیم کے اصلی نمایندوں یا کم سے کم ایسے لوگوں کو بھی شامل کیا جاتا جو اپنے مذہب کی تعلیم کے بارہ میں صحیح نقطۂ نظر پیش کرسکتے یا آیندہ مذہبی نصاب کی جو کمیٹی بنائی جائے یا اس کی ترتیب کا جو نظام بھی ہو، اس میں بھی اس کا لحاظ رکھا جائے اور ان سب کے مشورے سے نصاب تعلیم بنایا جائے اور ان کے اتفاق کے بعد اس کو جاری کیا جائے۔ جدید تعلیم کے ماہرین میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے، مگر حکومت ایسے موقعوں پر عموماً ان ہی لوگوں کا انتخاب کرتی ہے جن کو سرے سے اپنے مذہب ہی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور وہ اس کی ترجمانی کرنے کے بجائے حکومت کے منشا کی تکمیل کرتے ہیں۔

تعلیم کا مسئلہ ہندوستان کے تمام فرقوں کے لیے نہایت اہم ہے۔ اسی کے ذریعہ بچوں اور نوجوانوں کے عقائد وافکار بنتے اور ان کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے، جو نقش اس زمانہ میں قائم ہوتا ہے وہ کبھی نہیں مٹتا۔ ابتدائی تعلیم کے ذریعہ مسلمان بچوں کی ملی وتہذیبی خصوصیات کو مٹانے اور ان کو ہندو تہذیب وروایات کے رنگ میں رنگنے کی جس طرح کوشش کی جارہی ہے، اس کا تجربہ ان سب لوگوں

کو ہوگا جن کے بچے ابتدائی اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔اس لیے سرکاری تعلیم میں مذہبی تعلیم کو شامل کرنے کی جو تجویز ہے اگر ابھی سے اس میں اپنے مذہبی تحفظ کی کوشش نہ کی گئی تو ابتدائی تعلیم کے ذریعہ ہندوانے کی جو مہم شروع ہوئی ہے، اس کی پوری تکمیل ہو جائے گی۔اس لیے تمام فرقوں خصوصاً مسلمانوں کو اس کے تدارک کی پوری کوشش کرنی چاہیے اور جمعیۃ العلماء کو خاص طور سے اس کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔(معارف، ستمبر ۱۹۵۹ء)

ودیا بھون اور تاریخ ہند

انگریزوں پر یہ الزام بالکل بجا تھا کہ انہوں نے ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کے لیے ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ عمداً غلط رنگ میں پیش کی۔اگر انہوں نے ایسا کیا تو وہ ایک حد تک قابل معافی تھے کہ حکومت کے قیام و بقا کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن ہندوستان کی آزادی اور قومی حکومت کے زمانہ میں اسی پرانی روش پر قائم رہنا اور تاریخوں میں ایسی باتیں لکھنا جس سے مسلمانوں یا کسی فرقہ کی دل آزاری ہوتی ہو، کہاں تک مناسب اور ہندوستان کے مفاد کے موافق ہے۔افسوس ہے کہ بڑے بڑے ہندو مورخین کا دامن بھی اس سے پاک نہیں ہے اور مسلمانوں کے متعلق ان کے قلم پر جو بھی آتا ہے لکھ جاتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا اثر ہندوستان پر کیا پڑے گا۔

بھارتیہ ودیا بھون بمبئی کی جانب سے بڑے اہتمام سے ہندوستان کی ایک مبسوط تاریخ ”دی ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل“ کے نام سے کئی جلدوں میں شائع ہو رہی ہے۔اس کی پانچ جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ ہندوستان کے مشہور مورخ آر، سی موجمدار اس کے جنرل ایڈیٹر اور کے، ایم منشی سابق گورنر یوپی اس کے دیباچہ نگار ہیں۔ ان دونوں نے پانچویں جلد میں مسلمانوں کے متعلق نہایت دل آزار باتیں لکھی ہیں۔منشی جی سے تو اس کی شکایت نہیں کہ مسلم آزاری ان کا مستقل شیوہ ہے۔جس سے وہ کبھی نہیں چوکتے، مگر موجمدار جیسے ذمہ دار اور نامور مورخ سے اس کی توقع نہ تھی، جب ان کا یہ حال ہے تو معمولی درجہ کے مورخین کا کیا ذکر۔

انگریزوں نے جو کچھ کیا وہ تو ان کے مفاد کا تقاضا تھا، مگر آزاد ہندوستان کا مقصد تو ہندو مسلمانوں کو ملانا اور متحدہ قومیت کی تعمیر ہے لیکن کیا اس کا طریقہ یہی ہے اور اسی سے دونوں فرقوں میں وحدت پیدا ہوگی۔حقیقت یہ ہے کہ ہم آزاد تو ہو گئے ہیں مگر ابھی تک ہم میں آزاد قوموں کی بلند

نظری اور وسعت قلب نہیں پیدا ہوئی ہے اور ہمارا قدم تنگ نظری کے پرانے دائرے سے باہر نہیں نکلا ہے اور آج بھی ہندوستان میں ایک بڑی جماعت ایسی موجود ہے جو مسلمانوں کو غیر قوم سمجھتی ہے اور اس کو ہندوستان میں ان کا وجود گوارا نہیں اور وہ ان کے دور حکومت کو ہندوستان کی تاریخ سے مٹا دینا چاہتی ہے، جس کا ثبوت زندگی کے ہر شعبہ میں برابر مل رہا ہے۔ یہ کتاب بھی اس سے خالی نہیں ہے۔ اس پر کسی آیندہ پرچہ میں مفصل تبصرہ آئے گا۔ (معارف، اکتوبر ۱۹۵۹ء)

دائرۃ المعارف کی سترّ سالہ جوبلی

گذشتہ دسمبر اور جنوری میں دو اہم علمی اجتماع ہوئے۔ افسوس ہے کہ راقم کو بعض موانع کی بنا پر ان دونوں میں شرکت کا موقع نہ مل سکا۔ شاید ان کے تذکرے سے اس کی کچھ تلافی ہو جائے۔ ان میں ایک اجتماع دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد کی ستر سالہ جوبلی کا تھا۔ یہ ادارہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے اسلام کے اہم علمی اداروں میں ہے۔ اس نے اسلامی علوم وفنون کی بڑی قیمتی خدمات انجام دی ہیں اور اب تک قدیم عربی مصنّفین کی کئی سو اہم اور نادر تصانیف بڑے اہتمام سے شائع کر چکا ہے۔ مصر و شام کے بھی چند ہی ادارے اس کام میں اس کی ہمسری کر سکتے ہیں۔ جس کا اعتراف خود ان ملکوں کو بھی ہے۔ یہ شکریہ کا مقام ہے کہ یہ ادارہ ریاست حیدرآباد کے خاتمہ کے اثرات سے محفوظ رہا اور اپنے لائق ناظم ڈاکٹر نظام الدین صاحب کی نگرانی میں بدستور اپنی خدمات میں مصروف ہے۔

گذشتہ مہینہ ۲۵ تا ۲۹/ جنوری کو اس کی ستر سالہ جوبلی منائی گئی تھی۔ اس تقریب میں ہندوستان کے علاوہ بیرون ہند کے فضلا کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس میں اسلامیات پر مقالہ خوانی کے علاوہ دو علمی مذاکرے بھی رکھے گئے تھے۔ (۱) علوم مشرقیہ کی احتیاجات بالخصوص عربی و فارسی میں جدید تحقیقات کی ضرورت (۲) مشرقی علوم حکمیہ اور موجودہ سائنسی ترقی کے پیش نظر ان کی جدید تحقیقات کی ضرورت۔ عربی و فارسی کے نادر مخطوطات کی نمائش بھی تھی۔ اس تقریب کی تفصیلی روداد ہماری نظر سے نہیں گذری لیکن جس اہتمام سے منائی گئی ہے اس سے یقین ہے کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی ہوگی، آج اس ادارہ کی ہندوستان میں پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے اور ہم کو یقین ہے کہ ڈاکٹر نظام الدین صاحب جیسے صاحب علم کی نگرانی میں یہ ادارہ اور زیادہ ترقی کرے گا۔

دوسرا جلسہ آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس..... مسلم یونیورسٹی کا تھا، جو ۲۶/ ۲۷/ کو ڈاکٹر زبیر صاحب صدیقی کی صدارت میں علی گڑھ میں ہوا تھا۔ اس کی روداد آ گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اجتماع بہت کامیاب رہا۔ ہندستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور علمی و دینی اداروں کے نمایندوں نے اس میں شرکت کی اور اسلامی علوم وفنون کے مختلف پہلوؤں پر مقالات پڑھے۔ دارالمصنّفین کی جانب سے سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب شرکت کرنے والے تھے مگر عین وقت پر بیمار پڑ گئے۔ اس لیے نہ جا سکے، مگر اپنا مقالہ انہوں نے بھیج دیا تھا، جس سے دارالمصنّفین کی علمی شرکت ہوگئی۔ ان کا مقالہ ''ہندوستان کے فارسی لٹریچر میں ہندوؤں کے علوم و مذہب کا مطالعہ'' تھا۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی ایسا ادارہ نہیں ہے جس میں اسلامیات کے ماہرین جمع ہوکر اپنی تحقیقات کے نتائج پیش کر سکیں۔ اس ادارہ سے یہ کمی پوری ہوگئی اور وہ آیندہ چل کر ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کا نعم البدل ہوسکتا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اسلامیات سے ذوق رکھنے والے اہل علم اس سے پوری دلچسپی لیں۔ اس ادارہ کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ عربی کے قدیم اور جدید تعلیم یافتہ طبقوں کو ایک دوسرے کے قریب آنے اور ان کے خیالات کو سمجھنے کا موقع ملے گا اور ان میں جو بعد ہے وہ دور ہوجائے گا، جس کی نہ صرف علمی بلکہ دینی نقطۂ نظر سے بھی ضرورت ہے۔ دینی و تعلیمی اداروں کو اس لیے بھی اس میں شرکت کرنی چاہیے کہ ان کے نقطۂ نظر سے اس میں جو کمی ہو وہ پوری ہوسکے۔ حال ہی میں اس کا دستور بنا ہے اور ہمارے پاس بھی اظہار رائے کے لیے آیا ہے۔ اس میں وہ تمام مقاصد شامل ہیں جو اسلامک اسٹڈیز کے ہونے چاہئیں۔

(معارف، فروری ۱۹۶۰ء)

مسلمانوں کی دینی تعلیم کا مسئلہ

اس سے پہلے بھی ان صفحات میں مسلمان بچوں کی دینی تعلیم کے مسئلہ پر لکھا جاچکا ہے۔ اس کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ بار بار اس کی جانب توجہ دلائی جائے۔ نیا نظام تعلیم مسلمانوں کے مذہب اور ان کی تہذیب وروایات کے جس قدر خلاف ہے وہ اظہر من الشّمس ہے۔ گو اس کا احساس مسلمانوں کو اس کے اجرا کے بعد ہی ہوگیا تھا، مگر دس بارہ سال تک وہ دینی تعلیم کے لیے کوئی اجتماعی کوشش نہ کر سکے اور ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب اس کے نتائج نگاہوں کے سامنے آنے

لگے۔اب دینی تعلیمی بورڈ نے اس کی جانب عملی قدم اٹھایا ہے۔اب بھی وقت نہیں گیا ہے اگر پوری کوشش سے کام لیا جائے تو اس تاخیر کی تلافی ہوسکتی ہے۔

یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ قاضی عدیل صاحب عباسی جیسے عملی اور تجربہ کار آدمی نے دینی تعلیم کی اشاعت و تنظیم کا کام اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور مولانا ابوالحسن علی صاحب جیسی شخصیت کی رہنمائی ان کو حاصل ہے۔اس لیے امید ہے کہ استقلال کے ساتھ ہوگا لیکن کوئی بڑا تعمیری کام باہمی امداد و اعانت کے بغیر انجام نہیں پاسکتا اور مسلمانوں کی بے عملی کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی باہمت کسی بڑے کام کے لیے کھڑا بھی ہوجاتا ہے تو اس کو پوری امداد نہیں ملتی۔کم سے کم مسلمانوں کا یہ تو فرض ہے کہ جو لوگ خود قومی کاموں کے لیے وقت نہیں نکال سکتے وہ اپنی امداد و اعانت سے کام کرنے والوں کی ہمت افزائی کریں۔تعلیمی بورڈ کا ایک وفد عنقریب اضلاع کے دورے پر نکلنے والا ہے۔ہم کو توقع ہے کہ ہر ضلع کے مسلمان اپنے ضلع کی تعلیمی تنظیم میں اس وفد کے مشوروں سے فائدہ اٹھائیں گے۔

گو اردو دشمنی پہلے کے مقابلہ میں اب بہت گھٹ گئی ہے۔حکومت بھی اس کے حقوق کا اعتراف اور ان پر عمل درآمد کا اعلان کرتی ہے اور کبھی کبھی دل کے بہلانے کے لیے کوئی جزوی رعایت بھی دے دیتی ہے،مگر اس سے اردو کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔اس کی صحیح شکل یہی ہے کہ اردو جن علاقوں میں بولی جاتی ہے ان میں قانونی طور پر اس کی سرکاری حیثیت تسلیم کرلی جائے یا کم سے کم بلا کسی شرط و قید کے سرکاری مدارس میں اس کی تعلیم کا ایسا انتظام کیا جائے جو اردو کے حامیوں کے لیے بھی قابل اطمینان ہو۔اس کے بغیر محض وعدے وعید طفل تسلی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اور ان سے آیندہ اردو زبان قائم نہیں رہ سکتی۔ابھی اس کا اندازہ اس لیے نہیں ہوتا ہے کہ اردو داں نسل موجود ہے لیکن جب تعلیم سے اس کی جڑ کٹ جائے گی تو دو تین پشتوں کے بعد اردو جاننے والے ڈھونڈھے نہ ملیں گے،بلکہ اب بھی یہ عبرت ناک منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض ان خاندانوں کے لڑکے جن کی مادری زبان خالص اردو ہے۔اردو بول تو سکتے ہیں لیکن لکھ پڑھ نہیں سکتے۔اس سے آیندہ کا قیاس کیا جاسکتا ہے۔

اس زمانہ میں بھی جبکہ عام طور سے دینی مدارس اور اسلامی ادارے طرح طرح کی مشکلات میں مبتلا ہیں۔الحمدللہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ہر حیثیت سے ترقی پر ہے۔نئے نئے تعلیمی،علمی اور

انتظامی شعبے کھل رہے ہیں۔ تعمیرات کا سلسلہ الگ جاری ہے۔ طلبہ کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ اس کی شہرت ہندوستان سے نکل کر بیرونی ملکوں تک پہنچ گئی ہے اور اس وقت ندوہ میں نہ صرف اسلامی ممالک بلکہ چین و جاپان تک کے طلبہ زیر تعلیم ہیں اور وہ دنیائے اسلام کا ایک اہم تعلیمی مرکز بنتا جارہا ہے اور کارکنان ندوہ کی یہ پوری کوشش ہے کہ محض مالی مشکلات کی بنا پر کوئی طالب علم تعلیم سے محروم نہ رہنے پائے۔ اس لیے وظائف کی تعداد پہلے کے مقابلہ میں چوگنی ہوگئی ہے۔ تعمیرات اور نئے شعبوں کے مصارف علاحدہ بڑھ گئے ہیں، مگر کاموں کی اس وسعت کے لحاظ سے آمدنی میں اضافہ نہیں ہوا ہے، جس سے مصارف اور بعض منصوبوں کی تکمیل میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس لیے مسلمان اہل خیر سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اس کار خیر میں پوری امداد و اعانت فرمائیں۔ (معارف، مئی ۱۹۶۰ء)

مسلم یونیورسٹی اور اسلامی تہذیبی روایات

مسلم یونیورسٹی کے بارہ میں جو شکایتیں عرصہ سے سننے میں آتی ہیں ان سے ہم کو نہ ذاتی واقفیت ہے اور نہ بحث، لیکن جن شکایتوں کا تعلق یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد اور اس کی ملی وتہذیبی خصوصیات سے ہے ان کے بارہ میں ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور آج بھی چند باتیں کہنا ہیں۔ اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا تنہا تعلیمی نہیں بلکہ ملی ادارہ بھی ہے اور اس کا مقصد تعلیم کے ساتھ ان کی ملی وتہذیبی روایات کا تحفظ بھی ہے۔ اس لیے یونیورسٹی میں کسی ایسی چیز کو گوارا نہیں کیا جاسکتا جو ان مقاصد کے خلاف ہو۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ یونیورسٹی کے بہت سے نام نہاد مسلمان اساتذہ کی زندگی اسلامی شعار کے بالکل خلاف ہے، بلکہ اس کا استخفاف کیا جاتا ہے۔ یونیورسٹی میں بہت سی ایسی لغو باتیں رائج ہیں جو نہ صرف اسلامی روایات بلکہ قومی وملی حمیت کے بھی خلاف ہیں۔

یونیورسٹی میں علانیہ الحاد و دہریت کی تبلیغ ہوتی ہے۔ کمیونسٹوں کا اثر واقتدار روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ بہت سے کمیونسٹ کلیدی جگہوں پر قابض ہیں اور انہوں نے اپنے اثر واقتدار کو کمیونزم کی اشاعت کا ذریعہ بنالیا ہے اور وہ یونیورسٹی کو کمیونزم کا گڑھ بنا دینا چاہتے ہیں۔ اس کا اعتراف خود کمیونسٹوں کو بھی ہے کہ ان کو سب سے زیادہ کامیابی مسلم یونیورسٹی میں ہوئی ہے۔ چنانچہ گذشتہ سال

اتر پردیش میں کمیونسٹ پارٹی کی جو کانفرنس ہوئی تھی اس کی روداد مطبوعہ ٹائمس آف انڈیا میں یہ اعتراف موجود ہے۔ مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ یہیں مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ کی پرورش ہوتی ہے۔ اس میں کمیونسٹوں کے اثر و اقتدار کے معنی یہ ہیں کہ ہماری پوری نسل کمیونزم سے متاثر ہوجائے گی۔

کمیونسٹ نہ صرف مذہب و ملت کے دشمن ہیں بلکہ ملک و وطن کے وفادار بھی نہیں ہیں اور کمیونزم کی قربان گاہ پر ہر چیز کو بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اس لیے جو ادارے کسی مذہب و ملت سے منسوب اور اس کی روایات کے ترجمان ہوں۔ ان میں کمیونسٹوں کا اقتدار سراسر ان کے مقاصد کے خلاف ہے۔ اس جمہوری دور میں کسی شخص کے خیالات پر تو پابندی نہیں لگائی جاسکتی لیکن کسی ادارہ سے وابستہ کسی کمیونسٹ کو اس کے مقاصد کے خلاف سرگرمیوں کو اجازت نہیں دی جاسکتی۔ یہ کوئی تعصب یا تنگ نظری نہیں بلکہ اصولی بات ہے۔ کیا کوئی کمیونسٹ ادارہ کسی غیر کمیونسٹ کو اپنے گھر میں بٹھا کر اس کی تخریب کی اجازت دے سکتا ہے۔ اگر ایسا نہیں اور یقیناً نہیں ہے تو پھر مسلم یونیورسٹی میں کمیونسٹ اساتذہ کو نہ صرف اسلام اور مسلمان دشمن بلکہ ملک و وطن کے خلاف سرگرمیوں کی اجازت کس طرح دی جاسکتی ہے۔

غالباً مسلم یونیورسٹی کے دستور میں کوئی دفعہ بھی ایسی موجود ہے جس کی رو سے اس کے اساتذہ اسلامی روایات اور اسلامی کلچر کے خلاف کوئی کام نہیں کرسکتے۔ ایسی حالت میں تو ان کو قانوناً بھی روکا جاسکتا ہے۔ خیال آتا ہے کہ سر سلیمان مرحوم نے اپنی وائس چانسلری کے زمانہ میں اس قسم کی پابندی عائد کی تھی۔ اس وقت بڑے بڑے کمیونسٹوں نے اپنے عقائد سے اظہار برأت کیا تھا۔ اس لیے آج بھی یہ پابندی عائد کی جاسکتی ہے۔

ایک جمہوری اور سیکولر حکومت میں اقلیتوں کو اپنی ملی و تہذیبی خصوصیات برقرار رکھنے اور ان کو فروغ دینے کا پورا حق حاصل ہے۔ اس لیے مسلم یونیورسٹی کو اس کی خصوصیات کے ساتھ قائم رکھنا ہے اور حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ بھی اس کام میں پوری امداد دے۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈر اس کا اعتراف کرتے چلے آتے ہیں۔ ایک زمانہ میں جب جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مالی حالت زیادہ خراب تھی تو سیٹھ جمنا لال بجاج یا کسی اور ہندو صاحب ثروت نے اس شرط کے ساتھ

مدد دینے کا وعدہ کیا کہ جامعہ ملیہ سے اسلامیہ کا لفظ نکال دیا جائے تو خود گاندھی جی نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ نہ صرف اسلامیہ کا لفظ نہیں نکالا جاسکتا بلکہ جامعہ کو اسلامی افکار و تصورات اور اسلامی تہذیب و روایات کا پورا ترجمان رہنا چاہیے، تاکہ اگر کوئی غیر مسلم اسلامی کلچر کا مطالعہ کرنا چاہے تو جامعہ میں کرسکے۔اسی قسم کا خیال سی راج گوپال اچاریہ بھی مسلم یونیورسٹی کے متعلق ظاہر کر چکے ہیں۔

کمیونسٹوں کے ہاتھ میں اپنی مدافعت کا ایک بڑا حربہ یہ ہے کہ جہاں کسی نے ان کی مخالفت کی یا اسلام اور مسلمانوں کا نام لیا۔فوراً اس کو فرقہ پرستی سے متہم کردیا، مگر اس قسم کے حربے اب کام نہیں دے سکتے۔کمیونسٹوں کی قوم پروری اور وطن دوستی پہلے بھی ظاہر تھی۔چین کی جارحیت کے بعد اور بھی بے نقاب ہوگئی ہے۔فرقہ پرستی کی تردید کے لیے یہ ثبوت کافی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے ہندو اساتذہ کی بڑی تعداد کمیونسٹوں کی مخالفت میں مسلمان اساتذہ کے ساتھ ہے۔

ہمارے خیال میں اس صورت حال کی اصلاح کی بہتر شکل یہ ہوگی کہ جس طرح یونیورسٹی کے دوسرے معاملات کی تحقیقات کے لیے کمیٹی مقرر کی گئی ہے۔اسی طرح ان امور کی تحقیقات کے لیے بھی ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد اور اس کی روح کے خلاف یونیورسٹی میں رائج ہیں۔یہ کمیٹی ایسے اشخاص پر مشتمل ہونی چاہیے جو قوم کے معتمد علیہ ہوں اور دینی و ملی حمیت بھی رکھتے ہوں۔وہ تحقیقات کرکے رپورٹ اور اصلاح کی تجویزیں پیش کریں۔اگر یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد ایسا نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ خود ان کا دامن بھی پاک نہیں ہے۔اور ان کی نگاہ میں یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ہم کو توقع ہے کہ وہ تمام اخبارات اور دردمند مسلمان جو مسلم یونیورسٹی کی خصوصیات کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔اس مسئلہ میں متحدہ آواز بلند کریں گے۔(معارف، جون ۱۹۶۰ء)

مسلم یونیورسٹی
ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے قیمتی دنیاوی متاع

گذشتہ مہینہ ہم نے مسلم یونیورسٹی میں کمیونزم اور دوسرے غیر اسلامی اثرات کے بارہ میں جو خیالات ظاہر کیے تھے۔اس کو اردو کے تقریباً تمام اخبارات نے نقل کیا اور اس پر نوٹ لکھے۔بعض ممتاز شخصیتوں نے اس کی تائید میں بیانات شائع کیے اور اس کی تائید وحمایت میں بہت سے اکابر

کے خطوط آئے۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ یہ مسلمانوں کے دل کی آواز تھی۔ ان خرابیوں کو سب محسوس کرتے تھے اور اس کے خلاف آواز اٹھنے کے منتظر تھے۔ معلوم نہیں مسلم یونیورسٹی کے ایوانوں تک مسلم پریس کی یہ آواز پہنچی یا نہیں۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کا مقصد محض یونیورسٹی کی اصلاح ہے۔ اگر ہم کو ذرا بھی اس کی توقع ہوتی کہ ہماری نج کی معروضات قابل توجہ ہوں گی تو معارف میں لکھنے کے بجائے یونیورسٹی کے ذمہ داروں سے زبانی گفتگو یا خط و کتابت کرتے لیکن اس کی قطعاً کوئی امید نہ تھی اور اس قسم کی بعض کوششوں کا انجام معلوم تھا۔ اس لیے ہم کو بدرجۂ مجبوری تحریر میں لانا پڑا۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے قیمتی دنیاوی متاع اور ان کے سیاسی زوال کے بعد ان کا سب سے بڑا عملی کارنامہ مسلم یونیورسٹی ہے۔ اس پر غریب مسلمانوں کا لاکھوں روپیہ اور ان کی بڑی محنت صرف ہوئی ہے۔ اور وہ صرف تعلیم گاہ نہیں بلکہ تربیت گاہ اور مسلمانوں کا تہذیبی مرکز بھی ہے۔ اس کے قیام کا مقصد ہی یہ تھا کہ مسلمانوں کی قومی ضروریات اور ان کے ملی مزاج کے مطابق ان کو تعلیم دی جائے۔ ان میں قومی و ملی احساس پیدا اور ان کی تہذیبی روایات کا تحفظ کیا جائے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم جدید کی تقریباً کل بڑی بڑی شخصیتیں یہیں پیدا ہوئیں اور ان کے سارے قومی و ملی کام ان ہی کے ذریعہ انجام پائے اور ملک و وطن کی خدمت میں بھی ان کا قدم کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ چنانچہ تحریک آزادی کے تمام بڑے بڑے مسلمان لیڈر اور اس کے جاں باز مجاہد علی گڑھ ہی کے تعلیم یافتہ تھے، جن کی بعض یادگاریں اب بھی باقی ہیں۔

ہندوستان میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کی کمی نہیں۔ ان سے بھی ہزاروں مسلمان پڑھ کر نکلے اور ان میں بعض بڑی شخصیتیں بھی پیدا ہوئیں۔ جنھوں نے قومی خدمات بھی انجام دیے، لیکن اس کی مثالیں بہت کم ہیں۔ پھر ان کے کاموں کو علی گڑھ کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے کارناموں سے کوئی نسبت نہیں۔ مسلم یونیورسٹی کا تو طغرائے امتیاز ہی اس کی قومی و ملی خصوصیات تھیں۔ اس لیے اگر یہ خصوصیات ختم ہوگئیں تو اس کے تعلیم یافتہ مسلمانوں سے قومی و ملی احساس بھی ختم ہو جائے گا اور مسلم یونیورسٹی اور دوسری یونیورسٹیوں میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا، جو ایک بڑا قومی سانحہ ہوگا۔

اس لیے مسلم یونیورسٹی میں کسی ایسی چیز کو گوارا نہیں کیا جا سکتا جو اسلامی تہذیب و روایات اور مسلمانوں کے قومی و ملی حمیت کے خلاف ہو اور جس سے یونیورسٹی کی خصوصیات ختم ہو جائیں۔ یہ

ایسا کھلا ہوا اصولی مسئلہ ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ کوئی ادارہ اور کوئی نظام بھی اپنے متوسلین کو اپنے عقائد و تصورات اور اپنے اصولوں اور نظریوں کی مخالفت کی اجازت نہیں دے سکتا۔ آخر ہندو یونیورسٹی بھی تو ہے، کیا وہ اپنے یہاں ایک لمحہ کے لیے بھی ہندو تہذیب اور ہندو کلچر کی مخالفت کی اجازت دے سکتی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ ساری آزاد خیالی اور وسیع المشربی مسلم یونیورسٹی کے لیے کیوں مخصوص ہے۔ اس کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور وہ اسی حد تک قابل انگیز ہے، جس سے یونیورسٹی کے مقاصد اور اس کے نصب العین کو نقصان نہ پہنچے اور اگر مسلم یونیورسٹی کے ذمہ داروں کو اس کا احساس نہیں ہوتا تو مسلمانوں کو اس کے خلاف مسلسل احتجاج کرنا چاہیے، مگر ہم کو امید ہے کہ اس کی ضرورت نہ پیش آئے گی۔

مسلم یونیورسٹی کے محترم چانسلر ملا طاہر سیف الدین مذہبی شخصیت رکھتے ہیں اور ایک مذہبی فرقہ کے پیشوا ہیں۔ اس لیے ہم کو یقین ہے کہ وہ خود مسلم یونیورسٹی میں غیر اسلامی اثرات کو پسند نہ کریں گے۔ غالباً ان کو ان حالات کا علم نہیں ہے۔ ان سے واقفیت کے بعد وہ ضرور اس کے انسداد کی کوشش کریں گے۔ (معارف، جولائی ۱۹۶۰ء)

مردم شماری اور اردو

قانونی حیثیت سے اردو کے حقوق حاصل کرنے کے جو ذرائع ہیں ان میں سب سے بڑا ذریعہ اردو بولنے والوں کی تعداد ہے۔ ہندوستان کی مردم شماری کا زمانہ بہت قریب آ گیا ہے۔ اس میں زبان شماری بھی ہوگی اور ان کے بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے زبانوں کو حقوق ملیں گے۔ اس لیے اردو کے ساتھ حکومت کا طرز عمل جو بھی ہو لیکن قانونی حیثیت سے اس کے حقوق کا دار و مدار بڑی حد تک اس کے بولنے والوں کی تعداد پر منحصر ہے۔ گذشتہ مردم شماری کی طرح اس مرتبہ بھی اس کا اردو دشمن عملہ اردو زبان کے اندراج میں دھاندلی سے کام لے گا۔ خصوصاً دیہاتوں اور ان پڑھ لوگوں کی زبان لکھنے میں اس کا زیادہ موقع ملے گا۔ اس لیے اردو بولنے والوں کو ابھی سے اس کے مقابلہ کی تیاری کرنا چاہیے۔ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں بھی جہاں اردو بولنے والے موجود ہیں، دو چار خواندہ ضرور مل جائیں گے۔ اگر وہ زبان کے اندراجات کی پوری نگرانی کریں تو مردم شماری کرنے والوں کو خیانت کرنے کا موقع کم ملے گا۔ یہ کوئی مستقل کام نہیں ہے، صرف مہینہ ڈیڑھ مہینے کا معاملہ

ہے۔اس لیے تھوڑی سی توجہ سے ہوسکتا ہے۔اس کام میں ان سب جماعتوں کو پوری سرگرمی سے حصہ لینا چاہیے جن کو اردو کے مسئلہ سے تعلق ہے۔انجمن ترقی اردو کا اخبار ''ہماری زبان'' مردم شماری کے متعلق ہدایات شائع کرتا رہتا ہے۔ان کو دیکھ کر ان کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔

گو یہ واقعہ افسوس ناک ہے، مگر حقیقت ہے کہ اردو بولنے والے اپنی زبان کی حق تلفی کی شکایت تو برابر کرتے رہتے ہیں لیکن اس کے لیے عملی جدوجہد کی توفیق کم لوگوں کو ہوتی ہے۔خصوصاً اس صوبہ میں جو اردو کا سب سے بڑا مرکز ہے۔نہ صرف عوام بلکہ خواص اور تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی اردو کی جانب سے بڑی لاپروائی ہے۔ یہاں کتنے مقامات ایسے ہیں جہاں انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم ہیں اور اردو کے لیے کوئی عملی کام ہوتا ہے۔مرکزی انجمن اضلاع، قصبات اور دیہاتوں میں تو کام نہیں کرسکتی۔یہ ان مقامات کے باشندوں کا کام ہے کہ وہ اپنے یہاں انجمن کی شاخیں قائم کرکے انجمن کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائیں اور جو مشکلات پیش آئیں، ان میں صوبائی اور مرکزی انجمن کی طرف رجوع کریں۔اس وقت سب سے مقدم کام یہ ہے کہ اردو کی دستخطی مہم کی طرح مردم شماری کی مہم کو بھی پوری سرگرمی اور جوش وخروش سے چلایا جائے ورنہ اگر اس مرتبہ بھی اردو بھرنے والوں کی صحیح تعداد درج نہ ہوسکی تو اس کے حقوق ملنے میں اور بھی دشواری ہوگی۔(معارف، نومبر ۱۹۶۰ء)

جامعہ ملیہ کے مقاصد

ایک خبر ہے کہ جامعہ ملیہ کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کے لیے پارلیمنٹ کے آیندہ سشن میں ایک بل پیش ہونے والا ہے۔یہ خبر بظاہر بڑی مسرت افزا ہے لیکن جب تک یہ نہ معلوم ہوجائے کہ یہ یونیورسٹی کس قسم کی ہوگی، اس وقت تک اس کے متعلق کوئی رائے نہیں دی جاسکتی۔اگر وہ عام یونیورسٹیوں کی طرح محض ایک تعلیمی یونیورسٹی ہوگی تو اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں۔خود دلی میں ایک یونیورسٹی اور اس کے قریب ہی علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی موجود ہے۔مسلمان ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ایک نئی یونیورسٹی کی کیا ضرورت ہے، البتہ اگر جامعہ کے مقاصد اور اس کی خصوصیات کو قائم رکھتے ہوئے اس کو یونیورسٹی بنایا جائے تو یہ مسلمانوں کے لیے بھی مفید ہوگا اور حکومت کی شہرت ونیک نامی کا باعث بھی ہوگا۔

جامعہ ملیہ کا مقصد آزاد قومی تعلیم کے ساتھ مسلمانوں کی دینی ودنیوی تعلیم اور ان کی ملی و

تہذیبی خصوصیات کا تحفظ بھی ہے۔ گو اس کے اور مسلم یونیورسٹی کے بعض مقاصد بظاہر مشترک ہیں لیکن علی گڑھ کالج کے بانی سرسید تھے اور جامعہ کے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خاں، ان کے اور سرسید کے مذہبی و ملی اور تعلیمی و تہذیبی تصورات میں جو فرق تھا وہی ان دونوں اداروں کے مقاصد میں بھی ہے۔ اس لیے جامعہ پر ان مقاصد اور خصوصیات کو قائم رکھنے کی ذمہ داری مسلم یونیورسٹی سے زیادہ عائد ہوتی ہے۔ خود گاندھی جی بھی ان کو قائم رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہ مشہور واقعہ ہے کہ ایک زمانہ میں جب جامعہ کی مالی حالت زیادہ خراب ہوئی تو ایک ہندو سیٹھ نے اس شرط پر امداد کا وعدہ کیا کہ جامعہ ملیہ سے اسلامیہ کا لفظ نکال دیا جائے، مگر گاندھی جی نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ جامعہ کو اسلامی افکار و تصورات اور تہذیب و روایات کا ترجمان رہنا چاہیے تاکہ اگر کوئی غیر مسلم ان چیزوں کا مطالعہ کرنا چاہے تو جامعہ میں کر سکے۔ اس لیے جامعہ کے کارکنوں کو چاہیے کہ گاندھی جی کے اس نقطۂ نظر کی روشنی میں جامعہ کا جائزہ لیتے رہیں۔ اس حد تک تو صحیح ہے کہ نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے جامعہ میں کچھ نہ کچھ تبدیلی کرنا پڑے گی لیکن یہ تبدیلی ایسی نہ ہو جس سے اس کے بنیادی مقاصد ہی بدل جائیں۔ اس کو یونیورسٹی ضرور بنایا جائے مگر اس طرح کہ اس کی اصل روح میں فرق نہ آنے پائے۔

بانیان جامعہ کے نصب العین، گاندھی جی کے نقطۂ نظر، آزاد قومی تعلیم کی یادگار، قومی و ملی مفاد اور حکومت کے مصالح سب کا تقاضا یہی ہے کہ جامعہ کو اس کے اصلی مقاصد کے ساتھ قائم رکھا جائے۔ اس کے بغیر اگر وہ بین الاقوامی یونیورسٹی بھی بن گئی تو اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اس سے اس کے موجودہ اساتذہ اور طلبہ کو کچھ فوائد ضرور حاصل ہو جائیں گے مگر وہ بھی عارضی ہوں گے اور یہ بھی مشتبہ ہے کہ دلی یونیورسٹی کے قرب میں ایک نئی یونیورسٹی پنپ بھی سکے گی یا نہیں۔ ضرورت ہے کہ اس بل کو پیش کرنے سے پہلے اس کے متعلق رائے عامہ حاصل کی جائے اور اس کی روشنی میں کوئی قدم اٹھایا جائے، گو اب اپنی ملکی و قومی حکومت ہے لیکن بہرحال حکومت ہے۔ اس لیے آزاد تعلیم کی ایک یادگار کو اس کے اثر سے بھی آزاد رہنا چاہیے۔ ہمارے خیال میں جامعہ کے خدمات کا سب سے بڑا صلہ اور اس کی سب سے بڑی قدردانی یہ ہے کہ اس کو اردو یونیورسٹی بنا دیا جائے۔ اس سے کسی نہ کسی حد تک اس کی خصوصیات بھی قائم رہیں گی۔ اردو والوں کی بھی اشک شوئی ہو جائے گی۔

جامعہ عثمانیہ کا خوں بہا بھی ادا ہو جائے گا اور حکومت کی رواداری اور سیکولرزم کا بھی ایک بڑا نشان ہوگا۔(معارف،فروری ۱۹۶۱ء)

مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں تحقیقی کمیشن کی رپورٹ

مسلم یونیورسٹی کے ہر بہی خواہ کو اس سے دلی مسرت ہوگی کہ اس کے خلاف جو طوفان کھڑا کیا گیا تھا۔وہ بالکل بے بنیاد نکلا اور تحقیقاتی کمیشن نے یونیورسٹی کو نہ صرف ان تمام الزاموں سے بری قرار دیا،جس کا فرقہ پرستوں نے بڑا شور برپا کر رکھا تھا،بلکہ اس کی رواداری کا اعتراف کیا اور ہندو طلبہ کے ساتھ مسلمان طلبہ کے سلوک اور ان کے تعلقات کی خوش گواری پر مسرت ظاہر کی،مسلم یونیورسٹی کی اسلامی حیثیت،اس میں مسلمانوں کے ترجیحی حقوق اور اس بارہ میں یونیورسٹی کی پالیسی کو صحیح تسلیم کیا۔اسلامی علوم والسنہ کے شعبوں کو ترقی دینے کی سفارش کی،دوسری یونیورسٹیوں میں مسلمان طلبہ کو حصول تعلیم کی جو دقتیں پیش آئی ہیں حکومت کو اس کی تحقیقات اور اس کے تدارک کی جانب توجہ دلائی،اسی کے ساتھ انتظامی امور میں بعض غلطیوں اور فروگذاشتوں کی جانب بھی توجہ دلائی اور آیندہ اس کی اصلاح کی ہدایت کی،اس منصفانہ رپورٹ سے ان لوگوں کو بڑی مایوسی ہوگی،جنھوں نے اپنے گمان میں مسلم یونیورسٹی پر بڑی کاری ضرب لگانے کی کوشش کی تھی۔اس سے ان کا ہوائی قلعہ ہی مسمار ہو گیا۔اس کامیابی پر یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد مبارک باد کے مستحق ہیں۔دوسری خوش خبری یہ ہے کہ یونیورسٹی کے کلچرل پروگراموں سے رقص کو خارج کر دیا گیا یہ ایک قابل تعریف اصلاح ہے۔یونیورسٹی کو محض نام ونسبت کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے آثار ومظاہر کے لحاظ سے بھی مسلم رہنا چاہیے اور کم سے کم ان چیزوں سے اس کو پاک ہونا چاہیے جو اسلامی روایات اور قومی غیرت وحمیت کے خلاف ہیں۔(معارف،مارچ ۱۹۶۱ء)

انجمن ترقی اردو کا سالانہ اجلاس

انجمن ترقی اردو ہند کی سالانہ کانفرنس اس لحاظ سے بہت کامیاب رہی کہ اترپردیش کے گورنر ڈاکٹر بی رام کرشنا راؤ نے اس کا افتتاح کیا اور وزیر اعلیٰ مسٹر سی بی گپتا نے شرکت اور تقریر کی۔دونوں نے اپنی تقریروں میں اردو کے حقوق کا صریح اعتراف اور اب تک اس کی جو حق تلفی ہوتی چلی آئی ہے،اس کی تلافی کا وعدہ کیا اور اردو کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں،وزیر اعلیٰ نے اس کی تحقیقات کے

لیے کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا۔ اردو کے بارہ میں اتنی وعدہ خلافیاں ہوچکی ہیں کہ کسی نئے وعدہ کا مشکل ہی سے یقین کیا جاسکتا ہے لیکن اقلیت کے مسائل میں نئی حکومت کی پالیسی میں تبدیلی کے کچھ آثار ہیں۔ اس لیے خیال یہ ہے کہ گپتا حکومت کے زمانہ میں مسلم آزاری اور اردو کشی کی پالیسی میں بھی تبدیلی ہوگی۔ انہوں نے جن صریح الفاظ میں اردو کے حق کا اعتراف اور اس کی گذشتہ حق تلفیوں کی جانب اشارہ کیا ہے اور ان کی تلافی کے لیے جو عملی قدم اٹھایا ہے، اس سے توقع یہی ہے کہ اردو کی کس مپرسی کا دور شاید اب ختم ہوجائے۔ (معارف، مارچ ۱۹۶۱ء)

مردم شماری میں اردو زبان کے اندراج کا مسئلہ

اس مرتبہ مردم شماری میں اردو زبان کے صحیح اندراج کی پہلے سے کوشش کی گئی تھی لیکن یہ کام اتنا وسیع تھا کہ آل انڈیا تنظیم کے بغیر اس پر قابو پانا دشوار تھا، جو ممکن نہیں تھا۔ اس لیے شہروں اور بڑی آبادیوں میں جہاں اردو پڑھے لکھے ذی حیثیت لوگوں کی قابل لحاظ تعداد ہے اور انہوں نے زبان کے اندراج کی پوری نگرانی بھی کی ہے، وہاں تو بڑی حد تک صحیح اندراج ہوا ہوگا، مگر ایسے مقامات خصوصاً دیہاتوں میں جہاں اس قسم کا انتظام نہیں ہوسکا۔ اس مرتبہ بھی زبان کے اندراج میں بڑی بے عنوانیاں ہوئی ہیں، جن کی شکایتیں اردو اخبارات میں برابر چھپتی رہتی ہیں۔ اس لیے اس کی پوری تحقیقات کی ضرورت ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ساری شکایتیں اخبارات تک نہ پہنچ سکی ہوں گی، جو شکایتیں پہنچ سکی ہیں۔ ان سب کی تحقیقات بھی دشوار ہے لیکن اگر کچھ واقعات بھی تحقیقات سے صحیح ثابت ہوں تو پھر اردو بولنے والوں کے سارے اعداد و شمار مشکوک ہوجائیں گے۔ (معارف، مارچ ۱۹۶۱ء)

مسلم کنونشن

مسلم کنونشن کو منعقد ہوئے دو مہینے ہوچکے ہیں، مگر اس کے متعلق موافق و مخالف بیانات کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ فرقہ پرستوں نے اس کے خلاف جو طوفان بپا کیا وہ توقع کے عین مطابق ہے۔ ان کو تو مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے کا کوئی موقع ملنا چاہیے۔ کانگریس کے حلقہ سے بھی اس کے خلاف کچھ آوازیں بلند ہوئیں جن میں بعض نام نہاد مسلمانوں کے نام بھی نظر آتے ہیں۔ ان کی مخالفت بھی تعجب انگیز نہیں ہے۔ موجودہ کانگریس میں مشکل سے دو چار سچے کانگریسی نکل سکیں گے ورنہ ان میں اور فرقہ پروروں میں ظاہر کے علاوہ باطن کا کوئی فرق نہیں، مسلمانوں کے مسائل میں

تقریباً سب کے جذبات یکساں ہیں۔ رہے مسلمان تو حکومت کے ایسے وفاداروں سے کوئی زمانہ بھی خالی نہیں رہا ہے، جو ذاتی فائدے کے لیے دین وملت سب کچھ قربان کر سکتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ اس کنونشن کا یہ روشن پہلو بھی ہے کہ اس میں ہر فرقہ کے منصف مزاج لوگوں نے شرکت اور اس کی حمایت میں تقریریں کیں جو اس کنونشن کی معقولیت اور کامیابی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کنونشن نے انڈین یونین کی جمہوریت اور سیکولرزم کی لاج رکھ لی۔ اس کا مقصد نہ مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم ہے نہ کوئی نئی جماعت بنانا اور نہ حکومت کے خلاف محاذ قائم کرنا، بلکہ صرف مسلمانوں کی جائز شکایتوں اور ان حقوق ومطالبات کو حکومت کے کانوں تک پہنچا دینا ہے جو خود دستور ہند نے ان کو عطا کیے ہیں۔ درحقیقت کوئی حکومت اس وقت تک جمہوری اور سیکولر نہیں کہلائی جا سکتی جب تک وہ ملک کے تمام فرقوں کے ساتھ بلاامتیاز مذہب وملت یکساں سلوک خصوصاً اقلیتوں کو مطمئن نہیں کرتی، یہ تو استبداد کی بدترین شکل ہے کہ مظلوموں کو شکایت کی بھی اجازت نہ ہو۔ اس سے فرقہ پرستی گھٹتی نہیں اور بڑھتی ہے۔ جب دل شکایتوں سے معمور اور لب خاموشی پر مجبور ہوں گے تو لامحالہ فرقہ وارانہ جذبات پیدا ہوں گے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ ان شکایتوں کو کھل کر بیان کر دیا جائے اور یہ حکومت کا فرض ہے وہ ان کو دور کر کے عملاً حقیقی جمہوریت اور سیکولرزم قائم کرنے کی کوشش کرے۔ اس لحاظ سے اس کنونشن نے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ جمہوریت کی خدمت بھی انجام دی۔

ڈاکٹر محمود صاحب کا خطبۂ صدارت قوم وملت اور ملک ووطن کے حقوق وفرائض میں اعتدال وتوازن اور سچی قوم پروری ووطن دوستی کا نمونہ ہے۔ انھوں نے صرف مسلمانوں کی حق تلفی ہی کا گلہ نہیں کیا ہے، بلکہ مسلمانوں کو بھی ان کی خامیوں کی اصلاح اور ملک ووطن سے متعلق ان کے فرائض کی جانب توجہ دلائی ہے اور ان کو قوم پروری اور وطن دوستی میں دوسروں کے لیے نمونہ بننے کی تلقین کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا دامن اتنا بے داغ اور ان کی قوم پروری شک وشبہہ سے اتنی بالاتر ہے کہ اس کنونشن سے پہلے کوئی مخالف بھی ان پر حرف نہیں رکھ سکتا تھا۔ پھر جن شرائط اور احتیاطوں کے ساتھ یہ کنونشن کیا گیا ہے اس سے زیادہ احتیاط ممکن نہ تھی۔ اس سے خود مسلمانوں کے ایک طبقہ کو اس کنونشن سے شکایت پیدا ہو گئی ہے۔ اس کے بعد بھی جو لوگ اس کنونشن یا ڈاکٹر صاحب پر اعتراض کرتے ہیں وہ خود فرقہ پروری کے شکار اور خود غرض ہیں۔ (معارف، اگست ۱۹۶۱ء)

اردو اور سمپورنا نند جی

یاد بخیر سمپورنا نند جی اردو کے ان محسنوں میں ہیں جو کسی موقع پر بھی اس کی مخالفت سے نہیں چوکتے۔ گپتا حکومت نے اردو کے مسائل پر غور اور اس کی تحقیقات کے لیے جو کمیٹی مقرر کی ہے اس میں ہندی کی پوزیشن بالکل محفوظ کردی گئی ہے۔ کمیٹی کوئی ایسی سفارش نہیں کرسکتی جس سے ہندی کی امتیازی حیثیت پر اثر پڑتا ہو۔ اس کے ارکان میں متعدد ہندی نواز اور ہندی کے مصنّفین واہل قلم موجود ہیں۔ ابھی اس کی پہلی نشست ہوئی ہے اور اس نے صرف ایک سوال نامہ مرتب کیا ہے۔ تجویزوں اور سفارشوں کا مرحلہ بہت دور ہے اور معلوم نہیں اس کا نتیجہ کیا نکلے، مگر سمپورنا نند جی کو یہ بھی گوارا نہیں کہ اردو کا معاملہ بھی قابل توجہ سمجھا جائے یا کوئی ایسا اقدام کیا جائے جس سے اردو کے پنپنے کا اندیشہ ہو۔ اس لیے انہوں نے حفظ ماتقدم کے طور پر پہلے ہی اس کے خلاف بیان دے دیا اور اردو بولنے والوں کے لسانی اقلیت ہونے سے بھی انکار اور اس سے اس صوبہ کے دولسانی ریاست بن جانے اور قومی وحدت میں رخنہ پیدا ہونے کے خطرہ کا اعلان کردیا۔ اس طرح انہوں نے اردو کو لسانی اقلیتوں کے حقوق سے بھی محروم کردیا اور گپتا حکومت کے خلاف اپنے ہم نواؤں کو بھی بھڑکا دیا اور کمیٹی کو بھی متنبہ کردیا کہ وہ اس معاملہ میں زیادہ قدم نہ بڑھائے۔

اس بیان کا سب سے دلچسپ ٹکڑا یہ ہے کہ "اردو کے ساتھ ان کی حکومت کی پالیسی مناسب تھی۔ اگر ماتحت عملہ کی جانب سے اس میں کچھ کوتاہی نہ ہوئی ہوتی تو اس کی تلافی کافی ہے"، یعنی انہوں نے اردو کے حق کی حد بھی مقرر کردی کہ اس سے آگے قدم نہ بڑھنے پائے۔ انہوں نے اپنے زمانہ میں اردو کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ سب کی نگاہ کے سامنے ہے۔ اس کے بعد یہ دعویٰ

چہ دلا وراست دزدے کہ بکف چراغ دارد

کی کتنی اچھی مثال ہے۔ بہرحال اس کمیٹی سے نہ زیادہ توقع رکھنی چاہیے اور نہ کامل مایوسی، بلکہ نتیجہ کا انتظار کرنا چاہیے۔ (معارف، اگست ۱۹۶۱ء)

مسلم یونیورسٹی اور حکومت ہند

مسلم یونیورسٹی پر حکومت ہند کے وزیر تعلیم ڈاکٹر شری مالی کی خاص نظر توجہ ہے۔ ان کا تازہ نمونہ ان کی وہ تقریر ہے، جو انہوں نے مسلم یونیورسٹی کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے مباحثہ میں

پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں کی ہے۔ یہ رپورٹ مجموعی حیثیت سے یونیورسٹی کی صفائی اور موافقت میں ہے۔ اسی کے ساتھ اس میں یونیورسٹی کی بعض انتظامی خامیوں کی اصلاح کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے، مگر شری مالی صاحب تو یونیورسٹی سے بھرے بیٹھے تھے۔ اس لیے رپورٹ کی موافقت پر تو ان کی نظر نہیں پڑی اور اس کی بعض اصلاحی سفارشوں کو آڑ بنا کر وہ یونیورسٹی پر برس پڑے۔ ان کو بحیثیت وزیر تعلیم کے یونیورسٹی کی اصلاح کے لیے خیر خواہانہ مشورہ دینے کا پورا حق ہے، لیکن اس کے لیے انہوں نے جو آمرانہ اور تادیبی لہجہ اختیار کیا ہے۔ وہ ان کے اور یونیورسٹی دونوں کے رتبہ سے فروتر ہے۔ وہ دھمکی سے اپنے احکام نہیں منوا سکتے۔ مسلم یونیورسٹی ایک بااختیار اور نہایت معزز ادارہ ہے، پرائمری اسکول نہیں ہے۔ شری مالی صاحب کا حاکمانہ لہجہ بتا رہا ہے کہ ان کو یونیورسٹی سے کوئی ایسی شکایت ہے جس کا وہ اظہار نہیں کر سکتے اور اس تقریر میں انہوں نے محض اپنے دل کا بخار نکالا ہے اور اپنے اقتدار کی بے محل نمایش کی ہے۔

اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ یونیورسٹی کی ملی خصوصیات اور تہذیبی روایات کو ختم کر کے اس کو خالص سیکولر بنا دیا جائے تو یہ محض ان کا خیال خام ہے۔ یونیورسٹی اس معنی میں ہمیشہ سے سیکولر رہی ہے کہ اس کے دروازے کسی مذہب و ملت کے لیے بند نہیں رہے اور آج بھی اس کے غیر مسلم اساتذہ اور طلبہ کی تعداد ایک تہائی سے کم نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہندو یونیورسٹی میں مشکل سے دو چار فیصدی مسلمان ملیں گے۔ اتنی سیکولرزم یونیورسٹی کے لیے کافی ہے لیکن اگر شری مالی صاحب اس کو غیر مسلم یونیورسٹی بنانا چاہتے ہیں تو ان کا یہ مقصد کبھی پورا نہ ہوگا۔ ان کو یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ مسلم یونیورسٹی انڈین یونین کی سیکولرزم کا ایک بڑا نشان اور اس کی آبرو ہے۔ چنانچہ اسلامی ملکوں کے جو سربراہ بھی آتے ہیں، ان کو مسلم یونیورسٹی ضرور دکھائی جاتی ہے۔ اس لیے مسلم یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد سے قطع نظر خود حکومت کے مصالح کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو اس کی تہذیبی خصوصیات اور روایات کے ساتھ قائم رکھا جائے، بلکہ اس کو اسلامی علوم و فنون اور اسلامی تہذیب و روایات کا مرکز بنایا جائے۔ اس لیے شری مالی صاحب کو بہت سوچ سمجھ کر مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ (معارف، ستمبر ۱۹۶۱ء)

قومی اتحاد اور یکجہتی کانفرنس اور مسلم یونیورسٹی

قومی اتحاد اور یکجہتی کی ضرورت و اہمیت اتنی مسلم ہے کہ اس کا احساس اب سے بہت پہلے

ہونا چاہیے تھا۔اب انتشار پسند رجحانات کا زہر اتنا پھیل چکا ہے کہ اس کا تدارک بہت دشوار ہے۔ یہ سارے رجحانات نتیجہ ہیں تنگ دلی، تنگ نظری، فرقہ پروری اور اقتدار کی ہوس کا، جس سے کوئی طبقہ حتی کہ کانگریس اور نظام حکومت بھی محفوظ نہیں۔فرقہ پروری کی مقبولیت کا حال یہ ہے کہ وہ عیب کے بجائے ہنر اور ہندوستانی قومیت ووطنیت کا نشان بن گئی ہے۔ جو شخص یا جو جماعت جس قدر فرقہ پرور اور اقلیت دشمن ہوگی، اسی قدر مقبول ہوگی۔اس لیے خود کانگریس اور حکومت بھی اس کا سہارا لینے پر مجبور ہوجاتے ہیں اور اس کے خلاف عملی اقدام کی جرأت نہیں کرسکتے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ خود ان دونوں میں فرقہ پرستوں کا اتنا غلبہ ہے کہ وہ کس کے خلاف اقدام کریں۔ایسی حالت میں قومی اتحاد و یکجہتی کی کیا امید ہوسکتی ہے۔اس کی صرف ایک ہی شکل ہے کہ پہلے خود کانگریس کو فرقہ پروروں سے پاک کیا جائے پھر اس کی پروا کیے بغیر کہ کانگریس آیندہ الیکشن میں جیتتی ہے یا ہارتی ہے۔اس کو حکومت کی کرسی ملتی ہے یا اس سے محروم رہتی ہے۔پوری ہمت و جرأت کے ساتھ اتحاد و یکجہتی کی مہم چلائی جائے اور فرقہ پروروں اور دوسرے انتشار پسند رجحانات کا پوری قوت سے مقابلہ کیا جائے اور اس کے لیے حکومت جو پالیسی بھی بنائے اس پر سختی سے عمل کیا جائے اور جو حکام اس میں غفلت سے کام لیں ان کو پوری سزا دی جائے۔اس کے بغیر قومی اتحاد و یکجہتی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

حکومت کی کمزوری کا حال یہ ہے کہ اس نے فرقہ پروروں کو پوری آزادی دے رکھی ہے۔ وہ جس طرح چاہیں اقلیتوں کی جان، مال اور عزت و آبرو سے کھیلیں، فرقہ پرست جماعتیں، ان کے لیڈر، ان کے اخبارات علانیہ فرقہ پروری کی آگ بھڑکاتے اور اقلیتوں کے جذبات مجروح کرتے رہتے ہیں اور حکومت خاموشی سے تماشہ دیکھتی رہتی ہے۔اگر اس کا عشر عشیر بھی اقلیتوں کی زبان سے نکل جائے تو ان کی جان کے لالے پڑ جائیں اور اقلیتوں کو دبانے اور ان کو پست و پامال کرنے کے لیے معمولی باتوں پر فتنہ و فساد برپا اور اقلیتوں کو تباہ و برباد کیا جاتا ہے۔اور حکومت اس کا کوئی تدارک نہیں کرسکتی، بلکہ الٹے مظلوموں ہی کو سزا بھگتنی پڑتی ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ فرقہ پرستوں کا زور اتنا بڑھ گیا ہے کہ خود حکومت کے لیے خطرہ بن گئے ہیں۔اب اگر وہ ان کا زور توڑنا بھی چاہے تو اس کا تخت و تاج خطرہ میں پڑ جائے گا۔اس لیے وہ بھی چشم پوشی یا زیادہ سے زیادہ وعظ و پند سے کام لیتی ہے۔لیکن آگے چل کر اس کے لیے اس کے سوا چارۂ کار نہ رہ جائے کہ یا وہ بھی علانیہ فرقہ پرور بن

جائے یا پھر فرقہ پروروں کا پورا مقابلہ کرے۔ اس کے بغیر کانگریس کی حکومت قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ انگریزوں کی پھوٹ ڈلوانے کی پالیسی کے باوجود ان کے دو سو سالہ دور حکومت میں فرقہ پروری کو اتنا فروغ نہیں ہوا جتنا آزادی کے بعد ۱۴ برسوں میں ہوا ہے اور اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں نے غلامی کے دور میں بھی اپنے کو اتنا بے بس اور مجبور محسوس نہیں کیا جتنا اب کررہے ہیں۔ ان پر جو کچھ گذر رہی ہے اس کو ہمارے بلند خیال اور آسمان سے باتیں کرنے والے لیڈر محسوس ہی نہیں کرسکتے۔

اس کا تازہ ثبوت مسلم یونیورسٹی کا ہنگامہ ہے۔ ابھی قومی اتحاد و یکجہتی کی کانفرنس کی تجویزوں کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ فرقہ پروروں نے طلبہ کے آپس کے ایک معمولی جھگڑے کو ہندو مسلم سوال بنا کر پورے صوبے میں آگ لگانے کی کوشش کی اور علی گڑھ اور اس کے آس پاس کے اضلاع میں مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی اور ان کو جانی و مالی حیثیت سے تباہ و برباد کیا گیا۔ اس قسم کے جھگڑے کس یونیورسٹی اور کالج میں نہیں ہوتے، یونین کے انتخابات کے موقع پر ہندو ہندو اور مسلم مسلم طلبہ آپس میں لڑ جاتے ہیں، خود مسلم یونیورسٹی میں ہر سال انتخاب کے موقع پر مسلمان طلبہ میں اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ اس سال ہندو مسلم طلبہ میں جھگڑا ہوگیا جس میں دونوں فریق کے چند لڑکوں کو معمولی چوٹیں آئیں۔ اس کی تحقیقات اور مجرموں کو سزا دینا یونیورسٹی کے ذمہ داروں کا کام تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ فریقین ہندو اور مسلمان تھے۔ ورنہ صرف مسلمان طلبہ کے لیے اس کی بھی ضرورت نہ تھی۔ یہ تو ہر سال ہوتا ہی رہتا ہے۔ اس میں باہر کے لوگوں کو مداخلت کا قطعاً کوئی حق نہ تھا، مگر فرقہ پروروں نے جو بہانہ کی تلاش ہی میں رہتے ہیں۔ رائی کا پہاڑ بنا کر کشت و خون کا ایک ہنگامہ برپا کردیا اور افسوس یہ ہے کہ مرکزی حکومت کے بعض وزراء نے بھی اس کے متعلق غیر محتاط بیانات دیے ہیں، جو ان کے لیے کسی طرح زیبا نہ تھا۔ بعض بیانات تو ایک طرح کی دھمکی کہے جاسکتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا اتنا بڑا ادارہ عرصہ سے فرقہ پرستوں کی نگاہ میں کھٹک رہا ہے اور اس کے خلاف وقتاً فوقتاً آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں اور اس کو گرفت میں لا کر اس کی خصوصیات کو مٹانے کے لیے بہانہ کی تلاش رہتی ہے۔ یہ ہنگامہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، مسلمان تو

بالکل بے بس و مجبور ہیں۔اس لیےنہیں کہا جاسکتا کہ مسلم یونیورسٹی کا حشر کیا ہوگا، اگر مسلمانوں میں قومی غیرت وحمیت اور مسلمان وزراء اور ممبران پارلیمنٹ میں جرأت ہوتی اور وہ یونیورسٹی کی حمایت میں آواز بلند کرتے تو اس کو نقصان پہنچانا آسان نہیں تھا، مگر ان کو تو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ایسی حالت میں یونیورسٹی لاوارث کا مال ہے، جو چاہے تصرف میں لائے۔ پارلیمنٹ کے ممبروں میں لے دے کر ایک مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ایسے ہیں، جو مسلمانوں پر ظلم وزیادتی کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے ہیں، مگر نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔وہ بھی جمعیۃ العلماء کے ناظم کی حیثیت سے، ورنہ پارلیمنٹ کے مسلمان ممبروں میں یہ جرأت کہاں۔

ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور پھر لکھتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی حکومت کی سیکولرزم کا سب سے بڑا نشان ہے۔اگر اس کو کوئی نقصان پہنچا تو ساری دنیائے اسلام میں حکومت کی سیکولرزم کا بھرم کھل جائے گا۔ایسے موقع پر بے اختیار مولانا ابوالکلامؒ کی یاد آجاتی ہے۔ان کا وقار اتنا تھا کہ ان کی موجودگی میں کسی کو یونیورسٹی کو نقصان پہنچانے کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی۔(معارف، اکتوبر ۱۹۶۱ء)

ہندوستانی قومیت اور مسلمان

فرقہ پرور جماعتیں بڑی شدومد سے مسلمانوں پر یہ الزام دہراتی رہتی ہیں کہ وہ (۱) اپنے کو ہندوستانی قومیت سے الگ تصور کرتے ہیں۔(۲) ہندوستان کو اپنا ملک و وطن نہیں سمجھتے، اس لیے اس کے وفادار نہیں۔(۳) ان کی نگاہ ہمیشہ عرب اور دوسرے اسلامی ملکوں پر لگی رہتی ہے اور ہندوستان کے مقابلہ میں پاکستان کے زیادہ ہمدرد وہوا خواہ ہیں۔(۴) ہندوستان کی قدیم تاریخی اور عظیم شخصیتوں کو اپنا ہیرو نہیں مانتے اور ہندی الاصل مسلمان بھی اپنے کو ہندو اجداد کی طرف منسوب نہیں کرتے، اس لیے ہندوستان سے ان کو دلی لگاؤ نہیں پیدا ہوتا۔(۵) وہ صدیوں سے ہندوستان میں رہتے ہیں لیکن ہندو تہذیب سے بیگانہ رہے۔اس قسم کے اور الزام بھی ہیں لیکن بنیادی حیثیت انھی الزاموں کی ہے۔ باقی ان کی شاخیں ہیں، مگر یہ سارے الزام یا غلط ہیں یا مغالطوں کا مجموعہ ہیں اور ان سے مقصود صرف مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا ہے۔اس لیے خود الزام لگانے والوں نے کبھی ان کی صحت وصداقت پر غور نہیں کیا۔بس ان کو برابر دہراتے چلے جاتے ہیں۔ان پر تفصیلی بحث بہت طویل ہوگی جس کی اس مختصر تبصرہ میں گنجائش نہیں ہے۔اس لیے سردست ان کا صرف سرسری جائزہ لیا جاتا ہے۔

(۱) قومیت کے بہت سے اجزاء وعناصر ہیں، جن سے مل کر قومیت بنتی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ ان اجزاء کے لحاظ سے ہندوستان کے مختلف مذاہب، طبقات اور خطوں میں اس قدر نسلی، مذہبی، لسانی اور کلچرل اختلافات ہیں کہ ہندوستان میں کبھی کامل اور پختہ قومیت کا وجود نہیں رہا، بلکہ وہ مختلف قوموں کا مجموعہ ہے، جن کے عقائد، تصورات، زبان اور تہذیب ومعاشرت جدا جدا ہے۔ ان کو صرف وطنی قومیت کا اشتراک ایک رشتے میں پروتا ہے۔ اس لحاظ سے مسلمان بھی اپنے کو ہندوستانی قوم مانتے ہیں اور دنیا بھی ان کو ہندوستانی سمجھتی ہے۔ لیکن جن لوگوں کو اس کا یقین نہیں ہے ان کو خود اپنے دلوں کو ٹٹولنا چاہیے کہ ان کا سلوک مسلمانوں کے ساتھ کیسا ہے۔ وہ کہاں تک ان کو اپنی قوم سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ یگانگت کے بجائے اجنبیت اور بیگانگی کا برتاؤ کیوں ہے۔ بدھ، جین، سکھ، سناتن دھرمی بلکہ اچھوت تک کو جن میں عقائد وتصورات کے بنیادی اختلافات ہیں، ایک قوم سمجھا جائے۔ ان سے یگانگت کا برتاؤ کیا جائے اور مسلمانوں کو اجنبی اور ملیچھ سمجھ کر زندگی کے ہر شعبہ سے نکالا جائے اور ہر حق سے محروم رکھا جائے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن اس کی ناقابل تردید شہادت ہے۔ اس لیے اعتراض کرنے والوں کو خود اپنے گریباں میں منھ ڈال کر سوچنا چاہیے۔

(۲) یہ اعتراض اتنا طفلانہ ہے کہ اس کو سن کر ہنسی آتی ہے۔ یہ موٹی سی بات ہے کہ جس ملک میں مسلمان صدیوں سے آباد ہیں، جس کو انہوں نے اپنے خون جگر سے سینچا ہے، جہاں ان کے آباء واجداد کی ہڈیاں دفن ہیں، جہاں ان کے علماء ومشائخ اور بڑے بڑے اکابر کے مزارات ہیں، جہاں ان کے علمی، تعلیمی اور تہذیبی مرکز ہیں، جس کے چپہ چپہ سے ان کی تاریخ وابستہ ہے۔ اگر اس کو اپنا وہ وطن نہیں سمجھتے تو پھر کس ملک کو سمجھیں گے۔ جن مسلمانوں کو پاکستان جانا تھا وہ جا چکے، جو آئندہ جانا چاہیں گے، وہ چلے جائیں گے لیکن پورے پانچ کروڑ نہ ہندوستان چھوڑ سکتے ہیں اور نہ کوئی ملک ان کو جگہ دے سکتا ہے۔ ان کو یہیں جینا اور مرنا ہے۔ اس لیے ہندوستانی مسلمان تو ہندوستان کو اپنا وطن سمجھنے پر مجبور ہیں اور وطن سمجھنے کے بعد کوئی ایسا ہی بدبخت مسلمان ہوگا جو ہندوستان کے ساتھ بے وفائی کرے، جس کی مستثنیٰ مثالوں سے ہندو بھی خالی نہیں ہیں۔ البتہ مسلمان ہندوستان کو وطن سمجھتا ہے، بت بنا کر اس کی پرستش نہیں کر سکتا اور اب تو وطن پرستی کے نتائج دیکھ کر بہت سے عقلاء و

مفکرین اس کی مخالفت کر رہے ہیں۔

(۳) یہ اعتراض مغالطوں کا مجموعہ ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے تمام پیروؤں کو اسلامی اخوت کے رشتے میں منسلک کر دیا ہے اور اس گئی گذری حالت میں بھی مسلمانوں میں اسلامی اخوت کا جو احساس ہے وہ کسی قوم میں نہیں۔ اس لیے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے مسلمان ایک دوسرے سے برادرانہ تعلق اور ہمدردی رکھتے ہیں، گو اب مسلمانوں کی نقل میں یا سیاسی مصالح کی بنا پر مذہبی اشتراک کے رشتہ کا احساس کسی نہ کسی حد تک تمام قوموں میں پیدا ہو گیا ہے۔ یورپ میں اگرچہ برائے نام مذہب رہ گیا ہے۔ اس کے باوجود اس کو پوری عیسائی دنیا سے تعلق و ہمدردی ہے۔ اگر ایشیا یا افریقہ کے عیسائیوں پر کوئی مشکل وقت آتا ہے تو سارا یورپ اس کی امداد کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ان کی جا و بے جا حمایت میں جنگ و خوں ریزی سے بھی دریغ نہیں کرتا اور اب تو ہندو بھی اس جذبہ سے خالی نہیں ہیں۔ چنانچہ انھی نے ہندوستان سے بدھوں کا خاتمہ کیا۔ اس کے باوجود آزادی کے بعد محض اس رشتہ کی بنا پر کہ گوتم بدھ ہندوستان کے فرزند تھے۔ بدھسٹ ملکوں سے تعلقات بڑھانے کی بڑی کوششیں ہوئیں حتی کہ چینی ہندی بھائی بھائی کے نعرے بھی لگے، مگر چین کی جارحیت نے اس برادرانہ نعرہ کا خاتمہ کر دیا اور اب تو نسلی، قومی اور وطنی حد بندیوں کی خرابیوں کو دیکھ کر بڑے بڑے مفکرین بین الاقوامی برادری کے قیام پر سوچنے کے لیے مجبور ہو گئے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر مسلمانوں کو اسلامی ملکوں سے برادرانہ تعلق ہے تو کیوں قابل اعتراض ہے۔

عرب ان کے دین کا سرچشمہ ہے۔ ان کو دین و دنیا کی دولت یہیں سے ملی۔ وہاں ان کے مقدس مقامات ہیں۔ ان سے اسلام کی تاریخ وابستہ ہے۔ اس لیے اس سے ان کا تعلق بالکل فطری ہے، جس سے دنیا کی کوئی مذہبی قوم بھی خالی نہیں۔ آج بھی پوری یہودی اور عیسائی دنیا، خصوصاً رومن کیتھولک کو بیت المقدس سے عقیدت مندانہ تعلق ہے۔ خود ہندوؤں سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا وہ دنیا کے دوسرے خطوں میں رہ کر ہندوستان کے مقدس مقامات کو فراموش کر سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو عرب سے مسلمانوں کی عقیدت پر کیوں اعتراض ہے۔ اصل میں ان کی دنیا ہندوستان کی چار دیواری کے اندر محدود رہی۔ اس لیے ان میں بین الاقوامیت اور عالم گیر برادری کا تصور مشکل سے پیدا ہو گا۔

پاکستان سے مسلمانوں کا تعلق ایک تو اسلامی اخوت کے رشتہ سے ہے، دوسرے وہ ہندوستان ہی کا کٹا ہوا عضو ہے، وہاں ہندوستانی مسلمانوں کے ہزاروں خاندان، سینکڑوں اعزہ و اقرباء بلکہ ماں، باپ، بیٹے، بیٹی، بھائی، بہن آباد ہیں۔ ان کو وہ کس طرح فراموش کر سکتے ہیں۔ اس لیے پاکستان سے ان کا خصوصی تعلق بالکل فطری ہے، مگر چند پشتوں کے بعد یہ کیفیت نہ رہ جائے گی اور صرف اسی قدر تعلق رہ جائے گا جتنا دوسرے اسلامی ملکوں سے ہے مگر عرب، پاکستان اور دوسرے اسلامی ملکوں سے تعلق کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتے یا اس سے ان کو قلبی لگاؤ نہیں ہے یا اس پر اسلامی ملکوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ محبت و تعلق کی نوعیتیں جدا جدا ہوتی ہیں۔ ایک انسان کو ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچوں، اعزہ و اقرباء اور دوست احباب سب سے محبت اور تعلق ہوتا ہے اور ایک کی محبت دوسرے کی محبت میں حائل نہیں ہوتی۔ ایک سے محبت و تعلق کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ پھر کسی دوسرے سے تعلق نہ رکھا جائے۔

(۴) چوتھے اعتراض کا بڑا مفصل و مدلل جواب مولانا سید ابوالحسن علی صاحب دے چکے ہیں۔ اس کے بعد کسی جواب کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں صرف یہ کہنا ہے کہ کسی ملک و قوم کی عظیم شخصیتوں کو ہیرو ماننے سے یہ نہیں لازم آتا کہ اس ملک و قوم کے ساتھ لگاؤ اور یگانگت بھی پیدا ہو جائے۔ اسلام، یہودیت اور عیسائیت تینوں دین ابراہیمی کی شاخیں ہیں اور ان میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ مسلمان حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو خدا کا برگزیدہ پیغمبر اور توریت و انجیل کو الہامی کتاب مانتے ہیں اور جو مسلمان نہیں مانتا وہ مسلمان نہیں۔ اس کے باوجود ان میں اتحاد نہ ہو سکا اور صدیوں سے جو عداوت چلی آرہی ہے وہ آج بھی قائم ہے اور سیاسی مصالح کے علاوہ کسی کے دل سے کبھی نہ مٹے گی۔ یہی حال اس اعتراض کے دوسرے جز یعنی ہندو اجداد سے نسبت کا ہے۔ اس کے اعتراف سے بھی قومی وحدت و یگانگت کا پیدا ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ پاکستان کے تخیل کے موجد اقبال اور اس کے بانی مسٹر جناح دونوں ہندو نسل سے تھے، یعنی مادر ہند کی تقسیم ہندی الاصل مسلمانوں ہی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اور عربی نژاد مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ اور مولانا ابوالکلام مکی (ان کے قول کے مطابق ان کی پیدائش مکہ معظّمہ میں ہوئی تھی اور ان کی ماں عرب تھیں) آخر تک ملک و وطن کے وفادار رہے۔

(۵) ہندو تہذیب قبول کرنے کا مطالبہ بہت مجمل ہے۔ معلوم نہیں اس سے کہنے والوں کی کیا مراد ہے۔ تہذیب ایک وسیع اصطلاح ہے، جس میں زندگی کے بہت سے شعبے داخل ہیں۔ اور تہذیب کے مختلف پہلو اور مختلف رخ ہوتے ہیں، جن میں سے بعض کا تعلق مذہبی اثرات اور ملی روایات سے ہوتا ہے۔ اسی لیے ہر قوم کی تہذیب کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے، جو اس کو دوسری تہذیبوں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس لیے کوئی قوم بھی دوسری قوموں کے ان تہذیبی اثرات کو قبول نہیں کر سکتی، جو اس کے مزاج کو بدل دیں اور اس کی امتیازی حیثیت ختم کر دیں۔ اس کو وہ قومیں نہیں سمجھ سکتیں جو مذہب سے بالکل آزاد ہیں یا جن کے مثبت و منفی مذہبی عقائد نہیں ہیں لیکن تہذیب کے ایسے پہلو بھی ہیں جن کو مذہب سے زیادہ علاقہ نہیں ہوتا، مثلاً معاشرت میں طرز تعمیر، مکانوں کی زیب و زینت، ساز و سامان، رہنے سہنے کے طریقے، لباس، ملنے جلنے کے آداب وغیرہ گو اسلام میں ان کے بارہ میں بھی مفصل ہدایات ہیں لیکن ان کو مذہب سے کوئی بنیادی تعلق نہیں ہے۔ بس اتنا کافی ہے کہ شریعت کی حلال و حرام سے ان کا تصادم نہ ہو۔

تہذیب کے معاملہ میں مسلمان اتنے وسیع المشرب اور فراخ دل ہیں اور انہوں نے دوسری قوموں کے اتنے تہذیبی اثرات قبول کیے جس کی مثال دوسری قوموں میں نہیں مل سکتی۔ اس لیے کہ ان کا واسطہ بہت سی قوموں سے رہا۔ وہ جس ملک میں گئے اس کی اور اپنی تہذیب کو ملا کر ایک نئی تہذیب پیدا کر دی۔ اس لیے اسلامی ملکوں میں جو تہذیبی رنگا رنگی نظر آتی ہے وہ کسی دوسرے ملک میں نہ ملے گی۔ اس اصول کے مطابق انہوں نے ہندو تہذیب کے اثرات بھی بڑی فراخ دلی سے قبول کیے۔ اور اس میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ شرعی ممنوعات کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ چنانچہ ان کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی ہندو تہذیب کے اثر سے خالی نہیں ہے۔ ان کی موت و زندگی اور شادی و غمی کی بیشتر تقریبات و مراسم ہندوانہ ہیں اور ہندی مسلمانوں کی تہذیب نام ہی ہے ہندو اور مسلمانوں کی ملی جلی تہذیب کا جو ہندوستان کے علاوہ اور کسی اسلامی ملک میں نہ ملے گی۔

پھر اعتراض کرنے والوں کو تہذیبوں کی پیدائش اور اس کے رد و قبول میں، اس کے طبعی اصولوں کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ تہذیبیں مصنوعی طریقے سے پیدا نہیں کی جاتیں اور نہ زبردستی مسلط کی جاتی ہیں، بلکہ طبعی اصولوں پر بنتی اور بگڑتی ہیں، جب دو تہذیبوں میں اختلاط ہوگا تو وہ فطری

طور پر ایک دوسرے سے متاثر ہوں گی، جس سے ایک نئی مشترک تہذیب وجود میں آئے گی، دوسرے کسی تہذیب کے قبول کرنے میں اس کے معاشرتی فوائد۔ اس کی ظاہری نفاست ودلکشی کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ اعلیٰ اور بلند تہذیبوں کا اثر خودبخود دوسری قومیں قبول کر لیتی ہیں۔ مسلمانوں نے ایران کو فتح کرلیا لیکن اس کی تہذیب سے خود مفتوح ہوگئے۔ چنانچہ آج جو اسلامی تہذیب کہلاتی ہے اس میں سب سے زیادہ عناصر ایرانی تہذیب کے ہیں۔ انگریزوں نے اپنی تہذیب کسی قوم پر زبردستی مسلط نہیں کی بلکہ وہ مادی حیثیت سے اس قدر دلفریب اور جاذب نظر تھی کہ نہ صرف ان کی محکوم بلکہ آزاد قوموں نے بھی اس کو قبول کرلیا۔ اس لیے یہ بھی قابل غور ہے کہ مسلمانوں نے ہندو تہذیب کے جو پہلو قبول نہیں کیے اس میں ان کا قصور ہے یا خود اس تہذیب کا۔

ع ہم کو کیا ضد تھی اگر وہ کسی قابل ہوتی

یہ معترضین کے اعتراضات کا اجمالی جواب تھا۔ اس کا تفصیلی جواب اسی وقت دیا جاسکتا ہے، جب اس تہذیب کے حدود اربعہ معلوم ہوں جس کے قبول کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ یہ تو محض ایک علمی ونظری بحث تھی۔ اصل یہ ہے کہ اپنائیت اور یگانگت، ایک نفسی اور قلبی کیفیت ہے جس کو نہ مول تول سے خریدا جاسکتا ہے اور نہ زبردستی پیدا کیا جاسکتا ہے، بلکہ ''ہرچہ از دل خیزد، بر دل ریزد'' کے اصول پر اخلاص اور حسن سلوک خود اپنا بنالیتا ہے۔ یہ اصول افراد کے لیے بھی ہے اور اقوام کے لیے بھی، جس کے ساتھ بھی اپنا سمجھ کر اخلاص و یگانگت کا برتاؤ کیا جائے گا۔ وہ اپنا ہو جائے گا۔ اس لیے

مہرباں ہو کے بلالو مجھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

یہ زریں اصول سب سے بڑا معیار ہے۔ فرقہ پرستوں کو اسی اصول پر اپنے طرز عمل کو پرکھنا چاہیے اور یہی معیار مسلمانوں کے لیے بھی ہے، مگر ملک کی اکثریت پر اس کی ذمہ داری زیادہ عائد ہوتی ہے۔ (معارف، نومبر ۱۹۶۱ء)

مسلم یونیورسٹی، حکومت اور فرقہ پرست عناصر

گذشتہ فسادات سے مسلم یونیورسٹی کے متعلق جو خطرات پیدا ہوگئے تھے وہ سردست ٹل گئے ہیں اور ان کا فوری کوئی اندیشہ نہیں ہے، لیکن یونیورسٹی کے خلاف فرقہ پروری کا جو سیلاب امنڈا

ہے اور مسلمانوں کے ہر معاملہ میں وحدت و یکرنگی کا جو مطالبہ کیا جاتا ہے۔ آیندہ چل کر اس سے مسلم یونیورسٹی کا بچنا دشوار ہے، مگر اس کا پورا یقین ہے کہ نہ یونیورسٹی کا نام بدلا جائے اور نہ حکومت اس کو اپنے انتظام میں لے گی۔ اس کی ظاہری شکل اسی طرح قائم رہے گی، لیکن ایسی صورتیں اختیار کی جائیں گی کہ اس کی روح اور اس کی خصوصیات ختم ہوجائیں۔ ۱۹۴۷ء سے اس وقت تک یونیورسٹی بہت کچھ بدل چکی ہے، جو کسر باقی رہ گئی ہے وہ آیندہ پوری ہوجائے گی۔ اگر مسلمانوں میں سکت اور ان کے نمایندوں میں قومی و ملی غیرت وحمیت ہوتی تو کوئی طاقت یونیورسٹی کو بدلنے کی ہمت نہیں کرسکتی تھی، مگر اس کی تلاش عبث ہے اور اس کا قوی اندیشہ ہے کہ ذاتی اغراض کے بندے اور جاہ و اقتدار کے بھوکے مسلمان خود یونیورسٹی کے محضر پر دستخط کریں گے اور وفاداری کی یہ سند لے جاکر حکومت کے حضور میں پیش کریں گے۔ قوموں کی غلامی اور زوال کے دور میں ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے، اس لیے اگر یونیورسٹی کے ساتھ یہ معاملہ پیش آئے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی۔

دوسرے حکومت وقت کی وفاداری اور رضا جوئی مسلم یونیورسٹی کی پرانی روایت ہے۔ اس لیے اگر وہ اس کو دہرائے تو کوئی نئی بات نہ ہوگی مگر دلالت زمانہ کے اعتبار سے پرانے اور نئے وفاداروں میں یہ فرق ہوگیا ہے کہ پرانے وفاداروں میں حکومت کی رضا جوئی کے باوجود ان کی قومی و ملی غیرت وحمیت مردہ نہ ہوئی تھی اور ان کی وفاداری اور حکومت پرستی بھی ذاتی جاہ و اقتدار کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں کے مفاد کے لیے تھی۔ سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کی دنیاوی فلاح کے لیے علی گڑھ کالج قائم کیا تھا۔ خود کوئی ذاتی فائدہ کبھی نہیں اٹھایا، بلکہ کالج کے لیے اپنا سارا خانماں اور ننگ و ناموس تک لٹادیا۔ عمر بھر مسلمانوں کی سختیاں جھیلتے رہے، مگر ان کی غم خواری سے دست کش نہ ہوئے اور ان کی مذہبی غلطیوں کے باوجود اسلام کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ اس حیثیت سے اس زمانہ کے وفادار مسلمانوں کے مقابلہ میں وہ ولی نظر آتے ہیں اور یہ ان کے اخلاص وحسن نیت کا نتیجہ ہے کہ گو علی گڑھ کالج کی بنیاد مسلمانوں کی دنیاوی ترقی کے لیے رکھی گئی تھی، مگر اس درس گاہ سے دین و ملت کے کیسے کیسے مجاہد اور ملک و وطن کے کیسے کیسے جاں باز پیدا ہوئے اور اب یونیورسٹی جس رنگ پر جارہی ہے، اس سے قطعاً اس کی توقع نہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے بارہ میں فرقہ پروروں کے جو منصوبے بھی ہوں لیکن حکومت کے مفاد و

مصالح کا تقاضا یہی ہے کہ اس کو اس کی روح اور خصوصیات کے ساتھ قائم رکھا جائے، بلکہ اس کو اور زیادہ ترقی دی جائے۔ مسلم یونیورسٹی حکومت کی سیکولرزم کا بہت بڑا نشان ہے۔ اس سے دنیائے اسلام میں اس کی نیک نامی ہے۔ اس کو بدل کر اپنے دامن پر بدنامی کا داغ لگانا ہوش مندی کے خلاف ہے۔ اس کی روح ختم کر کے اس کا ظاہری ٹھاٹھ قائم رکھنا کچھ مفید نہ ہوگا۔ حقیقت بہرحال ظاہر ہوکر رہتی ہے۔ یونیورسٹی کے دروازے کسی فرقہ کے لیے بند نہیں ہیں، لیکن اس کی ہر چیز میں اسلامی رنگ اور اس کی تہذیب و روایات کا غلبہ رہنا چاہیے اور اس کا نظام ایسے مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے جو اپنی قوم کے صحیح نمایندے اور اس کے معتمد علیہ ہوں، نام نہاد اصحاب غرض مسلمانوں کے مقابلہ میں تو مسلمانوں کی تہذیب و روایات سے واقف ایماندار اور منصف مزاج ہندو کہیں بہتر ہیں۔ وہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر اور ان کے مفاد کا زیادہ خیال رکھیں گے۔ ایسے ہندوؤں کی آج بھی کمی نہیں۔ ہم کو حکومت کی عاقبت اندیشی سے یہی توقع ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں اپنی شہرت کو خراب نہ کرے گی لیکن اگر فرقہ پرستوں کے دباؤ میں آ کر اس کو بدلنا چاہے تو اس سے بہتر یہ ہے کہ مسلمان خود یونیورسٹی حکومت کے حوالے کر دیں۔ وہ جس طرح چاہے اس کو چلائے۔ اس کی خصوصیات مٹا کر محض نام باقی رکھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس سے مسلمان طلبہ کی تعلیم تو رک نہیں سکتی خود اس یونیورسٹی کا دروازہ مسلمانوں کے لیے بند نہ ہوگا اور دوسری یونیورسٹیوں کے دروازے بھی ان کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔

آخر سیکولرزم کا سارا زور مسلم یونیورسٹی کے لیے اور وحدت و یکرنگی کا سارا مطالبہ مسلمانوں ہی سے کیوں ہے۔ ہندو یونیورسٹی کا تو ذکر ہی نہیں۔ اس میں مسلمانوں کا گذر کہاں۔ ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں میں جو کسی فرقہ کی جانب منسوب نہیں ہیں اور سیکولر کہی جاتی ہیں۔ کتنے اساتذہ اور عہدے دار مسلمان ہیں، ان کی انتظامی مجالس کے مسلمان ممبروں کی تعداد کتنی ہے۔ ڈاکٹری، انجینئرنگ، پالیٹکنک اور سائنس کے دوسرے شعبوں میں کتنے مسلمان طلبہ لیے جاتے ہیں۔ عربی، فارسی، اردو اور اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں کو چھوڑ کر کسی شعبہ میں شاید ہی کوئی مسلمان پروفیسر نظر آئے، یہی حال انتظامی شعبوں کا ہے۔

مسلم یونیورسٹی یونین کے انتخاب میں ایک سال ہندو طلبہ کے نہ آنے پر اتنا بڑا ہنگامہ ہوگیا

اور وائس چانسلر صاحب کو مجبور ہو کر چند ہندو طلبہ کو نامزد کرنا پڑا لیکن ہندوستان کی دوسری یونیورسٹیوں بلکہ کالجوں تک کی یونین میں کتنے مسلمان طلبہ عہدے دار ہیں۔اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی یونین میں ہندو طلبہ کا حق نہیں ہے،ان کے وہی حقوق ہیں جو مسلمان طلبہ کے ہیں۔سوال صرف یہ ہے کہ یہی حقوق دوسری یونیورسٹیوں میں مسلمان طلبہ کو کیوں حاصل نہیں ہیں اور اگر وہ انتخاب میں نہیں آتے تو ان کے وائس چانسلر مسلمان طلبہ کو کیوں نامزد نہیں کرتے۔ہندوستان میں ۳۹ یونیورسٹیاں عملاً اکثریت کی ہیں۔ان میں انہی کا غلبہ واقتدار ہے،مسلمان برائے نام ہیں۔ایسی حالت میں کیا پانچ کرور مسلمانوں کو ایک ایسی یونیورسٹی کا بھی حق حاصل نہیں ہے جس کو وہ اپنے منشا کے مطابق چلا سکیں۔ایک یونیورسٹی کا کیا ذکر ہے،حکومت کے تمام شعبوں میں مسلمانوں کی حق تلفی اور بے بسی کا یہی حال ہے۔یہ حاکمانہ ذہنیت،یہ احساس برتری،یہ اقتدار کا گھمنڈ تو صاحب بہادروں کی حکومت میں بھی نہیں تھا اور اس کا نام ہے سیکولرزم اور جمہوریت! حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں اصطلاحوں کی مٹی جیسی ہندوستان میں پلید ہوئی ہے شاید ہی کسی ملک میں اس کی مثال مل سکے۔(معارف،دسمبر ۱۹۶۱ء)

ندوۃ العلماء کی ترقی

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے خدمات اہل ملک کے سامنے ہیں۔اس زمانہ میں بھی جب کہ عربی کے اکثر مدارس کی زندگی دشوار ہو رہی ہے۔الحمدللہ وہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت،ان کے اخلاص اور للّٰہیت نے اس کو جس درجہ تک پہنچا دیا ہے۔اس کی مثال اس کی گذشتہ تاریخ میں نہیں ملتی۔وہ تعلیمی،علمی اور تعمیرات ہر حیثیت سے روزافزوں ترقی پر ہے اور نہ صرف ہندوستان بلکہ اسلامی دنیا کا ایک ممتاز تعلیمی مرکز بن گیا ہے۔اس وقت ندوہ میں مختلف اسلامی ملکوں کے طلبہ زیر تعلیم ہیں۔اس وسعت وترقی کے ساتھ قدرتی طور پر اس کے مصارف میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔غیر معمولی گرانی نے بھی مصارف بڑھا دیے ہیں۔اس لیے اس کی موجودہ آمدنی اس کے مصارف کے لیے بالکل ناکافی ہے۔اقامتی طلبہ کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان کے لیے ایک نئے دارالاقامہ کی شدید ضرورت تھی۔اس کی ایک وسیع وشاندار دومنزلہ عمارت تعمیر ہو رہی ہے،جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے دور معتمدی ونظامت کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔بعض اور ضروری تعمیرات بھی زیر تجویز ہیں۔ان کی تکمیل کے لیے بڑے سرمائے کی ضرورت ہے۔ان خدمات کے مقابلہ میں

مسلمانوں کے بھی کچھ فرائض ہیں۔ ندوہ کے کارکن تو پورے اخلاص اور مستعدی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کررہے ہیں۔ اب مالی فرض ادا کرنا مسلمانوں کا کام ہے۔ رمضان المبارک کا خیر و برکت کا مہینہ قریب ہے۔ ہم کو توقع ہے کہ صاحب ثروت مسلمان خصوصاً بڑے تاجر اس موقع پر دارالعلوم ندوۃ العلماء کو فراموش نہ کریں گے، جہاں اس کے سفراء نہ پہنچ سکیں وہاں کے اصحاب خیر امدادی رقم ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے نام بھیج سکتے ہیں۔ (معارف، جنوری ۱۹۶۳ء)

جامعہ ملیہ میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کی تجویز

آج سے دو سال پیشتر جب جامعہ ملیہ کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کا بل پارلیمنٹ میں پیش ہونے والا تھا۔ ہم نے اس کے بارہ میں اپنے خیالات ظاہر کیے تھے اور لکھا تھا کہ ''جامعہ کے خدمات کا سب سے بڑا صلہ اور اس کی سب سے زیادہ قدردانی یہ ہے کہ اس کو اردو یونیورسٹی بنا دیا جائے۔ اس سے کسی نہ کسی حد تک اس کی خصوصیات قائم رہیں گی۔ اردو والوں کی اشک شوئی بھی ہوجائے گی۔ جامعہ عثمانیہ کا خوں بہا بھی ادا ہوجائے گا اور حکومت کی رواداری اور اس کی سیکولرزم کا بھی یہ ایک بڑا نشان ہوگا''۔ (معارف، فروری ۱۹۶۱ء)

جس وقت یہ تجویز پیش کی گئی تھی۔ اس وقت اس کے عمل میں آنے کا مشکل سے تصور کیا جاسکتا تھا، مگر اب ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے کہ یہ تجویز عملی شکل اختیار کرسکتی ہے۔ جامعہ کو یونیورسٹی بنانے کا مسئلہ طے ہوچکا ہے اور جلد ہی اس پر عمل شروع ہوجائے گا۔ مرکزی وزارت تعلیم صوبائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کی حمایت میں ہے اور یہ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اگر جامعہ میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے تو حکومت اس کی بھی حمایت کرے گی۔ ہندوستان کی سرکاری درس گاہوں سے اردو قریب قریب ختم ہوچکی ہے اور جہاں اس کا وجود باقی ہے، کچھ شعبۂ تعلیم کی بے مہری اور کچھ خود اردو والوں کی غفلت سے برائے نام ہی ہے اور بظاہر ان تعلیم گاہوں میں اردو کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ ایسی حالت میں ہندوستان میں اردو کی یونیورسٹی کے قیام کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، مگر حسن اتفاق سے ایک ایسی صورت پیدا ہوگئی ہے کہ اگر اس سے فائدہ اٹھایا جائے تو اردو یونیورسٹی کا خواب پورا ہوسکتا ہے۔

مرحوم جامعہ عثمانیہ اس راہ کی دشواریاں دور کرکے اس کا عملی نمونہ قائم کرچکی ہے۔ اس کا

متروکہ علمی و تعلیمی ذخیرہ بہت کچھ جامعہ کے کام آسکتا ہے اور ضرورت کے مطابق اس میں نیا اضافہ بھی ہوسکتا ہے اور اب جامعہ کے پاس ایسے مالی ذرائع بھی ہوگئے ہیں کہ وہ اس کام کو آسانی سے انجام دے سکتی ہے۔اس کے پاس ماہرین تعلیم کی کمی نہیں، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کو اگرچہ اب جامعہ سے کوئی ضابطہ کا تعلق نہیں رہ گیا ہے لیکن اس سے ان کی روحانی اور اخلاقی وابستگی ناقابل انقطاع ہے۔شیخ الجامعہ مجیب صاحب اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب بھی تعلیم و ترجمہ کے ماہر ہیں۔ان کے علاوہ بھی جامعہ میں ماہرین تعلیم کی ایک جماعت موجود ہے۔اس لیے خود اہل جامعہ اردو یونیورسٹی کا خاکہ بنا کر اس کو چلانے کے لیے کافی ہیں اور اگر ضرورت ہو تو جامعہ عثمانیہ، اس کے دارالترجمہ کے باقیات صالحات اور مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ سے بھی مدد لی جاسکتی ہے۔آدمیوں کی کمی نہیں ہے، صرف ہمت و عزیمت کی ضرورت ہے۔

حیدرآباد کے اردو دوستوں نے بے سروسامانی کے باوجود ایک اردو کالج قائم کرلیا جس کو جامعہ عثمانیہ نے بھی تسلیم کرلیا ہے۔ایسی حالت میں جامعہ کو جسے حکومت کی امداد و سرپرستی کی وجہ سے ہر قسم کی سہولتیں حاصل ہیں اور اردو کے ذریعہ تعلیم بنانے پر حکومت کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔اردو یونیورسٹی بنا دینا دشوار نہیں ہے۔اگر یہ کام انجام پا جائے تو یہ جامعہ کے کارکنوں کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا اور ان کا نام اردو کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا اور جس طرح آج جامعہ آزاد قومی تعلیم کی ایک اہم یادگار ہے۔اسی طرح وہ اردو کی اعلیٰ تعلیم کی ایک زندہ یادگار بن جائے گی۔اگر یہ موقع ہاتھ سے جاتا رہا تو پھر اردو یونیورسٹی کا قیام محال ہوگا، اس لیے ہم کو توقع ہے کہ ارباب جامعہ ہمارے ان معروضات پر سنجیدگی سے غور کریں گے اور یقین ہے کہ یہ مسئلہ خود ان کے سامنے بھی ہوگا۔(معارف، فروری ۱۹۶۳ء)

سہ لسانی فارمولہ اور اردو

سہ لسانی فارمولہ کمیٹی نے اس کی پوری وضاحت کردی تھی کہ اس فارمولے کی رو سے ہندی اور انگریزی کے ساتھ تیسری زبان کوئی ”جدید ہندوستانی زبان“ پڑھائی جانی چاہیے، جو کلاسیکل نہ ہونی چاہیے اور اس کی تعلیم کی مدت کم از کم مسلسل تین سال ہونی چاہیے اور جہاں اس کا انتظام نہیں ہے وہاں جلد سے جلد انتظام کرنا چاہیے۔اس وضاحت سے سنسکرت اور دوسری کلاسکل زبانیں خود بخود خارج ہوگئی تھیں۔اس صوبے میں ہندی کے بعد تیسری عام اور مقبول زبان اردو ہے جو ایک

بڑے طبقہ کی مادری زبان بھی ہے، جس سے اس کے مخالفین بھی انکار نہیں کر سکتے۔ اس لیے عدل و انصاف اور اصول تعلیم دونوں لحاظ سے یہاں تیسری زبان اردو ہونی چاہیے، لیکن ہمارے صوبہ کی اردونواز حکومت اس کو کب گوارا کرسکتی تھی۔ چنانچہ اس نے اردو کی جگہ سنسکرت کو دلانے کے لیے کمیٹی کے مقصد و منشا کے بالکل خلاف جدید ہندوستانی زبان کے فقرے کو "ہندوستانی زبان" سے بدل دیا اور اب اس صوبے میں تیسری زبان کی جگہ اردو کے بجائے سنسکرت کی تعلیم ہوگی۔

سنسکرت کی قدامت اور اس کی علمی وادبی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن وہ مردہ زبان ہے۔ اس کے جاننے والے ہزاروں میں مشکل سے دو چار اور اس کے پڑھنے والے اس سے بھی کم نکلیں گے، جس کا وزیر تعلیم صاحب نے بھی اعتراف کیا ہے کہ وہ سنسکرت کی تعلیم چاہتے ہیں اور طلبہ اردو پڑھنا چاہتے ہیں۔ اس کے علاوہ تعلیم کے ہر مرحلہ میں مختلف شکلوں میں سنسکرت کی تعلیم کا پہلے سے انتظام ہے۔ ایسی حالت میں اردو جیسی مقبول عام زبان کو چھوڑ کر اس کی جگہ سنسکرت کو دلانا نہ صرف صریح زیادتی بلکہ اصول تعلیم اور فارمولا کمیٹی کے منشاو مقصد سب کے خلاف ہے، اگر مرکزی حکومت سہ لسانی فارمولا کو یکساں طریقے سے پورے ہندوستان میں رائج کرنا چاہتی ہے تو اس کو ریاستوں کو اس میں ترمیم کا حق نہ دینا چاہیے اور نہ اس کی رو سے اس صوبے میں اردو کی تعلیم کی جو گنجائش نکلی ہے۔ اس سے بھی ہمارے صوبہ کی حکومت اس کو محروم کر کے رہے گی۔

اس صوبے میں اردو کی تعلیم کی یہ آخری امید نظر آئی تھی، اگر صوبائی حکومت نے اس کو بھی ختم کر دیا جس کی پوری کوشش ہے تو پھر آئندہ اس کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، لیکن اگر مرکزی حکومت اس میں مداخلت پسند نہیں کرتی تو خود اردو والوں کو پوری قوت سے تیسری زبان کی جگہ اردو کو دلانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ یہ صریح زیادتی صرف اردو والوں کی بے بسی کا نتیجہ ہے، ورنہ جنوبی ہند والوں کی طرح وہ بھی اپنے مطالبات منوا کر رہتے۔ ہمیشہ مصلحت اندیشی اور صبر و سکون سے کام نہیں چلتا، کبھی کبھی ہمت و حوصلہ ناگزیر ہو جاتا ہے اور جمہوری حکومت میں تو حق تلفی اور ظلم و زیادتی کے خلاف جد و جہد کرنا عین جمہوریت کی خدمت ہے۔ اس لیے نیا تعلیمی سال شروع ہونے سے پہلے اردو والوں کو اس کا حق دلانے میں اپنے تمام وسائل صرف کر دینے چاہئیں، ورنہ اگر ایک سال بھی سنسکرت رائج ہوگئی تو پھر اردو کو رائج کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ (معارف، مئی ۱۹۶۳ء)

ہندوستان کے
تجدد پسند مسلمان اور مسلم پرسنل لا

ہندوستان کے تجدد پسند مسلمانوں کا ایک طبقہ اسلامی ملکوں کی تقلید میں ہندوستان کے مسلمانوں کا پرسنل لا میں بھی اپنے حسب منشا تبدیلی چاہتا ہے اور اس کی تحریک سے اس کی تحقیقات کے لیے حکومت بھی آمادہ ہوگئی ہے، لیکن یہ مسئلہ کئی پہلوؤں سے قابل بحث ہے۔ اولاً مسلمانوں کا پرسنل لا محض انسانوں کا بنایا ہوا قانون نہیں ہے کہ جب چاہا اس کو بدل دیا بلکہ اس کی بنیاد قرآن مجید اور احادیث نبویؐ پر ہے۔ اس لیے اس میں ان دونوں کے خلاف کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ البتہ ان قوانین کے ان فقہی احکام میں جن کی صریح سند قرآن و حدیث میں نہیں ہے۔ اور وہ فقہاء اور ائمہ کے قیاس اور اجتہاد پر مبنی ہیں۔ ضرورت زمانہ اور مصلحت عامہ کے مطابق ترمیم کی گنجائش ہے، مثلاً طلاق، خلع، فسخ نکاح، زن وشو کے درمیان تفریق اور نان و نفقہ کے مسائل میں بعض فقہی احکام ایسے ہیں جن میں اسلامی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے عورتوں کو دشواری پیش آتی ہے یا اور جو معاملات اس قسم کے ہوں ان میں حالات اور مصلحت کی بنا پر اسلامی اصول و کلیات کی روشنی میں ترمیم کی جاسکتی ہے، بلکہ بعض دشواریوں کا حل ائمہ اربعہ ہی میں سے کسی نہ کسی کے مسلک میں مل جائے گا۔

اس لیے اگر پرسنل لا میں تبدیلی کا یہ منشاء ہے کہ ان دشواریوں اور نئے پیدا شدہ مسائل کا حل نکالا جائے تو اس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہوسکتا، خود علماء کو عرصہ سے اس ضرورت کا احساس ہے اور اس کی تحریک بھی بارہا ہوچکی ہے، مگر مختلف موانع کی بنا پر عمل میں نہ آسکی، لیکن یہ کام حکومت کا نہیں بلکہ علماء و مجتہدین کا ہے۔ وہ ان دشواریوں کا حل نکال کر اس کے مطابق پرسنل لا میں ترمیم کرانے کی کوشش کر سکتے ہیں، لیکن اگر تبدیلی کا یہ منشاء ہے کہ پرسنل لا کو مغربی قوانین کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ مثلاً نکاح کی تعداد اور وراثت کے قانون میں جس کے صریحی احکام کلام مجید میں موجود ہیں تبدیلی کی جائے تو اس کی قطعاً گنجائش اور مسلمان اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکتے۔

اس بارہ میں تجدد پسند اسلامی ملکوں کی مثال پیش کرنا صحیح نہیں ہے۔ اسلامی قانون کا ماخذ قرآن و حدیث ہے۔ اسلامی ملکوں کا عمل اور ان کی تقلید نہیں۔ آج اسلامی ملکوں میں سعودی عرب کے سوا کون سا ملک اسلامی قوانین پر عامل ہے، جو ملک جس قدر ترقی یافتہ ہے اسی قدر وہ مغربی

خیالات اور مغربی تہذیب میں غرق ہے اور اپنی ہر چیز کو اسی رنگ میں رنگ دینا چاہتا ہے، بلکہ مغربی قوموں کے مسلمہ عیوب اور برائیوں کو بھی انہوں نے اختیار کرلیا ہے۔ مصر جو قبۃ الاسلام کہلاتا تھا اور جو مدتوں دنیائے اسلام کی دینی و علمی رہبری کرتا رہا۔ ترک جو اسلام کے سب سے بڑے محافظ اور اس کی تلوار کہلاتے تھے۔ یہ دونوں آج ''او خویشتن گم است کرا رہبری کند'' کے مصداق ہیں۔ ان کی مغرب زدگی سے ہم سب واقف ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی پاکستان جس کا قیام ہی اسلام کے نام پر عمل میں آیا ہے، اس کی اسلامیت بھی ظاہر ہے۔ ایسی حالت میں ان کا عمل مسلمانوں کے لیے نمونہ کیسے بن سکتا ہے۔

ایک اور پہلو سے بھی یہ مسئلہ قابل غور ہے۔ اگر اسلامی حکومتیں کوئی غلط قدم اٹھاتی ہیں تو غلطی کے احساس کے بعد اس کی تلافی بھی کرسکتی ہیں۔ مصطفیٰ کمال یورپ کی نقل و تقلید میں حد سے بہت آگے بڑھ گئے تھے۔ انہوں نے خالص مذہبی معاملات بلکہ بعض عبادات تک میں پابندی عائد کردی تھی، مگر ان کے بعد جب ترکی حکومت کو اس غلطی کا احساس ہوا تو اس نے یہ پابندی ختم کردی، گو اب بھی ترکی کا قانون اسلامی نہیں ہے اور وہاں یورپ کے بہت سے خرافات رائج ہیں لیکن کمالی دور کے بعد کی حکومتوں نے بعض مفید مذہبی اصلاحات بھی کی ہیں، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ حکومت ان کے اختیار میں نہیں ہے۔ اس لیے اگر ان سے اس قسم کی کوئی غلطی سرزد ہوگئی تو پھر اس کی تلافی کی کوئی شکل نہ ہوگی۔ اس لیے ان کو جو قدم بھی اٹھانا ہے بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے اور پرسنل لا میں تبدیلی کا مسئلہ کسی خاص طبقہ کا نہیں بلکہ پوری مسلمان قوم کا ہے۔ اور علماء و مجتہدین بھی اس میں اسلامی قوانین کے خلاف کوئی تبدیلی نہیں کرسکتے۔ اس لیے حکومت کو ان کے مشورے اور ان کی رضامندی کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھانا چاہیے۔

اس ضمن میں ایک اور پہلو کی جانب بھی جو اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔ تجدد پسند مسلمانوں کے خیالات سے قطع نظر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعض پرانے اور نئے پیدا شدہ مسائل ایسے ہیں جن کی مشکلات کا حل نکالنا ضروری ہے۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ ایمانداری کے ساتھ ان مسائل کا اسلامی حل چاہتا ہے، لیکن جب اس میں اس کو مایوسی ہوتی ہے تو پھر وہ دوسری راہیں تلاش کرتا ہے۔ اس سے تجدد پسندی، مغرب زدگی اور غیر اسلامی و ملحدانہ خیالات

کے پھیلنے کا موقع ملتا ہے۔ان کے روکنے کی صورت یہی ہے کہ ان مشکلات کا حل، ان کے مطالبات کا جواب اور ان کی تشفی کا سامان مہیا کیا جائے۔ محض غصہ اور بیزاری کے اظہار سے اس سیلاب کو روکنا ناممکن ہے۔ دراصل یہ کام اسلامی حکومتوں کا تھا، لیکن وہ خود مغرب کے طلسم میں گرفتار ہیں۔ ایک حد تک علماء بھی اس کو انجام دے سکتے ہیں اور بعض جماعتیں اپنے طور پر انجام دے رہی ہیں لیکن ضرورت متحدہ اجتماعی کوشش کی ہے جس میں ہر مکتب خیال کے مسلمہ علماء شریک ہوں۔ اس کے بغیر یہ کام انجام نہیں پاسکتا۔ یہ کوئی نیا خیال یا نئی تجویز نہیں ہے۔ مسلمانوں کو مدتوں سے اس کا احساس ہے اور خود علماء کی جانب سے بارہا اس کی تحریک ہو چکی ہے، مگر عمل میں نہ آسکی اور نہ بظاہر ان کے مشاغل اور تجربے سے اس کی امید نظر آتی ہے۔ اس وقت پرسنل لا کی ترمیم کے سلسلہ میں اس خیال کے اعادہ کی ضرورت پیش آ گئی۔ (معارف، جون ۱۹۶۳ء)

اردو کا مسئلہ

اردو زبان کا مسئلہ کسی خاص فرقہ یا طبقہ کا نہیں بلکہ حق و انصاف، جمہوریت و سیکولرزم اور حکومت اور ملک کی بہی خواہی کا ہے۔ اس لیے جب تک اس کا حق نہیں ملتا اس مسئلہ کو چھوڑا نہیں جاسکتا اور حکومت سنے یا نہ سنے اردو کی آواز برابر اس کے کانوں تک پہنچاتے رہنا ضروری ہے۔ ہندی اب حکومت کی زبان بن چکی، اس کی اس حیثیت سے کسی کو بھی انکار نہیں اور اردو کے حق کے مطالبہ کا مقصد ہندی کی مخالفت نہیں ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اب اردو کا کوئی حق باقی نہیں رہا اور اس کے ساتھ جو زیادتی بھی کی جائے اس کو خاموشی کے ساتھ برداشت کیا جائے۔

اردو کی حیثیت محض ایک معمولی زبان کی نہیں ہے۔ وہ اپنی عمومیت، مقبولیت، لسانی، علمی، ادبی اور تمدنی اہمیت ہر لحاظ سے ہندوستان کی تمام زبانوں میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کو جو خصوصیتیں حاصل ہیں وہ ہندی کو بھی حاصل نہیں ہیں اور ابھی ان کو حاصل کرنے کے لیے ایک مدت درکار ہے۔ وہ ہندی سے سب سے زیادہ قریب ہے، بلکہ اسی کی ایک شاخ کی مہذب اور ترقی یافتہ شکل ہے۔ وہ ہندوستان کے مشترک تمدن کی ترجمان ہے۔ اس میں تقریباً تمام ہندوستانی زبانوں کے کچھ نہ کچھ اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس لیے پورے ملک میں سمجھی جاتی ہے اور اس کے مختلف حصوں میں ربط و تعلق کا سب سے بڑا ذریعہ ہے اور جس قومی اتحاد و یکجہتی کی ضرورت کا احساس اب ہوا ہے اس کو وہ

مدتوں سے پورا کرتی چلی آرہی ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں اس کا سب سے زیادہ حصہ رہا ہے۔ حصول آزادی کے متعلق جیسی پرجوش اور ولولہ انگیز نظمیں اردو میں ہیں۔ ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں مل سکتیں۔ سیاسی پروپیگنڈے کو چھوڑ کر اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو اس صوبے میں اردو یا کم سے کم ہندوستانی بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور اس کے مغربی اضلاع اور شہری اور تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان تو خالص اردو ہے۔ حتی کہ اردو کے مخالفین بھی سیاسی پلیٹ فارم سے اتر کر اپنی روزانہ کی زندگی میں آج بھی اردو ہی بولتے ہیں۔ علمی و تمدنی ذخیرے میں ہندوستان کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، غرض جس پہلو سے بھی دیکھا جائے تو اردو ہندوستان کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان ہے۔ اس لیے اس کو مٹانا حق و انصاف، جمہوریت و سیکولرزم، علم و فن، تعلیم و تہذیب سب کا خون کرنا ہے۔

سہ لسانی فارمولے کا سب سے بڑا مقصد قومی اتحاد و یکجہتی ہے، جس کا ایک بڑا ذریعہ اردو ہے، مگر ہمارے صوبہ کی حکومت نے اس بارہ میں جو پالیسی اختیار کی ہے اور جس طرح اردو کی جگہ سنسکرت کو دلانا چاہتی ہے وہ اس مقصد کے سراسر خلاف ہے، جن لوگوں کا مقصد محض اردو کو مٹانا ہے ان کے لیے تو دلائل بیکار ہیں، لیکن جو لوگ انصاف پسند اور ملک کے بہی خواہ ہیں ان کو اس مسئلہ کے دوسرے پہلوؤں پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اردو ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان ہے، جس سے انصاف پسند ہندو بھی انکار نہیں کرتے۔ یہ اور بات ہے کہ مسلمانوں کو اردو سے ایک خاص خصوصیت اور جذباتی لگاؤ بھی ہے، لیکن اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ اردو تنہا مسلمانوں کی زبان ہے تو کیا ہندوستان کے پانچ کروڑ اور اس صوبہ کے ایک کرور مسلمانوں کی زبان کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔

زبان کا مسئلہ مذہب سے کم اہم نہیں ہے۔ اس کو دبانے سے انقلاب انگیز تحریکیں اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔ جنوبی ہند والوں کی مثال اس کی شاہد ہے۔ حالانکہ حکومت نے وہاں کی کسی زبان کو دبایا نہیں، محض ہندی کے تسلط کے خوف سے وہ ہندوستان سے علاحدگی تک کے لیے آمادہ ہیں اور حکومت کو ان کے مطالبات کے سامنے جھکنا پڑا۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ اردو کی حق تلفی محض مسلمانوں کی بے بسی کا نتیجہ ہے۔ اگر ان میں بھی دم ہوتا تو حکومت اس طرح اردو کا حق پامال نہیں کرسکتی تھی،

لیکن اقلیت کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا جمہوریت اور سیکولرزم کے سراسر خلاف ہے۔ دوسرے اس سے مسلمانوں میں جو بددلی اور بے اعتمادی پیدا ہوتی ہے وہ ملک کے لیے قطعاً مفید نہیں اور اس کی ذمہ داری تمام تر حکومت کے سر ہے۔

گپتا حکومت سے خوش فہموں کو بڑی امیدیں تھی۔ انہوں نے اپنی خوش آیند باتوں اور لسانی کمیٹی کے ذریعہ اردو والوں کو بہلانے کی بھی کوشش کی، مگر جب ایک آل انڈیا تعلیمی فارمولے کی رو سے اس صوبے میں اردو کی تعلیم کی گنجائش نکلی تو اس کی جگہ سنسکرت کو ٹھونس کر اردو کی تعلیم کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کردیا۔ ایک پنڈت جواہر لال نہرو اپنی حق پسندی سے اردو کے جائز حقوق کی حمایت برابر کرتے رہتے ہیں۔ سہ لسانی فارمولا کی وضاحت میں اردو کے حق میں فیصلہ دیا، لیکن یہ اردو کی بدقسمتی ہے کہ پنڈت جی کی آواز بھی جس کی صدائے بازگشت سے پورا ہندوستان گونج اٹھتا ہے۔ اردو کے معاملہ میں بے اثر رہتی ہے۔

سنسکرت کے احیاء اور اس کی تعلیم واشاعت کے لیے تو حکومت کے سارے ذرائع وقف ہیں اور مختلف شکلوں میں اس کی تعلیم کا انتظام ہے۔ اس لیے اگر سہ لسانی فارمولے میں تیسری زبان کی جگہ اردو کو دے دی جاتی تو اس سے سنسکرت کا کیا بگڑ جاتا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت کا مقصد محض سنسکرت تعلیم نہیں بلکہ اردو کو مٹانا ہے۔ تاہم اس صورت حال سے مایوس نہ ہونا چاہیے اور اردو کے لیے کوشش برابر جاری رکھنا چاہیے۔ اردو والوں کے بہلانے کے لیے ایک شکل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ بعض اسکولوں میں اردو لینے کی اجازت دے دی جائے، مگر اس پر ہرگز قناعت نہ کرنا چاہیے اور جب تک ہر اسکول میں یہ حق نہیں ملتا اس کی جدوجہد برابر جاری رکھنا چاہیے۔ (معارف، جولائی ۱۹۶۳ء)

مسلم پرسنل لا اور حکومت

مسلم پرسنل لا میں ترمیم کی تحقیقات کے لیے مرکزی حکومت جو کمیٹی بنانے والی تھی، اس کے خلاف مسلمانوں کے عام احتجاج اور خصوصاً نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی صدارت میں مسلمان عمائد کا جو اجتماع ہوا تھا۔ اس کے مشورے سے متاثر ہوکر اس نے یہ ارادہ ترک کردیا ہے لیکن یہ کوئی وقتی مسئلہ نہیں ہے جو ٹالنے سے ٹل جائے گا۔ آج پوری دنیا میں مغربی خیالات کی جو رو چل رہی ہے، جس نے اسلامی ملکوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اس سے ہندوستان کے

مسلمانوں خصوصاً ان کی نئی نسل کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ اس سے قطع نظر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جدید تمدن نے زندگی کے مختلف شعبوں میں ایسے مسائل پیدا کردیے ہیں، جن کا وجود ہماری پرانی فقہ میں نہیں ہے اور مسلمانوں کا ایک طبقہ ایمانداری سے ان کا اسلامی حل چاہتا ہے، جب اس کو اس میں مایوسی ہوتی ہے تو وہ دوسری راہیں تلاش کرتا ہے۔ اسی سے مغرب زدگی، تجدد پسندی، ملحدانہ خیالات اور ملحدانہ تحریروں کو پھیلنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے روکنے کی صورت صرف یہ ہے کہ کتاب وسنت کی روشنی میں ان مسائل ومشکلات کا حل نکالا جائے، نئے تقاضوں کا جواب اور نئے طبقہ کی تشفی کا سامان مہیا کیا جائے۔ اس کے بغیر اس سیلاب کا روکنا ناممکن ہے۔

اصل میں یہ کام اسلامی حکومتوں کے کرنے کا تھا مگر بعض تو پرانی لکیر کی فقیر ہیں اور اس سے ایک انچ آگے بڑھنا نہیں چاہتیں اور بیشتر خود مغربی تمدن کی اسیر اور مغربی خیالات میں غرق ہیں۔ اس لیے ان سے اس کی توقع نہیں۔ ان کے مقابلہ میں ہندوستان کے مسلمان بہت غنیمت ہیں۔ اس لیے یہاں کے علماء پر بھی یہ فرض کفایہ عائد ہوتا ہے۔ اس ضرورت کا احساس ہمیشہ علماء کو رہا اور اس کے لیے جزوی اور انفرادی کوششیں بھی ہوئیں، لیکن مختلف اسباب وموانع کی بنا پر اب تک کوئی اجتماعی کوشش نہ ہوسکی۔ مولانا سید ابوالحسن علی نے جن کو اللہ تعالیٰ نے دین وملت کی خدمت کی خاص سعادت عطا فرمائی ہے۔ اس اہم اور ضروری کام کی جانب بھی پیش قدمی کی ہے اور فی الحال ابتدائی صلاح وشوری کے لیے مختلف مکاتب فکر کے مخصوص علماء کو یکم ستمبر کو ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اجتماع کی دعوت دی ہے۔ اس کے بعد پھر وسیع قدم اٹھایا جائے گا۔ یہ کام کسی خاص جماعت یا طبقہ کا نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے مفاد کا ہے۔ اس لیے یقین ہے کہ علماء اس میں پورے تعاون سے کام لیں گے، گو یہ کام دیر سے شروع ہوا ہے لیکن جب کسی راہ میں ایک قدم اٹھ جاتا ہے تو بہت سے رکے ہوئے قدم اٹھ جاتے ہیں۔ اس لیے انشاء اللہ دیر آید درست آید کا مصداق ہوگا۔ (معارف، اگست ۱۹۶۳ء)

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ایک زمانہ میں مسلمانوں کی بہت مفید تعلیمی خدمات انجام دے چکی ہے۔ لیکن ادھر مدتوں سے ایک بے جان ادارہ بن کر رہ گئی تھی اور اب تو عرصہ سے اس کا نام بھی سننے میں نہیں آتا تھا۔ غالباً اس میں ملک کے نئے حالات کو بھی دخل تھا۔ کانفرنس جن

حالات اور جن مقاصد کے لیے قائم ہوئی تھی، ان کے لحاظ سے آج پہلے سے کہیں زیادہ اس کی ضرورت ہے۔کانفرنس کا خاص مقصد مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح وترقی خصوصاً ان میں جدید تعلیم کی اشاعت تھا۔اب حالات بدل گئے ہیں۔زمانہ خود ان کو جدید تعلیم کی طرف مائل کر چکا ہے اور اس کے بجائے دوسرے تعلیمی مسائل درپیش ہیں۔اس وقت سب سے بڑا مسئلہ مسلمان بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم وتربیت کا ہے۔سرکاری تعلیم تمامتر ہندو مذہب، ہندو تہذیب اور ہندو روایات کی ترجمان ہے، جس کو مسلمانوں کی تہذیب وروایات سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔اور مسلمان بچے اس کو حاصل کرنے پر مجبور ہیں۔اس لیے اگر مسلمان ان کی مذہبی تعلیم وتربیت کا خود مستقل نظام قائم نہیں کرتے تو وہ اپنے مذہب اور اپنی تہذیب وروایات سے بالکل بیگانہ ہو جائیں گے۔دینی تعلیمی کونسل اور دینی تعلیمی بورڈ اس کام کو انجام دے رہے ہیں لیکن یہ کام اتنا وسیع ہے کہ اس میں دوسری جماعتوں کے بھی کام کی گنجائش ہے۔

ان حالات میں اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی کہ مسلم ایجوکیشنل کی نشاۃ ثانیہ ہو رہی ہے اور اس کا اجلاس بمبئی میں ہونے والا ہے لیکن اس کے گذشتہ اجلاسوں کی طرح محض جلسہ کر کے محض چند تجویزیں پاس کر دینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کو ایک عملی اور جاندار ادارہ بنانے کی ضرورت ہے۔عملی کام کے بغیر کوئی ادارہ زندہ نہیں رہ سکتا۔اس لیے خود کانفرنس کی بقا کے لیے عملی پروگرام ضروری ہے اور اس وقت سب سے اہم تعلیمی مسئلہ مسلمان بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کا ہے۔اس لیے ایجوکیشنل کانفرنس کو اس کی جانب بھی توجہ کرنی چاہیے اور اس میں پورا عملی حصہ لینا چاہیے۔

(معارف، اگست ۱۹۶۳ء)

مسلم یونیورسٹی۔چند گذارشات

گذشتہ مہینے عرصہ کے بعد علی گڑھ جانے کا اتفاق ہوا اور یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر بدرالدین طیب جی نے یونیورسٹی کی بعض پرانی خامیوں کو دور کر کے مفید اصلاحات کی ہیں اور اس کو وہ صحیح معنوں میں ایک تعلیمی وعلمی ادارہ اور اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز بنانا چاہتے ہیں اور یونیورسٹی کا بہی خواہ طبقہ ان کے کاموں سے پوری طرح مطمئن ہے۔اس کے ساتھ بعض ایسی تجویزیں بھی سننے میں آئیں جو اسلامی روایات کے خلاف تھیں، مگر

تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان تجویزوں کو عمل میں لانے کا خیال ترک کر دیا گیا۔

اس موقع پر چند اصولی باتیں یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کے گوش گذار کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ معلوم و مسلم ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کا مقصد ہی اسلامی تہذیب وروایات کے مطابق مسلمان طلبہ کی تعلیم وتربیت اوران کا تحفظ تھا اوراس نے اپنی بعض خامیوں کے باوجود بڑی حد تک اس مقصد کو پورا کیا اور مسلمانوں کی ذہنی وفکری تربیت پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی قریب قریب تمام بڑی بڑی شخصیتیں اسی کی پیداوار ہیں، جو مدتوں مسلمانوں کی رہنمائی کرتی رہیں، گو ان سے غلطیاں بھی ہوئیں لیکن زندگی کے مختلف شعبوں میں ان کے نمایاں کارنامے ہیں اور آج بھی مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا نہ صرف سب سے بڑا تعلیمی ادارہ بلکہ ذہنی تربیت گاہ بھی ہے۔ اس کا جو رنگ ہوگا اوراس کے طلبہ جس قالب میں ڈھل کر نکلیں گے، اس کا اثر پورے ہندوستان کے مسلمانوں پر پڑے گا۔ اس لیے اس کے بنیادی مقاصد، اس کی روح اوراس کی خصوصیات کا ہر حال میں قائم رہنا ضروری ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ زمانہ کے حالات اور تقاضے بدلتے رہتے ہیں، جن سے مطابقت ضروری ہے، مگر اسی حد تک جس حد تک اصل مقاصد میں فرق نہ آئے، پھر ان حالات اور یونیورسٹی کی خصوصیات میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے۔ خالص تعلیمی معاملات ومسائل کا ان خصوصیات اور اسلامی تہذیب وروایات سے کوئی تصادم نہیں ہوتا، تصادم تو مذہب وملت سے آزاد طبقہ کے غیر اسلامی عقائد وتصورات اور ہوس پرست اور عیش کوش سوسائٹی کے تفریحی مشاغل سے ہوتا ہے، جن کو تہذیب و ثقافت کے خوش نما ناموں سے محض حظِ نفس اور لطف ولذت کے لیے رائج کر دیا گیا ہے، جن کو تعلیم سے دور کا بھی تعلق نہیں اور جو نہ صرف اسلامی تعلیمات بلکہ مشرقی غیرت وحمیت کے بھی خلاف ہیں اور جن کے برے نتائج کا اب ماہرین تعلیم کو بھی احساس ہو رہا ہے۔ اس لیے ہر فکری وعملی فسق سے یونیورسٹی کو پاک رکھنا ضروری ہے۔ جہاں تک ہم کو علم ہے اور بدرالدین طیب جی کی تقریروں سے بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ یونیورسٹی کی اسلامی خصوصیات کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے توقع یہی ہے کہ وہ اپنے دور میں کوئی ایسی چیز رائج نہ ہونے دیں گے جن سے مسلمانوں میں ان کی نیک نامی پر حرف آئے۔ (معارف، نومبر ۱۹۶۳ء)

ہندوستان اور کلچرل اتحاد

ہندوستان کے مختلف فرقوں میں کلچرل اتحاد کا نعرہ نہ صرف فرقہ پروروں بلکہ کبھی کبھی کانگریسیوں کی زبان سے بھی سننے میں آتا ہے۔فرقہ پرست کھل کر اس کا مطالبہ کرتے ہیں اور کانگریسی خوشنما الفاظ کے پردہ میں۔ہم اس مسئلہ پر بارہا لکھ چکے ہیں۔آج بعض دوسرے پہلوؤں سے اس کا جائزہ لینا ہے۔کلچر ایک وسیع اصطلاح ہے جس میں مذہبی عقائد سے لے کر تہذیب و معاشرت تک سب داخل ہیں اور مذہب کلچر کا ایک اہم عنصر ہے۔اس کے بہت سے مظاہر کا تعلق مذہب سے ہے،اس لیے ہر قوم کے کلچر کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے جو اس کو دوسرے کلچروں سے ممتاز کرتا ہے اور اسی پر اس قوم کے انفرادی وجود کا دار و مدار ہوتا ہے،اگر یہ مزاج بدل جائے تو اس کا انفرادی وجود ختم ہو جائے۔اس لیے کوئی قوم بھی کسی دوسری قوم کا کلچر قبول نہیں کر سکتی۔اسی لیے ساری دنیا کی جمہوریتوں کے دستور میں اقلیتوں کے مذہب کے ساتھ ان کے کلچر اور زبان کے تحفظ کی بھی پوری ضمانت ہوتی ہے اور ہندوستان کے دستور میں بھی یہ ضمانت موجود ہے۔اس لیے کلچرل اتحاد کا مطالبہ اقلیتوں کے دستوری حق اور اتحاد و یکجہتی دونوں کے خلاف ہے۔اس سے یکجہتی کے بجائے اختلاف وتفریق پیدا ہوتی ہے۔

اس سے قطع نظر ہندوستان کے مختلف خطوں اور خود ہندوؤں کے مختلف طبقوں میں اس قدر کلچرل اختلافات ہیں کہ ان میں لفظ ہندو کے علاوہ اور کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔جنوبی ہند کا کلچر شمالی ہند سے بالکل مختلف ہے، بلکہ ایک ہی صوبہ اور ایک ہی مقام کی مختلف ذاتوں اور اعلیٰ و ادنیٰ طبقوں کے کلچر میں بڑا اختلاف ہے۔ایسی حالت میں اقلیتوں سے کلچرل اتحاد کے مطالبہ کے کوئی معنی نہیں ہیں، پھر کلچر کے تہذیبی پہلو ترقی پذیر ہیں اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ بدلتے اور ترقی کرتے رہتے ہیں اور کلچرل اتحاد کے نعرہ کا مقصد قدیم ہندوستان کے کلچر کا احیاء ہے،اگر مسلمانوں اور انگریزوں کے دور کی تہذیبی و معاشرتی ترقیوں کو چھوڑ کر پراچین بھارت کا کلچر زندہ کیا جائے گا،تو اس زمانہ میں اس کی قدر و قیمت کیا ہوگی اور اس کو دنیا کے سامنے ایک ترقی یافتہ کلچر کی حیثیت سے کس طرح پیش کیا جائے گا۔حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی کلچر کی ساری خوبی اور سارا حسن اس کی رنگارنگی میں ہے۔اسی سے اس کی عظمت قائم ہے اگر اس کو ختم کر دیا جائے گا تو وہ اس زمانہ کے لیے مضحکہ بن جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف قومی اتحاد و یکجہتی بلکہ انسانیت وشرافت، اخوت و یگانگت سب کا اصلی سرچشمہ صحیح مذہب ہے۔ اس لیے انہی لوگوں میں حقیقی یگانگت پیدا ہوسکتی ہے جو اپنے مذہب کے پورے پابند اور اپنے کلچر کے نمایندے ہوں۔ پہلے بھی انہی میں یگانگت رہی ہے اور آیندہ بھی انہی میں ہوگی۔ اتحاد و یکجہتی کے سیاسی نعرہ سے پہلے ان ہندو مسلمانوں میں آج سے زیادہ اتحاد اور بھائی چارہ تھا جو اپنے مذہب اور کلچر کے صحیح نمایندے تھے، جس کی بچی کھچی ہوئی یادگاریں اب بھی باقی ہیں۔ اختلاف اور تفریق اس وقت سے شروع ہوئی ہے جب سے سیاست نے مذہب کی جگہ لی ہے اور نام نہاد آزادی، روشن خیالی اور رواداری کا آغاز ہوا ہے۔

اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مسلمانوں میں ملک و وطن کے سچے، وفادار اور فدائی قومی اتحاد و یکجہتی کے سب سے بڑے علم بردار اور جنگ آزادی کے سرفروش مجاہد وہی لوگ تھے جو اپنے مذہب اور کلچر کے نہ صرف نمایندے بلکہ اس کے محافظ و نگہبان تھے۔ علماء میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب، مولانا حسین احمد صاحب مدنی، مولانا کفایت اللہ، مولانا ابوالکلام، مولانا احمد سعید، مولا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا سجاد، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی۔ غیر علماء میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، تصدق احمد خاں شروانی اور ڈاکٹر سید محمود کی قوم پروری اور وطن دوستی سے کون انکار کرسکتا ہے اور یہ سب کے سب نہ صرف اپنے مذہب اور کلچر کے نمایندے بلکہ اس کے محافظ اور پاسبان بھی تھے۔ یہ صرف چند نامور لوگوں کے نام ہیں، ورنہ وطن پروروں کی اکثریت اسی طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ علماء میں مولانا ابوالکلام آزاد سب سے زیادہ آزاد خیال اور ترقی پسند تھے لیکن وہ بھی اسلامی تہذیب وروایات کے محافظ تھے اور رام گڑھ کانگریس کے خطبہ صدارت میں کانگریس کے پلیٹ فارم سے انہوں نے بہ بانگ دہل یہ اعلان کیا تھا کہ

> ”میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور یہ

میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے"۔

یہ اس شخص کے خیالات ہیں جو مسلمانوں میں سب سے زیادہ قوم پرور اور وطن دوست تھا، جس کی پوری زندگی قوم و وطن کی وفاداری اور جاں نثاری میں گذری۔ جس کی ذات قومی اتحاد و یکجہتی کا مجسم پیکر تھی، مگر وہ بھی اپنی تہذیب و روایات کا کوئی حصہ بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مگر اب ان ملفوظات کو کون سنتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کلچرل اتحاد کا نعرہ قوم و ملک کے ساتھ دوستی نہیں بلکہ انتہائی دشمنی ہے اور جو مسلمان اس کی ہمنوائی کریں وہ منافق ہیں۔ قومی اتحاد و یکجہتی کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہر قوم اور ہر ملت کے کلچر اور تہذیب و روایات کو زندہ رہنے اور نشوونما حاصل کرنے کا پورا موقع دیا جائے۔ اس کے بغیر یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ (معارف، جنوری ۱۹۶۲ء)

جذباتی ہم آہنگی کا مسئلہ اور اردو

آج کل ہندوستان کے باشندوں میں جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کا بڑا غلغلہ ہے۔ اس کی اہمیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا۔ ملک کی سالمیت اور قومی وحدت کو برقرار رکھنے کے لیے ہر قوم اور ہر فرقہ کے لسانی، تہذیبی اور کلچرل تحفظ کے ساتھ قومی و وطنی امور و مسائل میں جذباتی ہم آہنگی ضروری ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کا مقصد صرف اکثریت کے مختلف طبقوں کے درمیان لسانی اور صوبائی اختلافات کا دور کرنا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس سلسلہ میں اقلیتوں کے ان مسائل کا جو اختلاف کی بنیاد ہیں، کوئی ذکر نہیں آتا۔ دوسرے تعلیم کے ذریعہ قومی یکجہتی پیدا کرنے کا جو سہ لسانی فارمولہ بنایا گیا ہے اور جس پر جلد ہی عمل ہونے والا ہے۔ اس میں زبانوں کی تعلیم کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ ان صوبوں میں جہاں اردو بھی بولی جاتی ہے اور جن کے ایک طبقہ کی مادری زبان بھی ہے۔ اردو کی تعلیم میں مختلف قسم کی دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں اور مشکل ہی سے اس کی تعلیم کی گنجائش نکل سکتی ہے۔

اس حقیقت سے اردو دشمنوں کے علاوہ کسی کو بھی انکار نہ ہوگا کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں یہ امتیاز صرف اردو کو حاصل ہے کہ وہ ہندوستان کے مختلف فرقوں اور طبقوں کی تہذیب و کلچر کی

ترجمان ہے اور مدتوں سے ان میں جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کا فرض انجام دیتی چلی آرہی ہے اور ان کے درمیان ربط و تعلق کا بہت بڑا وسیلہ ہے۔اس وصف میں ہندوستان کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی، آج بھی ہندوستان کے جس خطہ میں بھی چلے جایئے اردو زبان ہی باہمی تعارف کا ذریعہ ثابت ہوگی۔اس لیے ہندوستان کی تمام زبانوں میں اردو زبان جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔(معارف،فروری ۱۹۶۲ء)

ہندوستانی مسلمانوں کے حالات۔ذمہ دار کون!

ہندوستان کے مسلمان جن حالات میں مبتلا ہیں،اس کی ذمہ داری سے وہ خود بھی بری نہیں ہیں۔وہ اکثریت اور حکومت کی شکایت تو برابر کرتے رہتے ہیں لیکن اپنی خامیوں پر ان کی نظر نہیں جاتی۔ان کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ان کا کوئی نصب العین نہیں ہے،جس کے لیے وہ ایک مرکز پر جمع ہوسکیں۔اس لیے ان کی ساری قوتیں منتشر ہیں۔عام مسلمانوں میں قومی زبوں حالی کا احساس نہیں،اگر ان کو پیٹ بھر روٹی ملتی رہے تو اس پر وہ قانع ہیں۔کوئی لیڈر شپ نہیں جو ان میں قومی احساس پیدا کرسکے۔تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ میں احساس ہے لیکن عمل کے میدان میں وہ بھی عوام سے بلند نہیں۔خواص کا طبقہ جس میں لیڈر شپ اور اپنی قوم کی نمایندگی اور ترجمانی کی صلاحیت ہو اور وہ عام مسلمانوں اور حکومت پر اثر انداز ہوسکے بہت کم ہے۔اور جس قدر ہے حددرجہ ناقص اور خودغرض ہے۔اس کو اپنے فائدے سے کام ہے،اس لیے وہ اور حکومت دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور جن مسلمانوں کی نمایندگی کے طفیل میں ان کو عہدے اور مناصب حاصل ہوتے ہیں۔وہ ان کی ترجمانی کرنے کے بجائے حکومت کی ہم نوائی کرتا اور الٹے مسلمانوں کو ملزم ٹھہراتا ہے،جس پر مسٹر چھاگلہ کا بیان شاہد ہے۔اگر مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں اپنی علاحدہ تنظیم کی گنجائش نہیں ہے تو کم سے کم وہ ترقی پسند پارٹیوں میں جماعتی حیثیت سے شریک ہوکر موثر پوزیشن حاصل کرسکتے ہیں لیکن انتشار و پراگندگی کی وجہ سے یہ بھی نہیں ہے اور کسی پارٹی میں بھی ان کی کوئی موثر پوزیشن نہیں ہے۔اس لیے ان کی کوئی آواز بھی نہیں ہے۔

دوسری خامی بلکہ غلطی جو ان کے اسلاف سے ہوتی چلی آئی ہے، یہ ہے کہ انھوں نے ہندوستان میں تبلیغ کا فرض انجام نہیں دیا اور ہندوؤں کے قریب جاکر ان کو صحیح اسلامی تعلیمات اور

اسلامی اخلاق سے متاثر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا حکمراں طبقہ قوت و اقتدار کے گھمنڈ میں مست رہا۔ اس میں عربوں کی جیسی تبلیغی اسپرٹ نہ تھی۔ اس لیے اس نے محض حکومت کی قوت اور شوکت کو اسلام کی خدمت کے لیے کافی سمجھا۔ اس سے انکار نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو ضرور مادی فوائد حاصل ہوئے مگر اسلام کی تبلیغ کا فرض انجام نہیں پایا اور اس کے اخلاقی فوائد حاصل نہ ہو سکے اور اس کے لیے مفت بدنام بھی ہوئے۔ علماء زیادہ تر درس و تدریس، فقہ و فتاویٰ اور مسلمانوں کے ارشاد و ہدایت میں مشغول رہے اور اس حیثیت سے انہوں نے دین اور علوم دین کی بڑی خدمت انجام دی اور یہ بھی ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے لیکن خالص تبلیغی فریضہ کی طرف انہوں نے بھی توجہ اور غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی صحیح تعلیمات اور اس کا عملی نمونہ پیش کرنے کی کوشش نہیں کی، ورنہ آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی اور ہندو مسلمانوں میں جو دوری ہو گئی ہے اور اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو غلط فہمیاں ہیں وہ نہ پیدا ہوئی ہوتیں۔

ہندوستان میں اسلام کی جس قدر بھی اشاعت ہوئی۔ اس کا ایک سبب تو ہندو سوسائٹی کی طبقاتی تقسیم اور اس کے ادنیٰ طبقوں کے ساتھ اعلیٰ طبقوں کا غلامانہ سلوک، اس کے مقابلہ میں اسلامی مساوات تھا۔ دوسرا صوفیائے کرام کا روحانی فیض، ان کا اسلامی اخلاق اور طریق تبلیغ تھا، جس نے اس زمانہ میں اسلام کی شمع روشن کی، جب آج کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تبلیغ کی دشواریاں تھی، اگر اسلام کی قوت تسخیر دائمی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آج بھی اس کی تبلیغ کے وہی نتائج نہ نکلیں، جو اس سے پہلے نکل چکے ہیں۔ مگر اس کے لیے غیر مسلموں کو اسلام کی صحیح تعلیمات سے آشنا اور ان کے سامنے اس کا عملی نمونہ پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ آج بہت سے ہندوؤں کو واقعی اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو غلط فہمیاں اور بدگمانیاں ہیں، ان کا ازالہ حسن عمل اور حسن کردار ہی سے ہو سکتا ہے۔ اس کا تجربہ ہر شخص کو ہوگا کہ جو ہندو مسلمان ایک دوسرے کے پڑوس میں رہتے ہیں وہ بھی ایک دوسرے کے حالات سے عموماً بے خبر رہتے ہیں۔ حالانکہ اسلام میں پڑوسیوں کے بڑے حقوق ہیں اور ان کے درد دکھ میں شریک ہونے کی تاکید ہے اور اس میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں۔ ایسی حالت میں اگر کچھ ہندوؤں کو مسلمانوں کے متعلق غلط فہمیاں ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ان کو اسلامی اخلاق سے دور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو یہ نسخۂ شفا بھی آزما کر دیکھنا چاہیے جو انشاءاللہ بہت مفید اور موثر

ثابت ہوگا۔ یہ کوئی سیاسی تدبیر نہیں بلکہ اسلام کی عین تعلیم اور تبلیغی فریضہ ہے۔(معارف، مئی ۱۹۶۲ء)

اردو کا مسئلہ اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

اردو کا مسئلہ اب ذہول اور خاموشی کی اس منزل پر پہنچ گیا ہے کہ اس میں بظاہر حرکت کے کوئی آثار نظر نہیں آتے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اس مریض جاں بلب کو دوا کے بہانہ اتنا ٹالنا چاہتی ہے، اس کی قوت حیات خود بخود ختم ہوجائے۔ چنانچہ ۱۴/سال کے عرصہ میں وہ حکومت کے تمام شعبوں سے رفتہ رفتہ خارج ہوچکی ہے۔ حکومت جو وعدے کرتی ہے ان کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ بے نتیجہ ہیں۔ اگر کوئی معمولی رعایت دیتی بھی ہے تو ایسی پیچیدہ شکل میں کہ جس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اور اگر اس کی گنجائش نکلتی بھی ہے تو حکومت کے اردو دشمن عمال طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو روز بروز ختم ہوتی جارہی ہے۔ اگر چند دنوں اور یہ صورت قائم رہی تو اردو پڑھنے والے ہی نہ رہ جائیں گے اور اس کا قصہ ہی ختم ہوجائے گا اور حکومت کو بھی اس دردسر سے نجات مل جائے گی۔

اردو ہندوستان کی ۱۴/مسلمہ زبانوں میں سے ایک زبان ہے۔ حکومت بھی زبانی اس کے حقوق کا اعتراف کرتی ہے اور اردو کا مسئلہ ایک خالص لسانی مسئلہ ہے۔ ارباب سیاست نے محض اپنے مصالح کی بنا پر اس کو سیاسی بنا کر الجھا دیا ہے لیکن ہمارے موجودہ صدر ایک خالص علمی و فلسفی اور حقیقت پسند انسان ہیں۔ سیاست کی پیچیدگیوں سے ان کا دماغ بالکل صاف ہے۔ اس لیے ان سے یہ توقع بے جا نہیں کہ وہ اس مسئلہ کو اس کے اصلی پس منظر میں دیکھیں گے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہمارے موجودہ نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ایک عرصہ تک انجمن ترقی اردو ہند کے صدر رہ چکے ہیں۔ اردو علاقائی زبان کی تحریک انہی کی صدارت کے زمانہ میں چلی تھی اور اس کی پہلی کانفرنس کی صدارت بھی انہی نے کی تھی۔ اور اردو کی وکالت میں بڑا پرزور خطبہ دیا تھا۔ بیس لاکھ دستخطوں کا محضر بھی انہی کی صدارت کے زمانہ میں صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش ہوا تھا اور غالباً وہ اس سلسلہ کے کسی وفد میں بھی شریک تھے۔ اس لیے ان پر اعتماد کا بھی یہ تقاضا ہے کہ جن علاقوں میں اردو بولی جاتی ہے خصوصاً دلی اور اترپردیش میں۔ اس کو علاقائی زبان تسلیم کرلیا جائے، اگر ہمارے موجودہ صدر کے زمانہ میں اردو کو اس کا حق مل گیا تو یہ ان کی فلسفیانہ حقیقت پسندی کا عملی ثبوت ہوگا اور پوری

اردو دنیا ان کی شکر گذار ہوگی۔ (معارف، جون ۱۹۶۲ء)

گپتا منسٹری اور اردو

گپتا منسٹری سے اردو کے بارہ میں جو توقعات خوش فہموں نے قائم کی تھیں وہ تعلیم کے سہ لسانی فارمولے نے بالکل ختم کردیں۔ اس کے متعلق جو بیان حال میں اخبارات میں شائع ہوا ہے اس میں یہ صراحت ہے کہ ''اگر طلبہ کو اردو بحیثیت تیسری زبان کے اختیار کرنے کا حق دیا گیا تو ان کی ایک بڑی تعداد اردو ہی کو تیسری زبان بنالے گی۔ کیونکہ جنوبی ہند کی زبان کے مقابلہ میں ان کے لیے اس زبان کا سیکھنا آسان ہوگا۔ اس طرح سہ لسانی فارمولے کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا، یعنی شمالی اور جنوبی ہندوستان میں ہم آہنگی پیدا کرنا۔ اس لیے خیال کیا جارہا ہے کہ جو طلبہ اردو کے اپنی مادری زبان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کو اردو کو بحیثیت تیسری زبان کے لینے کی اجازت دینا منصفانہ نہ ہوگا''۔

یعنی ہندی اور انگریزی تو لازمی ہوگی اور تیسری زبان جنوبی ہند کی کوئی زبان ہوگی۔ اس طرح اردو کا قصہ خود بخود ختم ہوجائے گا۔ یہ ہم آہنگی کی بالکل نئی قسم ہے کہ جو زبان صدیوں سے ہم آہنگی کا ذریعہ چلی آرہی ہے اس کو تو ختم کرکے ایک ہی صوبہ کے باشندوں میں ہم آہنگی کا جنازہ نکال دیا جائے اور جنوبی ہند کی زبانوں کے ذریعہ شمال وجنوب کے دور دراز علاقوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ ہم آہنگی پیدا کرنے کا مخلصانہ جذبہ نہیں بلکہ صرف طاقت کا خوف ہے، ورنہ جس صوبے میں ہندی کی اتنی شدید مخالفت بلکہ اس سے نفرت کی جاتی ہو کہ اس کے حروف کو چھیل کر مٹایا جاتا ہو، ہندوؤں کی مقدس کتابوں کو نذر آتش کیا جاتا ہو، دراوڑستان قائم کرنے کی دھمکی دی جاتی ہو اس کی زبان کی تعلیم تو اتر پردیش میں لازمی قرار دی جائے اور جو درحقیقت اس صوبہ کی عام یا کم سے کم ثانوی زبان ہے۔ اس کی تعلیم کی گنجائش ہی نہ رکھی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کی پشت پر قوت اور اس کو منوانے کے لیے قربانی کا حوصلہ نہ ہو وہ محض دوسروں کے رحم وکرم پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر اردو کے حامیوں میں بھی قوت ہوتی اور وہ اس کے لیے قربانی کرسکتے تو اس کا یہ انجام نہ ہوتا، مگر وہ تو مجبور محض ہیں۔ یہ محض خوش فہمی ہے کہ مسلسل کوشش سے جمہوریت ایک نہ ایک دن حقدار کا حق ماننے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس کا تجربہ ۱۴/سال سے ہورہا

ہے کہ اردو والوں کی مسلسل کوشش کے باوجود آج تک کوئی شنوائی نہیں ہوئی، اگر کبھی اردو کی حق شناسی کے کچھ آثار بھی نظر آتے ہیں تو ایسی صورتیں پیدا کردی جاتی ہیں کہ اس کا قدم اور پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جمہوریت جمہور کے مطالبہ کو زیادہ دنوں تک نظر انداز نہیں کرسکتی لیکن اردو کو تو فرقہ وارانہ مسئلہ بنادیا گیا ہے۔ وہ جمہوری رہ کہاں گیا اور اب کسی اقدام کے بغیر آسانی سے اردو کا حق ملنے کی بظاہر کوئی امید نہیں۔

مسلمانوں کو آئے دن جن نئی نئی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کی تازہ مثال یہ ہے کہ آیندہ بیسک اسکولوں کے طلبہ کو ہندو تہواروں کے منانے کی عملی تعلیم دی جائے گی اور ان میں جو مشرکانہ رسوم ادا کی جاتی ہیں وہ مسلمان بچوں کو بھی ادا کرنا پڑیں گی۔ اس کے متعلق قاضی عدیل صاحب عباسی کا مفصل مضمون اردو اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو یہ مسلمانوں کے لیے ایک نئی آزمائش ہے۔ بیسک ریڈروں کے خرافات ہی کیا کم تھے کہ یہ ایک نیا شاخسانہ پیدا ہوگیا، جو ان خرافات سے بھی زیادہ قابل اعتراض ہے۔ تفہیم ہی کی غرض سے سہی، ہر چیز کی عملی تعلیم دینا کیا ضروری ہے، تفہیم زبانی بھی ہوسکتی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا کوئی ہندو یہ گوارا کرے گا کہ مسلمانوں کے تہوار عید و بقرعید کو سمجھانے کے لیے ہندو بچوں سے عید کی نماز پڑھوائی اور قربانی کرائی جائے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر مسلمان بچوں کو ہندو تہواروں کی عملی تعلیم پر کیوں مجبور کیا جائے۔ ہم کو امید ہے کہ شعبۂ تعلیم کے ذمہ دار اس لغو تجویز کو خارج یا مسلمان بچوں کو اس سے مستثنیٰ کردیں گے۔ (معارف، جولائی ۱۹۶۲ء)

یوپی لسانی کمیٹی اور اردو

اردو کے بارہ میں یوپی لسانی کمیٹی کی رپورٹ کا خلاصہ بعض اخبارات میں شائع ہوگیا ہے۔ اس کمیٹی سے کچھ زیادہ توقعات تھیں بھی نہیں۔ چنانچہ اس کی سفارشوں میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دوسری زبانوں کے طفیل میں اردو کو جو حقوق ملے ہیں اور جن کو مرکزی اور صوبائی حکومتیں بھی مانتی ہیں۔ ان میں بعض جزوی ترمیموں اور اصلاحوں کے علاوہ اس کمیٹی نے کوئی ایسی سفارش نہیں کی ہے جس سے اردو کی پوزیشن میں کوئی خاص تبدیلی پیدا ہو۔ اسی لیے کمیٹی کے ہندی کے ارکان نے بھی ان سفارشوں سے کوئی اختلاف نہیں کیا ہے۔

ان سفارشوں میں پرانے نیم سرکاری اور آزاد اسلامی مکاتب کو لوکل بورڈ کے تعلیمی نظام

کے ماتحت لاکر ان کو اردو میڈیم اسکول بنانے کی تجویز البتہ نئی ہے، مگر یہ ہمیشہ سے اردو کے اسکول چلے آرہے ہیں۔اس سے اردو کو نیا حق کیا ملا۔ان کو سرکاری نظام تعلیم کے ماتحت لانے سے اگر اردو کی تعلیم میں کچھ سہولتیں حاصل ہوں گی تو اس کے شرائط خصوصاً مدرسین کے لیے مسلم کی شرط ختم کردینے سے ان مکاتب کو فائدے سے زیادہ نقصان پہنچے گا اور ان کی دینی تعلیمی حیثیت بالکل ختم ہوجائے گی۔ان کی بیسک ریڈروں کی زبان کے بارہ میں جو سفارش کی گئی ہے، وہ اردو کے لیے سخت مضر ہے۔اس سے اردو زبان ہندی بن جائے گی اور رسم الخط کے علاوہ ان دونوں میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔اگر کسی درجہ میں یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ ان سفارشوں سے اردو کو کچھ سانس لینے کا موقع مل جائے گا تب بھی ان تجویزوں پر عمل کا اصل مسئلہ باقی رہ جاتا ہے، جس کا ان سفارشوں میں بھی کوئی اطمینان بخش حل نہیں ہے اور اردو کے مطالبات کے بعد سب سے اہم مسئلہ یہی ہے کہ ان سفارشوں پر عمل کی کیا ضمانت ہوگی۔اس کی دو ہی صورتیں ہیں۔اردو کو جو حقوق بھی ملیں ان کو قانونی حیثیت دی جائے یا پھر حکومت کے عمال کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہو، جس کی سردست کوئی امید نہیں ہے۔اس رپورٹ میں بعض اور خامیاں بھی ہیں۔پوری رپورٹ شائع ہونے کے بعد ہم ان کے بارہ میں تفصیلی خیالات پیش کریں گے۔ (معارف، ستمبر ۱۹۶۲ء)

مسلمانوں کے لیے
ایک انگریزی اخبار کی ضرورت

مسلمانوں کے لیے ایک انگریزی اخبار کی جتنی شدید ضرورت ہے اس کے بارہ میں کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔اس کا احساس تمام مسلمانوں کو ہے۔چنانچہ بارہا اس کی تحریک ہوئی مگر عمل میں نہ آسکی۔ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کرور سے زیادہ ہے اور اس گئی گذری حالت میں بھی ان میں ایسے ایسے دولت مند موجود ہیں کہ چند آدمی اخبار کا خرچ برداشت کرسکتے ہیں، مگر کوئی جماعت ایسی نہیں ہے جو اس تحریک کو لے کر اٹھے اور انجام تک پہنچائے۔اسی لیے آج تک اخبار نہ نکل سکا۔اب جماعت اسلامی نے ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار نکالنے کا ارادہ کیا ہے۔ممکن ہے کچھ لوگوں کو جماعت اسلامی کے بعض خیالات و نظریات سے اختلاف ہو، مگر یہ اخبار ان کے خیالات و نظریات کا نہیں بلکہ عام مسلمانوں کے جذبات و ضروریات کا ترجمان ہوگا۔اسی لیے

جماعت اسلامی نے تمام مسلمانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی ہے۔(معارف،ستمبر ۱۹۶۲ء)

لسانی رپورٹ اور اردو

لسانی کمیٹی کی رپورٹ پر اتنی بحث ہوچکی ہے،خصوصاً حیات اللہ صاحب انصاری اور قاضی عدیل صاحب عباسی ان کی موافقت اور مخالفت میں اتنا لکھ چکے ہیں کہ اس کا ہر رخ سامنے آ گیا ہے۔

کوئی پہلو تشنہ باقی نہیں ہے۔اتنا سب کو تسلیم ہے کہ یہ رپورٹ بہت ناقص ہے۔اس میں اردو کے بعض ضروری مسائل کو بالکل نظر انداز کردیا گیا ہے اور اردو کے مطالبات سے اس کی سفارشوں کو کوئی نسبت نہیں ہے۔اس لیے اردو کے تمام اخبارات حتیٰ کہ انجمن ترقی اردو ہند کے ترجمان ہماری زبان تک نے جس کی پالیسی اس کی ذمہ داریوں کی بنا پر نسبتاً نرم اور معتدل ہے۔اس رپورٹ کی مخالفت کی ہے۔اس لیے موجودہ شکل میں وہ قطعاً ناقابل قبول ہے لیکن ایک بڑا سوال یہ بھی ہے کہ اردو کے موجودہ مخالف حالات میں اس کو بالکل رد کردینا اردو کے لیے مفید ہوگا یا بعض ضروری ترمیموں کے قبول کرلینا۔

اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ آزادی کے بعد کچھ ہندوستان کی تقسیم کے اثرات اور کچھ پراچین بھارت کی احیائی ذہنیت نے اردو کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور اس کو بھی پاکستان کا ہمزاد تصور کیا جاتا ہے اور اس کی مخالفت ہندوستان کا ایسا قومی مسئلہ بن گئی ہے،جس میں کسی جماعت کا استثناء نہیں ہے۔ایک مختصر جماعت کو چھوڑ کر جس کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے، مرکز سے لے کر صوبوں تک اور ہندو مہاسبھا اور جن سنگھ سے لے کر کانگریس تک سب کے جذبات اردو کے بارہ میں تقریباً یکساں ہیں اور ہندوستان کی بہت بڑی اکثریت اردو کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔کچھ منصف مزاج اور حق پسند ضرور ایسے ہیں جو اردو کو ختم کرنا پسند نہیں کرتے۔لیکن ان کی تعداد اتنی کم ہے کہ وہ کبھی کبھی اردو کے حق میں کلمۂ خیر کہہ دینے کے علاوہ عملاً اس کے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔حتیٰ کہ پنڈت جواہر لال نہرو تک اس معاملہ میں بے بس ہیں۔ان حالات میں حکومت سے زیادہ توقع رکھنا عبث ہے،اگر وہ ہمت کرکے اردو کے لیے کچھ کرنا بھی چاہے تو بہت آگے نہیں جاسکتی اور ملک کے متفقہ جذبات کو نظر انداز کرکے اپنے کو خطرہ میں نہیں ڈال سکتی۔

ان حالات میں چارۂ کار کیا ہے۔زور وقوت سے اردو کے حقوق منوانے کا سوال ہی نہیں۔ اس راہ میں جو دشواریاں بلکہ خطرات ہیں، ان سے ہر شخص واقف ہے۔عدالت سے فیصلہ کرانے میں بھی بڑی طوالت اور پیچیدگیاں ہیں،محض زبانی احتجاج اور حکومت کو برا بھلا کہنے سے کچھ حاصل نہیں،جس کا تجربہ ۱۳؍سال سے ہورہا ہے۔اس لیے اگر جذبات سے قطع نظر کرکے محض اردو زبان کے مفاد کے نقطہ نظر سے اس مسئلہ پر غور کیا جائے تو مناسب صورت یہی نظر آتی ہے کہ کمیٹی کی سفارشوں کو ضروری ترمیموں کے ساتھ منظور کرلیا جائے۔کمیٹی کی رپورٹ حرف آخر تو ہے نہیں کہ اس میں ترمیم کی مطلق گنجائش نہ ہو۔اس میں ایک اہم مسئلہ اسلامی مکاتب کا بھی ہے۔کمیٹی کی رپورٹ پر غور کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو ہند کی مجلس عاملہ کا جلسہ عنقریب ہونے والا ہے۔حیات اللہ صاحب انصاری اور عدیل عباسی صاحب دونوں انجمن کے رکن ہیں۔قاضی صاحب دینی تعلیم کونسل اترپردیش کے سکریٹری بھی ہیں۔اس لیے وہ اس کی نمایندگی بھی کرسکتے ہیں۔انجمن کو جمعیۃ کے تعلیمی بورڈ کے نمایندے کو بھی مدعو کرلینا چاہیے۔یہ تینوں مل کر جو فیصلہ کردیں اس کو مان لیا جائے اور باقی حقوق کے لیے جدوجہد جاری رکھی جائے۔(معارف،اکتوبر ۱۹۶۲ء)

مسلمانوں کے مذہبی اختلافات

مسلمانوں کے مذہبی اختلاف نے ہمیشہ ان کی قوت کو نقصان پہنچایا ہے، بلکہ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ ان کے سیاسی زوال میں بھی کسی حد تک اس کو دخل ہے۔اس کے باوجود ان کو عبرت حاصل نہیں ہوتی۔فروعی اختلافات سے کسی مذہب کے پیرو بھی خالی نہیں ہیں اور ان کے بدولت ایک زمانہ میں بڑے بڑے معرکے رہ چکے ہیں،مگر اب اس قسم کی ہنگامہ آرائی کا زمانہ ختم ہوچکا۔ چنانچہ مسلمانوں کے علاوہ کسی مذہبی فرقے میں یہ ہنگامے نہیں پائے جاتے،مگر ان کا ایک طبقہ اب تک اپنی گرمیٔ بازار کے لیے اس کو زندہ کیے ہوئے ہے۔اس سلسلہ میں مغربی پاکستان میں جو طوفان برپا ہے اور جس سطح پر فریقین میں جنگ ہورہی ہے وہ انتہائی شرمناک ہے۔لطف یہ ہے کہ اہل سنت کے کسی طبقہ میں بھی عقیدہ کا کوئی ایسا بنیادی اختلاف نہیں ہے جس کا تعلق کفر،شرک یا فسق سے ہو۔یہ اختلافات محض فروعی ہیں اور ان کی حیثیت بھی نزاع لفظی سے زیادہ نہیں ہے۔اس کے باوجود کفر سازی اور شرک نوازی کا ایک طوفان برپا ہے۔(معارف،دسمبر ۱۹۶۲ء)

قدیم اور جدید ضروریات کا
جامع نصاب تعلیم اور ندوۃ العلماء

اسلامی علوم، دینی تعلیم اور دین وملت کی خدمت کے کچھ اصول اور طریقے تو بنیادی حیثیت رکھتے ہیں جو ہمیشہ یکساں رہیں گے اور کچھ طریقے زمانہ کے حالات اور تقاضوں کے مطابق بدلتے رہتے ہیں۔اس کے بغیر دین کی صحیح خدمت نہیں ہوسکتی۔اسی اعتبار سے مسلمانوں کا نظام تعلیم ہر زمانہ میں بدلتا رہا اور اس کی ضرورت آج بھی ہے، مگر مسلمانوں کے دور زوال میں ان کی دوسری چیزوں کی طرح ان کا نظام تعلیم بھی بے روح اور جامد ہوکر رہ گیا تھا۔اس میں حالات کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی۔ عین اسی زمانہ میں مغربی علوم اور مغربی تہذیب کی یلغار شروع ہوئی، جس نے مسلمانوں کے مذہب، ان کی تاریخ، ان کی تہذیب اور ان کی روایات وغیرہ پر مختلف سمتوں اور ایسے ایسے گوشوں سے حملہ شروع کردیا، جس کے جواب سے ہمارے علماء قاصر تھے۔اس سے نہ صرف دوسری قوموں بلکہ خود مسلمانوں کی نئی نسل میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلنے لگیں اور امت اسلامیہ کی پوری عمارت خطرہ میں پڑ گئی۔اس صورت حال کے مقابلہ کے لیے ایسے نظام تعلیم کی ضرورت تھی جو قدیم وجدید دونوں ضروریات کا جامع ہو اور ایسے علماء پیدا کرسکے جو دینی علوم میں مہارت اور دین میں رسوخ وپختگی، نئے خیالات ورجحانات اور مغرب کے حملوں کی کمین گاہوں سے پوری طرح واقف ہوں تاکہ انہی کے اسلحہ سے ان کا جواب دے سکیں۔دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے مقاصد میں سب سے بڑا مقصد یہی تھا اور اس کی حیثیت محض ایک درس گاہ کی نہیں بلکہ ایک مستقل تحریک کی تھی۔ یہ وقت کی ایسی ضرورت تھی کہ ہندوستان کے تمام عربی مدارس اس سے متاثر ہوئے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء اور اس کے علمی ثمر دارالمصنّفین نے ہندوستان میں علم اور تعلیم کی راہ سے دین کی خدمت کا ایک نیا مکتب فکر قائم کردیا اور آج مسلمانوں کے بہت سے علمی اور تعلیمی ادارے اسی راہ پر گامزن ہیں۔

یہ ضرورت جس قدر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے زمانہ میں تھی اسی قدر آج بھی ہے، بلکہ نئے پیدا شدہ مسائل، نئی مادی اور ملحدانہ تحریکوں اور ہندوستان کے موجودہ حالات نے اس ضرورت کو اور بڑھا دیا ہے۔ندوہ آج بھی ان فرائض کو ادا کررہا ہے۔اس کی تعلیمی شہرت اتنی پھیل گئی ہے کہ یورپ کی بعض یونیورسٹیوں تک نے ڈاکٹریٹ کے داخلہ کے لیے اس کی سند کو تسلیم کرلیا ہے۔

اسلامی بلکہ خالص عرب ملکوں کے بہت سے طلبہ اس وقت ندوہ میں زیر تعلیم ہیں۔ دارالعلوم سے ایک پندرہ روزہ عربی اخبار ''الرائد'' اور ایک ماہانہ عربی رسالہ ''البعث الاسلامی'' نکل رہا ہے، جس کے علمی اور ادبی معیار کو عرب ادباء تک مانتے ہیں۔ یہ دونوں اخبار اور رسالے ہندوستانی مسلمانوں اور عرب ملکوں کے درمیان ربط و تعلق کا بڑا ذریعہ ہیں۔ علمی حیثیت سے دین کی خدمت کے لیے ''مجلس تحقیقات ونشریات اسلام'' کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے، جو بڑی مفید خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کی بعض کتابوں کے عربی اور انگریزی ترجمے بھی ہو چکے ہیں۔ موجودہ زمانہ کے ان مسائل کے حل کے لیے جن کا زندگی کے کاروبار میں روزانہ سابقہ پڑتا ہے اور جن کا وجود پرانی فقہ میں نہیں ہے۔ ''مجلس تحقیقات شرعیہ'' کے نام سے حال میں ایک ادارہ قائم ہوا ہے، جو اس ضروری اور اہم کام کو ہندوستان کے اصحاب فقہ وفتاوی علماء کے مشورے سے انجام دے رہا ہے۔ دینی حیثیت سے ندوہ تبلیغی جماعت کا ایک اہم مرکز بن گیا ہے۔ اس کے ناظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے دینی اور تبلیغی خدمات سے پورا ملک واقف ہے۔ غرض ندوہ ہر میدان میں علم و دین کی خدمت کا پورا فرض انجام دے رہا ہے۔ ابھی حال میں دارالعلوم سے ''تعمیر حیات'' کے نام سے اردو کا بھی ایک پندرہ روزہ اخبار نکلا ہے، جو ندوے کے مقاصد کی اشاعت اور اس کی ترجمانی کے ساتھ مفید علمی و دینی مضامین بھی پیش کرتا ہے۔ اس کی خریداری ہم خرمہ وہم ثواب ہے۔ اس لیے ہم کو امید ہے کہ دینی ذوق خصوصاً دارالعلوم ندوۃ العلماء سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اس کی خریداری اور توسیع اشاعت کی کوشش کریں گے۔ اس کی قیمت پانچ روپے ۲۵ نئے پیسے ہے۔ (معارف، جنوری ۱۹۶۴ء)

ہندوستانی زبانوں کے
رسم الخط میں یکسانیت کا مقصد اور اردو

ہندوستان کی تمام زبانوں کے رسم الخط میں وحدت پیدا کرنے خصوصاً اردو کے لیے دیوناگری رسم الخط اختیار کر لینے کی اب تک جتنی آوازیں اٹھیں، وہ چنداں قابل توجہ نہ تھیں، لیکن اب دو بڑی شخصیتوں پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر چھاگلا نے بھی اسی قسم کا مشورہ دیا ہے۔ پنڈت جی کا مشورہ تو سب زبان کے لیے یکساں ہے لیکن مسٹر چھاگلا نے خاص طور سے اردو کے رسم الخط کو دیوناگری بنا دینے کا مشورہ دیا ہے۔ ہم کو ان کے مشورے پر کوئی تعجب نہیں ہے۔ وہ اپنی سیکولرزم کے

ثبوت میں اختلافی معاملات ومسائل میں ہمیشہ اسی قسم کے مشورے دیا کرتے ہیں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کو اردو سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔شاید ان کو اردو بولنے کا بھی کم اتفاق ہوتا ہوگا،اردو لٹریچر سے ان کی واقفیت کا تو کوئی سوال ہی نہیں اور وہ جس تہذیب اور جس ماحول کے آدمی ہیں،اس میں اردو کی اہمیت کا احساس ہی نہیں ہوسکتا۔اردو کی دو حیثیتیں ہیں۔ایک لسانی وادبی، دوسری تہذیبی،لسانی حیثیت سے وہ ہندو مسلمانوں کی مشترک زبان ہے،لیکن تہذیبی حیثیت سے مسلمانوں کو اس سے ایک جذباتی لگاؤ بھی ہے۔اس لیے کہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں تنہا اردو ہی ایسی زبان ہے،جس میں مسلمانوں کے تہذیبی اثرات بھی ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی اور علمی لٹریچر کا بہت بڑا ذخیرہ اردو میں ہے اور ان کے لیے اس کی وہی حیثیت ہے، جو اسلامی ملکوں کے مسلمانوں کے لیے عربی کی ہے۔اگر اردو کا رسم الخط بدل دیا جائے تو یہ سارا ذخیرہ جو صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہے، برباد ہوجائے گا اور مسلمان اس سے بالکل محروم ہوجائیں گے،کیونکہ پورے ذخیرہ کا دیوناگری رسم الخط میں منتقل کرنا ناممکن ہے۔اس لیے وہ کسی حال میں بھی رسم الخط کی تبدیلی پر آمادہ نہیں ہوسکتے، بلکہ اردو کا کوئی ہوا خواہ بھی آمادہ نہ ہوگا،مگر مسٹر چھاگلا اردو رسم الخط کی اس اہمیت کو نہیں سمجھتے۔

رسم الخط کی تبدیلی درحقیقت اردو زبان کی موت ہے،گو اب اردو اور ہندی دو مستقل زبانیں ہوگئی ہیں اور ان کا اپنا لٹریچر ہے لیکن درحقیقت ان دونوں میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے اور رسم الخط اور الفاظ کے تھوڑے ردوبدل سے آسانی کے ساتھ وہ ایک دوسرے کا قالب اختیار کرسکتی ہیں۔ان کی مستقل حیثیت زیادہ تر ان کے رسم الخط کی وجہ سے قائم ہے۔اگر اردو کا رسم الخط دیوناگری کردیا جائے تو ہندی کے اس بحران میں وہ بہت جلد ہندی کی شکل اختیار کرلے گی اور اس کا وجود چند دنوں میں ختم ہوجائے گا۔اس لیے اردو والوں کو اس نئی چال سے ہوشیار رہنا چاہیے۔اردو رسم الخط کی سیاسی حیثیت بھی نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے۔وہ وسط ایشیا کے متعدد اسلامی ملکوں کا رسم الخط ہے۔ اس میں اور عربی رسم الخط میں برائے نام فرق ہے، بلکہ یہ دونوں ایک ہی رسم الخط کی مختلف شکلیں ہیں۔ایک کا نام نسخ اور دوسرے کا نستعلیق ہے۔اس لیے اردو رسم الخط تمام اسلامی ملکوں سے ربط و تعلق کا ذریعہ ہے۔ان حالات میں کم سے کم اردو کی حد تک پنڈت جواہر لال نہرو کا مشورہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔(معارف،جنوری ۱۹۶۴ء)

مسٹر چھاگلا، مسلم یونیورسٹی اور اردو

مسٹر چھاگلا جب سے وزارت میں آئے ہیں، بیشتر اختلافی مسائل، خصوصاً مسلمانوں کے معاملات میں ہمیشہ غلط مشورے دیتے ہیں۔ ابھی گذشتہ اکتوبر میں مسلم یونیورسٹی کی ایک تقریر میں انہی کے الفاظ ہیں، انہوں نے مسلمانوں کو اکثریت کی تہذیب کے دھارے میں بہ جانے کا مشورہ دیا، پھر اردو کے رسم الخط کو دیوناگری بنادینے کی صلاح دی، اب انہوں نے مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی کا حق پارلیمنٹ کو سونپ دیا، یعنی جس معاملہ میں مداخلت سے خود حکومت برأت ظاہر کر چکی ہے۔ مسٹر چھاگلا اصرار کر کے اس کو اس پر آمادہ کرنا چاہتے ہیں۔ مذہبی نقطۂ نظر سے قطع نظر جس سے مسٹر چھاگلا کو برائے نام ہی تعلق ہے۔ کم سے کم ایک قانون داں اور سابق جج کی حیثیت سے وہ اتنا تو واقف ہی ہوں گے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا کا تعلق دنیاوی قانونی جماعتوں سے نہیں بلکہ اسلامی شریعت سے ہے جس کے خلاف ترمیم کا حق خود مسلمان حکومتوں کو بھی نہیں ہے اور جو مسلمان حکومت ایسا کرتی ہے وہ مذہب کے سراسر خلاف ہے۔ اس لیے اس کا عمل دلیل نہیں بن سکتا۔ اگر مسٹر چھاگلا کو اپنی وفاداری اور سیکولرزم ہی کا ثبوت دینا ہے تو اس کے لیے اور میدان بھی ہیں۔ انہوں نے مذہب کو اس کے لیے کیوں منتخب کیا ہے۔

سید ظہیر الدین علوی مرحوم رجسٹرار جامعہ اردو علی گڑھ کی وفات دنیائے اردو کا افسوس ناک سانحہ ہے۔ جامعہ اردو ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ اس کے ذریعہ اردو کی تعلیم کی جس قدر اشاعت ہوئی اس کی مثال کوئی ادارہ پیش نہیں کر سکتا۔ جامعہ اردو کے امتحان دینے والوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوگئی ہے۔ اس کی سند کو ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں نے تسلیم کر لیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ سینکڑوں آدمیوں نے جامعہ اردو کے امتحانات کے ذریعہ محض انگریزی زبان و ادب کا امتحان دے کر انگریزی کی پوری تعلیم حاصل کر لی۔ اس سے لڑکیوں کی تعلیم میں خصوصیت کے ساتھ بڑی سہولت پیدا ہوگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ ان کے بعد جامعہ کی رجسٹراری کے لیے مولوی نور الرحمٰن صاحب کا انتخاب عمل میں آیا ہے، جو اپنی قابلیت اور تجربہ کے لحاظ سے اس جگہ کے لیے موزوں ترین شخص ہیں اور ہم کو یقین ہے کہ وہ اپنے پیش رو کے صحیح جانشین اور ان کا نعم البدل ثابت ہوں گے۔ (معارف، فروری ۱۹۶۴ء)

مسلمانوں کے ایک انگریزی اخبار کی ضرورت

مسلمانوں کے ایک روزانہ انگریزی اخبار کی تحریک بارہا ہو چکی ہے۔موجودہ حالات نے اس کی ضرورت اور بھی واضح کر دی ہے۔اس کے بغیر ان کی آواز حکومت کے کانوں تک بھی نہیں پہنچتی اور ان کے مخالف پریس کی آواز پورے ہندوستان میں گونج جاتی ہے جو ہمیشہ واقعات کی غلط تصویر دکھاتے ہیں۔مسلمانوں میں سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ وقتی جوش میں آ کر وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں لیکن عام حالات میں ضروری کاموں کی طرف بھی توجہ نہیں کرتے۔انہوں نے جبل پور اور کلکتہ کے مظلومین کی امداد کے لیے جتنا روپیہ صرف کیا ہے (یہ بھی ایک ضروری کام تھا) اتنی رقم سے ایک روزانہ اخبار آسانی سے نکل سکتا تھا،اس کے بغیر ان کی آواز کا کوئی اثر نہ ہوگا، پریس ہی کی قوت سے حکومت مسلمانوں کی آواز سننے پر مجبور ہوگی۔اس لیے اخبار کا اجراء مسلمانوں کی ایسی ناگزیر ضرورت ہے، جس کو بہرحال پورا کرنا ہے۔(معارف،مارچ ۱۹۶۴ء)

ہندوستانی مسلمانوں کی مشکلات

ہندوستان کے مسلمان جن مشکلات میں مبتلا ہیں اور ان پر جو کچھ گذر رہی ہے اگر وہ غور کریں تو اس میں ان کے لیے بڑا سامان عبرت ہے۔اس سنت الٰہی کا قرآن مجید میں بہ تکرار اعلان کیا گیا ہے کہ جو قومیں احکام الٰہی سے سرتابی کرتی ہیں اور تنبیہ کے بعد بھی اس سے باز نہیں آتیں تو آخرت کے عذاب کے علاوہ ان کو دنیا میں بھی مختلف شکلوں میں اس کی سزا ملتی ہے۔ان قوموں کے عبرت آموز واقعات قرآن مجید میں مذکور ہیں۔یہودیوں کی تو قریب قریب پوری تاریخ موجود ہے۔ ان کی مسلسل سرکشی کی سزا میں ان پر جابر قوموں کو مسلط کر دیا گیا،جنہوں نے ان کو حکومت اور سلطنت سے محروم اور غلام بنا کر ساری دنیا میں منتشر کر دیا۔ان کا قبلہ چھین کر ان کا معبد اعظم تک مسمار کر دیا۔ اگر ''بحبل من الناس ''یعنی امریکا اور برطانیہ کا سہارا نہ ہوتا تو آج بھی اس کا کوئی مرکز نہ ہوتا۔

کیا مسلمانوں کی حالت ان قوموں سے مختلف ہے؟ان کو مذہب سے برائے نام تعلق رہ گیا ہے۔عمل کے لحاظ سے ان میں اور غیر مسلموں میں بہت کم فرق ہے۔دینی اعمال و اخلاق کے ساتھ قومی وحدت و تنظیم،ہمدردی و مواسات،ایثار و قربانی،سعی و عمل،سادگی و جفاکشی،عزم و استقلال، جرأت و حوصلہ مندی وہ سارے اوصاف بھی ان سے رخصت ہو گئے ہیں،جن پر قوموں کی زندگی

اوران کے استحکام کا دارومدار ہے۔ کیونکہ یہ اوصاف کسی بڑے مقصد اور نصب العین کے تابع ہوتے ہیں مسلمانوں کا نصب العین رضائے الٰہی اور اسلام کی شوکت وسربلندی تھی۔ یہی جذبہ ان میں حوصلہ مندی، بلند نظری اور ایثار وقربانی کا ولولہ پیدا کرتا تھا۔ اس لیے یہ جذبہ ختم ہونے کے بعد ان کے یہ اوصاف بھی ختم ہوگئے اور دین کے ساتھ ان سے دنیا بھی رخصت ہوگئی۔ موجودہ حالات ان کے لیے تنبیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ابھی موقع ہاتھ سے نہیں گیا ہے۔

گو مسلمانوں کے دلوں سے ایمان کا شعلہ بجھ چکا ہے لیکن ابھی اس کی حرارت باقی ہے۔ اس کے ذریعہ ان میں دوبارہ دینی روح پیدا ہوسکتی ہے۔ اب ہندوستان میں ان کے لیے صحیح اسلامی زندگی کے علاوہ اور کوئی جائے پناہ نہیں ہے، جب تک ان میں مبلغوں کی اسپرٹ، مجاہدوں کا جوش و جذبہ اور صوفیوں کا اخلاق نہ پیدا ہوگا۔ ان کے لیے باعزت زندگی بسر کرنا بہت مشکل ہے۔ اسلامی اعمال واخلاق ہی سے ان میں زندگی کی قوت بھی پیدا ہوگی اور دوسرے بھی ان سے متاثر ہوں گے۔ اس لیے ان کی موجودہ مشکلات کا علاج بھی یہی ہے۔ مسلمانوں کو موجودہ حالات سے گھبرا کر ہمت نہ ہارنا چاہیے، ان کو ہندوستان ہی میں رہنا ہے اور پکا مسلمان اور سچا وطن دوست بن کر رہنا ہے اور ان دونوں کے حقوق ادا کرنا ہیں۔ دین سے بیگانگی نے ان کو ''او خویشتن گم است کرا رہبری کند'' کا مصداق بنادیا ہے، ورنہ ان کا اصلی مقام تو ہندوستان کی رہنمائی اور اس کی اصلاح تھی۔ ایک زمانہ میں اسلام ان کو بہت کچھ دے چکا ہے اور اب بھی دے سکتا ہے لیکن افسوس ہے کہ ہندوستان کا مسلمان اب خود اس دولت سے تہی دامن ہوچکا ہے، ورنہ آج اس کی پوزیشن دوسری ہوتی۔

پست ہمتی اور فرار کی ذہنیت قوموں کے لیے موت ہے۔ مسلمانوں کے سامنے تو حضرت ابوایوب انصاریؓ کا اسوۂ حسنہ موجود ہے۔ قسطنطنیہ پر پہلی فوج کشی میں وہ مجاہدانہ شریک تھے۔ دوران محاصرہ میں ان کا انتقال ہوگیا۔ موت سے پہلے یہ وصیت کی کہ میری لاش کو جہاں تک دشمن کی سرزمین میں لے جاکر دفن کرسکیں، دفن کرنا۔ چنانچہ مسلمانوں نے تیر وتفنگ کی بارش میں قسطنطنیہ کی فصیل کے نیچے لے جاکر دفن کیا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر ایک طرف رومی متحیر ہوگئے۔ دوسری طرف مسلمانوں میں مدفن ایوبی پر قبضہ کرنے کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ اور ایک دن وہ آیا کہ سینٹ صوفیا پر اسلامی جھنڈا لہرایا، ایسی حالت میں مسلمانوں کے لیے فرار کی ذہنیت اور جیتے جی اپنے محبوب وطن کو

چھوڑنے یا عارضی حالات سے بددل ہونے کا جذبہ کس قدر بزدلانہ ہے۔ ہندوستان کی سرزمین کو اندلس نہیں بنانا ہے۔

جو مسلمان حالات سے گھبرا کر ترک وطن کا تصور ذہن میں لاتے ہیں وہ درحقیقت ہندوستان سے اسلام کا نام مٹانے کے مجرم ہیں اور جو لوگ مسلمانوں کو جلائے وطن کرنا چاہتے ہیں وہ محض تخیل کی دنیا میں رہتے ہیں۔ مسلمانوں کو مسلمان بن کر ہندوستان میں رہنا ہے اور اسلام کی برکتوں کو یہاں پھیلانا ہے۔ قوموں کی موت وحیات دوسروں کے نہیں بلکہ خود ان کے اختیار میں ہوتی ہے۔ آج کی دنیا میں کوئی قوت چھوٹی سے چھوٹی قوم کو بھی نہیں مٹا سکتی۔ مسلمانوں کی تعداد تو اب بھی ہندوستان میں پانچ کروڑ سے زیادہ ہے جو ایک بڑی طاقتور قوم کے برابر ہے، اگر ان میں سے چند لاکھ مسلمان بھی ہندوستان میں باعزت زندگی کا عزم بالجزم کرلیں تو کوئی قوت بھی ان کو اس سے محروم نہیں کرسکتی، مگر ان میں جان دین ہی سے آسکتی ہے۔ ہندوستان تو ایک جمہوری اور سیکولر ملک ہے، اس لیے موجودہ حالات کتنے ہی مخالف سہی لیکن ایک نہ ایک دن یا وہ صحیح معنوں میں جمہوری اور سیکولر بنے گا اور اقلیتوں کو ان کے حقوق ملیں گے یا پھر خود ہندوستان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ (معارف، مارچ ۱۹۶۴ء)

فسادات

اس مرتبہ جس شکل میں اور جیسے مسلسل فسادات ہو رہے ہیں۔ وہ اس کا ثبوت ہے کہ یہ کوئی ہنگامی واقعہ نہیں، بلکہ ایک مرتب اور منظم اسکیم کا نتیجہ ہیں جو مسلمانوں اور حکومت دونوں کے لیے یکساں خلاف ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ یا حکومت فرقہ پرستوں کے سامنے سپر ڈال دے یا اس کا تختہ الٹ کر اس کو اپنے قالب میں ڈھالا جائے اب فسادات نے ایک انقلابی اور وسیع و منظم تحریک کی شکل اختیار کرلی ہے اور فرقہ پروری کا زہر پورے ہندوستان میں سرایت کر چکا ہے، جس سے کانگریس اور حکومت کے ارکان تک کا دامن پاک نہیں ہے۔ وہ حکام جن پر امن وامان کے قیام کا دارومدار ہے خصوصیت کے ساتھ اس کا شکار ہیں۔ اس لیے حکومت فرقہ پروروں کے خلاف کوئی سخت قدم نہیں اٹھا سکتی۔ اگر وہ اس کی ہمت کرے بھی تو اس میں کامیاب نہ ہوگی۔

ان فسادات کو روکنے کی صرف یہی شکل ہے کہ پہلے کانگریسی اور حکومت کے ارکان خود اپنا ذہن صاف کریں اور ایسے بیانات نہ دیں، جن سے فرقہ پرستوں کو شہ ملتی ہو، ان کے اخبارات،

لیڈروں اور جارحانہ تنظیموں پر پابندیاں عائد کی جائیں، ان میں سے جو بھی فرقہ پروری کو بھڑکائے، اس سے سختی کے ساتھ مواخذہ کیا جائے، یہ عذر لغو ہے کہ زبان اور قلم پر پابندی عائد کرنا جمہوریت کے خلاف ہے۔ جب ان کو جمہوریت کو ختم کرنے کے لیے استعمال کیا جائے، اس وقت ان کی آزادی کو قائم رکھنا جمہوریت نہیں، بلکہ جمہوریت دشمنی ہے جو حکام فسادات میں فرقہ پروری سے کام لیں ان کو سخت سزائیں دی جائیں۔ فوج اور پولیس میں مسلمانوں کو ان کے تناسب سے جگہیں دی جائیں۔

کانگریس پوری قوت اور تنظیم کے ساتھ پورے ملک میں فرقہ پرستی کے خلاف تحریک چلائے اور جس طرح وہ آزادی کی جنگ لڑی تھی، اسی ہمت و جرأت سے فرقہ پروری کا مقابلہ کرے۔ اگر اس میں حکومت ہاتھ سے نکل جانے کا خطرہ ہو تو اس کی بھی پروانہ کرے۔ اس کے بغیر اس طوفان کا روکنا ناممکن ہے۔ دوسرے ذرائع سے ممکن ہے فساد عارضی طریقہ سے دب جائیں لیکن جب تک فرقہ پرستی کی جڑ نہ اکھڑے گی۔ اس وقت تک فسادات کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ فرقہ پرستوں کی قوت اتنی بڑھ گئی ہے اور ان کا اثر اتنا ہندوستان گیر ہو چکا ہے کہ ان باتوں پر عمل کرنا بہت دشوار ہے لیکن ان حالات میں بھی ہندوستان سے انسانیت کا چراغ بجھ نہیں گیا ہے۔ اور اب بھی ایک طبقہ ایسا موجود ہے جو دل سے فرقہ پروری کا استیصال چاہتا ہے۔ اگر وہ ہمت کرکے میدان میں نکل آئے تو کامیابی بالآخر اسی کو ہوگی۔ اس لیے کہ فرقہ پروروں کی بنیاد تخریب، نفرت اور دشمنی پر ہے۔ اس لیے وہ تعمیری اور اصلاحی جماعتوں کے مقابلہ میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے اور دیر سویر ان کو ان کے مقابلہ میں شکست ماننا پڑے گی اور اگر یہ صورت نہ اختیار کی گئی تو حکومت کو یا فرقہ پرستوں سے سمجھوتا کرنا یا اقتدار سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ دونوں صورتوں میں اس کا خاتمہ ہے۔

حکومت کی کمزوری اور عارضی مصلحتوں نے اس کو حقائق سے غافل کردیا ہے۔ فرقہ پرستوں کا اصل مقصد حکومت پر قبضہ کرکے اس کو اپنے قالب میں ڈھالنا ہے۔ مسلمانوں کی دشمنی کو انہوں نے اس مقصد کے حصول کا وسیلہ بنایا ہے۔ اس لیے اگر وہ غالب آگئے تو کانگریس کو نہ صرف حکومت سے ہاتھ دھونا پڑے گا، بلکہ اس کے ساتھ ہندوستان سے جمہوریت اور سیکولرزم کا بھی خاتمہ یقینی ہے اور اس لیے اس کے ذریعہ دنیا میں جو وقار حاصل کیا ہے وہ خاک میں مل جائے گا۔ اور فرقہ پرستی کی آگ محض مسلمانوں کی دشمنی تک محدود نہ رہے گی۔ بلکہ آگے چل کر اس سے اور بھی فرقہ

بندیاں پیدا ہوں گی، جو ہندوستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے گی۔ اس لیے فرقہ پرستی کا مسئلہ تنہا مسلمانوں کے تحفظ کا نہیں بلکہ خود جمہوریت اور سیکولرزم کے تحفظ کا ہے۔ اس لیے یا حکومت کو کھل کر فرقہ پروری کا مقابلہ کرنا یا اپنے اصولوں کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ دونوں چیزیں ایک ساتھ نہیں چل سکتیں، یہی توقع پاکستان سے بھی ہے۔ خدا ان دونوں کو اپنی اپنی اقلیتوں کی ذمہ داری محسوس کرنے کی توفیق دے۔ (معارف، اپریل ۱۹۶۴ء)

لکھنؤ میں مشاورتی اجتماع

گذشتہ مہینے لکھنؤ میں مسلمانوں کا جو مشاورتی اجتماع ہوا تھا، وہ اس لحاظ سے تاریخی ہے کہ اس میں مسلمانوں کی تمام جماعتوں نے شرکت کی اور تحریک خلافت کے بعد پہلی مرتبہ ایسا نمایندہ اجتماع ہوسکا، جس میں شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، جمعیۃ العلماء، جماعت اسلامی، مسلم لیگ، کانگریس اور قوم پرور مسلمان، تبلیغی جماعت کے ارکان، تقریباً تمام جماعتوں کے نمایندوں نے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر مسلمانوں کے مسائل اور مشکلات پر غور کیا اور اس کے متعلق متفقہ تجویزیں منظور کیں۔ یہ تجویزیں نہایت معقول اور متوازن تھیں۔ ان میں ایک تجویز مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کی مشکلات اور وہاں کے شرنارتھیوں کے متعلق بھی تھی۔

اس اجتماع کو فرقہ پروروں اور بعض انتہا پسند نیشنلسٹ مسلمانوں کے علاوہ جمہور مسلمانوں اور اکثریت کے منصف مزاج اور حق پرست طبقہ نے بھی پسند کیا اور اس کی پوری تائید کی۔ اس اجتماع کا مقصد مسلمانوں کی کوئی سیاسی اور فرقہ وارانہ تنظیم نہیں ہے جس کے نام سے ڈرا جائے، بلکہ صرف مسلمانوں کی مشکلات اور ان کے حل کے ذرائع پر غور کرنا۔ ان کی شکایتوں کو حکومت کے کانوں تک پہنچانا اور ان کا خوف و ہراس دور کر کے ان کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ اپنے کو ہندوستان کا شہری سمجھ کر اس کی تعمیر و ترقی میں حصہ لے سکیں۔ اس اجتماع کے داعی اور شرکاء بھی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ تنہا حکومت اور مسلمانوں کی جداگانہ تنظیم ان کی حفاظت نہیں کرسکتی۔ اس کے لیے اکثریت کا اعتماد اور اس کی ہمدردی اور اعانت حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر ان کی مشکلات دور نہیں ہوسکتیں۔

مشاورتی اجتماع کو بھی اس سے اتفاق ہے۔ چنانچہ اس نے آیندہ ہونے والے مشترکہ کنونشن کی پوری تائید کی ہے اور اس کے داعی اور شرکاء پورے اخلاص سے اس کانفرنس میں شریک

ہوں گے اور اکثریت اور دوسری اقلیتوں کے صلاح ومشورے سے مسلمانوں کی مشکلات اور ان کے حل کے ذرائع اور ان وسائل پر بھی غور کریں گے، جس سے فریقین کی غلط فہمیاں دور ہوں اور مسلمانوں کو اکثریت کا اعتماد حاصل ہو سکے۔ اس سے مسلمانوں کی فرقہ وارانہ تنظیم کا کوئی سوال ہی نہیں لیکن اسی کے ساتھ اکثریت کی یہ ذہنیت نہایت مستبدانہ اور نام نہاد نیشنلسٹ مسلمانوں کی نہایت غلامانہ ہے کہ اکثریت کی شرکت کے بغیر مسلمان اپنے معاملات ومسائل پر آپس میں مشورہ، اپنی مشکلات پر غور اور حکومت کے سامنے اپنی شکایتیں بھی نہیں پیش کر سکتے، یہ تو ان کا جمہوری حق ہے۔ اس لیے اس کی مخالفت درحقیقت جمہوریت کی مخالفت ہے، جو نہ ملک کے لیے مفید ہے اور نہ حکومت کے لیے۔

اس موقع پر مسلمانوں کی ذمہ دار جماعتوں سے بھی یہ کہنا ہے کہ وہ قومی وملی کام، جماعتی غلبہ و اقتدار اور لیڈر شپ کے جذبہ سے بلند ہو کر انجام دیں۔ اس وقت مسلمانوں میں کوئی جماعت ایسی نہیں ہے جو صحیح معنوں میں ان کی نمایندگی اور قیادت کا دعویٰ کر سکے۔ ان میں کوئی لیڈر شپ ہی نہیں ہے۔ اس لیے قومی وملی کام مختلف جماعتوں کے اتحاد ہی سے انجام پا سکتے ہیں، ورنہ اور زیادہ اختلاف وانتشار پیدا ہوگا اور یہ جماعتیں اَلَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَ کَانُوْا شِیَعًا وَ کُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ کا مصداق بن کر رہ جائیں گی۔ (معارف، ستمبر ۱۹۶۴ء)

شیعہ سنی فسادات

یہ بڑے افسوس اور شرم کا مقام ہے کہ ٹھیک اس زمانہ میں جب لکھنؤ میں مسلمانوں کا متحدہ اجتماع ہو رہا تھا، لکھنؤ کے شیعہ سنی آپس میں لڑ پڑے۔ اس معاملہ میں حق وناحق کی تحقیق کا سوال نہیں ہے اور نہ کسی فریق کو ملزم بنانا مقصود ہے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ کیا اب بھی مسلمانوں کی آنکھیں نہیں کھلتیں اور کیا ہندوستان میں زندہ رہنے کا یہی طریقہ ہے۔ لطف یہ ہے کہ عموماً اس قسم کے جھگڑے کسی بنیادی عقیدے یا دین کے کسی اصولی مسئلہ میں اختلاف کی بنا پر نہیں۔ زیادہ تر رسم پروری بلکہ بدعات کے لیے ہوتے ہیں، جن کا فریقین کے مذہب سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ شیعہ سنی اختلافات سے مسلمانوں کو بڑا نقصان پہنچا ہے اور اب کسی اسلامی ملک میں ان کا وجود نہیں، لیکن ہندوستان کے مسلمان جن کے سامنے موت وزیست کا سوال ہے۔ اب تک ان خرافات میں مبتلا

ہیں۔ان کو ان قوموں سے سبق لینا چاہیے جو اپنے مختلف العقیدہ اور متضاد عناصر کو جن میں برائے نام دینی اشتراک ہے، کس طرح متحد کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔شیعہ سنیوں میں تو اختلافی پہلوؤں کے مقابلہ میں اشتراک اور وحدت کے پہلو زیادہ ہیں۔ان کا خدا ایک، پیغمبر ایک، قرآن ایک، قبلہ ایک اور بعض مخصوص عقائد کو چھوڑ کر بہت سے عقائد و عبادات تک یکساں ہیں۔ایسی حالت میں کیا وہ اپنے عقیدوں پر قائم رہتے ہوئے متحد نہیں ہو سکتے۔اگر وہ اس کو نہیں سمجھتے تو خود حالات ایک نہ ایک دن ان کو سمجھنے پر مجبور کر دیں گے یا پھر دونوں تباہ و برباد ہو جائیں گے۔(معارف، ستمبر ۱۹۶۴ء)

لکھنؤ کے مشاورتی اجتماع کی مخالفت

مسلمانوں کے ایک خاص طبقہ کی جانب سے لکھنؤ کے مشاورتی اجتماع کی مخالفت برابر جاری ہے، مگر وہ لائق التفات نہیں۔پانچ کرور مسلمانوں کا کسی ایک مقصد کے لیے اس طرح متحد ہو جانا کہ اس کی مخالفت میں ایک آواز بھی بلند نہ ہو، نہ ممکن ہے اور نہ ضروری، مشاورتی اجتماع کی کامیابی کے لیے اتنا کافی ہے کہ مسلمانوں کی تمام اہم جماعتوں کے نمایندے ایک مقصد کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے جن میں خاصی تعداد نیشنلسٹ مسلمانوں کی تھی۔اس کی مثال تحریک خلافت کے بعد نہیں ملتی۔اس اجتماع کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں خوف و ہراس اور احساس کمتری کے بجائے خود اعتمادی اور زندگی کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔لطف یہ ہے کہ جس طبقہ کی جانب سے مشاورتی اجتماع کی مخالفت ہو رہی ہے مسلمانوں کو برا بھلا کہنے کے علاوہ اس کا اور کوئی کارنامہ نہیں ہے۔اس سترہ برس کے عرصہ میں مسلمانوں پر ایسے ایسے ستم ٹوٹے کہ منصف مزاج اور انسانیت دوست ہندو تک چیخ اٹھے، مگر ان نیشنلسٹوں کی زبان پر مہر سکوت لگی رہی اور کانگریس، ایوان حکومت اور پارلیمنٹ کے حلقوں سے مسلمانوں کی مظلومیت پر بعض مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر اس طبقہ کی جانب سے کوئی آواز بلند نہیں ہوئی اور جب کچھ دردمند مسلمان آگے بڑھے تو ان کو مطعون کرنے میں ان کی زبانیں وا ہوئیں۔

یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے، ہر زمانہ میں اور ہر حکومت میں اس قسم کے وفاداروں کا ایک طبقہ موجود رہا ہے لیکن قوموں اور ملتوں کے زوال کے لحاظ سے ان میں بھی بلندی اور پستی پیدا ہوتی رہی۔ کچھ تو خالص جعفر و صادق ہوئے اور کچھ اپنی ذمہ داری اور حکومت پرستی سے اپنی قوم کو فائدہ پہنچاتے

رہے۔انگریزوں کے زمانہ میں سرکار پرستوں کا جو طبقہ پیدا ہوا وہ بھی قومی غیرت وحمیت اور ملت کی غم خواری سے خالی نہ تھا، بلکہ اس کی وفاداری اور حکومت پرستی بھی درحقیقت اپنی قوم کے فائدے کے لیے تھی۔اس نے اس کے ذریعہ اپنی ذات سے زیادہ اپنی قوم کو فائدہ پہنچایا۔

مسلمانوں میں سرسید کو سرکار پرستوں کا سرخیل کہا جاتا ہے لیکن ان کی بعض مذہبی بے اعتدالیوں اور سیاسی غلطیوں سے قطع نظر انھوں نے اپنی انگریز پرستی سے مسلمانوں کو جو دنیاوی فوائد پہنچائے، اس سے ان کے مخالفین بھی انکار نہیں کر سکتے۔ان کی وفاداری اس لیے تھی کہ حکومت کی نگاہ میں معتوب اور ۵۷ء کے پست و پامال شدہ مسلمانوں کو دوبارہ ابھرنے اور زندہ رہنے کے قابل بنایا جائے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے، بلکہ وہ بعض ایسے نازک موقعوں پر بھی سینہ سپر ہو جاتے تھے، جس کا اس زمانہ میں کسی حکومت پرست سے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔اس زمانہ میں غدر ۵۷ء کے باغیوں کی صفائی میں کچھ کہنا سنگین جرم تھا، لیکن سرسید نے ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کر غدر کا ذمہ دار انگریزوں کو قرار دیا۔حضرت سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید کی تحریک کے اثرات کو مٹانے کے لیے ''وہابیت'' جرم تھی۔سرسید گو پشتینی حنفی تھے لیکن انھوں نے برملا اپنے وہابی ہونے کا اعلان کیا۔ان کی مذہبی غلطیوں کے باوجود ان کی دینی غیرت کا یہ حال تھا کہ صوبہ متحدہ کے لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور کی زہریلی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا جواب شائع کرنے کے لیے اپنے گھر کا اثاثہ تک بیچ دیا۔آج کتنے حکومت پرست اس جرأت اور ایثار کا ثبوت دے سکتے ہیں، پھر اس کے صلہ میں مسلمانوں نے سرسید کو سر آنکھوں پر نہیں بٹھایا بلکہ عمر بھر ان کی مخالفت کرتے رہے اور ان پر کفر کے فتوے تک لگے، مگر انھوں نے اس کی مطلق پروانہ کی اور برابر اپنے کام میں لگے رہے۔ سرسید تو بڑے شخص تھے۔اس دور کے اکثر و بیشتر سرکار پرست حکومت کے تقرب سے اپنی قوم کو بھی فائدہ پہنچاتے تھے۔یہی بلندی اور ملی احساس پرانے نیشنلسٹ اور کانگریسی مسلمانوں میں تھا، جمعیۃ العلما کے ارکان و عمائد، مولانا ابوالکلام، ڈاکٹر سید محمود، رفیع احمد قدوائی اور اس دور کے دوسرے کانگریسی مسلمان ہمیشہ مسلمانوں کی گالیاں کھاتے رہے لیکن کبھی اس کا جواب نہیں دیا اور ان کی فلاح و بہبود سے غافل نہیں رہے۔رفیع احمد قدوائی جس طرح ہندوؤں کے کام کرتے تھے، اسی جرأت کے ساتھ مسلمانوں کے کام آتے تھے، بلکہ بغیر کسی اشتہار کے ان کی وکالت تک کرتے

تھے۔اسی لیے ان کی موجودگی میں مسلمانوں کو بڑی تقویت تھی اور ان کے مخالفوں کے دلوں میں بھی ان کا احترام تھا اور ایک ہمارے ''نومولود نیشنلسٹ مسلمان'' ہیں جن کا کام صرف اپنی وفاداری کے اظہار کے لیے مسلمانوں کو بدنام کرنا ہے۔

مسلمان اس وقت ہمدردی اور غم گساری کا بھوکا ہے۔وہ اپنی مشکلات کا حل اور اپنے درد کا مداوا چاہتا ہے۔یہ چیز جہاں سے اس کو ملے گی ادھر لپکے گا۔اگر نومولود نیشنلسٹ مسلمانوں میں واقعی مسلمانوں کا درد ہے اور وہ ان کی فلاح چاہتے ہیں تو ان کو گالیاں دے کر نہیں، گالیاں کھا کر اور ہر طرح کے خطرات میں پڑ کر ان کی مشکلات دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، نہ کہ ان کو اکثریت اور حکومت کی نگاہ میں اور زیادہ مشکوک بنایا جائے۔خدمت سے عظمت پیدا ہوتی ہے۔ذرا نیشنلسٹ حضرات تجربہ کر کے دیکھیں، کچھ دنوں میں خود مسلمان ان کے ساتھ ہو جائیں گے محض ان کو برا بھلا کہنے سے تو کام نہیں چل سکتا۔اس سے تو اور زیادہ ضد پیدا ہوگی، نہ وہ مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرسکیں گے اور نہ ادنیٰ درجہ کے فوائد حاصل کرنے کے علاوہ حکومت کی نگاہ میں بھی ان کا کوئی وقار ہوگا۔وقار اسی کا ہوتا ہے جس کی پشت پر کوئی قوت ہوتی ہے۔

اس سے قطعاً انکار نہیں اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ حکومت کی امداد اور اکثریت کا اعتماد اور اس کی ہمدردی حاصل کیے بغیر مسلمانوں کی مشکلات دور نہیں ہوسکتیں۔مشاورتی اجتماع قطعاً اس میں حائل نہیں ہے، بلکہ اس کا عقیدہ بھی یہی ہے، جس پر اس کے ارکان کے بیانات شاہد ہیں اور اس پر وہ عامل بھی ہیں۔چنانچہ جہاں جہاں ان کا وفد گیا اس نے اس اصول کو پیش نظر رکھا اور اکثریت کے مقامی عمائد کو ساتھ لے کر قدم بڑھایا، جس پر اخبارات کی رپورٹیں شاہد ہیں۔جمہوری کنونشن اس کام کو اور زیادہ وسعت کے ساتھ انجام دے گا لیکن اسی کے ساتھ تاریخ کا یہ بھی فیصلہ ہے کہ کوئی قوم محض دوسروں کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتی اور حقوق قوت کے بغیر حاصل نہیں ہوتے۔

تقدیر کے مفتی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ہندوستان سے ابھی انسانیت ختم نہیں ہوگئی ہے۔اکثریت میں اب بھی ایسا طبقہ موجود ہے جو مسلمانوں کے جائز حقوق کی حمایت میں اور فرقہ پروری کے مقابلہ میں

ان کا پورا ساتھ دے گا۔(معارف، اکتوبر ۱۹۶۴ء)

دارالمصنّفین کی طلائی جوبلی تقریبات

الحمدللہ جوبلی کی تقریب بخیر وخوبی اور نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوگئی۔لوگوں کا بیان ہے کہ ۴۷ء کے بعد سے مسلمانوں کا ایسا منتخب اور نمایندہ اجتماع نہیں ہوا تھا۔حکومت کے ارکان، اسلامی ملکوں کے سفراء، مشاہیر علماء، یونیورسٹیوں اور عربی درس گاہوں کے نمایندے، نامور اصحاب علم وقلم اور مسلمانوں کے مختلف مکاتب خیال کے اکابر شریک ہوئے۔بیرونی ملکوں کے نمایندوں میں سعودی عرب کے سفیر محمد الحمد الشبیلی اور ان کے نائب، پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر افضل اقبال، والیان ریاست میں نواب ساجدہ سلطانہ صاحبہ نواب بیگم بھوپال، صوبائی حکومت کے ارکان میں شریمتی سوچتا کرپلانی وزیر علیا، سید علی ظہیر وزیر قانون، سید مظفر حسین وزیر ٹرانسپورٹ، علماء میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، قاری محمد طیب صاحب، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب، مولانا سید محمد اسعد، مولانا منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار، مولانا ابواللیث امیر جماعت اسلامی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا محمد عمران خاں ناظم دارالعلوم، تاج المساجد بھوپال، مولانا ابوالعرفان مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، مولانا محمد اویس نگرامی، مولانا تقی الدین امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی، مولانا عبدالسلام قدوائی ناظم شعبۂ دینیات جامعہ ملیہ، قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ فتح پوری دہلی، مولانا بدرالدین صاحب اصلاحی ناظم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، مولانا شاہد فاخری، مولانا محمد رضا فرنگی محلی، مولانا شاہ عون احمد صاحب وشاہ عزالدین صاحب پھلواروی، مولانا محمد رابع استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء۔

یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور مشاہیر اصحاب علم وقلم میں مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں پرووائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، پروفیسر محمد مجیب صاحب شیخ الجامعہ، ڈاکٹر عابد حسین، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی، ضیاءالحسن صاحب فاروقی پرنسپل جامعہ کالج، سعید انصاری صاحب استاد ٹریننگ کالج جامعہ، خلیق احمد صاحب نظامی ریڈر شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی، اقبال انصاری صاحب استاد شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی، سید حسن عسکری صاحب صدر شعبہ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی، ڈاکٹر امیر حسن زیدی ریڈر شعبۂ فارسی دلی یونیورسٹی، حافظ غلام مرتضیٰ صاحب استاد شعبۂ عربی الٰہ آباد یونیورسٹی، شبیر احمد خاں صاحب غوری رجسٹرار امتحانات عربی وفارسی اترپردیش، مولانا

سید ریاست علی صاحب استاد عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پٹنہ، سید نجیب اشرف صاحب ندوی ڈائریکٹر انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی، سید شہاب الدین دیسنوی پرنسپل صابو صدیق ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بمبئی، مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی رام پور، مالک رام صاحب دہلی، پروفیسر رام کمار چوبے بنارس، حیات اللہ صاحب انصاری ایڈیٹر قومی آواز، مولانا حامد الانصاری غازی، حکیم عبدالقوی صاحب نائب مدیر صدق جدید، محمد الحسنی ایڈیٹر البعث الاسلامی و تعمیر حیات لکھنؤ، عبداللطیف صاحب اعظمی جامعہ، عبدالقوی دیسنوی سیفیہ کالج بھوپال۔

دوسرے ممتاز لوگوں میں کرنل بشیر حسن زیدی سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، شیخ ظہور الحسن صاحب ریٹائرڈ سکریٹری حکومت اترپردیش، قاضی عدیل صاحب عباسی ایڈوکیٹ بستی۔ ان مخلصوں کے علاوہ اور بہت سے اصحاب ذوق اور قدردانوں نے شرکت فرمائی، جن کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان ناموں سے جوبلی کی کامیابی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

جوبلی کے تین اجلاس ہوئے۔ افتتاحی اجلاس کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ اس کے بعد مجلس دارالمصنّفین کے صدر ڈاکٹر سید محمود صاحب نے جلسہ کا افتتاح اور راقم الحروف نے دارالمصنّفین کی جانب سے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔ اس کے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے اپنا بے مثل خطبہ پڑھا جو خیالات کی بلندی و گہرائی، قومی و ملی جذبات اور ادبی فصاحت و بلاغت کا شاہکار اور بقول مولانا سید ابوالحسن علی خطبوں کا تاج محل تھا۔ صدر کے شکریہ کے بعد یہ اجلاس ختم ہوگیا۔ اسی جلسہ میں عطیوں کا اعلان ہوا، اسی دن شب کو علمی مذاکرہ (سمپوزیم) کی مجلس ہوئی۔ اس میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مولانا قاری محمد طیب صاحب، سعودی عرب کے سفیر اور پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر نے تقریریں کی۔ سعودی عرب کے سفیر کی تقریر عربی میں تھی جس کا بلیغ ترجمہ مولانا ابوالحسن علی نے سنایا۔ ڈپٹی ہائی کمشنر کی تقریر انگریزی میں تھی، جس کو تعلیم یافتہ طبقہ نے بہت پسند کیا۔

دوسرے دن صبح کو مجلس مقالات ہوئی۔ اس میں مولانا عبدالماجد صاحب، پروفیسر محمد مجیب صاحب، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، ضیاء الحسن صاحب فاروقی، ڈاکٹر امیر حسن عابدی اور ڈاکٹر عابد صاحب نے مقالات پڑھے۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے شبیر احمد خان صاحب غوری، حافظ

غلام مرتضیٰ صاحب اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے مقالات نہ پڑھے جا سکے، جو انشاءاللہ جوبلی کی روداد کے ساتھ کتابی شکل میں شائع ہوں گے۔ مولانا عبدالماجد صاحب کے مقالہ ''شبلی'' کا لوگوں کو بڑا اشتیاق تھا، اس لیے وہ اسی پرچہ میں شائع کیا جارہا ہے۔ دوسرے دن شب کو پنڈت آنند نرائن ملا کی صدارت میں ایک ادبی نشست یا مختصر بزم مشاعرہ ہوئی۔ جس میں روش صدیقی، حبیب احمد صدیقی، جگن ناتھ آزاد، عارف عباسی، سروش اوناوی، شمس الرحمٰن قیسی فاروقی ڈپٹی کلکٹر، ذی النورین صاحب کین کمشنر اور یحییٰ اعظمی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

جوبلی مالی حیثیت سے بھی بہت کامیاب رہی۔ ان رقموں کے علاوہ جو جوبلی سے پہلے وصول ہو چکی تھیں اور جن کا معارف میں اعلان ہو چکا ہے۔ جوبلی کے موقع پر حکومت ہند نے پچاس ہزار، حکومت اتر پردیش نے دس ہزار، نواب بیگم بھوپال نے چھ ہزار، ملا طاہر سیف الدین نے بارہ ہزار، رابطہ اسلامیہ مکہ معظّمہ نے پانچ ہزار، سعودی عرب کے سفیر نے دو ہزار، حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی نے ایک ہزار، ڈاکٹر عبداللطیف صاحب کویت نے ایک ہزار کے عطیے دیے۔ ان میں سے بعض کے چک جوبلی ہی میں وصول ہو گئے، باقی آئندہ ملیں گے۔

دارالمصنّفین کو ریاست بھوپال سے بہت پرانا تعلق ہے۔ اسی کی امداد سے دارالمصنّفین کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس تعلق کی بنا پر ساجدہ سلطانہ صاحبہ نواب بیگم بھوپال نے اپنی تشریف آوری سے جوبلی کو عزت بخشی اور ہمارے صوبہ کی وزیر علیا شریمتی سوچتا کرپلانی نے ازراہ قدردانی جوبلی کو نوازا۔ اس لیے ان دونوں کو دارالمصنّفین کی طرف سے ایڈرس دیے گئے، جن کا انھوں نے مناسب جواب دیا۔ سوچتا کرپلانی نے اپنی تقریر میں ہر مذہب وملت، ہر تہذیب وثقافت اور ہر زبان کے ساتھ ہمدردی اور رواداری اور ان کے تحفظ کا یقین دلایا۔ پوری تقریر اردو میں تھی۔ ایک لفظ بھی ثقیل ہندی کا نہ آنے پایا تھا۔ یہ تقریر اپنے خیالات اور زبان کے لحاظ سے اس قابل تھی کہ دوسرے وزراء اس سے سبق حاصل کریں۔

جوبلی کی کامیابی میں ان تمام محسنوں کا حصہ ہے، جنھوں نے سرمایہ کی فراہمی میں کوشش کی یا اس کے انتظامات میں مدد دی یا اپنی شرکت سے اس کی رونق بڑھائی لیکن اس کا اصلی سہرا ڈاکٹر ذاکر صاحب کے سر ہے۔ انھوں نے ہر قدم پر ہمت بڑھائی اور ہر قسم کی امداد فرمائی۔ جوبلی کے بہت

سے شرکاء خصوصاً ارکان حکومت کو انہی کی کشش کھینچ کر لائی تھی۔ ہمارے رفیق کار سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے جوبلی کی کامیابی کے لیے رات دن ایک کردیے، درحقیقت یہ جوبلی انہی کی ہمت و حوصلہ کا نتیجہ تھی۔ ہم ان تمام محسنوں خاص طور سے ڈاکٹر ذاکر صاحب، شریمتی سوچیتا کرپلانی، نواب بیگم بھوپال، کرنل بشیر حسن زیدی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی، سید شہاب الدین دسنوی، مولانا محمد عمران خاں، سید علی جواد زیدی، مولانا سید ابوالحسن علی، منشی عبدالعزیز صاحب انصاری اور مولانا جمال میاں فرنگی محلی کے شکرگزار ہیں۔ جن کی خصوصی امداد سے جوبلی میں اتنی کامیابی حاصل ہوئی۔ ضلع کے کلکٹر مسٹر ایس، کے ماڈول اور ایس پی مسٹر بھلا کے بھی ہم مشکور ہیں کہ انہوں نے جوبلی کے انتظامات میں پورے اشتراک وتعاون سے کام لیا۔

آخر میں دارالمصنّفین کی سب سے پرانی یادگار اور اس کے معمار مولانا مسعود علی ندوی کا ذکر ضروری ہے، جن کا نام ان کی معذوری کی وجہ سے کہیں نہیں آسکا، گو اب وہ بالکل معذور ہوچکے ہیں اور ان کی حیثیت اب تبرک کی رہ گئی ہے۔ لیکن ان کا وجود ہمارے لیے غنیمت ہے اور ہم کو خوشی ہے کہ یہ جوبلی ان کی زندگی میں انجام پاگئی اور اس کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ دارالمصنّفین کی مجلس انتظامیہ کے صدر جناب ڈاکٹر سید محمود صاحب کو بھی دارالمصنّفین اور اس کے کارکنوں سے بڑا گہرا تعلق ہے اور وہ اپنی صحت کی خرابی اور معذوری کے باوجود سال میں ایک دو مرتبہ گرتے پڑتے دارالمصنّفین پہنچ جاتے ہیں۔ اس جوبلی میں بھی شرکت سے انہوں نے اس کا وقار بڑھایا۔ ان کی جگہ پُر کرنے والا کوئی دوسرا نہ تھا۔ یہ جوبلی کی مختصر سرگذشت ہے۔ اس کی تفصیلی روداد انشاءاللہ کتابی شکل میں شائع ہوگی۔

اعظم گڑھ میں مولانا شبلی کی دوسری یادگار شبلی کالج اور شبلی اسکول ہے۔ جوبلی کے موقع پر یہ دونوں بھی اپنے حصہ سے محروم نہیں رہے۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب نے کالج کے شعبۂ کیمیا کی عمارت کا اور نواب بیگم بھوپال نے اسکول کے بھوپال ہال کا سنگ بنیاد نصب کیا۔ بیگم صاحبہ نے اسکول کو چار ہزار روپے بھی عطا فرمائے۔ اسکول کے ارکان نے بیگم صاحبہ کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے کالج کے جلسۂ تقسیم اسناد کو خطاب فرمایا۔

(معارف، مارچ ۱۹۶۵ء)

مسلم یونیورسٹی
کورٹ کی میٹنگ میں ہنگامہ

مسلم یونیورسٹی کے طلبہ اپنے ضبط ونظم اور تہذیب وشائستگی میں دوسری یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لیے نمونہ تھے۔ تمام یونیورسٹیوں میں آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے تھے، لیکن مسلم یونیورسٹی ان سے بالکل پاک تھی، مگر ۲۵/ اپریل کی کورٹ کی میٹنگ میں طلبہ نے جو ہنگامے برپا کیا اس نے ان کی پوری تاریخ پر پانی پھیر دیا۔ انہوں نے وائس چانسلر کے ساتھ جو سلوک کیا، اس کی مثال نہیں ملتی، اس کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے حالانکہ یہ وہی طلبہ ہیں جنہوں نے اپنے سابق وائس چانسلر بدرالدین طیب جی کو جس محبت، عزت اور شان سے یونیورسٹی سے رخصت کیا تھا، اس کی مثال بھی نہیں ہے۔

اس واقعہ میں یونیورسٹی کے ذمہ داروں سے بھی غلطیاں ہوئیں، ورنہ اتنی سنگین صورت حال نہ پیش آتی۔ نئے وائس چانسلر نے پچھتر فی صدی کے قانون کو بدلنے میں عجلت سے کام لیا۔ اگر وہ کسی مصلحت سے اس کو بدلنا ہی چاہتے تھے تو اس کے لیے رفتہ رفتہ فضا ہموار کرنا چاہیے تھا۔ مگر آتے ہی انہوں نے اس کو بدل دیا اور اس فیصلہ پر اس سختی سے قائم رہے کہ طلبہ کے احتجاج کے باوجود اس پر نظر ثانی کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔ یونیورسٹی کے دوسرے ذمہ داروں سے یہ غلطی ہوئی کہ ان کو یا تو خود معاملہ کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوسکا یا وہ وائس چانسلر کو سمجھانے کی جرأت نہ کر سکے۔ کورٹ کے جلسہ میں طلبہ کے ہجوم کے وقت بھی ان کو حسن تدبیر سے ٹھنڈا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس میں شبہہ نہیں کہ طلبہ کی شورش اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کو روکنا مشکل تھا، لیکن یونیورسٹی کی روایت کے خلاف پولیس کی آمد نے ان کو اور زیادہ مشتعل کر دیا۔ پولیس نے یہ غلطی کی کہ طلبہ کو منتشر کرنے کے دوسرے ذرائع اختیار کیے بغیر گولی چلادی اور یہ خبر اڑ گئی کہ دو طالب علم ہلاک ہوگئے۔ اس خبر نے ان کو آپے سے باہر کر دیا اور وہ ایسی حرکتیں کر گذرے جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

لیکن خوشی کی بات ہے کہ اس واقعہ کو فرقہ واریت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس ہنگامے میں ہندو اور سکھ طلبہ بھی شریک تھے۔ ایک ہندو طالب علم ایکشن کمیٹی کا ممبر بھی تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس ہنگامے میں کسی ہندو طالب علم یا استاد کو خراش تک نہیں آئی۔ سب کے سب مسلمان ہی زخمی ہوئے۔

پچھتر فی صدی کے مطالبہ کو بھی فرقہ واریت سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں ایک تہائی سے زیادہ غیر مسلم طالب ہیں۔ وہ بھی اس سے فائدہ اٹھاتے، اب تعلیم اتنی بڑھ گئی ہے کہ یونیورسٹیوں میں طلبہ کو داخلہ نہیں ملتا۔ اس لیے تمام یونیورسٹیاں داخلہ میں اپنے طلبہ کو ترجیح دیتی ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ میڈیکل، انجینئرنگ اور پالی ٹیکنک میں اور دوسری یونیورسٹیوں میں مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے ان کے لیے صرف مسلم یونیورسٹی رہ گئی ہے۔ اس لیے جس ترجیحی اصول پر تمام یونیورسٹیوں کا عمل ہے، اگر مسلم یونیورسٹی نے اس کو قانونی شکل دے دی تو اس میں کون سی قباحت ہوگئی، جب کہ اس سے ہندو اور سکھ طلبہ بھی فائدہ اٹھاتے تھے اور انجینئرنگ اور پالی ٹیکنک میں ان کی تعداد ان کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے۔

اس ہنگامہ کا سب سے افسوسناک نتیجہ یہ ہے کہ اس سے بعض حلقوں میں یونیورسٹی کے خلاف زہر اگلنے اور اس کو نقصان پہنچانے کا موقع مل گیا، لیکن مسلم یونیورسٹی نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے قیمتی متاع ہے بلکہ حکومت ہند کی سیکولرزم کا بھی بہت بڑا نشان ہے۔ چنانچہ اسلامی ملکوں کے جو سربراہ بھی ہندوستان آتے ہیں ان کو یہ نشان ضرور دکھایا جاتا ہے۔ اس لیے توقع یہی ہے کہ وہ اس معاملہ میں دانش مندی سے کام لے گی اور یونیورسٹی کے بارہ میں کوئی ایسا فیصلہ نہ کرے گی جو اس کی سیکولرزم کے خلاف ہو۔ طلبہ کے اس ہنگامہ کی پوری تحقیقات ضرور ہونی چاہیے، لیکن ایسا نہ ہو کہ حکومت یونیورسٹی میں جن لوگوں کو اپنے مصالح کے خلاف سمجھتی ہے ان کو خواہ مخواہ ملزم بنا کر الگ کر دیا جائے۔ اگر اس واقعہ کو بہانہ بنا کر مسلم یونیورسٹی کے نظام میں کوئی ایسی تبدیلی کی گئی جس سے اس کی روایات اور خصوصیات ختم ہو جائیں تو اس کو مسلمان خوش دلی سے گوارا نہ کریں گے اور یہ تبدیلی خود حکومت کی سیکولرزم اور بیرونی شہرت کے لیے بھی مضر ہوگی۔ مسلم یونیورسٹی کو ہر حال میں مسلم یونیورسٹی رہنا چاہیے ورنہ یہ سمجھا جائے گا کہ اصل مقصد یونیورسٹی کو بدلنا تھا۔ اس واقعہ کو محض بہانہ بنایا گیا۔

اگر مسلم یونیورسٹی واقعی خود مختار یونیورسٹی ہے تو یہ بالکل مناسب نہیں کہ یہ کسی ایسے وائس چانسلر کے ہاتھوں میں رہے جو وہاں کی عام رائے کے ساتھ نہ ہو۔ اگر نواب علی یاور جنگ واپس آنا پسند کریں تو ان ہی کو لایا جائے۔ قوم کے ناموں کو اس سے زیادہ آزمائشوں سے گذرنا پڑا ہے۔ ان کی بڑائی اسی میں ہے کہ ان واقعات کے بعد بھی اگر وہ یونیورسٹی کی خدمت کر سکتے ہیں تو ان کو ضرور واپس آنا چاہیے۔

بدرالدین طیب جی جیسے وطن دوست اور قوم پرست وائس چانسلر کی مثال ان کے سامنے ہے، جنھوں نے نہ صرف یونیورسٹی بلکہ یونیورسٹی کے تمام طلبہ کے دلوں پر حکومت کی۔ (معارف، مئی ۱۹۶۵ء)

مسلم یونیورسٹی میں حکومت کی مداخلت

مسلم یونیورسٹی کے ہنگامے پر ذاتی مشاہدہ کی بنا پر گذشتہ مہینہ معارف میں اظہار خیال کیا جاچکا ہے۔ اس واقعہ کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ اس نے مسلم یونیورسٹی کی روایات کو داغدار کردیا، لیکن یہ کوئی نیا اور عجیب واقعہ نہیں ہے۔ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں آئے دن اس قسم کے ہنگامے ہوتے رہتے ہیں لیکن کسی نے ان کو اتنی اہمیت نہیں دی جتنی مسلم یونیورسٹی کے ہنگامے کو دی جارہی ہے اور نہ حکومت کا اتنا عتاب کسی یونیورسٹی پر نازل ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی عرصے سے ایک طبقہ کی نگاہ میں کھٹک رہی ہے اور وہ اس کے خلاف برابر زہر اگلتا اور اس کو طرح طرح کے الزاموں کا نشانہ بناتا رہا ہے۔ اب اس کو اپنے منصوبے پورا کرنے کا موقع مل گیا لیکن اس کا مقصد ہی مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہے۔ اس لیے اس کا شکوہ نہیں، حیرت حکومت کے طرز عمل پر ہے کہ وہ ایک ایسے واقعہ پر جو یونیورسٹیوں میں برابر ہوتا رہتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کی بنیاد ہی ڈھانے کے لیے آمادہ ہے اور یہ کار خیر ایک مسلمان وزیر کے ہاتھوں انجام پارہا ہے۔

اس سلسلہ میں اصل سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے دستور کی رو سے یہاں کی تمام اقلیتوں کو اپنی ضرورت اور مرضی کے مطابق اپنے قومی وملی ادارے قائم کرنے کا حق ہے۔ مسلم یونیورسٹی بھی اسی قسم کا ادارہ ہے، وہ محض درس گاہ نہیں بلکہ اسلامی تہذیب وثقافت کا مرکز بھی ہے۔ اس کے قیام کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کو ان کی تہذیب وروایات کے مطابق تعلیم دی جائے۔ اس کے لیے اس کا کردار اور اس کی فضا اسلامی اور اس میں مسلمانوں کی اکثریت اور ان کا اقتدار ہونا ضروری ہے۔ ایسی حالت میں حکومت کو ان خصوصیات کے مٹانے کا کس طرح حق ہے۔ وہ ان کی خرابیوں کی اصلاح تو کرسکتی ہے لیکن اس کی خصوصیات اور روایات کو نہیں مٹاسکتی۔

سیکولرزم اور وسیع تر قومیت کے نام سے یونیورسٹی کے اسلامی کردار کو مٹانے کا جواز نہیں نکل سکتا۔ سیکولرزم کا تعلق صرف حکومت سے ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کسی مذہب اور فرقہ کی نمایندہ نہیں ہے۔ اس کی نگاہ میں سارے مذاہب اور فرقے برابر ہیں۔ وہ مذہب کی بنا پر کسی میں کوئی

فرق و امتیاز نہیں کرتی۔ اس کے دستور میں سب کے حقوق یکساں اور سب کو یکساں ترقی کے مواقع حاصل ہیں۔ اس مفہوم کے اعتبار سے ہر چیز میں سیکولرزم کو گھسیٹنا کہاں تک صحیح ہے۔ حکومت کے علاوہ اور جہاں بھی اس کا استعمال کیا جائے گا، اس کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ کسی مذہب اور فرقے کے ساتھ تعصب نہ کیا جائے۔ سب کے ساتھ رواداری برتی جائے۔ اسی طرح قومیت کا مفہوم یہ ہے کہ ملک کے تمام باشندوں کا ملکی و وطنی مفاد مشترک ہے اور ہندوستان سے متعلق ان کے حقوق و فرائض یکساں ہیں۔ یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اپنی انفرادی اور ملی خصوصیات مٹا کر ایک ہی رنگ میں رنگ جائیں اور من وتو کا امتیاز نہ رہے۔ اس اعتبار سے بلاشبہہ مسلمان بھی ہندوستانی قومیت کا ایک جز ہیں اور ہندوستان سے متعلق ان کے وہی فرائض اور وہی ذمہ داریاں ہیں جو دوسرے باشندوں پر ہیں۔

اس لیے مسلم یونیورسٹی کی سیکولرزم اور قوم پروری کا مقصد صرف یہ ہے کہ اس کے دروازے کسی فرقہ پر بند نہ ہوں اور اختلاف مذہب کی بنا پر کسی کے ساتھ امتیازی سلوک نہ کیا جائے۔ اس کے طلبہ میں وطن کی خدمت اور محبت کا جذبہ پیدا کیا جائے اور اس میں ان کا قدم کسی سے پیچھے نہ رہے۔ یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کے اسلامی کردار کو مٹا دیا جائے۔ یہ سیکولرزم نہیں خالص فرقہ پروری ہے۔ قوم پروری اور وطن دوستی کے لحاظ سے بھی مسلم یونیورسٹی کی تاریخ بڑی روشن ہے۔ اس کے مخالفین کی نظر اس پر تو جاتی ہے کہ لیگ اور کانگریس کی کشمکش کے زمانہ میں یہاں کے طلبہ کی ایک جماعت نے لیگ میں حصہ لیا تھا لیکن اس پر نہیں جاتی کہ نان کوآپریشن کی تحریک میں جب ہندو یونیورسٹی نے کسی قوم پرور لیڈر کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیا تھا، مسلم یونیورسٹی کے طلبہ نے مولانا محمد علی کی سرکردگی میں مسلم یونیورسٹی کے بالمقابل ایک قومی یونیورسٹی قائم کردی۔ وہ مسلم یونیورسٹی ہے جس نے مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر سید محمود، رفیع احمد قدوائی، عبدالمجید خواجہ تصدق احمد خان شیروانی اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے قوم پرور پیدا کیے۔ آج بھی مسلم یونیورسٹی کی فراخ دلی کا یہ حال ہے کہ اس میں ایک تہائی سے زیادہ غیر مسلم طلبہ ہیں اور پالی ٹیکنک، انجینئرنگ اور ڈاکٹری میں ان کی اکثریت ہے۔ اسٹاف میں بھی غیر مسلم اساتذہ کی خاصی تعداد ہے، پھر بھی وہ فرقہ پروری کی مجرم ہے، لیکن اگر دوسری یونیورسٹیاں تعصب اور تنگ نظری کا گڑھ بھی ہوں تو بھی قابل اعتراض نہیں۔

یہ مسئلہ تنہا مسلم یونیورسٹی کا نہیں بلکہ ایک دستوری حق کا ہے۔اسی صوبہ میں ہندو یونیورسٹی بھی ہے، جو ہندو تہذیب وثقافت کا مرکز ہے اوراس کو ان کا مرکز رہنا چاہیے۔ان دونوں کی خصوصیات کو قائم رکھنا ہی سیکولرزم ہے۔ جو لوگ مسلم یونیورسٹی کو سیکولر بتانے کے جواز میں ہندو یونیورسٹی کو سیکولر بنانے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ خواب وخیال کی دنیا میں ہیں۔اگر انہوں نے اس کی جرأت کی تو ان کی وزارت کی خیر نہیں۔''یہ علی گڑھ نہیں بنارس ہے''۔لیکن بالفرض اس کو سیکولر بنانے کی کوشش بھی کی جائے تو اس کا معاملہ تو''خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گل کوزہ'' کا ہے۔اس میں اکثریت واقتدار ہر حال میں اس کی قوم ہی کا رہے گا، جس کا کوئی طبقہ بھی قومی حمیت اوراپنی تہذیب کے احیاء کے جذبہ سے خالی نہیں ہے۔اس لیےاس کے کرداراورخصوصیات کو کسی حال میں بھی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

ہندوستان کی ہر چیز نرالی ہے۔سیکولرزم جن لوگوں کی ایجاد ہے، ان کا خود عمل یہ ہے کہ نہ صرف ان کی یونیورسٹیوں میں اسلامیات کے شعبے قائم ہیں، بلکہ ان کے یہاں اسلامیات کی تحقیقات کے مستقل ادارے ہیں، جن میں اسلامی آثار کو بھی ظاہر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ایک ہندوستان کی سیکولرزم ہے کہ پہلے عثمانیہ یونیورسٹی سے اردو زبان اوراسلامیات کو ختم کر کے سیکولر بنایا گیا۔اب مسلم یونیورسٹی کا نمبر ہے۔

مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے مسلمانوں کی بہت بڑی متاع اوران کا سرچشمۂ حیات ہے۔ اس کی روح کو ختم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ان کی شہ رگ کاٹ دی گئی، جس کو مسلمان کسی حالت میں بھی انگیز نہیں کر سکتے۔ وہ بڑے بڑے مصائب جھیل لے گئے لیکن مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں سارے مسلمان تلملا اٹھے ہیں، جس کا اندازہ ان کے متحدہ اور مسلسل احتجاج سے کیا جاسکتا ہے۔اگر حکومت اپنے ارادہ پر قائم رہی اوراس کے دستور میں کوئی ایسی تبدیلی کی جس سے اس کی خصوصیات یا اس کی آزادی کو نقصان پہنچا تو مسلمان ہر قیمت پر اس کو بچانے کی کوشش کریں گے اور عجب نہیں کہ اس سے ان کی زندگی کا رخ بدل جائے، جو قومی یکجہتی کے لیے انتہائی مضر ہے۔

مسلم یونیورسٹی حکومت کی سیکولرزم کا بھی بہت بڑا نشان ہے۔ چنانچہ اسلامی ملکوں کی جو بڑی شخصیتیں بھی ہندوستان آتی ہیں۔ان کو یونیورسٹی ضرور دکھائی جاتی ہے۔ اگر اس کو بدلا گیا تو سیکولرزم کا ایک بڑا نشان مٹ جائے گا اور پوری اسلامی دنیا میں اس کی بدنامی ہوگی۔اس لیے یونیورسٹی

کے دستور میں کوئی بنیادی تبدیلی کرنا ہر حیثیت سے حکومت کے لیے مضر ہے۔ اب تک جو کچھ ہوا اس کی تلافی کی شکل یہی ہے کہ آرڈیننس کو واپس لیا جائے اور یونیورسٹی کے ہنگامہ کی آزادانہ تحقیقات کے بعد قانونی کارروائی کی جائے۔ اس واقعہ کو آڑ بنا کر یونیورسٹی کو مسخ نہ کیا جائے۔ یہ وائس چانسلر صاحب کے امتحان کا بھی وقت ہے کہ وہ یونیورسٹی کے اسلامی کردار کو کہاں تک قائم رکھتے ہیں۔

(معارف، جون ۱۹۶۵ء)

مسلم یونیورسٹی میں آرڈیننس

مسلم یونیورسٹی کے خلاف جو آرڈیننس نافذ کیا گیا ہے وہ طاقت کا نہایت غلط استعمال ہے۔ اس لیے اس کے خلاف جس قدر بھی احتجاج کیا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن آرڈیننس بہر حال عارضی ہے۔ یونیورسٹی کے مستقل نظام پر اس کا اثر نہیں پڑتا۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آئندہ حکومت اس کے دستور میں کیا تبدیلی کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ مسلم یونیورسٹی ایک خود مختار تعلیمی ادارہ ہے۔ دوسرے اس حیثیت سے وہ اسلامی بھی ہے کہ اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ تعلیم کے ساتھ اسلامی تہذیب و روایات کے مطابق مسلمان طلبہ کی تربیت کی جائے، جس کو موجودہ بحث میں اسلامی کردار سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو لوگ اسلام کے نام سے گھبراتے ہیں وہ اقلیتی کردار سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ کردار، مسلمانوں کا مسلمہ دستوری حق ہے، اس لیے حکومت کو یونیورسٹی میں کسی ایسی تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں ہے جس سے اس کے کردار اور خود مختاری میں فرق آئے۔

اس سلسلہ میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ اسلامی کردار سے مراد کیا ہے اور اس کے حدود کیا ہیں؟ چھاگلہ صاحب کے نزدیک جیسا کہ ان کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے۔ اس سے مراد اسلامی تہذیب و ثقافت کی تحقیقات ہے، یعنی مسلم یونیورسٹی میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی تحقیقات کو اہمیت دی جائے۔ لیکن یہ اسلامی کردار نہیں بلکہ ریسرچ یا علمی تحقیق ہے، جس کو یورپ کی بہت سی یونیورسٹیاں انجام دے رہی ہیں۔ اور انہوں نے اسلامیات پر جتنا کام کیا ہے وہاں تک پہنچنے کے لیے مسلم یونیورسٹی کو ایک مدت درکار ہوگی، اگر اسلامی کردار اسی کا نام ہے تو پھر یہ ساری یونیورسٹیاں مسلم ہیں۔ ان میں اور مسلم یونیورسٹی میں فرق کیا ہوا؟

اصل میں جو لوگ اسلامی کردار کے مفہوم ہی سے ناآشنا ہیں یا ان کی نگاہ میں اس کی کوئی

اہمیت نہیں اور وہ اس کو نام نہاد ترقی پسندی اور قومی وحدت کے انضمامی تصور کے منافی سمجھتے ہیں۔ ان کو اسلامی کردار کی تعیین کا کوئی حق نہیں ہے۔ ان کو اس کا تو حق ہے کہ وہ یونیورسٹی کے لیے اسلامی کردار کی ضرورت اور اہمیت ہی سے علانیہ انکار کردیں لیکن اتنی اخلاقی جرأت نہیں، اس لیے وہ اس کو فرقہ پروری، رجعت اور علاحدگی پسندگی کی آڑ لے کر مسخ کرتے رہتے ہیں۔ اس کی تعبیر و تعیین کا حق ان ہی لوگوں کو ہے جو اسلامی کردار کو مسلمانوں کا سرچشمۂ حیات اور تعمیر ملت کی بنیاد سمجھتے ہیں۔

اس کے لیے تنہا اسلام کے بعض ظاہری مظاہر مثلاً دینیات کی رسمی تعلیم، ہوسٹلوں میں نماز کا انتظام، رمضان میں ڈائننگ ہال کی نمائشی بندش، اسلامی تقریبات کا انعقاد، میلاد کے جلسے اور اسی قبیل کی دوسری ظاہری چیزیں کافی نہیں ہیں، بلکہ اس وہ اسلامی روح مراد ہے، جس سے مسلمان طلبہ میں دینی احساس، اسلامی شعائر کا احترام، ان کی عظمت اور ملی غیرت وحمیت کا جذبہ بیدار رہے۔ یونیورسٹی کے احاطہ کے اندر اس کے کسی متوسل کو اسلامی عقائد و تصورات کی علانیہ مخالفت کی اجازت نہ دی جائے، اسلامی علوم وفنون کی تحقیقات اور دینی تعلیم کو خاص اہمیت دی جائے۔ یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں خواہ تعلیمی ہوں یا انتظامی۔ مسلمانوں کی نمایاں اکثریت اور ان کا اقتدار ہو، انتظامی مجالس کے ارکان کی اکثریت کا انتخاب جمہوری طریقہ پر کیا جائے، حکومت کے نامزد کردہ ارکان کی تعداد کم سے کم رکھی جائے۔ غیر مسلم ارکان ایسے منتخب اور نامزد کیے جائیں، جو مسلمانوں کی تہذیب و روایات سے واقف اور یونیورسٹی کے ہمدرد و ہوا خواہ ہوں، ایسے غیر مسلموں کی آج بھی کمی نہیں ہے۔ اس کے بغیر یونیورسٹی کا کردار قائم نہیں رہ سکتا۔

یہ چیز نہ رجعت پسندی ہے اور نہ فرقہ پروری اور نہ قومی وحدت اور سیکولرزم کے خلاف ہے، بلکہ اقلیتوں کا ایک تسلیم شدہ دستوری حق ہے، جس کو نہ حکومت سلب کرسکتی ہے اور نہ کسی ترقی پسند کو اس کی اجازت دی جاسکتی ہے، خود ہندوستان میں ہندو یونیورسٹی ہندو کردار کا اور عیسائی مشنریوں کے بعض کالج عیسائی کردار کا نمونہ موجود ہیں۔ درحقیقت ان کو ان کے کردار کے ساتھ قائم رکھنا ہی سیکولرزم اور جمہوریت ہے۔ مسلم یونیورسٹی اس معنی میں یقیناً سیکولر اور قومی ہے کہ اس کے دروازے بلا تفریق مذہب وملت سب فرقوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں اور وہ اختلاف مذہب کی بنا پر کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کرتی اور آج سے نہیں، بلکہ علی گڑھ کالج کے قیام کے زمانہ سے لے کر

اب تک ہر زمانہ میں یہاں غیر مسلم طلبہ کی خاصی تعداد رہی ہے، جن میں بعض نامور لوگ بھی ہیں لیکن اس معنی میں یقیناً مسلم ہے کہ اس کی فضا اور اس کا کردار اسلامی اور اس میں مسلمانوں کی اکثریت اور اس کا اقتدار ہونا ضروری ہے۔ یہی حقوق ہندو یونیورسٹی کو بھی حاصل ہیں۔

اسلامی کردار کے نام سے بھڑکنے کی ضرورت نہیں۔ یہ چیز قومی وحدت و یکجہتی کے قطعاً منافی نہیں۔ علاحدگی پسندی مسلمانوں کے قومی مزاج کے خلاف ہے۔ انہوں نے کبھی کسی قوم اور کسی تہذیب سے چھوت نہیں کی، جہاں گئے ملکی باشندوں میں گھل مل گئے اور ان کی اور اپنی تہذیب کو ملا کر تہذیبی یک رنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ خود ہندوستان میں ایک مشترک تہذیب اور مشترک زبان پیدا کی جس میں دونوں تہذیبوں کے یکساں عناصر ہیں اور ہندوستان کی احیائی ذہنیت سے پہلے یہ زبان اور یہ تہذیب ہندو مسلمانوں کے بڑے طبقہ کی مشترک تہذیب و زبان سمجھی جاتی تھی۔ مختلف ٹکڑوں میں بنے ہوئے ہندوستان کو جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے تھے۔ متحدہ ملک بنایا، قومی وحدت کا تصور پیدا کیا، ان سے پہلے ہندوستان مختلف طبقوں اور فرقوں میں بٹا ہوا تھا۔ اور ان میں باہم اتنا ہی بغض وعناد تھا۔ جتنا دشمنوں میں ہوسکتا ہے۔ اس لیے ہندوستان کی وحدت اور قومی یکجہتی کے پہلے معمار مسلمان ہی ہیں اور علاحدگی پسندی کے وہ لوگ مجرم ہیں، جو وحدت کے ان آثار کو مٹانے کے درپے ہیں۔

آزاد مشرب ترقی پسندوں بلکہ تخریب پسندوں کا ایک طبقہ عرصہ سے مسلم یونیورسٹی کے روایات اور خصوصیات کو مٹانے کی کوشش میں مصروف ہے، لیکن وائس چانسلر صاحب ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جو پشتہا پشت سے اسلامی تہذیب و روایات کا حامل رہا ہے اور وہ خود اسی تہذیب کے پروردہ ہیں۔ ان سے بڑھ کر ان کا واقف کار اور کون ہوسکتا ہے اس لیے ان سے توقع یہی ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی خصوصیات کو قائم رکھنے کی کوشش کریں گے۔ ان کے سامنے ان کے پیش رو بدرالدین طیب جی کی مثال موجود ہے۔ جن کو اسلامی تہذیب و روایات سے اتنا گہرا تعلق نہ تھا۔ جتنا موجودہ وائس چانسلر صاحب کو ہے۔ اس لیے ان پر ان سے زیادہ اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ (معارف، جولائی ۱۹۶۵ء)

مسلم یونیورسٹی کی تحریک اور حکومت

حکومت مسلم یونیورسٹی کی تحریک دبانے پر تلی ہوئی ہے۔ ندائے ملت کے مسلم یونیورسٹی نمبر

کی ضبطی اور اس کے عملہ کی گرفتاری اسی کا نتیجہ ہے، ورنہ جو پرچہ پبلک کے ہاتھوں میں پہنچا بھی نہیں تھا، محض شبہہ کی بنا پر اس کی ضبطی اور اس کے عملہ کی گرفتاری کا کوئی قانونی جواز نہیں ہے۔ اشاعت کے بعد اگر اس کا کوئی مضمون قابل اعتراض نظر آتا تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کی جاسکتی تھی۔ اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو خوف زدہ کر کے اولڈ بوائے کنونشن کو ناکام بنایا جائے، لیکن یہ امر قابل اطمینان ہے کہ کنونشن بخیر وخوبی کامیابی کے ساتھ انجام پا گیا۔ باہر کے ایک ہزار سے زیادہ نمایندوں نے شرکت کی۔ ایسے اجتماع میں نرم گرم تقریروں کا ہونا ناگزیر ہے، لیکن دونوں نے مل کر کنونشن میں اعتدال پیدا کردیا تھا۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب کی تقریر بڑی موثر اور قومی جذبات سے معمور تھی۔ کنونشن کے صدر یٰسین نوری صاحب کا خطبہ صدارت نہایت متوازن اور مدلل تھا۔ انہوں نے مسلم یونیورسٹی کی تاریخ کی روشنی میں بڑی خوبی کے ساتھ مسلمانوں کے دستوری حق کی وکالت کی، جس میں یونیورسٹی کے متعلق ان کے تمام مطالبات آگئے ہیں۔ کنونشن میں جو تجویزیں منظور ہوئی ہیں ان کو عمل میں لانے کے لیے ایک کمیٹی کے قیام کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس کنونشن کی کامیابی کا سہرا منشی احترام علی صاحب صدر استقبالیہ کے سر ہے۔

جب حکومت یقین دلاتی ہے کہ یونیورسٹی کا کردار نہ بدلا جائے گا اور مسلمان یہی چاہتے ہیں تو پھر مسلمانوں کی پُرامن کوشش کو سختی سے دبانے کے کوئی معنی نہیں، البتہ کردار کے مفہوم کی تعبیر وتعیین میں اختلاف ہوسکتا ہے، لیکن اصولاً اس کی تعیین کا حق صرف مسلمانوں کو ہے اور وہی کردار صحیح مانا جائے گا جو مسلمان متعین کریں۔ اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا کہ نام کے لیے یونیورسٹی کا نظام مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہنے دیا جائے لیکن کورٹ اور اکزیکٹو کونسل کو یونیورسٹی کے ملازمین اور حکومت کے نامزد کردہ مسلم اور غیر مسلم ممبروں سے بھر دیا جائے اور اس کی حیثیت گھٹا کر وائس چانسلر کی مجلس مشاورت کی کردی جائے۔ یہ تو محض ایک کھیل ہوگا جس میں بظاہر یونیورسٹی کا نظام مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہے گا لیکن حقیقتاً اس کی باگ حکومت کے ہاتھوں میں آجائے گی اور اس کی خودمختار حیثیت اور اس کا کردار دونوں ختم ہوجائیں گے۔ اس قسم کے کھیل بہت پرانے ہوچکے جو اس زمانہ میں نہیں چل سکتے۔

اس مسئلہ کے حل کی شکل صرف یہی ہے کہ یونیورسٹی ایکٹ میں کوئی تبدیلی نہ کی جائے جس سے اس کے کردار اور اس کی خودمختاری میں فرق آئے۔ اس کے سارے پہلوؤں پر بیانات اور

مضامین نکل چکے ہیں۔ ہم بھی گذشتہ پرچہ میں اپنے خیالات ظاہر کر چکے ہیں اور کنونشن نے ان مطالبات کو جامع اور مرتب شکل میں پیش کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ جو شکل بھی اختیار کی جائے گی اس سے مسلمان کبھی مطمئن نہ ہوں گے۔ ان میں اور حکومت میں ایک مستقل کشمکش پیدا ہو جائے گی جو دونوں کے لیے مضر ہوگی۔ اس قضیہ کے حل کی ایک شکل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہندو یونیورسٹی کے کورٹ اور اکزیکٹو کونسل کی جو شکل ہے وہی مسلم یونیورسٹی میں بھی جاری کر دی جائے، گو بعض حیثیتوں سے ان دونوں کا موازنہ بھی صحیح نہیں ہے۔ اس کے حکومت کے نامزد کردہ ارکان بھی اس کے کردار کے سب سے بڑے محافظ ہوں گے۔ یہ فخر تو صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ ان کو حکومت کی خوش نودی کے لیے ملت فروشی میں بھی عار نہیں ہوتا اور ہندو یونیورسٹی میں مسلمانوں کی موثر حیثیت کیا ان کی ممبری کا بھی کوئی سوال نہیں ہے۔ (معارف، اگست ۱۹۶۵ء)

دارالمصنّفین کی کتابوں کا سرقہ

ہم نے گذشتہ مہینہ ایک معتبر راوی کی اطلاع پر لکھا تھا کہ ادارۂ آئینۂ ادب انارکلی لاہور نے سیرۃ النبیؐ کا پورا سیٹ چھاپ لیا ہے۔ اب اس ادارے کے مالک عبدالسلام صاحب کا خط ہمارے پاس آیا ہے کہ ”یہ اطلاع سراسر غلط ہے جن صاحب نے یہ اطلاع دی ہے ممکن ہے ان کو اس لیے غلط فہمی ہوئی ہو، کیونکہ ہم نے دارالمصنّفین کی مطبوعہ سیرت کی عمدہ جلد بندھوا کر اور گرد پوش لگا دیا ہے۔ آئینۂ ادب ایسا ادارہ نہیں ہے جو اس قسم کی حرکتیں کرتا ہو“۔

ہمارے پاس جو اطلاع آئی تھی وہ اس قدر واضح تھی کہ اس میں کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں تھی۔ ہم نے اس خط کا ضروری حصہ بھی معارف میں شائع کر دیا تھا اور اصل خط ہمارے پاس محفوظ ہے، پھر یہ اطلاع ایک ثقہ اہل قلم نے دی تھی، جو کئی کتابوں کے مصنف اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کے سوانح نگار اور غالباً ان کے متوسلین میں بھی ہیں۔ اس لیے ان کی اطلاع پر یقین کر کے ہم نے معارف میں اس کا ذکر کر دیا۔ اتنی فروگذاشت ضرور ہوئی کہ براہ راست آئینہ ادب والوں سے اس کی تحقیقات نہیں کی۔ اب اس کی تردید کے بعد ہم کو پورا یقین ہے کہ یہ اطلاع کسی غلط فہمی ہی کا نتیجہ تھی، لیکن گل رعنا اور شعرالہند کی اشاعت کی جس کو ایک دوسرے ادارے نے شائع کیا ہے۔ ابھی تک تردید نہیں ہوئی ہے، ہم اس کی تحقیقات کر رہے ہیں۔ (معارف، ستمبر ۱۹۶۵ء)

مسلم یونیورسٹی کی قسمت کا فیصلہ

بالآخر مسلم یونیورسٹی کی قسمت کا فیصلہ ہوگیا۔ نئے ایکٹ نے اس کی خودمختاری اوراس کی روح دونوں کا خاتمہ کردیا۔جس یونیورسٹی کی اکزیکٹوکونسل اورکورٹ کے سارے ممبر حکومت کے نامزد کردہ ہوں وہ خودمختار کہلانے کی کہاں تک مستحق ہے۔اس کی روح اوراس کا کرداراس طرح ختم ہوا کہ ۵۱ ممبروں میں گیارہ غیر مسلم ہیں، چالیس مسلمان ممبروں میں اکثریت وابستگان حکومت اور سیکولر مسلمانوں کی ہے جن کو اسلامی کردار سے کوئی زیادہ دلچسپی نہیں اوراس کو وہ سیکولرزم کے خلاف سمجھتے ہیں، جن ممبروں کوحکومت سے بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے وہ بھی اس کے اثر سے آزاد نہیں ہیں۔ صرف چند ممبر مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کرسکتے ہیں۔لیکن یونیورسٹی کی موجود فضا میں اس کی جرأت کون کرے گا اوراس کی آواز کا کیا اثر ہوسکتا ہے۔ایسی حالت میں یونیورسٹی کے اسلامی کردار کے باقی رہنے کا کیا امکان رہ جاتا ہے۔سیکولر مسلمانوں کو مبارک ہو کہ انھوں نے مسلمانوں کی سب سے قیمتی متاع کو سیکولر بنا کر چھوڑا۔ یہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایسا المیہ ہے جس کو وہ کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔

پرانے نیشنلسٹ مسلمانوں کو اپنے مذہب وملت اوراپنی تہذیب وروایات کا بھی لحاظ تھا۔ اس لیے اب وہ نئے ترقی پسند نیشنلسٹوں کے مقابلہ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں اورسیکولر مسلمانوں کا نیا طبقہ پیدا ہوگیا ہے،جس نے پوری زندگی کو سیکولرزم کے دائرے میں داخل کرلیا ہے اوراپنی تہذیب و ثقافت کو بھی سیکولر بنانا چاہتا ہے اوراس میدان میں ان میں مسابقت شروع ہوگئی ہے۔دیکھنا یہ ہے کہ سیکولرزم کی انتہا کہاں جاکر ہوتی ہے اوراس میدان میں بازی کن خوش قسمتوں کے ہاتھ رہتی ہے۔ ہمارے خیال میں ''سیکولر مسلمان'' کی اصطلاح میں بھی فرقہ پروری کی بوآتی ہے۔مسلمان کو بھی اڑا دینا چاہیے تاکہ بغیر کسی آمیزش کے خالص سیکولرزم باقی رہ جائے۔

مسلم یونیورسٹی کی قلب ماہیت بھی انھی سیکولر مسلمانوں کا کارنامہ ہے۔انھوں نے اپنے گمان میں مسلم یونیورسٹی کی روح ختم کرکے اپنے سیکولرزم کا ثبوت دیا ہے اور ملک وقوم کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔لیکن حقیقتاً ان دونوں کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ چند نام نہاد مسلمانوں کے سوا پوری مسلمان قوم نے آرڈیننس اور یونیورسٹی بل کی ایسی متفقہ مخالفت کی جس

کی نظیر ہندوستان کی آزادی کے بعد نہیں ملتی اور ان کو یونیورسٹی کی قلب ماہیت کا انتہائی دکھ ہے اور اس کے اثر کو وہ اپنے دل سے کبھی نہیں مٹا سکتے۔ اس لیے ایسے حالات میں جب کہ ملک کے تمام فرقوں میں زیادہ سے زیادہ اتحاد و یکجہتی کی ضرورت ہے۔ چھ کرور مسلمانوں کو حکومت سے بد دل کرنا ملک کی کوئی خدمت نہیں ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے مخالفوں اور سیکولر مسلمانوں نے جو کچھ کیا اس پر ہم کو تعجب نہیں ہے۔ ان کا تو کام ہی یہی ہے۔ البتہ شاستری جی کی خاموشی پر حیرت ہے۔ اتنا بڑا واقعہ ہو گیا مگر اس کے بارہ میں انھوں نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ وہ مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں مسلمانوں کے جذبات سے پوری طرح واقف ہیں، بلکہ ہمارا حسن ظن تو یہ ہے کہ اس مسئلہ میں ان کا نقطہ نظر مسلمانوں کے جذبات سے زیادہ قریب ہوگا۔ انھوں نے ایسا ایکٹ کیوں بننے دیا، جو نہ صرف مسلمانوں کے جذبات بلکہ حکومت کے مصالح کے بھی خلاف ہے۔ اگر پنڈت جواہر لال زندہ ہوتے تو مسلم یونیورسٹی کا یہ حشر نہ ہونے پاتا۔ اس لیے شاستری جی کو مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں بھی ان کی جانشینی کا حق ادا کرنا چاہیے۔ اس کی تلافی اب بھی ہو سکتی ہے۔ آیندہ جو مستقل ایکٹ بننے والا ہے۔ اس کو جلد سے جلد بنایا جائے۔ اس میں کورٹ کو با اختیار ادارہ رکھا جائے۔ اس کے ممبروں کی تعداد بڑھائی جائے۔ ان کا انتخاب جمہوری طرز پر کیا جائے، مسلمانوں کی تمام اہم جماعتوں کو نمایندگی دی جائے تا کہ کورٹ میں ان کے اصلی نمایندے جا سکیں۔ جو حکومت کی نامزدگی کے ذریعہ ممبری قبول کرنا پسند نہ کریں گے۔ اس کے بغیر یونیورسٹی کا کردار اور اس کی خود مختاری قائم نہیں رہ سکتی۔ (معارف، اکتوبر ۱۹۶۵ء)

جمعیۃ علمائے ہند میں اختلافات

جمعیۃ علمائے ہند کی بنیاد بڑی مقدس ہستیوں کے ہاتھوں پڑی تھی اور اس کے کارناموں کی ایک شاندار تاریخ ہے۔ لیکن اس کا "شاندار ماضی" حال کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے۔ جمعیۃ کی آخری شخصیت مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم تھے، جنھوں نے اس کے وقار اور روایات کو قائم رکھا۔ ان کے بعد کوئی ایسی مضبوط شخصیت نہیں رہ گئی جو اس بار کو پوری طرح سنبھال سکتی۔ اس لیے ان کی آنکھ بند ہوتے ہی جمعیۃ میں انتشار، پارٹی بندی، حصول اقتدار کی جنگ اور ایک دوسرے کے خلاف بیانات اور پمفلٹ بازی کا مستقل سلسلہ شروع ہو گیا اور علمائے کرام کی جماعت نے اس کے ایسے ایسے

نمونے پیش کیے، جن کو دیکھ کر دنیادار بھی انگشت بدنداں رہ گئے۔ اس بارہ میں ہمارا مسلک ہمیشہ یہ رہا ہے کہ

رموز مملکت خویش خسرواں دانند گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

لیکن جمعیۃ کی خانہ جنگی اور اس کے وقار کو ختم ہوتے دیکھ کر ضبط نہ ہوسکا۔ اس لیے اس کے محترم اراکین کی خدمت میں کچھ عرض کرنے کی جسارت کی۔ دور کے تماشائی اس کا فیصلہ تو نہیں کرسکتے کہ کون فریق حق پر ہے اور کون ناحق پر، کس کا بیان صحیح ہے، کس کا غلط، لیکن دو باتیں غیر جانبدار لوگوں کی نگاہ میں بھی کھٹکتی ہیں۔ ایک مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے ساتھ نئی جمعیۃ کا سلوک، دوسرے مجلس مشاورت سے اس کی برأت، مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی شخصیت اور ان کے قومی اور ملی خدمات سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کرسکتا۔ وہ جمعیۃ کے کاموں میں مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم کے دست راست تھے اور اس کے پرانے رکن رکین ہیں۔ اس لیے ان کی وفات کے بعد وہ سب سے زیادہ ان کی جانشینی کے مستحق تھے۔ اس لیے جمعیۃ سے ان کو اکھاڑ پھینکنا صریح زیادتی ہے۔ اس سے بڑھ کر بدنما حرکت ان پر خیانت کا الزام اور اس کی تشہیر ہے، جس کا تصور کوئی بھی شریف انسان مفتی صاحب کے متعلق نہیں کرسکتا اور جس کی اصل حقیقت ان کے بیان سے ظاہر ہوگئی ہے۔ کیا ارباب جمعیۃ اس بارہ میں حسن ظن اور تاویل سے کام نہیں لے سکتے تھے۔ اگر خدانخواستہ یہ واقعہ صحیح بھی ہوتو کیا ستر مومن کا تقاضا یہی تھا کہ ایک محترم شخصیت کو بدنام کرنے کے لیے مجلس میں اس پر بحث اور اخبارات میں اس کا اعلان کیا جائے۔ اس سے مفتی صاحب کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آیا، البتہ الزام لگانے والوں کی سیرت ظاہر ہوگئی۔

دوسرا غلط اقدام مجلس مشاورت سے جمعیۃ کی تبری اور جمعیۃ کے ارکان پر اس میں شرکت کی بندش ہے۔ مجلس مشاورت کوئی فرقہ وارانہ اور جمعیۃ کی حریف تنظیم نہیں، بلکہ ہر مکتب خیال کے مسلمانوں کی مشترکہ جماعت ہے، جس میں قوم پرور مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے۔ ان میں ڈاکٹر سید محمود صاحب اور یٰسین نوری جیسے پرانے اور پکے کانگریسی ہیں، جن کی قوم پروری پر کوئی حرف نہیں رکھا جاسکتا اور جن کی خالص قومی و وطنی خدمات جمعیۃ کے موجودہ اراکین سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس کے اغراض و مقاصد میں کوئی چیز بھی قوم پروری کے خلاف نہیں بلکہ اس کا ایک بڑا مقصد قومی اتحاد و

یکجہتی کوفروغ دینا بھی ہے۔اگر بالفرض جمعیۃ کے نقطہ نظر سے اس میں کوئی بات قابل اعتراض ہے تو اس میں رہ کراس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے، نہ کہ اس پر فرد جرم لگا کراس سے علاحدگی اختیار کی جائے۔حکومت اور اکثریت کی نگاہ میں اس کو مشکوک بنایا جائے اور ارکان جمعیۃ کے لیے اس کو شجر ممنوعہ قرار دیا جائے۔ حیرت ہے کہ جمعیۃ نے ایسا غلط فیصلہ کس طرح کیا۔ جمعیۃ کا وقار اور اس کی عظمت، مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی، ان کی خدمت اور ان میں مقبولیت سے وابستہ ہے۔اگر وہ اس فیصلہ پر قائم رہی تو ممکن ہے اس کو ایک خاص طبقہ کی داد وتحسین اور حکومت کی خوشنودی حاصل ہوجائے،لیکن مسلمانوں کی نگاہوں سے اس کا وقار بالکل ختم ہوجائے گا۔ابھی ۵ر نومبر کو اخبار مدینہ نے دارالعلوم دیوبند کے بارہ میں جمعیۃ والوں کے جس منصوبے کی خبر دی ہے اگر وہ صحیح ہے تو انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنے کے سوا اور کیا کہا جائے۔کاش ارباب جمعیۃ کو اس کا احساس ہوجائے کہ ان کی یہ روش ان کو کس منزل کی طرف لے جارہی ہے۔ہم نے یہ باتیں بڑے دکھ لیکن اخلاص کے ساتھ لکھی ہیں بشرطیکہ جمعیۃ کے محترم ارکان کی نگاہ میں بھی قابل توجہ ٹھہریں۔

یہ سطریں لکھی جاچکی تھیں کہ جمعیۃ کے اختلافات کو ختم کرنے کے لیے مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور مولانا اسعد میاں کی اپیل نظر سے گذری۔یہ خوش خبری ہر مسلمان کے لیے باعث مسرت ہے۔اس سے بڑھ کر مبارک خیال اور کیا ہوسکتا ہے۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ فریقین کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے اور جمعیۃ کا وقار مسلمانوں میں باقی رہ جائے، مگر اس کا افسوس بھی ہے کہ علمائے کرام کا اختلاف دور کرنے کے لیے حکومت کے وزراء مسٹر ہمایوں کبیر، جنرل شاہنواز اور جناب نورالدین احمد کو درمیان میں آنا پڑا۔بہرحال اصلاح ذات البین ہر مسلمان کا فریضہ ہے۔اگر ان کے ذریعہ بھی اصل مقصد حاصل ہوجائے اور ارباب جمعیۃ میں پائیدار مفاہمت کی کوئی شکل نکل آئے تو بھی غنیمت ہے۔(معارف، نومبر ۱۹۶۵ء)

سیکولرازم اور اکثریت کی وفاداری

بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہر زمانہ میں یکساں قائم رہتی ہیں۔زمانہ کے تغیرات کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔انہی میں ''الناس علی دین ملوکھم'' بھی ہے۔اس مقولہ میں دین سے مراد مذہب نہیں بلکہ خیالات ورجحانات اور طریقۂ زندگی ہے۔البتہ اس زمانہ کے لحاظ سے ملوک کے

بجائے حکومت کہا جائے گا۔ طریقۂ زندگی میں ایک اثر پذیری تو فطری ہے، جب دو قومیں یا دو تہذیبیں ایک دوسرے سے ملیں گی تو ان کا دوسرے سے متاثر ہونا طبعی اور ناگزیر ہے، جس طرح ایک زمانہ میں ہندو مسلمان ایک دوسرے کی تہذیب سے متاثر ہوئے لیکن یہ دونوں تہذیبوں کا حسین اور فطری امتزاج تھا۔ دوسرا تاثر مرعوبیت، احساس کمتری، حکومت سے تقرب، اس کی خوش نودی اور منصب و جاہ کی طلب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال انگریزوں کے زمانہ کے ''دیسی صاحب'' اور حکومت کے مقرب و خطاب یافتہ ہندو مسلمان تھے۔ ہندو مسلمان فطری طور پر ایک دوسرے کی تہذیب سے جتنا متاثر ہونا تھا، ایک ہزار سال میں ہو چکے۔ اب مسلمانوں کی مزید اثر پذیری، ان کی مرعوبیت، احساس کمتری، حکومت سے تقرب، اس کی خوش نودی اور منصب و جاہ کی طلب کا نتیجہ ہے۔ یہ اثر پذیری ان مسلمانوں میں زیادہ ہے جو حکومت سے وابستہ اور اس کے فوائد اور مناصب کے طالب ہیں۔ اس کی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ اس کا اندازہ ہر شخص کو ہوگا۔

یہاں تک بھی غنیمت تھا، اس سے بھی بڑھ کر مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو اپنی سیکولرازم اور حکومت و اکثریت کی وفاداری کے ثبوت اور ان کی خوش نودی کے جنون میں ایسی ایسی خفیف حرکتیں کرتا ہے، جس کا کوئی خوددار انسان تصور نہیں کر سکتا۔ اسلام اور مسلمانوں کی نسبت سے گھبراتا ہے، سیکولرازم کے پردہ میں اسلامی تہذیب و روایات کی مخالفت کرتا ہے، مسلمانوں کو فرقہ پروری کا مجرم بناتا ہے، ان کے خلاف جاسوسی تک کرتا ہے، اس کی نگاہ میں پرانے نیشنلسٹ مسلمان بھی جن میں قوم پروری کے ساتھ ملی احساس بھی ہے، فرقہ پرور ہیں۔ چنانچہ وہ ان کٹر نیشنلسٹ مسلمانوں کو بھی جو کسی فرقہ وارانہ یا اسلامی جذبہ کے ماتحت نہیں بلکہ خالص جمہوری اور سیکولر نقطہ نظر سے مسلمانوں کے ساتھ بھی انصاف چاہتے ہیں، نہیں بخشتا کسی کی زبان پر مسلمان کا نام آیا اور اس نے فرقہ پروری کا لیبل لگا دیا اور پاکستانی ایجنٹ کا خطاب دے دیا۔ ایک خالص اور پرانے نیشنلسٹ اخبار تک کو ان محتاط الفاظ میں اس کا اعتراف کرنا پڑا۔

> ''بعض سیاسی جماعتوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ مسلمانوں نے جہاں کوئی
> مطالبہ ایسا کیا جس کا تعلق صرف مسلمان فرقے سے ہے وہ جماعتیں شور مچانے لگتی ہیں
> کہ مطالبہ اپنی اسپرٹ میں پاکستانی ہے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان ہندوستان

کے ساتھ نہیں ہیں، پاکستان کے ساتھ ہیں۔ خیر یہ تو فرقہ پرور جماعتیں ہیں۔ کہیں تو کہیں، ان کا تو کام ہی یہ ہے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں میں بھی ایک گروہ ایسا ہے جو ہندو فرقہ پرور جماعتوں کی تحریکوں اور پروپگنڈے سے متاثر ہو کر مسلمانوں کی ان باتوں کو انہی کی نظروں سے دیکھنے لگتا ہے''۔ (قومی آواز، ۹/نومبر ۱۹۶۵ء)

معزز معاصر نے مسلمانوں کے اس نو پیدا طبقہ کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے لیکن اس کا جو سبب بتایا ہے وہ محض اس کی احتیاط ہے، ورنہ اس کا اصلی سبب وہ بھی جانتا ہے۔ درحقیقت یہ سب ''الناس علی دین ملوکھم'' کا نتیجہ ہے اور سیکولرازم کے نام پر کیا جاتا ہے۔ اس لیے اگر ایسے مسلمانوں کو حکومت اور اکثریت کا خوشامدی نہ سمجھا جائے تو کیا سمجھا جائے۔ محض سیکولرازم پر عقیدہ رکھنے والے مسلمان اس میں شامل نہیں ہیں لیکن حقیقتاً یہ جمہوریت اور سیکولرازم کی کوئی خدمت نہیں ہے۔ صحیح جمہوریت اور سیکولرازم یہ ہے کہ ہر فرقہ کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔ اس کی خصوصیات کے ساتھ اس کو زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا موقع دیا جائے۔ سب کو ایک رنگ میں رنگنے کی کوشش سیکولرازم اور جمہوریت نہیں بلکہ استبداد کی بدترین قسم ہے۔ اس لیے جو لوگ ایسا کرتے ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان سیکولرازم اور جمہوریت کے دشمن ہیں، ممکن ہے ان سیکولر مسلمانوں کو حکومت سے کچھ فوائد حاصل ہو جائیں لیکن اس کی نگاہ میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی اور نہ وہ اکثریت کا اعتماد حاصل کر سکتے ہیں۔ (معارف، دسمبر ۱۹۶۵ء)

دارالمصنّفین کی کتابیں اور پاکستان

تقریباً ڈیڑھ سال سے پاکستان میں دارالمصنّفین کی کتابوں کی تجارت بالکل بند ہے۔ عام اقتصادی حالات کی وجہ سے ہندوستان کی تجارت بھی بہت گھٹ گئی ہے اور اب اس کی آمدنی مشکل سے ایک تہائی رہ گئی ہے۔ ان حالات میں دارالمصنّفین کا چلنا بہت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ دوسرا نقصان یہ ہو رہا ہے کہ پاکستان میں دارالمصنّفین کی کتابوں کی طلب بدستور قائم ہے۔ اس کی کئی کتابیں وہاں کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہیں۔ اس لیے پاکستان کے تاجران کتب نے یہ کتابیں چھپوانا شروع کر دی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آیندہ جب پاکستان کی تجارت کھلے گی بھی تو وہاں کا بازار دارالمصنّفین کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

اس صورت حال پر غور کرنے کے لیے پہلی اور دوسری اکتوبر کو دارالمصنّفین کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہوا جس میں باہر کے ممبروں میں ڈاکٹر سید محمود صاحب، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد عمران خاں ندوی سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء، مولانا محمد اویس نگرامی استاد تفسیر دارالعلوم، سید شہاب الدین دسنوی پرنسپل صابو صدیق ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ بمبئی نے شرکت کی۔غور وفکر کے بعد مجلس نے طے کیا کہ دارالمصنّفین کی مالی حالت کو مستحکم کرنے کے لیے کم سے کم پانچ لاکھ کا سرمایہ جمع کیا جائے جس کو محفوظ کر دیا جائے، صرف اس کی آمدنی صرف میں لائی جائے، اس سرمایہ کی فراہمی کے لیے پورے ملک میں دارالمصنّفین کے معاونین کا حلقہ بنایا جائے، جس میں تین قسم کی رکنیت رکھی جائے (۱) ایک ہزار روپے یا اس سے زیادہ یکمشت دینے والے ارکان، (۲) پانچ سو یکمشت دینے والے (۳) ایک سو روپے سالانہ دس سال تک دینے والے، کتابی شکل میں اس کے معاوضہ کے اصول زیر غور ہیں۔

اس مقصد کے حصول کے لیے حسب ذیل ارکان کی ایک کمیٹی بنالی گئی ہے (۱) ڈاکٹر سید محمود صاحب، (۲) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، (۳) مولانا محمد عمران خاں، (۴) منشی عبدالعزیز صاحب انصاری بمبئی، (۵) سید شہاب الدین دسنوی بمبئی، (۶) جسٹس بشیر سعید احمد صاحب مدراس، (۷) مولوی حبیب الرحمٰن صاحب حیدرآباد، (۸) ناظم دارالمصنّفین اور (۹) شریک ناظم، یہ کمیٹی ملک کے مختلف حصوں میں معاونین بنانے کے لیے وقتاً فوقتاً دورہ کرے گی۔

دارالمصنّفین کی پچاس سالہ خدمات ملک کے سامنے ہیں اور ہم کو اس کی خوشی ہے کہ اہل علم نے ہمیشہ ان کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور اس کا اعتراف کیا، دارالمصنّفین نے جس زمانہ اور جن حالات میں اسلامی علوم وفنون، اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب وثقافت کی جو خدمت کی اور دوسرے جو دینی اور علمی کام انجام دیے۔آج کے حالات میں پہلے سے زیادہ ان کی ضرورت ہے۔اس لیے ہم کو امید ہے کہ ملک کے اصحاب علم اور اس کا صاحب استطاعت طبقہ اس تحریک کا خیر مقدم کرے گا۔ پانچ لاکھ رقم اتنی بڑی نہیں ہے کہ اس کو مسلمان مہیا نہ کرسکیں۔

دوسری درخواست پاکستان کے پریس اور وہاں کے اصحاب علم وقلم سے ہے۔اس سے پہلے جب پاکستان کے ناشروں نے دارالمصنّفین کی کوئی کتاب چھاپی تو وہاں کے اخبارات واہل قلم نے

اس کی پرزور مخالفت کی اور پوری قوت سے اس کو روکا، اس لیے ہم کو امید ہے کہ ان حالات میں جبکہ دارالمصنّفین بڑے نازک دور سے گذر رہا ہے وہ پاکستانی ناشروں کو دارالمصنّفین کی کتابوں کی طبع و اشاعت سے روکنے کی کوشش کرے گا۔ (معارف، اکتوبر ۱۹۶۶ء)

کانگریس اور مسلمان

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے کانگریس نے انہیں بالکل نظر انداز کر دیا۔ ان کی ایک شکایت بھی دور نہیں کی بلکہ ان کو ان کے جائز حقوق سے بھی محروم کر دیا۔ ان کی زبان اور ان کی تہذیب کو مٹانے کی کوشش کی۔ فرقہ پرور جماعتوں کو ان کے مقابلہ میں بالکل آزاد چھوڑ دیا۔ ایسی جماعت سے مسلمانوں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے، یوں تو ان کے بہت سے مسائل ہیں لیکن ان میں سے تین سب سے مقدم ہیں۔ اردو زبان، سیکولر تعلیم اور مسلم یونیورسٹی۔ اردو زبان اور سیکولر تعلیم پر ان کے مذہب و تہذیب کا دارومدار ہے۔ اردو ان کی تہذیبی و علمی زبان ہے۔ اس میں ان کے مذہب کا بڑا ذخیرہ ہے۔ سیکولر تعلیم سے کم سے کم ان پر کسی دوسری تہذیب و مذہب کا نقش قائم نہ ہونے پائے گا۔ مسلم یونیورسٹی ان کی تہذیب و روایات کا مرکز اور ان کے دل و دماغ کا سرچشمہ ہے۔ جب تک ان کے حسب منشا یہ مسائل حل نہ ہوں گے وہ مطمئن نہیں ہو سکتے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ اس لحاظ سے کانگریس اب بھی دوسری پارٹیوں کے مقابلہ میں غنیمت ہے۔ کم سے کم اس کے اصول و نظریات اعلیٰ ہیں۔ اس کے سامنے ایک تعمیری پروگرام ہے۔ اس کو ۱۹ سال کا برا بھلا تجربہ ہے، جو کسی دوسری پارٹی کو حاصل نہیں ہے۔ اس لیے اگر اب بھی وہ اپنی خامیوں اور غلطیوں کا جائزہ لے کر ان کی اصلاح کرے تو اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتی ہے، ورنہ اس کا خاتمہ یقینی ہے۔ (معارف، مارچ ۱۹۶۷ء)

ہندوستان میں اردو

اردو ادب مخالف حالات میں بھی جس طرح ترقی کر رہا ہے وہ اردو زبان کی مقبولیت کی دلیل ہے لیکن اگر اس کی تعلیم کا دروازہ بند رہا تو ایک دو نسلوں کے بعد اس کا خاتمہ یقینی ہے۔ یہ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ بہت سے اونچے مسلمان گھرانوں کے لڑکے اردو لکھنے پڑھنے پر قدرت نہیں رکھتے۔ اس میں حکومت سے زیادہ ان کے والدین کا قصور ہے۔ اردو کے معاملہ میں زبانی دعووں کے باوجود تمام پارٹیوں کا نقطۂ نظر ایک ہے۔ جب کانگریس کی حکومت اپنے اعلیٰ اصولوں، اقلیتوں کے

دستوری تحفظات اور سیکولرزم کے دعویٰ کے باوجود بیس سال کی طویل مدت میں اردو کے لیے کچھ نہ کرسکی تو متضاد عناصر کی معجون مرکب حکومتوں سے جن کو خود کوئی ثبات و قرار نہیں، کیا امید کی جاسکتی ہے، جس کا تجربہ بھی شروع ہوگیا ہے۔ یہ ذکر ضمناً آ گیا۔ اصلی مقصود یہ دکھانا ہے کہ اردو کا دامن کمیت کے لحاظ سے تو بلاشبہہ وسیع ہو رہا ہے لیکن کیفیت کے اعتبار سے سمٹ رہا ہے۔ اردو کے بیشتر ادیبوں اور اصحاب قلم کی پرواز شعر و ادب، اس کی تنقید، ترقی پسند ادب اور افسانوں سے آگے نہیں بڑھتی، نومشق بھی اسی سے طبع آزمائی کی ابتدا کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی تو اتنی بہتات ہوگئی ہے کہ ان سے دل گھبرانے لگا ہے لیکن ادبیات کے دائرہ میں علمی اور تحقیقی کاموں کی بڑی کمی ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ یونیورسٹیوں کے اردو کے شعبوں میں ان کے اساتذہ کے ذوق کے مطابق تحقیقی کام بھی ہو رہے ہیں، جن کی بدولت اردو زبان و ادب سے متعلق بعض اہم اور مفید کتابیں اور تحقیقی مقالات نظر آجاتے ہیں لیکن ادبیات کے دائرہ کے باہر علم و فن کی دوسری اصناف اور علمی مسائل و مباحث پر تحقیقات و تصانیف کی رفتار بہت سست ہوگئی ہے، بلکہ اس کا پرانا ذخیرہ بھی نایاب ہوتا جاتا ہے۔ (معارف، مئی ۱۹۶۷ء)

جمہوریہ ہند کی صدارت

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا انتخاب پرائمری اسکولوں کا نصاب تعلیم

جمہوریہ ہند کی صدارت کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا انتخاب حق بحق دار رسید کا مصداق ہے۔ ہندوستان میں اس عہدہ کے لیے ان سے زیادہ موزوں شخص مشکل سے مل سکتا تھا۔ وہ اپنے اوصاف و کمالات کے لحاظ سے بھی اس عہدہ کے مستحق تھے اور روایۃً بھی نائب صدر ہی کو صدر ہونا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور صدارت کا عہدہ دونوں ایک دوسرے کے لیے باعث زینت ہیں۔ ان کا انتخاب اس کا ثبوت ہے کہ ابھی کانگریس زندہ ہے۔ لیکن ان کی صدارت سے مسلمانوں کو کوئی غلط توقع قائم نہ کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب حکومت کے سب سے بڑے نمایندے ہیں۔ اس لیے اس کی پالیسی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے، البتہ بحیثیت سربراہ حکومت ان پر یہ ذمہ داری ضرور عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے دور صدارت میں جمہوریت اور سیکولرزم کو صحیح معنوں میں زندہ کرنے کی کوشش کریں گے، جس میں اقلیتوں کے حقوق بھی ہیں۔ ان کے ساتھ ایسا سلوک ہونا چاہیے کہ وہ بھی اپنے کو ہندوستان کا معزز شہری سمجھیں اور اکثریت کے مقابلہ میں اپنے کو فروتر محسوس نہ کریں۔

ڈاکٹر صاحب پکے نیشنلسٹ ہونے کے ساتھ راسخ العقیدہ مسلمان بھی ہیں، جس کا وہ فخریہ اظہار بھی کرتے رہتے ہیں، بلکہ ان کو اسلامی تہذیب و روایات کا نمایندہ کہنا صحیح ہوگا، مگر مسلمانوں کو حکومت کی کرسی کی کچھ نہ کچھ قیمت ضرور ادا کرنا پڑتی ہے۔ اس لیے اگر ڈاکٹر صاحب سے اس راہ میں بعض لغزشیں ہوگئیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ البتہ ڈاکٹر صاحب جیسے ہوش مند مرد مسلمان سے اس کی توقع نہیں تھی۔ مولانا ابوالکلام بھی حکومت کے رکن رکین تھے لیکن انہوں نے اپنی کسی وضع میں فرق نہیں آنے دیا۔ ڈاکٹر صاحب سے حسن ظن یہی رکھنا چاہیے کہ یہ لغزش اتفاقی ہے۔ اس سے ان کے اصلی مزاج میں فرق نہ آئے گا اور ہم کو امید ہے کہ وہ اس حسن ظن کو قائم رکھیں گے اور ہماری دعا ہے کہ ان کا دور صدارت ملک و ملت دونوں کے لیے مفید ثابت ہو۔

اردو کے معاملہ میں صوبائی حکومتوں سے کسی قسم کی کوئی توقع رکھنا بالکل بے سود ہے۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب کی صدارت سے اس کا موقع پیدا ہوگیا ہے کہ اردو کا مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا جائے۔ وہ برسوں انجمن ترقی اردو کے صدر رہ چکے ہیں۔ لکھنؤ کا اردو کنونشن ان ہی کی صدارت میں ہوا تھا اور صدر جمہوریہ کی خدمت میں بیس لاکھ دستخطوں کا میمورنڈم بھی ان ہی کی قیادت میں پیش ہوا تھا۔ اس لیے اردو کے سب سے بڑے وکیل وہی ہیں۔ اس لیے انجمن ترقی اردو ہند کا ایک وفد ان کی خدمت میں جانا چاہیے کہ وہ جن مطالبات کو حق سمجھتے تھے اور جن کی قیادت انہوں نے خود کی تھی۔ اب وہ اس کے بارہ میں کوئی فیصلہ کردیں۔ ان کی حق پرستی سے یہ امید نہیں ہے کہ جن مطالبات کو وہ صدارت سے پہلے صحیح سمجھتے تھے، اب ان کو غلط سمجھنے لگیں۔

سرکاری پرائمری اسکولوں کا نصاب تمامتر ہندو مذہب اور اس کی تہذیب و روایات کا ترجمان ہے، جس کو مسلمان بچے بھی پڑھتے تھے اور مسلمانوں کی مسلسل شکایت کے باوجود وہ نہیں بدلا گیا۔ اس لیے انہوں نے خود اپنے آزاد مکاتب قائم کیے، جن میں حکومت کے معیار تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ حکومت ہند نے جو تعلیمی کمیشن مقرر کیا تھا، اس نے اپنی رپورٹ پیش کردی ہے۔ اس نے جو سفارشیں کی ہیں، ان میں بعض سفارشوں کی زد اسلامی مکاتب اور دوسرے آزاد مدارس پر بھی پرتی ہے۔ اگر یہ سفارشیں منظور ہوگئیں تو ان مدارس اور مکاتب کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا جو اقلیتوں کے دستوری حقوق کے سراسر خلاف ہے۔ اور اس بارہ میں بمبئی ہائی کورٹ کا فیصلہ

بھی ہو چکا ہے، مگر ابھی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ سفارش کی منزل میں ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو اس کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ جن سفارشوں کی زد اسلامی مکاتب اور آزاد مدارس پر پڑتی ہے ان کو حکومت منظور نہ کرے، ورنہ ان سب کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا۔ (معارف، جون ۱۹۶۷ء)

مشاورت کا منشور اردو اور حکومت

اردو کا مسئلہ ادھر عرصہ سے ٹھنڈا تھا، مگر اب پھر اس میں گرمی پیدا ہوئی ہے۔ گذشتہ الیکشن میں کانگریس اور جن سنگھ کے علاوہ تمام پارٹیوں نے مجلس مشاورت کے منشور کو مانا تھا۔ اس میں اردو کا مسئلہ بھی تھا، اس لیے نئی حکومت کے قیام کے بعد وہ زور وشور سے اٹھا ہے اور اس کے لیے مختلف جماعتیں میدان عمل میں آگئی ہیں۔ سابق کانگریسی حکومت کے بعض وزراء نے بھی موقع کو غنیمت سمجھ کر اردو کی حمایت شروع کردی ہے۔ اس لیے حکومت اس کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہوگئی ہے۔ اردو دانوں کا اصل مطالبہ تو اردو کو اس کے صوبے کی دوسری سرکاری زبان بنانے کا ہے لیکن جن سنگھ اس کے خلاف ہے اور حکومت اسی کے سہارے پر قائم ہے۔ اس لیے وہ اس کے خلاف نہیں جاسکتی۔ کمیونسٹوں کے علاوہ دوسری پارٹیاں بھی جنہوں نے مشاورت کے منشور کو تسلیم کیا تھا۔ اردو کے معاملے میں حکومت کی کرسی خطرہ میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہیں لیکن اردو کو بنیادی حقوق دینے کے سب حامی ہیں، حتی کہ جن سنگھ کو بھی شرمی شرما ایک حد تک اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ وزیر اعلیٰ بھی ان حقوق کو دینے پر آمادہ ہیں لیکن ان کو قانونی شکل دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اور اس کے لیے انہوں نے ایک جن سنگھی وزیر کے ماتحت ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کردی ہے۔ ان دونوں باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب حیلہ سازی ہے، جن حقوق کو وہ تسلیم کرتے ہیں ان کو قانونی شکل دینے میں کیا قباحت ہے اور اس کے لیے تحقیقاتی کمیٹی کے قیام کی کیا ضرورت ہے۔ وہ بھی ایک جن سنگھی کی ماتحتی میں۔ اس کی جیسی سفارش ہوگی ظاہر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب دھوکا ہے۔ قانونی شکل دیے بغیر محض زبانی وعدے اور تحریری احکام کا کوئی اعتبار نہیں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جو حقوق ملیں وہ پورے صوبے کے لیے ہوں، محض چند مغربی اضلاع کے لیے نہیں۔

گذشتہ الیکشن میں کانگریس کی شکست نے اس کو بھی مسلمانوں کی شکایتوں کی تحقیقات کی طرف متوجہ کردیا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی نمایندہ مختلف جماعتیں بار بار ان شکایتوں کو پیش کرچکی ہیں۔

خود مرکزی وزیر فخر الدین علی احمد صاحب مسلمانوں سے مل کر ان کی شکایتیں اور مطالبات معلوم کر چکے ہیں۔ اس کے بعد تحقیقات کی کیا ضرورت ہے۔ یہ شکایتیں بالکل کھلی ہوئی ہیں، مسلم یونیورسٹی کے اسلامی کردار، اردو زبان اور ملازمتوں میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ، سیکولر تعلیم، مسلم پرسنل لا میں عدم مداخلت، فسادات اور فرقہ پرستوں کی مسلم دشمنی کا تدارک، یہ چند بنیادی مطالبات ہیں۔ اگر کانگریس واقعی مسلمانوں کی شکایتوں کو دور کرنا چاہتی ہے تو اس کو ان سب چیزوں کی طرف توجہ کرنا چاہیے۔ اردو والوں کے لیے یہی موقع ہے، وہ صوبے میں جدو جہد جاری رکھنے کے ساتھ کانگریس ہائی کمان اور صدر جمہوریہ کے سامنے بھی اس مسئلہ کو پیش کریں۔ (معارف، اگست ۱۹۶۷ء)

فسطائی پارٹیوں کا اقتدار اور مسلمان

یو پی، بہار اور بعض دوسری ریاستوں میں جب سے جن سنگھ کا اقتدار قائم ہوا ہے اس نے حکومت کو اپنی پالیسی کے مطابق ڈھالنا اور منظم طریقہ سے مسلم کشی کا سلسلہ شروع کر دیا ہے اور اندیشہ ہے کہ یہ آگ پورے ملک میں پھیل جائے گی۔ جن سنگھ اور دوسری فسطائی جماعتوں کا نقطہ نظر بالکل کھلا ہوا ہے، وہ سیکولرزم اور جمہوریت کو نہیں مانتیں، ان کا نصب العین ہندو حکومت کا قیام اور برہمنی تہذیب کا احیاء ہے۔ اس کا سب سے زیادہ نشانہ مسلمان ہیں، وہ ان کے وجود اور ان کی جانب منسوب ہر چیز کی دشمن ہے۔ اس کا سب سے آسان نسخہ پاکستان ہے، جس کے نام سے وہ اکثریت کے جذبات کو بھڑکاتی رہتی ہے۔ درحقیقت اس کی مسلم دشمنی پاکستان کے قیام کا نہیں بلکہ اس فسطائی ذہنیت کا نتیجہ ہے جو اپنے علاوہ کسی فرقہ، کسی مذہب اور کسی تہذیب کو برداشت نہیں کر سکتی اور یہ ذہنیت بہت قدیم ہے۔ اسی نے ہندوستان کے اصلی باشندوں کو اچھوت بنایا، جو آج تک مظلوم ہیں۔ اسی نے بدھ مت کا خاتمہ کیا اور ہندوستان سے اس کا نام ونشان تک مٹا دیا۔ پاکستان کا قیام بھی درحقیقت اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے، مگر انگریزی حکومت کے زمانہ میں یہ ذہنیت نہیں چل سکتی تھی، اس لیے دبی رہی۔ آزادی ملتے ہی ابھر آئی، یہ البتہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کے قیام نے اس میں اور شدت پیدا کر دی۔ اگر پاکستان نہ بھی بنتا تب بھی یہ ذہنیت موجود رہتی، یہ ممکن ہے کہ اس کو زیادہ ابھرنے کا موقع نہ ملتا اور مسلمان اتنے بے بس نہ ہوتے اور اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ مسلم دشمنی پاکستان ہی کے قیام کا نتیجہ ہے تو اس کا انتقام پاکستان والوں سے لینا چاہیے، ان پر تو بس نہیں چلتا، سارا نزلہ ہندوستان کے بے بس مسلمانوں

پر گرتا ہے جو نہ بہادری ہے نہ شرافت۔ سب سے زیادہ لائق تعریف ہماری جمہوری اور سیکولر حکومت ہے جو آج تک اپنے شہریوں کے جان و مال کا تحفظ نہ کرسکی۔

درحقیقت فرقہ پروری اور فسطائیت ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں، اس لیے فسطائی ذہنیت محض مسلمانوں کی دشمنی تک محدود نہیں، کم و بیش تمام اقلیتیں اس کا شکار ہیں، حتی کہ سکھ بھی جو ہندو مذہب ہی کی ایک ترقی یافتہ شاخ ہیں اس سے محفوظ نہیں، جہاں مذہب کا اختلاف نہیں ہے وہاں دوسری شکلوں میں یہ ذہنیت ظاہر ہوتی ہے۔ اچھوت قومیں اس کے تحقیر آمیز سلوک اور جنوبی ہندوالے لسانی اور تہذیبی جارحیت سے نالاں ہیں۔ مسلمان سب سے زیادہ اس لیے نشانہ ہیں کہ وہ اپنی تعداد کے اعتبار سے ایک پوری قوم اور اپنے مذہب اور تہذیب و روایات کے اعتبار سے ایک مستقل ملت اور اپنا انفرادی وجود رکھتے ہیں۔ اس لیے فسطائی ذہنیت کی زد سب سے زیادہ انہی پر پڑتی ہے۔ اگر مسلمان درمیان میں نہ ہوں تو یہ مادہ آپس ہی میں پھوٹ نکلے اور اب بھی مختلف شکلوں میں پھوٹتا رہتا ہے۔ اسی ذہنیت نے پہلے بھی ہندوستان کو نقصان پہنچایا ہے اور آیندہ بھی اس کو متحد اور مستحکم نہ ہونے دے گا۔

اس میں سب سے زیادہ قصور کانگریس اور اس کی حکومت کا ہے۔ جب اس فتنہ کو دبانے کا وقت تھا، اس وقت وہ عوام میں مقبولیت اور حکومت کی طمع میں اس کو اس قدر ڈھیل دیتی بلکہ پرورش کرتی رہی کہ فسطائی طاقتوں نے کانگریس اور حکومت میں گھس کر خود ان کو بدل دیا، بعض پرانے اور مخلص لیڈر خصوصاً پنڈت جواہر لال نہرو ان کے خلاف برابر آواز بلند کرتے رہے لیکن آخر میں وہ بھی ان کے مقابلہ میں بے بس ہو گئے تھے۔ ان کے بعد خود حکومت نے اس کے سامنے سپر ڈال دی اور فسطائی جماعتوں کو مشیر بنالیا۔ اس لیے ان کو طاقت پکڑنے کا موقع مل گیا، جس کا نتیجہ خود کانگریسی حکومت کو بھگتنا پڑا اور وہ دن دور نہیں جب جن سنگھ ریاستوں سے لے کر مرکزی حکومت تک پر قابض ہو جائے گی اور ہندوستان سے سیکولرزم اور جمہوریت کا خاتمہ اور پورا ملک انتشار اور بدنظمی کا شکار ہو جائے گا۔ اس لیے اب یہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ سیکولرزم و جمہوریت اور ملک کے تحفظ و بقا کا مسئلہ ہے۔

مگر اب فسطائی طاقتیں اتنی قوت پکڑ چکی ہیں کہ ان کا مقابلہ آسان نہیں ہے۔ اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ وہ تمام ترقی پسند پارٹیاں اور اقلیتیں جو سیکولرزم اور جمہوریت کو زندہ رکھنا چاہتی ہیں۔ اسی سرفروشی اور ایثار و قربانی کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں، جس طرح کانگریس نے انگریزی

حکومت کا مقابلہ کیا تھا۔ وہ گاؤں گاؤں میں پھر کر اس مہم کو چلائیں اور اس راہ میں عوام میں مقبولیت اور حکومت کے اقتدار ہر چیز کی بازی لگادیں، اس وقت کامیابی کی کچھ امید ہوسکتی ہے، محض زبانی تقریروں، بیانات اور قومی یکجہتی کی انجمنیں بنانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا، مگر سوال یہی ہے کہ کیا اب بھی ہندوستان میں ایسی بے لوث اور ترقی پسند جماعتیں موجود ہیں جو اس ایثار و قربانی کے لیے تیار ہوں۔ عوام میں مقبولیت اور حکومت کی چاٹ بڑی مشکل سے چھوٹتی ہے، وقت آنے پر سب کی حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے۔ اس لیے ہندوستان میں سیکولرزم اور جمہوریت کا مستقبل بظاہر تاریک نظر آتا ہے۔

فرقہ پرور اور فسطائی جماعتوں کے حوصلے اس لیے اور بڑھ گئے ہیں کہ ان کو مسلمانوں کی جان و مال سے کھیلنے کی پوری آزادی ہے۔ ان کے لیڈر اور اخبارات مسلمانوں کے خلاف زہر پھیلاتے رہتے ہیں اور کوئی روکنے والا نہیں۔ فساد کے روکنے کا پہلے سے کوئی انتظام نہیں کیا جاتا، فساد کے موقع پر امن و امان کے محافظ خود فریق بن جاتے ہیں، فساد میں مسلمان ہی تباہ و برباد ہوتے ہیں اور الٹے وہی پکڑے جاتے ہیں، فسادیوں سے کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔ چنانچہ آج تک کسی فساد میں مجرموں کو سزا نہیں ملی۔ ایسی حالت میں فساد ہونا نہیں بلکہ نہ ہونا تعجب انگیز ہے۔ اگر حکومت سنجیدگی سے فساد کو روکنا چاہتی ہے تو اس کو چاہیے کہ فرقہ پروروں کی زبان و قلم پر پابندی عائد کرے۔ فساد کے موقع پر حکام اور پولیس کی غفلت کی سختی سے باز پرس کی جائے، فسادیوں کا پتہ چلا کر ان کو پوری سزا دی جائے۔ فوج اور پولیس میں مسلمانوں کو بھرتی کیا جائے، اگر حکام اور پولیس دیانت داری سے اپنا فرض انجام دیں تو بڑی حد تک فساد کا خاتمہ ہوجائے یا کم از کم وہ سنگین صورت اختیار نہ کرنے پائیں۔ اس کے بغیر محض اظہار افسوس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ (معارف، اکتوبر ۱۹۶۷ء)

مسلم یونیورسٹی، رٹ کا فیصلہ

مسلم یونیورسٹی کی رِٹ کے فیصلہ سے مسلمانوں میں عام طور پر بڑی مایوسی ہے، لیکن مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ سپریم کورٹ نے اس پر کوئی بحث نہیں کی ہے کہ یونیورسٹی کا مخصوص کردار باقی رکھا جائے یا ختم کردیا جائے۔ اس نے ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ یونیورسٹی مسلمانوں کی نہیں بلکہ حکومت کی قائم کردہ ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسکا کردار بھی ختم کردیا جائے۔ مسلم یونیورسٹی خواہ قانونی طور سے مسلمانوں کی نہ مانی جائے لیکن واقعہ کے لحاظ سے انہی کے سرمایہ سے

قائم ہوئی ہے اور اس کے مخصوص کردار کی روایت انگریزوں کے زمانہ سے مسلم چلی آرہی ہے۔اس کو ہماری حکومت بھی مانتی ہے،جس پر ارکان حکومت کے بیانات شاہد ہیں اور اسی حیثیت سے وہ اس کو دنیا کے سامنے پیش کرتی ہے،جس کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔اس لیے مسلم یونیورسٹی پر مسلمانوں کے جو حقوق اجنبی حکومت کے زمانہ سے مسلم چلے آرہے ہیں،اپنی قومی حکومت کے ہاتھوں ان کا خاتمہ اس کے دامن پر ایک بدنما دھبہ ہوگا۔

درحقیقت مسلم یونیورسٹی حکومت کی سیکولرزم کا بہت بڑا نشان ہے۔مسلمانوں کے دستوری حقوق کے سلسلہ میں سیکولرزم کے ثبوت میں جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں،ان میں سب سے اہم اور اس کا عملی نمونہ صرف مسلم یونیورسٹی ہے۔اس کے مقابلہ میں نمائشی عہدوں کی کوئی قیمت نہیں۔اس سے قطع نظر پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی صرف یہی ایک یونیورسٹی ہے،جو مسلمان طلبہ کے لیے جائے پناہ بھی ہے۔ان کو جو تعلیمی سہولتیں یہاں حاصل ہیں،وہ کسی یونیورسٹی میں نہیں ہیں۔جن طلبہ کو کسی یونیورسٹی میں داخلہ نہیں ملتا یا جو ہونہار طلبہ غربت کی وجہ سے گراں تعلیمی مصارف برداشت نہیں کرسکتے،ان کو مسلم یونیورسٹی کی رعایتوں سے حصول تعلیم کا موقع مل جاتا ہے۔اس کی مخصوص حیثیت ختم ہونے کے بعد یہ سہولتیں بھی ختم ہوجائیں گی اور بہت سے ہونہار طلبہ محض ناداری کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ جائیں گے،جو تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ پورے ملک کا نقصان ہے۔

اس مسئلہ کو جوش و خروش کے بجائے سنجیدگی اور ٹھنڈے دماغ سے حکومت سے مل کر سلجھانے کی ضرورت ہے۔اس فیصلہ نے تھوڑی سی دشواری ضرور پیدا کردی ہے۔اس کی آڑ لے کر یونیورسٹی کی دشمن طاقتیں اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گی لیکن امید ہے کہ صاف ذہن کے لوگ اس معاملہ میں مسلمانوں کی حمایت کریں گے۔اس کا انحصار بڑی حد تک حکومت کے رویہ پر ہے،مسلمانوں کے جذبات سے قطع نظر خود حکومت کے مصالح کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا کردار باقی رکھا جائے،جس کا وہ بار بار اعلان کرچکی ہے۔اس لیے ہم کو توقع ہے کہ آئندہ جو یونیورسٹی ایکٹ بننے والا ہے،اس میں وہ اس کا لحاظ رکھے گی۔یہ ایکٹ حکومت کی سیکولرزم کا امتحان ہوگا۔اس کا بل پیش ہونے سے پہلے مسلمانوں کو اس مسئلہ پر حکومت سے گفتگو کرلینا ضروری ہے۔

دوسرا مسئلہ وائس چانسلری کا ہے۔نواب علی یاور جنگ بہادر تو اپنا کام پورا کرکے امریکہ کی

سفارت پر جارہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان کی جگہ کون لیتا ہے۔ انہوں نے اپنے ''عہد میمنت مہد'' میں یونیورسٹی کو جس نوبت تک پہنچادیا اور جن مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے، اس میں مشکل ہی سے کوئی اہل و مستحق آدمی کانٹوں کا یہ تاج اپنے سر پر رکھنے کے لیے تیار ہوگا اور ایسے اشخاص بھی آسانی سے نہیں مل سکتے، جن کو حکومت اور مسلمان قوم دونوں کا اعتماد حاصل ہو، اس وقت چند نام نگاہ میں آتے ہیں، خواجہ غلام السیدین، کرنل بشیر حسین زیدی، ہمایوں کبیر، بشیر احمد سعید، آخر الذکر دو حکومت کی نگاہ میں معتوب ہیں، اس لیے ان کے ہونے کا کوئی امکان نہیں، خواجہ غلام السیدین بھی جہاں تک معلوم ہوا ہے، قبول نہ کریں گے اور وہ حکومت کے پورے گوں کے بھی نہیں ہیں۔ صرف کرنل بشیر حسین صاحب زیدی رہ جاتے ہیں، وہی اس ٹوٹی کشتی کو منجدھار سے نکال سکتے ہیں اور اگر حکومت کسی علی یاور جنگ ہی کو بنانا چاہتی ہے تو اس سے بہتر یہ ہے کہ کسی ایسے ہندو کو بنادے جو اسلامی کلچر سے واقف اور مسلمانوں سے زیادہ قریب ہو، وہ علی یاور جنگ جیسے مسلمان کے مقابلہ میں یونیورسٹی کے لیے زیادہ مفید ہوگا۔ (معارف، نومبر ۱۹۶۷ء)

دارالمصنّفین کی مشکلات

اس وقت دارالمصنّفین دوہری مشکلات میں مبتلا ہے۔ اس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ اس کی تجارت ہے۔ ہندوستان و پاکستان کی جنگ کے زمانہ سے دونوں ملکوں کے درمیان تجارت بالکل بند ہے جن سے دارالمصنّفین کی آمدنی نصف کے قریب گھٹ گئی ہے اور تنہا ہندوستان کی تجارت پر اس کا مدار رہ گیا ہے، جو اس کے مصارف کے لیے ناکافی ہے اور موجودہ ہوش ربا گرانی کی وجہ سے اس کے مصارف پہلے کے مقابلہ میں بہت بڑھ گئے ہیں۔ اس لیے وہ کئی سال سے مالی مشکلات میں مبتلا ہے۔ جوبلی کے موقع پر جو رقم ملی تھی، اس کو ملا کر کام چلتا رہا، مگر اب وہ بھی ختم کے قریب ہے۔ دارالمصنّفین نے کبھی چندہ کے لیے دست سوال دراز نہیں کیا اور اب بھی وہ اس وضع داری پر قائم ہے۔ اس کی سب سے بڑی مدد یہ ہے کہ اس کے قدرداں اس کی کتابوں کی توسیع اشاعت کی کوشش کریں، اصحاب استطاعت اس کے لائف ممبر بنیں، جس کی فیس ایک ہزار اور پانچ سو اک مشت ہے۔ ایک ہزار کے ممبروں کو اس کی تمام گذشتہ اور آیندہ مطبوعات پیش کی جاتی ہیں، جن کی قیمت ایک ہزار کے قریب ہوجاتی ہے اور ان کو اپنی امداد کا معاوضہ کتابی شکل میں مل جاتا ہے۔ پانچ سو کے ممبروں کو

ممبری کے وقت سے نئی مطبوعات پیش کی جاتی ہیں، جس میں معارف بھی شامل ہے۔

(معارف، دسمبر ۱۹۶۷ء)

مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر

مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری کا قرعۂ انتخاب ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب صدر شعبۂ عربی و اسلامیات کے نام نکلا۔ اس انتخاب کے متعلق متضاد رائیں ہوں گی۔ مسلمانوں خصوصاً مسلم یونیورسٹی کا آزاد خیال طبقہ اس کو اپنے اثر واقتدار کا دیباچہ اور مذہبی طبقہ اس کو یونیورسٹی کے لیے مضر سمجھے گا لیکن اس مسئلہ کو جذبات سے الگ ہوکر یونیورسٹی کے مفاد کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اب وائس چانسلر کا انتخاب مسلمانوں کی مرضی کے مطابق نہیں ہوسکتا، اس لیے جس شخص سے یونیورسٹی کی ہوا خواہی اور اس کی صحیح خدمت کی نسبتاً زیادہ توقع ہو، اس کو غنیمت سمجھنا چاہیے، اس حیثیت سے ڈاکٹر علیم صاحب کا انتخاب بہت غنیمت ہے۔

وہ اگرچہ کمیونسٹ ہیں لیکن دیانت دار، بااصول اور صاحب کردار ہیں۔ کسی غرض و مصلحت کے لیے کسی اصول کو قربان نہیں کرسکتے۔ ان کی کمیونزم ان کی ذات اور ان کے حلقہ تک محدود ہے، خود ان کا گھر مذہبی ہے اور وہ اس میں کوئی مزاحمت نہیں کرتے بلکہ مدد دیتے ہیں۔ مذہب کا ظاہری احترام قائم رکھتے ہیں۔ اپنے ڈپارٹمنٹ میں انھوں نے مذہبی اور غیر مذہبی اور کمیونسٹ اور غیر کمیونسٹ کے درمیان کوئی فرق وامتیاز نہیں کیا۔ سب کے ساتھ انصاف برتا، اسلامی اور مذہبی موضوعوں پر اپنی نگرانی میں جو مقالے لکھوائے ان میں بھی اپنے خیالات کو اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ اس لیے یونیورسٹی کے معاملات میں بھی ان سے اسی دیانت داری کی توقع رکھنی چاہیے اور ہم کو امید ہے کہ وہ یونیورسٹی کو اس کے نصب العین کے مطابق چلانے اور اس کے کردار اور خصوصیات کو قائم رکھنے کی کوشش کریں گے لیکن موجودہ مخالف حالات میں کوئی ایسی توقع قائم نہ کرنا چاہیے جس کا پورا کرنا ان کے بس میں نہ ہو۔ یونیورسٹی ان کو جس حالت میں ملی ہے اس کو سدھارنا بہت دشوار ہے، اس لیے دیکھنا صرف یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا دوران کے ''نیک نام'' پیش رو کے مقابلہ میں یونیورسٹی کے لیے کہاں تک مفید ثابت ہوتا ہے۔

ڈاکٹر علیم صاحب علی گڑھ کے پرانے طالب علم ہیں۔ پھر شعبۂ عربی و اسلامیات کے لکچرار

اورصدر کی حیثیت سے برسوں سے یونیورسٹی سے ان کا تعلق ہے۔ وہ اپنی انتظامی قابلیت کی بنا پر انتظامی امور میں بھی دخیل رہے۔اس لیے یونیورسٹی کے پورے مزاج شناس اوراس کی سیاست و نشیب وفراز سے پوری طرح واقف ہیں، اس لیے مختلف حیثیتوں سے ان کا انتخاب نہایت موزوں ہےاوران سے یونیورسٹی کی بھلائی ہی کی توقع رکھنی چاہیے۔ہم کوامید ہے کہ ہمارا حسن ظن صحیح ثابت ہوگااوراگر ہماری توقع پوری نہ ہوئی تو ہماراحق تنقید محفوظ ہے۔(معارف،جنوری ۱۹۶۸ء)

مسلم خون کی ارزانی

اب مسلمانوں کی خوں ریزی معمول بن گئی ہےاوروہ اس کے اتنے عادی ہوچکے ہیں کہ اس بارہ میں کوئی بات کہنے کونہیں رہ گئی ہے،لیکن مسلم دشمنی جس فسطائی ذہنیت کا نتیجہ ہے اب اس نے پورے ملک پر حملہ شروع کردیا ہے۔اس لیے اب یہ تنہا مسلمانوں کانہیں بلکہ پورے ملک کا مسئلہ بن گیا ہے۔فسطائی جماعتوں کے دلوں سے قانون کا احترام اورحکومت کا خوف بالکل اٹھ گیا ہے۔ پورے ملک میں انتشاراور بدنظمی برپا، امن وسکون عنقا ہے۔آزاد ہندوستان میں مغلوں کے دور زوال کا نقشہ نظرآتا ہےاورآزادی رحمت کے بجائے زحمت بن گئی ہے۔انگریزوں کے زمانہ میں ساری خرابیوں کاالزام ان کے سرمنڈھ دیا جاتا تھالیکن آزادی کے بیس سال گذرنے کے بعدبھی ان میں کوئی کمی نہیں آئی، بلکہ نئی نئی خرابیاں پیدا ہوتی جاتی اورزندگی کی دشواریاں بڑھتی جاتی ہیں اور یہ خیال غلط نہیں ہے کہ غلامی کے تصور کوچھوڑ کر ملک کی وحدت اورامن ورفاہیت کے اعتبار سے غلامی کا دورآزادی کے دور سے کہیں بہتر تھا۔

ان تمام خرابیوں کا بنیادی سبب فرقہ پرور جماعتوں کی فسطائی ذہنیت،تعصب وتنگ نظری، قوت کا گھمنڈ، اقتدار کی ہوس اوراپنی برتری اور بالادستی کا احساس ہے۔اس ذہنیت کا نشانہ اگرچہ سب سے زیادہ مسلمان ہیں لیکن یہ وہ وبا ہےجس کا اثر کسی فرقہ اوراقلیت تک محدودنہیں رہتا، بلکہ پورے ملک کواپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔اب یہی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ہندوستان مختلف مذاہب،مختلف نسلوں،مختلف تہذیبوں اورمختلف زبانوں کا گہوارہ ہے۔فسطائی طاقتیں ان سب پر اپنی بالادستی، اپنی تہذیب اوراپنی زبان مسلط کرنا چاہتی ہیں،جس کومسلمان کیا کوئی اقلیت بلکہ اکثریت کاوہ طبقہ بھی گوارانہیں کرسکتا،جس کی تہذیب اورجس کی زبان فسطائی طاقتوں کی تہذیب اور

زبان سے مختلف ہے۔ چنانچہ موجودہ سارے لسانی، نسلی اور صوبائی فسادات اسی ذہنیت کا نتیجہ ہیں۔ کسی سیاسی پارٹی کو بھی ملک کی فکر نہیں، ہر پارٹی اقتدار کی ہوس اور حکوت کے جنون میں مبتلا ہے اور اس کے لیے اس کو کسی جائز و ناجائز کام میں باک نہیں۔ ملک کا جو حشر بھی ہو، اس کو حکومت کی کرسی ملنی چاہیے، ان فسطائی جماعتوں کی طاقت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ متعدد ریاستوں میں ان کا اقتدار قائم ہو گیا ہے، اس لیے بظاہر اس ذہنیت کے بدلنے کے کوئی آثار نہیں۔

ہندوستان کے دستور میں بلا تفریق مذہب و ملت اور اقلیت و اکثریت ملک کے تمام باشندوں کو یکساں حقوق حاصل ہیں لیکن اس ذہنیت نے دستوری حقوق کو عملاً معطل کر رکھا ہے۔ کوئی اقلیت بھی اس سے مطمئن نہیں ہے۔ مسلمان خاص طور سے ان حقوق سے محروم ہیں اور یہ فخر تنہا ہندوستان کو حاصل ہے کہ یہاں مسلم دشمنی کے لیے مستقل جماعتیں قائم ہیں، جن کا مقصد ہی مسلمانوں کو مٹانا ہے۔ ان کا ہر طبقہ اپنے اپنے دائرے میں اس کام کو انجام دے رہا ہے۔ اس کے لیڈر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں۔ اخبارات اشتعال انگیز مضامین لکھتے ہیں۔ مصنّفین اپنی تصنیفوں میں اسلام اور مسلمانوں کی نفرت انگیز تصویر پیش کرتے ہیں۔ معلمین طلبہ کو مسلم دشمنی کا سبق پڑھاتے ہیں۔ مسلمانوں سے نفرت و عداوت کے سوا اس کا کوئی دوسرا نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا اور اب یہ ذہنیت اتنی جڑ پکڑ چلی ہے اور فسطائی جماعتیں اتنی طاقت ور اور حکومت میں اتنی دخیل ہو چکی ہیں کہ وہ بھی ان کے مقابلہ میں بے بس ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اب یہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ پورے ملک کا مسئلہ ہے۔ اس لیے اگر جرأت و ہمت کے ساتھ ان کا مقابلہ نہ کیا گیا تو نہ صرف جمہوریت و سیکولرزم کا خاتمہ بلکہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، جس کی بنیاد پڑ چکی ہے۔ (معارف، فروری ۱۹۶۸ء)

فسادات

گذشتہ چند مہینوں کے اندر جس قدر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور ان میں مسلمانوں کا جس قدر جانی و مالی نقصان ہوا اسکی مثال گذشتہ کئی برسوں میں نہیں ملتی۔ ان فسادات کی شدت اور تسلسل نے ہر طبقہ کو چونکا دیا ہے اور پہلی مرتبہ وزیر اعظم اور وزیر داخلہ نے کھل کر ان کی مذمت کی اور بعض فساد زدہ مقامات کا دورہ بھی کیا۔ پارلیمنٹ میں بھی اس پر تقریریں ہوئیں، ہندو مفکرین نے اس کے خلاف مضامین لکھے، حتی کہ جن سنگھ کے صدر نے بھی اس کے خلاف آواز بلند کی اور اب

کانگریس اور مرکزی حکومت اس کے انسداد کی تدبیروں پر غور کررہی ہیں۔اب تک کا تجربہ یہی ہے کہ فسادات کے موقع پر اس کی مذمت کردی جاتی ہے۔اس کے خلاف کچھ مضامین اور بیانات نکل جاتے ہیں، پھر اس کو طاق نسیاں کے حوالہ کردیا جاتا ہے، مگر اس مرتبہ حکومت اس معاملہ میں زیادہ سنجیدہ نظر آتی ہے، فساد کے اسباب اور اس کے انسداد کے طریقے کوئی پیچیدہ اور دقیق نہیں کہ ان پر زیادہ غور وفکر کی ضرورت ہو۔ وہ بالکل کھلے ہوئے ہیں اور ان کو بار بار پیش کیا جاچکا ہے۔ بشرطیکہ حکومت ہمت سے کام لے اور کانگریس اور دوسری ترقی پسند پارٹیاں اس کے لیے اخلاص کے ساتھ عملی قدم اٹھائیں ورنہ محض زبانی جمع خرچ سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

ان فسادات سے تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ پورے ملک کا نقصان ہوتا ہے۔ قانون کا احترام دلوں سے اٹھ جاتا ہے، حکومت کا نظام درہم برہم ہوتا ہے، ساری دنیا میں ہندوستان کی سیکولرزم کی رسوائی ہوتی ہے۔ دوسرے جب کسی جماعت میں قانون شکنی اور فتنہ وفساد کا رجحان پیدا ہوجاتا ہے تو پھر وہ فرقہ وارانہ دائرے تک محدود نہیں رہتا، بلکہ پورے ملک کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، جس کا نمونہ مختلف ریاستوں میں مختلف شکلوں میں نظر آتا ہے۔ اس لیے اب یہ فسادات جمہوریت اور سیکولرزم کے لیے چیلنج ہیں۔ اگر اس کا مقابلہ نہ کیا گیا تو ہندوستان سے ان کا خاتمہ اور پورا ملک انتشار اور بدنظمی کا شکار ہوجائے گا۔

ان فسادات میں یہ چیز قابل اطمینان ہے کہ ان سے مسلمانوں میں پہلے جیسا ہراس پیدا نہیں ہوا بلکہ وہ اپنی جگہ پر جمے رہے اور جب تک پولیس اور حکام نے فسادیوں کی ہمت افزائی نہیں کی انھوں نے ان کا پورا مقابلہ کیا۔ یہ استقلال ان کے لیے فال نیک ہے، فرقہ پرور جماعتوں کو یہ حقیقت سمجھ لینا چاہیے کہ ان کا ظلم وستم مسلمانوں کے قدم نہیں اکھاڑ سکتا۔ ان کو ہندوستان ہی میں رہنا ہے اور عزت کے ساتھ رہنا اور اکثریت کی غلط روی کی اصلاح بھی کرنا ہے۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرتی ہے یا نہیں، مگر اب مسلمانوں کو تنہا اس کے سہارے پر نہیں رہنا ہے، موجودہ حالات میں وہ فساد میں پیش قدمی کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ ان کو فرقہ پروری کے انسداد اور امن وامان کے قیام کی ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے، لیکن اپنی حفاظت کے سامان سے غافل نہ رہنا چاہیے اور ہر وقت اپنی حفاظت ومدافعت کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ظالم ہمیشہ بزدل ہوتا ہے۔ آج بھی فسادیوں

میں پولیس اور حکام کے سہارے کے بغیر مسلمانوں کے مقابلہ کی ہمت نہیں ہے۔ اگر یہ دونوں درمیان میں نہ ہوں تو مسلمان تنہا ان کے مقابلہ کے لیے کافی ہیں۔ اگر حکومت صرف اتنا کر سکے کہ پولیس اور حکام کو فسادیوں کی حمایت سے روک دے تو دو چار تجربوں کے بعد پھر ان کو فساد کی ہمت نہ ہوگی۔ (معارف، اپریل ۱۹۶۸ء)

مسلم یونیورسٹی بل

مسلم یونیورسٹی کا بل غالباً جلد ہی پارلیمنٹ میں پیش ہونے والا ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ اب حکومت کو مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی اور ان کی شکایتوں کا احساس ہوگیا ہے۔ اس نے برملا اس کا اعتراف کیا ہے اور اس کی تلافی پر آمادہ نظر آتی ہے۔ اگر یہ تاثر وقتی اور کسی مصلحت کی بنا پر نہیں ہے تو اس کا سب سے بڑا امتحان مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ ہے۔ فسادات میں کثیر جانی و مالی اتلاف کے باوجود مسلمانوں کو اتنا نقصان نہیں پہنچا ہے جتنا مسلم یونیورسٹی کی ہیئت بدل دینے سے پہنچے گا۔ وہ مسلمانوں کی تقریباً ایک صدی کی کمائی اور ان کے ذہن و دماغ کا سرچشمہ ہے، اس کی روح بدل دینے سے یہ سرچشمہ خشک ہوجائے گا اور مسلمانوں کی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع نہ ملے گا۔ کسی قوم کی تعمیر و بقا محض رسمی مروجہ تعلیم سے نہیں ہوتی بلکہ اس کی ملی خصوصیات اور تہذیبی روایات کے مطابق اس کی تعلیم و تربیت پر موقوف ہے، جو صرف اپنی قومی درس گاہ میں حاصل ہوسکتی ہے۔ اسی لیے ہندوستان کے دستور میں اقلیتوں کو ان کی مرضی کے مطابق تعلیم گاہیں قائم کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں تنہا مسلم یونیورسٹی ہی وہ ادارہ ہے جہاں مسلمان اپنی تہذیب و روایات کے مطابق تعلیم و تربیت حاصل کر سکتے ہیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اس کی خصوصیات اور اس کا کردار قائم رکھا جائے۔

اس سے قطع نظر، خالص تعلیمی نقطہ نظر سے بھی اس کردار کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دوسرے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے دروازے مسلمانوں پر بند نہیں ہیں لیکن ان میں داخلہ ہر طالب علم کے لیے آسان نہیں ہے، جو روزانہ کا تجربہ ہے۔ دوسرے مسلم یونیورسٹی میں مسلمان طلبہ کو جو سہولتیں حاصل ہیں وہ دوسری یونیورسٹیوں میں نہیں ہیں۔ جو غریب ہونہار طلبہ دوسری یونیورسٹیوں کے تعلیمی مصارف برداشت نہیں کر سکتے وہ مسلم یونیورسٹی کی سہولتوں سے فائدہ اٹھا کر تعلیم حاصل کر لیتے ہیں، جو کسی دوسری یونیورسٹی میں ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کسی ہونہار طالب علم کا محض غربت کی وجہ سے

تعلیم سے محروم رہ جانا ایک قومی نقصان ہے۔اس لیے مسلم یونیورسٹی کا بل ایسا ہونا چاہیے جو ان تمام اغراض کو پورا کر سکے۔یہ نہیں کہا جاتا کہ اس کو مذہبی مدرسہ بنا دیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس کا اقلیتی کردار قائم رکھا جائے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب یونیورسٹی کا نظام مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہے اور ان کی موثر حیثیت قائم رہے۔حکومت کا اس میں کم سے کم دخل ہو،کورٹ کے ممبروں کا انتخاب کورٹ ہی کے اختیار میں رہے۔کورٹ اور دوسری انتظامی مجالس میں حکومت کے نامزد کردہ ممبروں کی تعداد کم سے کم ہونی چاہیے۔یونیورسٹی کے ہر شعبہ میں مسلمانوں کی کم سے کم دو تہائی اکثریت اور اس کے کلیدی عہدے مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہونے چاہئیں۔اس کے بغیر یونیورسٹی کا اقلیتی کردار قائم نہیں رہ سکتا۔(معارف،مئی ۱۹۶۸ء)

فسادات کے اسباب

مسلسل یک طرفہ فسادات،بدامنی،لاقانونیت اور بیرونی ملکوں میں ہندوستان کی بدنامی نے بالآخر حکومت،کانگریس،دوسری ترقی پسند پارٹیوں اور سنجیدہ طبقوں کے ضمیر کو بیدار اور فسادات کے انسداد کی تدبیروں پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور کر دیا۔بہت سے ہندو مفکرین نے اس کے خلاف مضامین لکھے جن میں ان فسادات کے اصلی اسباب،فرقہ وارانہ ذہنیت اور اس کے نتائج کا بڑا صحیح اور منصفانہ تجزیہ کیا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابھی ہندوستان کا ضمیر زندہ ہے۔یہاں انسانیت کی شمع گل نہیں ہوئی ہے اور سیکولرزم اور جمہوریت کے سچے پرستار موجود ہیں۔ضرورت ہے کہ اس جذبہ کو عام کیا جائے اور فسادات کے انسداد میں خارجی تدبیروں کے ساتھ اس کے بنیادی اسباب کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

ان فسادات کے اسباب مذہبی سے زیادہ سیاسی ہیں۔فرقہ پرور پارٹیوں کے پاس حصول حکومت کے لیے کوئی تعمیری پروگرام نہیں ہے۔اس کے لیے انہوں نے مسلمانوں کو قربانی کا بکرا بنایا ہے۔اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مختلف سیاسی اور تاریخی اسباب کی بنا پر آزادی کے پہلے سے ایک جماعت ایسی موجود ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کو اجنبی اور بیرونی حملہ آور سمجھتی ہے اور ان کو ملکی حقوق میں برابر کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔اس کا کام اسلام اور مسلمانوں کی غلط تصویر پیش کر کے،ان کے خلاف نفرت پھیلانا ہے۔آزادی سے پہلے یہ جماعت غیر موثر تھی۔کانگریس نے

بھی جب تک وہ اپنے اصولوں پر قائم اور ملک کی خدمت گذار رہی اس جماعت کو ابھرنے نہیں دیا۔ آزادی کے بعد کچھ ملک کی تقسیم اور کچھ کانگریس اور اس کی حکومت کی غلطیوں کی وجہ سے اس کو ابھرنے کا موقع مل گیا اور اب وہ اتنی طاقت ور ہوگئی ہے کہ کانگریسی حکومت کے ساتھ جمہوریت اور سیکولرزم کے لیے بھی خطرہ بن گئی ہے۔

اس قسم کی پارٹیوں کے پاس دو بڑے حربے ہیں۔ایک ہندی زبان، ہندو قوم اور ہندو کلچر کے احیاء کا نعرہ۔دوسری مسلمانوں پر الزام تراشی، وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر تاریخوں سے ایسے واقعات نکالتی بلکہ گڑھتی ہیں جن سے اسلام اور مسلمانوں سے نفرت پیدا ہو اور اس کے ذریعہ وہ عوام میں مقبولیت حاصل کرسکیں۔ بد قسمتی سے یہ ذہنیت اتنی عام ہوگئی ہے کہ اس سے کوئی طبقہ بھی خالی نہیں ہے۔چنانچہ تاریخوں اور نصاب کی کتابوں کے ذریعہ مسلمانوں سے نفرت کا سبق پڑھایا جاتا ہے اور تقریروں اور تحریروں کے ذریعے اس زہر کو مسلسل پھیلا جاتا ہے، بالفرض اگر کچھ ایسے واقعات مل بھی جائیں تو کس قوم کے حکمرانوں کا دامن اس سے پاک ہے۔ اچھے برے حکمراں ہر قوم میں ہوتے ہیں، کیا ہندو حکمرانوں نے ہندوؤں پر اور مسلمان بادشاہوں نے مسلمانوں پر ظلم نہیں کیے ہیں۔اس کی ذمہ داری موجودہ مسلمانوں پر کیا ہے، اس کے مقابلہ میں اچھے حکمرانوں کی بھی کمی نہیں ہے، جنھوں نے بڑے عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کی اور اپنے کارناموں سے ہندوستان کو جنت نشان بنایا، جس کا اعتراف ہندو مورخین تک کو ہے۔ جب دونوں قسم کے واقعات ملتے ہیں تو اچھے واقعات کو چھوڑ کر برے واقعات کو اچھالنے کی کیا ضرورت ہے، پھر حکمرانوں کے پیش نظر سب سے زیادہ حکومت کے مصالح ہوتے تھے۔اس لیے کسی مسلمان بادشاہ کے عمل کو مذہبی رنگ دینا صحیح نہیں ہے۔اور تاریخ تو ایک خام مواد ہے۔اس سے مورخ اپنے ذوق کے مطابق مختلف شکلیں بنا سکتا ہے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ترقی پذیر قومیں ملک کی تعمیر و ترقی میں حال و مستقبل کے تقاضوں کو دیکھتی ہیں۔ ماضی کے ایسے واقعات پر نظر نہیں ڈالتیں جو ملک کی تعمیر و ترقی میں حارج ہوں۔ اگر پرانی تاریخ کے اوراق ہی الٹنا ہیں تو مسلمانوں سے پہلے ہندوستان کی تاریخ اور بھی تاریک نظر آئے گی۔ یہ وقت پرانی تاریخ کے دہرانے کا نہیں بلکہ نئی تاریخ بنانے کا ہے۔مسلمان ہندوستان کی تاریخ کے جزو اعظم ہیں اور آیندہ بھی رہیں گے۔ان کو نظر انداز کرکے ہندوستان کی

تصویر مکمل نہیں ہوسکتی اور نہ وہ آیندہ ترقی کرسکتا ہے۔

اس بحث کا حاصل ہے کہ فرقہ پروری کو روکنے کے لیے خارجی تدبیروں کے ساتھ اس کے اندرونی اور اصلی اسباب کا ازالہ بھی ضروری ہے یعنی مسلمانوں کے بارہ میں صحیح نقطۂ نظر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ تاریخ نصاب کی کتابوں اور اخبارات کے ذریعہ جو زہر پھیلایا جارہا ہے اس کو روکا جائے۔ نصاب میں ایسی کتابیں رکھی جائیں جو دونوں فرقوں کے کلچر کی ترجمان ہوں، جن سے ان میں دوری اور نفرت کے بجائے اتحاد و یگانگت پیدا ہو، ایک دوسرے کے بارہ میں جو غلط فہمیاں ہیں ان کو علمی اور عملی دونوں طریقوں سے دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ بڑی افسوس ناک بات ہے کہ ایک ہزار سال تک ساتھ رہنے کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے مذہب سے پوری طرح واقف نہیں بلکہ ان کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس غلطی کا احساس لوگوں کو اب ہوا ہے، مگر دارالمصنّفین نے شروع سے اس کا لحاظ رکھا، یہاں کے مصنّفین اور اہل قلم نے ہندو مسلمانوں کو قریب لانے اور پرانی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے سینکڑوں مضامین اور مستقل کتابیں لکھیں۔ خارجی تدبیروں سے فسادات کی شدت میں تو کمی آسکتی ہے مگر اس کا پورا انسداد نہیں ہوسکتا۔ وہ اسی وقت ختم ہوسکتے ہیں جب فرقہ پروروں کا پھیلایا ہوا زہر دور ہوگا، اس کی سب سے بڑی ذمہ داری صحیح نقطۂ نظر رکھنے والے اہل قلم پر ہے۔ اس وقت ملک میں جو اچھا رجحان پیدا ہوگیا ہے اس سے ہندو مسلمان دونوں کو فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ (معارف، جون ۱۹۶۸ء)

الجمعیۃ اور اس کے ایڈیٹر کے خلاف مقدمہ

یہ واقعہ حیرت انگیز ہے کہ الجمعیۃ اخبار اور اس کے ایڈیٹر مولوی محمد عثمان صاحب فارقلیط پر مختلف فرقوں کے درمیان منافرت پھیلانے کے الزام میں مقدمہ قائم کیا گیا ہے۔ جمعیۃ العلماء کی تاریخ قوم پروری اور وطن دوستی کے کارناموں سے معمور ہے۔ اس نے ملک کو قوم پروری اور ہندو مسلم اتحاد کا سبق پڑھایا ہے اور اس زمانہ میں ہندوستان کی آزادی کا علم بلند کیا ہے اور اس کے لیے قربانیاں کی ہیں، جب موجودہ قوم پرور اس کا نام بھی نہیں جانتے تھے بلکہ بہت سے پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے اخبار الجمعیۃ کو جو جمعیۃ العلماء کا نقیب ہے۔ فرقہ پرور اخبارات میں شامل کرنا سخت حیرت انگیز ہے۔ اس کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی حق تلفی اور ان کی مظلومیت اور

فرقہ پرور جماعتوں کی مسلم دشمنی پر لکھتا اور حکومت کو ان کی جانب توجہ دلاتا رہتا ہے۔ الجمعیۃ کی جن تحریروں کو حکومت فرقہ پروری سمجھتی ہے وہ درحقیقت فرقہ پروروں کی دل آزار تحریروں کا جواب ہے۔ اس نے خود کبھی ابتدا نہیں کی اور اس جواب کا تو بہر حال اس کو حق حاصل ہے۔

لیکن یہ کوئی جرم نہیں بلکہ حکومت اور ملک کی بہت بڑی خدمت ہے کہ اس کو صحیح معنوں میں سیکولر اور جمہوری بنانے کی کوشش کی جائے، جس میں ہندوستان کے تمام شہریوں کے حقوق برابر اور ان کو یکساں ترقی کے مواقع حاصل ہوں۔ کسی فرقہ کے ساتھ مذہب کے اختلاف کی بنا پر کوئی امتیاز نہ برتا جائے اور کوئی فرقہ محض اکثریت کی بنا پر کسی اقلیت پر ظلم و زیادتی نہ کرنے پائے۔ اس سے انکار نہیں کہ مرکزی حکومت سب فرقوں کے ساتھ انصاف کرنا چاہتی ہے۔ اکثریت کا معقول اور سنجیدہ طبقہ بھی کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی پسند نہیں کرتا لیکن فرقہ پرور جماعتوں کا اس قدر غلبہ ہو گیا ہے کہ ان کے سامنے کسی کی چلنے نہیں پاتی اور اب قوم پروری نام ہو گیا ہے ان ہی کی خواہشات کی ہم نوائی کا۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے سب فرقہ پروری ہے، حتیٰ کہ اقلیت کی جانب سے اپنی مظلومیت کا اظہار بھی جرم ہے۔

اتحاد و یکجہتی کا یہ مفہوم بھی خوب ہے کہ اس کی زد سب سے پہلے ان ہی اخبارات پر پڑی جو فرقہ پروری کے سب سے بڑے مخالف اور اتحاد و یکجہتی کے سب سے بڑے علم بردار ہیں۔ لطف یہ ہے کہ جو اخبارات علانیہ اس کے دشمن ہیں اور فرقہ پروری اور مسلم دشمنی کا زہر برابر پھیلاتے رہتے ہیں ان سے کوئی باز پرس نہیں۔ اس سے اتحاد و یکجہتی کے مفہوم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے جمعیۃ العلماء کو سبق لینا چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ اب قوم پروری کا پرانا مفہوم بدل گیا ہے۔ اس لیے اس کو بھی اپنی قوم پروری پر نظر ثانی کرنا چاہیے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اخبار الجمعیۃ اور اس کے ترجمان حقیقت اڈیٹر کو اس آزمائش میں کامیاب فرمائے اور ہر قسم کی مشکلات و مصائب سے محفوظ رکھے۔

یہ مسلم ہے کہ فرقہ پرور جماعتوں کا خاص نشانہ مسلمان ہیں اور ان کی فتنہ انگیزی سے سب سے زیادہ نقصان ان ہی کو پہنچتا ہے۔ اس لیے ان سے زیادہ فرقہ پروری کا مخالف اور اتحاد و یکجہتی کا حامی کون ہوگا۔ مسلمان تو فرقہ پروری کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ یہ کون عقل باور کر سکتی ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنے کو تباہ و برباد کرنا پسند کریں گے۔ لیکن قوم پروری اور اتحاد و یکجہتی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ایک جمہوری حکومت کے سامنے اپنی شکایتیں بھی بیان نہ کریں۔ اپنے حقوق بھی نہ مانگیں اور فرقہ پرستوں

کے ہر ظلم وزیادتی کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے رہیں اور اپنے کو ان کی مرضی کے تابع اور اکثریت میں ضم کردیں۔ اتحاد و یکجہتی جبر وقوت سے نہیں بلکہ دلجوئی اور حسن سلوک سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کی ان شکایتوں کو جن کا اعتراف اکثریت کے دانشوروں اور حکومت کے منصف مزاج ارکان تک کو ہے۔ دور کیا جائے ان کو وہ حقوق دیے جائیں جو ہندوستان کے دستور کی رو سے ان کو حاصل ہیں۔ فرقہ پرور جماعتوں کو مسلم دشمنی سے روکا جائے، مسلمان تو صرف عزت و آبرو کی زندگی چاہتا ہے اور فرقہ پرور جماعتیں اس کو اچھوت بنا کر رکھنا چاہتی ہیں۔ ان کے لیڈر اس کا علانیہ اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔ سارا جھگڑا اسی کا ہے، اسی لیے اتحاد و یکجہتی کی اصل دشمن تو یہ جماعتیں ہیں، مگر ان پر کسی کا بس نہیں چلتا اور سارا نزلہ عضو ضعیف پر گرتا ہے۔ (معارف، اگست ۱۹۶۸ء)

مسلمان اقلیت اور دستوری حقوق

ہندوستان کے جمہوری اور سیکولر دستور نے اقلیتوں کو جو حقوق دیے ہیں۔ مختلف اسباب کی بنا پر ان پر پورا عمل نہ ہوسکا، جس سے ہر اقلیت غیر مطمئن ہے، خصوصاً مسلمانوں کو اپنی حق تلفی بلکہ زیادتی کی بجا شکایت ہے۔ فرقہ وارانہ احیائی ذہنیت اور اس کی جارحیت نے پورے ملک میں بدامنی اور انتشار پیدا کردیا ہے۔ اس لیے اقلیتوں کی شکایتوں سے قطع نظر خالص ملکی مفاد کے نقطہ نظر سے اس صورت حال کا تدارک ضروری ہوگیا ہے اور حکومت، کانگریس اور دوسری ترقی پسند پارٹیاں سنجیدگی سے اس کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہوگئی ہیں۔ حکومت نے اتحاد و یکجہتی کی کونسل قائم کی ہے۔ اگر اس کی تجویزوں پر پورا عمل ہوجائے تو بڑی حد تک صورت حال بدل سکتی ہے۔ کمیونسٹوں، مسلم مجلس اور کانگریس، اقلیتی محاذ نے اقلیتوں کے مسائل کے حل کے لیے اپنے کنونشن کیے ہیں۔ بعض دوسری جماعتوں کی طرف سے بھی اس قسم کی کوششیں ہورہی ہیں، جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کے موجودہ حالات کا عام احساس پیدا ہوگیا ہے، گو اب تک کا تجربہ یہی ہے کہ الیکشن کے قریب اقلیتوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے حکومت اور سیاسی پارٹیوں کی توجہ ان کے مسائل کی طرف ہوجاتی ہے، جس کا بعد میں کوئی اثر باقی نہیں رہتا لیکن اب تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ پورے ملک کی امن و سلامتی اور جمہوریت اور سیکولرزم کی موت وزندگی کا مسئلہ پیدا ہوگیا ہے۔ اس لیے ان تمام مسائل کا حل نکالنا ضروری ہے، ورنہ پورا ملک بدامنی کا شکار ہوجائے گا۔

اقلیتوں میں سب سے اہم مسئلہ مسلمانوں کا ہے۔مختلف سیاسی اور تاریخی اسباب کی بنا پر فرقہ پرور جماعتوں کا سب سے زیادہ نشانہ وہی ہیں۔ دوسری اقلیتوں سے ان کو اتنی پرخاش نہیں ہے اور پھر ان کے مسائل بھی اتنے اہم نہیں ہیں اور ان میں ان کے حل کی طاقت بھی ہے۔اس لیے وہ زیادہ دور تک مسلمانوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں،تاہم جس حد تک بھی وہ ساتھ دے سکیں ان کو ساتھ لے چلنا چاہیے۔یہ بھی مسلم ہے کہ اکثریت کی مدد کے بغیر مسلمانوں کے مسائل حل نہیں ہو سکتے،گو اس کا بڑا حصہ فرقہ پروری سے متاثر ہے،لیکن ان میں انسانیت دوست بھی ہیں،جو مسلمانوں کے ساتھ بھی انصاف چاہتے ہیں،ان کی ہمدردی و امداد حاصل کرنا ضروری ہے۔

مسلمانوں کے معاملہ میں تمام پارٹیوں کا طرز عمل یکساں ہے،جب کانگریس تک فرقہ پروری سے پاک نہیں ہے تو دوسری پارٹیوں کا کیا ذکر۔اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں پر ساری زیادتیاں اسی کے دور حکومت میں ہوئیں اور اس نے ان کا کوئی تدارک نہیں کیا۔واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی زبانی دل جوئی کے علاوہ اس کو ان کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔اس کے باوجود وہ اپنے اصولوں کے اعتبار سے جمہوری اور سیکولر ہے،جس کی وہ اب بھی مدعی ہے۔اس کی ایک تاریخ ہے اور اس کے ہاتھ میں قوت بھی ہے۔اس لیے اگر وہ فرقہ پروروں کے غلبہ اور اثر سے آزاد ہو جائے یا کم از کم اس میں اقلیتوں کی موثر قوت پیدا ہو جائے تو کسی نہ کسی حد تک ان کی شکایتوں کا ازالہ ہو سکتا ہے،لیکن یہ دونوں باتیں بہت مشکل ہیں،کانگریس پر فرقہ پروروں کا اتنا غلبہ ہو چکا ہے اور وہ ان سے اس قدر دب چکی ہے کہ بظاہر ان سے رہائی ممکن نہیں ہے۔خود کانگریس بھی اپنے اندر اقلیتوں کی قوت پسند نہیں کرتی، چنانچہ کانگریس اقلیتی محاذ کنونشن کی بھی اس کی جانب سے کوئی حوصلہ افزائی نہیں ہوئی۔اس لیے جب مسلمان اپنی قوت کے زمانہ میں کانگریس چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تو موجودہ حالات میں ان کی یا کسی اقلیت کے دوبارہ موثر قوت پیدا کرنے کی توقع امید موہوم سے زیادہ نہیں ہے،تاہم اقلیتوں کے مسائل کے حل کی ایک تدبیر یہ بھی ہے اس لیے اس کا بھی تجربہ کر کے دیکھنا چاہیے مگر جب تک کسی جماعت کی پشت پر کوئی قوت نہ ہو اس کی آواز کہیں بھی موثر نہیں ہو سکتی۔اس لیے کانگریس کے اندر قوت پیدا کرنے کے ساتھ اپنی تنظیم کے ذریعہ بھی قوت پیدا کرنا ضروری ہے،ورنہ کانگریس کے اندر بھی ان کی آواز نہ ہوگی۔(معارف،نومبر ۱۹۶۸ء)

دہلی میں انجمن ترقی اردو کے لیے ایک مرکز کی تعمیر

مرکزی انجمن ترقی اردو کی کوئی ذاتی عمارت نہیں ہے۔ وہ علی گڑھ میں ایک کرایہ کی عمارت میں ہے۔ اس کی مرکزیت اور ضروریات کا تقاضا تھا کہ اس کو دلی منتقل کیا جائے۔ اس سے اس کے کاموں میں بھی سہولت ہوتی۔ کچھ دن ہوئے مرکزی حکومت نے اس کی عمارت کے لیے دلی میں ایک مناسب موقع پر ایک قطعہ زمین دے دیا ہے۔ اس کی تعمیر کے لیے انجمن کے پاس لاکھ ڈیڑھ لاکھ موجود ہے لیکن اس کے مصارف کا تخمینہ سات لاکھ ہے، جو کوئی غیر معمولی رقم نہیں ہے۔ انجمن نے اس کی فراہمی کے لیے مختلف قیمتوں کے ٹکٹ یا رسیدیں چھپوائی ہیں۔ اردو دوستوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کو انجمن سے منگا کر مطلوبہ رقم فراہم کرنے کی کوشش کریں۔ (معارف، دسمبر ۱۹۶۸ء)

پاکستان میں دارالمصنّفین کے مسروقہ ایڈیشن

دارالمصنّفین کے خدمت گذاروں کو اس کا بڑا دکھ ہے کہ پاکستان کے بعض خودغرض ناشرین اس کی بعض مطبوعات کو اپنے لیے چھاپ کر اس کو بڑا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ اطلاع ملی ہے کہ اس کی مطبوعات میں سے اقبال کامل، سیرت عائشہؓ، شعرالہند، گل رعنا اور سیرت عمر بن عبدالعزیزؒ وغیرہ کو وہاں کے کچھ ناشرین اپنے ذاتی منافع کی خاطر چھاپ کر فروخت کر رہے ہیں۔ سیرت النبیؐ کے خلاصے بھی شائع ہو کر وہاں کے بازار میں بک رہے ہیں۔ ادارہ نے ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر کی توجہ اس طرف دلائی ہے، جنھوں نے اپنے ایک مراسلہ میں وعدہ کیا ہے کہ وہ اس کے انسداد کے لیے ضروری کارروائی کریں گے۔ پاکستان میں دارالمصنّفین کے ہمدردوں سے بھی اپیل ہے کہ وہ اپنے اخلاقی دباؤ سے ایسے خودغرض ناشرین کو اس ادارہ کو نقصان پہنچانے سے باز رکھیں یہ صحیح ہے کہ پاکستان کے بعض مصنّفوں کی کتابیں بھی ہندوستان میں چھاپ لی جاتی ہیں لیکن دارالمصنّفین جیسے ادارہ کی مطبوعات کو چھاپ کر فروخت کرنے کی نوعیت کچھ مختلف ہے۔ یہ صرف اپنی مطبوعات کی آمدنی ہی سے چل رہا ہے۔ اس کو کہیں سے کوئی بڑی سالانہ امداد نہیں ملتی۔ گذشتہ پچپن سال سے اس کے کارکن ایثار اور قربانی سے کام لے کر اس کی علمی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کی مطبوعات کو چھاپ کر ذاتی فوائد اٹھانے کے معنی علوم و فنون کی خدمت کو نقصان پہنچانا ہے۔

ہندوستان و پاکستان کے تجارتی کاروبار بند ہونے کی وجہ سے دارالمصنّفین کی مطبوعات

پاکستان کے بازاروں میں نہیں ملتی ہیں۔بعض ناشرین اس سے بھی بے جا فوائد اٹھا کر اس کی کتابیں چھاپ رہے ہیں۔ اس دست برد کو روکنے کی خاطر اس کی کوشش کی جارہی ہے کہ قانونی طور پر دارالمصنّفین کی مطبوعات کا اسٹاک وہاں کے بعض دیانت دار اور قابل اعتبار تاجروں کے پاس جمع ہوجائے،جن سے قیمت کی ادائیگی اس وقت کرلی جائے گی جب دونوں ملکوں میں مالی لین دین شروع ہوجائے گا،جن خریداروں کو دارالمصنّفین کی عام مطبوعات کی ضرورت ہو وہ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور اور ابومعاویہ تاجر کتب ۱۴۱/۱ وحید آباد کراچی سے حاصل کرسکتے ہیں۔ ان دونوں کے پاس ہماری مطبوعات کا پرانا اسٹاک ابھی موجود ہے۔(معارف،جنوری ۱۹۶۹ء)

سیرت النبیؐ کا مسروقہ ایڈیشن پاکستان میں

گذشتہ مہینہ لکھا جاچکا ہے کہ پاکستان کے ناشرین نے دارالمصنّفین کی کتابیں چھاپ لی ہیں۔اب یہ اطلاع ملی ہے کہ بعض ناشر سیرۃ النبیؐ کا پورا سیٹ چھاپنے کا ارادہ کررہے ہیں۔ پاکستان کی بدولت یوں ہی ہندوستان کے اسلامی ادارے نیم جان ہورہے ہیں۔اب اس کے خودغرض ناشر ان کو بالکل ہی ختم کردینا چاہتے ہیں۔اگر دارالمصنّفین کی کتابیں اسی طرح پاکستان میں چھپتی رہیں تو اس کے زندہ رہنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔اگر حکومت پاکستان تک ہماری آواز پہنچ سکتی ہے تو ہماری درخواست ہے کہ وہ ان ناشروں کو اس خودغرضی سے روکنے کی کوشش کرے۔عرصہ ہوا ایک ناشر نے سیرۃ النبیؐ کا پہلا حصہ چھاپ لیا تھا،اس زمانہ میں سردار عبدالرب نشتر زندہ تھے۔انہوں نے اس تاجر کو روکا اور پاکستانی پریس نے اس کے خلاف اتنا لکھا کہ وہ مطبوعہ کتابیں دارالمصنّفین کے حوالہ کرنے پر مجبور ہوگیا۔اس میں سب سے زیادہ حصہ شورش صاحب کاشمیری کا تھا۔اس لیے ہم کو امید ہے کہ پاکستانی پریس اس مرتبہ بھی دارالمصنّفین کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دے گا۔

(معارف،فروری ۱۹۶۹ء)

لکھنؤ کا شیعہ سنی فساد

لکھنؤ کا شیعہ سنی فساد اس قدر شرم ناک ہے کہ تاسف اور ملامت کے حدود سے باہر ہے۔یہ کس قدر شرم اور افسوس کا مقام ہے کہ ان مقدس اور برگزیدہ ہستیوں کے نام پر بربریت کی جاتی ہے، جنھوں نے پوری دنیا کو امن وسلامتی کا پیام دیا اور اس کے سامنے ایثار وقربانی کا عملی نمونہ پیش کیا۔آج

ان کے نام لیوا آپس ہی میں کٹے مرتے ہیں۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور شیعہ سنی چودہ سو برس کے فرسودہ اور بے نتیجہ جھگڑوں میں مبتلا ہیں۔ ان کو مسلمانوں کے نازک حالات سے بھی سبق حاصل نہیں ہوتا۔ ان کے سامنے یہ مثال بھی موجود ہے کہ ہمارے وطنی بھائی اور حکومت دونوں اچھوتوں تک کو جو ہندو مذہب کے رو سے عام ہندوؤں سے الگ طبقہ ہے اور جن میں وطنیت کے سوا کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ ملانے کی کوشش کر رہے ہیں اور شیعہ سنی جن کا پیغمبر ایک، کتاب ایک، قبلہ ایک اور بہت سے عقائد و عبادات تک یکساں ہیں۔ برادر کشی میں مبتلا ہیں۔ اور یہ اختلاف کسی بنیادی عقیدہ کا نہیں بلکہ بدعات اور رسوم پر اصرار کا نتیجہ ہے۔ آج کوئی سنجیدہ شیعہ کم سے کم علانیہ تبرے کو پسند نہیں کرتا بلکہ اس سے اعلان برأت کرتا ہے اور بہت سے شیعہ مفکرین جن کی امت کے مصالح پر نظر ہے، سرے سے تبرّا کے خلاف ہیں۔ یہی حال مدح صحابہ کے مروجہ جلسے اور جلوس کا ہے جو سراسر بدعت ہیں اور ان دونوں پر اصرار مسلمانوں کے مصالح کے خلاف ہے۔ میلاد کی مجالس الگ چیز ہیں۔ ان پر شیعوں کو بھی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ لطف یہ ہے کہ اس اختلاف کے باوجود سنی محرم کی تمام بدعتوں میں مبتلا ہیں، بلکہ اس کی ساری رونق ان ہی کے دم سے قائم ہے۔ اگر ان میں مذہب کا سچا جذبہ ہے تو پہلے ان کو محرم کی بدعتوں کو چھوڑنا چاہیے۔

شیعہ سنیوں کے لیے یہ بڑے شرم اور غیرت کا مقام ہے کہ ان کے اختلاف میں حکومت بلکہ جن سنگھ تک کو مداخلت کی ضرورت پیش آئے اور ان کو نقصان مایہ کے ساتھ شماتت ہمسایہ کا بھی تلخ گھونٹ پینا پڑے۔ اگر وہ اپنی ضد اور جہالت پر قائم رہے تو دونوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا اور ان میں ایک مستقل کشمکش پیدا ہوجائے گی، جس کا نتیجہ جانی اور مالی نقصان کے سوا اور کچھ نہیں نکل سکتا۔ اس سے سیاسی پارٹیاں فائدہ اٹھائیں گی، کسی فریق کو ان کی ظاہری ہمدردی سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ مسلمانوں کے معاملات و مسائل میں، ان سب کا نقطہ نظر ایک ہے، اس میں شیعہ سنی کی تفریق نہیں ہے اور اب تک مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا ہے اس میں شیعہ سنی برابر کے حصہ دار ہیں، خاص طور پر شیعوں کو ان کے فریب سے زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، ممکن ہے فرقہ پرور پارٹیوں کی ظاہری ہمدردی سے ان کے جذبات کی تسکین ہوجائے لیکن کوئی سیاسی پارٹی اور حکومت سنّیوں کی اکثریت کو نظر انداز نہیں کرسکتی۔ اس لیے دونوں کا فائدہ اتحاد ہی میں ہے۔

شیعہ سنیوں کا سنجیدہ طبقہ اس اختلاف اور معرکہ آرائی کو پسند نہیں کرتا، یہ سارا فتنہ دونوں کے عوام اور خود غرض لیڈروں کا پیدا کردہ ہے۔اس لیے ضرورت ہے کہ دونوں کے سنجیدہ اور معقول اشخاص اس کا مستقل حل نکالنے کی کوشش کریں اور شیعہ سنی کی ایسی تقریبات کے لیے جن میں فساد کا اندیشہ ہو ایسے ضوابط اور حدود مقرر کردیے جائیں، جن کی پابندی دونوں کے لیے ضروری ہو اور ان تقریبات کے موقع پر یہ لوگ خود اس کی نگرانی کریں تاکہ آیندہ فساد کی نوبت نہ آنے پائے۔(معارف، جون ۱۹۶۹ء)

شیعہ سنی فساد

ابھی تک لکھنؤ کے شیعہ سنی اختلاف کا کوئی حل نہیں نکلا ہے، لیکن دونوں کے سنجیدہ طبقہ میں اس کی کوشش جاری ہے۔اس لیے امید ہے کہ کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ہم نے گذشتہ مہینہ اجمالاً اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا تھا۔اس مہینہ کسی قدر تفصیل سے لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔شیعہ سنی اختلاف کے نقصانات اس قدر کھلے ہوئے ہیں، خصوصاً ہندوستان کے مسلمان جن نازک حالات میں گھرے ہوئے ہیں۔ان میں اس اختلاف پر اور بھی حیرت ہوتی ہے، اس سے دونوں فرقوں کو جو نقصان پہنچتا ہے، اس سے قطع نظر، اس سے ہمیشہ مسلمانوں کے دشمنوں نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے، جس سے مسلمانوں کو من حیث القوم بڑا نقصان پہنچا ہے۔اس وقت ہندوستان میں یہی صورت حال ہے۔چنانچہ فرقہ پرور جماعتیں اس اختلاف کو بھڑکا کر اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کررہی ہیں۔ان کا افسوں سنیوں پر تو چل نہیں سکتا، اس لیے ان کی کوشش ہے کہ وہ شیعوں سے ظاہری ہمدردی کرکے ان کو سنیوں سے الگ کردیں۔اس ہمدردی میں انھوں نے سنیوں کے بزرگوں پر تبرابازی بھی شروع کردی ہے اور یہاں تک ان کا دعویٰ ہے کہ شیعہ اپنے کو مسلمان نہیں صرف شیعہ کہتے ہیں یعنی وہ اپنے کو مسلمانوں میں شامل نہیں کرتے، جس کو کوئی شیعہ گوارا نہیں کرسکتا۔ان کی یہ ہمدردی صرف فریب ہے، جس جماعت کا مقصد ہی اسلام اور مسلمانوں کو مٹانا ہو وہ شیعوں کا وجود کب گوارا کرسکتی ہے اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔اس کی زد سب سے زیادہ شیعوں ہی پر پڑتی ہے، مگر یہ اطمینان ہے کہ شیعوں کا سمجھدار طبقہ اس فریب کو پوری طرح سمجھتا ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ شیعہ سنیوں کے عقائد میں بعض بنیادی اختلافات ہیں۔اس کے باوجود اختلاف کے مقابلہ میں وحدت کے پہلو زیادہ ہیں۔دونوں توحید و رسالت کے قائل ہیں، ان کا

رسول ایک، کتاب ایک، قبلہ ایک، عبادات میں روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ یا خمس دونوں کے یہاں ارکان اسلام میں ہیں۔ معاملات کے بہت سے مسائل یکساں ہیں۔ دونوں کی تہذیب بھی ایک ہے۔ وحدت کے اتنے پہلوؤں کے ہوتے ہوئے آپس میں ایسا اختلاف جو عناد اور دشمنی تک پہنچ جائے کس قدر نادانی ہے۔

اگرچہ شیعہ سنیوں میں ہر دور میں اختلاف رہا، ان میں لڑائیاں بھی ہوئیں لیکن اسی کے ساتھ بہت سے معاملات میں اشتراک وتعاون بھی رہا ہے۔ خصوصاً ہندوستان کی تاریخ کا کوئی صفحہ ان کے مشترک کاموں سے خالی نہیں ہے۔ سنی مسلمانوں کی سب سے بڑی سلطنت مغل امپائر کو بنانے اور اس کو مستحکم کرنے میں شیعوں کا بڑا حصہ ہے۔ اس کے بڑے بڑے وزراء و امراء اور اراکین سلطنت زیادہ تر شیعہ تھے، خود اورنگ زیب جیسے کٹر سنی بادشاہ کی ماں اور ایک بیوی شیعہ تھی۔ اس دور کی سب سے بڑی اسلامی حکومت پاکستان کے بانی محمد علی جناح شیعہ تھے اور آج بھی اس کا صدر شیعہ ہے۔ اس سے پہلے سکندر مرزا بھی شیعہ تھے۔ ہندوستان میں جس کو اسلامی تمدن کہا جاتا ہے تمام تر ایرانی ہے اور اس کو فروغ دینے والے شیعہ ہیں۔ اکبری دور سے ہندو رانیوں کے ذریعہ شاہی محلات میں ہندو تمدن کے جو اثرات پہنچ گئے تھے، ان کو نور جہاں نے مٹایا جو شیعہ تھی۔ اردو زبان کو تراش خراش کر ادبی زبان بنانے میں شیعوں کا بڑا حصہ ہے۔ اس کے بڑے بڑے شاعر اکثر شیعہ تھے اور شیعوں کے دوست نما دشمن فرقہ پرور جماعتیں ان سب کو مٹانا چاہتی ہیں۔ اس لیے اس کی زد سب سے زیادہ شیعوں ہی کے آثار پر پڑتی ہے۔

اس تفصیل کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ شیعہ سنی ہمیشہ حریف ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار بھی رہے ہیں۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی وتمدنی تاریخ بنانے میں دونوں کا حصہ ہے۔ اس زمانہ میں بھی مسلم یونیورسٹی دونوں کی مشترکہ کوشش کی یادگار ہے۔ مغلوں کے دور عروج تک مذہب کے دائرے سے باہر شیعہ سنی کا کوئی سوال نہیں تھا۔ یہ سارے جھگڑے زوال اور طوائف الملوکی کے دور کی پیداوار ہیں، جب ان کے سامنے کوئی مشترک تعمیری کام نہیں رہ گیا تھا اور ہر امیر اپنے اقتدار کی فکر میں تھا۔ اس لیے یہ مذہب سے زیادہ اقتدار کی جنگ تھی۔

شیعہ سنی اگر سمجھ داری سے کام لیں تو اپنے اپنے عقیدہ پر قائم رہتے ہوئے آج بھی متحد

ہوسکتے ہیں۔اس وقت اختلافی مسائل دو ہیں۔ایک تبرّا، دوسرا مدح صحابہ۔ان دونوں کے دو پہلو ہیں، اگر تبرا شیعوں کا جزو ایمان ہے تو اس سے ان کو کوئی نہیں روک سکتا۔وہ اپنے عقیدہ پر قائم رہیں اور اپنے گھروں اور اپنی مجلسوں میں جس طرح چاہیں اس پر عمل کریں لیکن کوئی قانون و اخلاق اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ اسلام کی ان برگزیدہ شخصیتوں اور سنیوں کے پیشواؤں کو جن کو خود قرآن نے رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ کی سند دی ہے اور جن کی عظمت کے غیر مسلم تک معترف ہیں۔علانیہ اور برسر عام برا بھلا کہا جائے، جو شیعہ مورخین ان کی دینی حیثیت کے قائل نہیں ہیں وہ بھی ان کے اسلامی خدمات اور کارناموں کے ذکر پر مجبور ہیں۔اس لیے کہ تاریخ سے ان کو نہیں مٹایا جاسکتا۔ایسی محترم ہستیوں پر دشنام طرازی تو انسانی شرافت کے خلاف ہے۔اس لیے بہت سے شیعہ مفکر اور اہل علم سرے سے تبرا کے خلاف ہیں۔قرآن نے تو غیر مسلموں کے معبودان باطل کو بھی برا کہنے کی ممانعت کی ہے اور برسر عام تبرا حضرت علیؓ کی سنت نہیں، بلکہ امیر معاویہؓ کی بدعت ہے، جس کو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے بند کیا تھا۔

مدح صحابہ کے بھی دو پہلو ہیں۔ایک صحابۂ کرام کے فضائل و مناقب، ان کے اسوۂ حسنہ اور ان کے اسلامی خدمات کا بیان تو یہ کسی حیثیت سے بھی قابل اعتراض نہیں۔یہ تو دنیا کے لیے سبق آموز ہیں اور ان کے بغیر اسلام کی تاریخ ناقص رہتی ہے۔اس لیے اگر سنی اپنی مجلسوں اور مذہبی اجتماع میں ان کو بیان کرتے ہیں تو اس سے شیعوں کی کیا دل آزاری ہوتی ہے۔اس کا دوسرا پہلو مدح صحابہ کے جلسے اور جلوس ہیں یعنی محرم کے جلوس کی طرح مدح صحابہ کا جلوس نکالا جائے اور اس میں مدح صحابہ کے اشعار پڑھے جائیں تو اہل سنت کے عقیدہ کی رو سے بھی بدعت ہے اور اگر شیعوں کی ضد میں ایسا کیا جائے تو اور بھی برا ہے، اس لیے سنیوں کو اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

شیعہ سنی اختلاف کی یہ شکل کسی اسلامی ملک میں نہیں ہے، نہ شیعہ ملک ایران میں تبرا کی یہ شکل ہے اور نہ سنی ملکوں میں مدح صحابہ کی۔وہاں ان مسائل کا وجود ہی نہیں ہے۔یہ فخر صرف ہندوستان کے شیعہ سنیوں کو حاصل ہے کہ ان حالات میں بھی جب یہاں کے مسلمان ہر طرح کے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں۔وہ ان خرافات میں مبتلا ہیں، جس کا نتیجہ دونوں کو بھگتنا پڑے گا۔امید ہے کہ ان سطور کی اشاعت کے وقت مفاہمت کی کوئی شکل نکل چکی ہوگی۔(معارف، جولائی ۱۹۶۹ء)

مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار

مسلم یونیورسٹی کا معاملہ اب تک معلق ہے اور اس وقت حکومت خود ایسے حالات میں مبتلا ہے کہ فی الحال اس طرف توجہ کی امید نہیں۔ہم بارہا اس مسئلہ پر اپنے خیالات ظاہر کر چکے ہیں۔اس وقت ہمارا خطاب حکومت سے تھا۔اس مرتبہ یونیورسٹی کے اسٹاف،طلبہ اور ذمہ داروں سے کچھ عرض کرنا ہے۔یونیورسٹی کے لیے سب سے بڑا مسئلہ صریح الفاظ میں اس کی ملی خصوصیات اور تہذیبی روایات اور سیکولر اصطلاح میں اقلیتی کردار کے تحفظ کا ہے۔اس کی ذمہ داری سب سے زیادہ خود یونیورسٹی کے اسٹاف اور ذمہ داروں پر عائد ہوتی ہے کہ وہ خود کہاں تک اقلیتی کردار کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔اس کے بعد حکومت سے اس کے مطالبہ کا حق ہوگا۔اقلیتی کردار کے تحفظ کے صرف یہ معنی نہیں ہیں کہ یونیورسٹی کا انتظام مسلمانوں کے ہاتھوں میں اور ان کی اکثریت قائم رہے اور نام کے مسلمان اس سے حصول جاہ و مال کا فائدہ اٹھاتے رہیں، بلکہ یہ معنی ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت کے ساتھ یونیورسٹی میں اسلامی فضا بھی رہے۔اس کے احاطہ میں اس کے کسی متوسل کو خواہ وہ کسی درجہ کا ہو،غیر اسلامی اور ملحدانہ خیالات کی اشاعت کی اجازت نہ ہو۔اسلامی شعائر کا پورا احترام کیا جائے۔اس کے خلاف کوئی چیز نہ ہونے پائے۔اس کے بغیر اقلیتی کردار کے تحفظ کا مطالبہ بے معنی ہے۔مسلمانوں کا کردار ملحدانہ خیالات، اسلامی آداب و اخلاق سے آزادی، کلچرل پروگراموں،عورتوں اور مردوں کے بے باکانہ اختلاط اور بزم شبانہ کی سرمستیوں کا نام نہیں ہے۔اگر اقلیتی کردار کا مطلب یہی ہے تو مسلم یونیورسٹی کا ختم ہو جانا بہتر ہے۔حیرت ان لوگوں پر ہوتی ہے جو اسلامی تہذیب و روایات کی بیخ کنی بھی کرتے ہیں اور اس کے نام سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔(معارف،نومبر ۱۹۶۹ء)

آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس دارالمصنّفین میں

آل انڈیا اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کا چھٹا اجلاس ۳۰/۳۱/دسمبر ۱۹۶۹ء کو دارالمصنّفین میں منعقد اور کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔اعظم گڑھ اس صوبہ کا دور دراز خطہ اور بہت چھوٹا مقام ہے۔یہاں بڑے شہروں کی دلچسپیوں کا کوئی سامان نہیں ہے۔اس لیے اندیشہ تھا کہ اس اجلاس میں زیادہ اجتماع نہ ہو سکے گا لیکن ہم کو مسرت ہے کہ دارالمصنّفین کی کشش اہل علم کو ملک کے گوشہ گوشہ سے کھینچ لائی اور ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور علمی و اسلامی اداروں کے ساٹھ سے اوپر نمایندے اور دوسرے

اصحاب علم شریک ہوئے۔ اجلاس کی صدارت جناب حکیم عبدالحمید صاحب نے فرمائی اور اس کا افتتاح مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا۔ راقم نے استقبالیہ پیش کیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی افتتاحی تقریر میں اسلامک اسٹڈیز کانفرنس کے اصل مقصد ومنشا کو بڑی خوبی سے واضح فرمایا، جو بہت پسند کیا گیا۔ مقالہ خوانی کی مختلف نشستوں میں اسلامیات کے مختلف پہلوؤں پر فاضلانہ مقالات پڑھے گئے۔ اختتامی تقریر جناب ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے فرمائی اور کانفرنس کے مقصد ومنشا کو اپنے نقطہ نظر سے واضح کیا۔ ان کی تقریر خیالات کے اعتدال وتوازن کی بنا پر ہر خیال کے اہل علم میں پسند کی گئی۔ آخری دن شب کو عربی مدارس کے نصاب اور طریقہ تعلیم کی اصلاح پر ایک مذاکرہ ہوا، اس میں متعدد اہل علم اور اساتذہ نے اپنے خیالات ظاہر کیے۔

کانفرنس کے سلسلہ میں دارالمصنّفین کے نوادر اور قلمی نسخوں کی نمائش بھی کی گئی تھی، اس کا افتتاح جناب حکیم عبدالحمید صاحب نے فرمایا۔ دارالمصنّفین کا کتب خانہ کتابوں کی تعداد کے لحاظ سے زیادہ بڑا نہیں ہے لیکن مذہب اسلام اور اسلامی تاریخ وثقافت کی تحقیق پر ایسا کلکشن اور منتخب ذخیرہ دوسرے کتب خانوں میں مشکل سے ملے گا، جس کا اعتراف کانفرنس کے اہل علم شرکاء نے بھی کیا۔ اس کی مطبوعہ کتابوں میں بھی بہت سی خصوصاً تاریخ جغرافیہ اور طبقات وتراجم کی کتابیں اب نایاب ہیں، مخطوطات میں بہت سے نسخے اپنی قدامت، تاریخی اہمیت، نایابی اور خطاطی وغیرہ کے لحاظ سے نادر ونایاب ہیں، اس لیے یہ نمائش خاص طور سے اہل علم کی توجہ کا مرکز رہی۔ علامہ شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کی تصانیف کے ان کے قلم کے مسودوں خصوصاً سیرۃ النبی، شعرالعجم، سوانح مولانا روم کے مسودوں اور مولانا شبلی کے دوسرے قلمی آثار کو بڑی دلچسپی سے دیکھا گیا، مولانا شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے نام تمام ہندوستان اور بیرون ہند کے اکابر کے خطوط کے البم سے بھی بڑی دلچسپی لی گئی۔

اس اجتماع کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ندوہ کے ابتدائی دور کی طرح قدیم اور جدید تعلیم کے نمایندے ایک مقصد کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے اور ان کو آپس میں تبادلۂ خیالات کا موقع ملا اور دونوں کی راہیں جدا ہونے کے باوجود اسلامیات کی تحقیقات کے بارہ میں ایک نقطۂ اتصال نکل آیا، جس پر مولانا سید ابوالحسن علی اور ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب کی تقریریں شاہد تھیں۔ یہ اس

اجلاس کی بہت بڑی کامیابی اور مولانا شبلی کے خواب کی روشن تعبیر ہے۔اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ مولانا سید ابوالحسن علی نے کانفرنس کے آیندہ اجلاس کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے دعوت دی۔کانفرنس کی بیشتر تقریبات شبلی کالج کی عمارت میں انجام پائیں، جو دارالمصنّفین سے بالکل ملا ہوا ہے، کالج کے پورے اسٹاف نے کانفرنس کے جملہ انتظامات میں بڑی محنت وجاں فشانی کی اور اس کی کامیابی میں اس کا بڑا حصہ ہے، کالج نے مہمانوں کے اعزاز میں ایک پرتکلف عصرانہ بھی دیا، کالج اور دارالمصنّفین ایک ہی درخت کی دوشاخیں ہیں، اس لیے کالج کا شکریہ ادا کرنا خود اپنا شکریہ ادا کرنا ہے۔یہ کانفرنس کی مختصر روداد ہے، مفصل روداد اور خطبہ صدارت آیندہ مہینہ شائع ہوگا۔

(معارف، جنوری ۱۹۷۰ء)

ندوہ کی اسٹرائک

ندوہ کی اسٹرائک کے متعلق راقم اپنے خیالات اخبارات کے ذریعہ ظاہر کر چکا ہے اور ۱۷/ جون کو ندوہ کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہونے والا ہے۔اس لیے اب کسی دوسری تحریر کی ضرورت نہ تھی لیکن اس سلسلہ میں چند ضروری باتیں کہنی ہیں۔ندوہ کی اسٹرائک کوئی نئی چیز نہیں۔مولانا شبلی کے زمانہ میں اس سے بڑی اسٹرائک ہوچکی ہے۔سید صاحب کے زمانہ میں بھی ہوئی تھی۔دارالعلوم دیوبند جیسا مقدس ادارہ اس وبا سے بچ نہ سکا، اس لیے اسٹرائک کی حیثیت سے اس کی زیادہ اہمیت نہیں ہے لیکن عربی مدارس کے طلبہ کے لیے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کی تقلید میں مطالبات منوانے کا یہ طریقہ نہایت نامناسب اور ان کی دینی حیثیت سے فروتر ہے۔یونیورسٹیوں کے طلبہ کی اکثریت مذہب، اخلاق اور مشرقی آداب وتہذیب سے بالکل آزاد ہوتی ہے اور عربی کے طلبہ ان کے نمایندے ہوتے ہیں، مگر ان طلبہ کی تقلید میں وہ ساری حرکتیں کرتے ہیں، جن کی مذہب کیا معمولی اخلاق وتہذیب بھی اجازت نہیں دیتی جوان کے لیے انتہائی شرم ناک ہے۔

طلبہ کو سیاسی اغراض کے لیے استعمال کرنا لیڈروں کا معمول بن گیا ہے۔چنانچہ ان کی ہر اسٹرائک میں کچھ لوگ ان کی حمایت میں کھڑے ہوجاتے ہیں اور سارا الزام منتظمین کے سر رکھ دیتے ہیں، یہی سیاست بازی ندوہ کی اسٹرائک میں بھی ہوئی اور بیرونی لوگوں نے اس کو زیادہ ہوا دی، اخلاق کا سبق دینا آسان ہے لیکن ان پر عمل ان معلمین اخلاق کے لیے بھی دشوار ہے۔اگر ان کو کسی

یونیورسٹی کا وائس چانسلر، کسی کالج کا پرنسپل اور کسی امتحان کا نگراں بنادیا جائے تو ان کو ایسا سبق ملے کہ سارا فلسفۂ اخلاق بھول جائیں۔ ان کی سیاست بازی کے بہت سے میدان ہیں، وہ عربی مدارس پر رحم کریں اور ان کو اپنی سیاست کا اکھاڑہ نہ بنائیں اور غیر متعلق بحثوں میں اس مسئلہ کو نہ الجھائیں، البتہ اگر اصلاحی اور تعمیری نقطہ نظر سے کوئی مفید مشورہ دیں تو وہ قابل غور ہوسکتا ہے۔

اگر طلبہ، مدرسین اور منتظمین اپنے حقوق و فرائض کے حدود کا خیال رکھیں تو عربی مدارس کے لیے اس مسئلہ کا حل دشوار نہیں ہے۔ طلبہ کا فرض اطاعت و سعادت مندی ہے اور اساتذہ و منتظمین کا شفقت و محبت، اس میں دونوں طرف سے کوتاہی ہوتی ہے۔ طلبہ کی غلطی یہ ہے کہ وہ حدود کا لحاظ نہیں رکھتے، رائی کا پہاڑ بنادیتے ہیں اور معمولی معمولی شکایتوں پر جو آسانی سے پوری ہوسکتی ہیں۔ رائج الوقت نامناسب طریقے اختیار کرتے ہیں اور منتظمین کی غفلت یہ ہے کہ وہ ان شکایتوں کی طرف اس وقت توجہ کرتے ہیں جب معاملہ حد سے آگے بڑھ جاتا ہے، اگر ابتدا ہی میں جائز شکایتیں دور کردی جائیں تو اس کی نوبت ہی نہ آنے پائے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ طلبہ کا ہر مطالبہ قابل قبول نہیں ہوتا، ورنہ نظام ہی قائم نہیں رہ سکتا، ان سب معاملات پر مجلس انتظامیہ میں غور کیا جائے گا۔

(معارف، جون ۱۹۷۰ء)

مسلم پرسنل لا اور حکومت

مسلمانوں کے پرسنل لا میں حکومت جیسا کہ اس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، فی الحال کسی تبدیلی کا ارادہ نہیں رکھتی لیکن ادھر چند دنوں سے جس زور شور سے اس کا پروپگنڈہ جاری ہے۔ اس سے اندیشہ ہے کہ یہ مسئلہ سنجیدہ شکل نہ اختیار کرلے، مسلمانوں کا پرسنل لا محض معاشرتی نہیں بلکہ مذہبی مسئلہ بھی ہے۔ اس کے متعلق کلام مجید میں صریح احکام موجود ہیں، مذہب، تہذیب اور زبان وہ بنیادی چیزیں ہیں جن پر قوموں کی انفرادیت اور ان کے قومی و ملی وجود کا مدار ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی قوم بھی ان میں مداخلت گوارا نہیں کرسکتی اور ان کو چھیڑنے سے بڑے بڑے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی لیے دنیا کے تمام دستوروں میں ان کے تحفظ کی پوری ضمانت ہوتی ہے اور ہندوستان کے دستور میں بھی موجود ہے۔ مسلمانوں کا معاملہ تو الگ رہا خود اکثریت میں جس کا مذہب اور کلچر قریب قریب یکساں ہے۔ زبان اور صوبائی مسائل پر کتنا بڑا انقلاب برپا ہے، مذہب کا معاملہ تو اس

سے کہیں زیادہ نازک ہے۔اس لیے مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی دستوری حقوق، جمہوریت اور قومی مصالح سب کے خلاف ہے۔

پرسنل لا کے مسئلہ میں بعض اسلامی حکومتوں کی مثال اور چند مغرب زدہ مسلمان مردوں اور عورتوں کا مطالبہ دلیل نہیں بن سکتا، کسی مسلمان کو بھی اس میں تبدیلی کا اختیار نہیں ہے۔ یہ حکومتیں مسلمان ضرور ہیں لیکن اسلامی نہیں ہیں اور ان کے یہاں پورا قانون شریعت رائج نہیں ہے اور وہ خود مغربی تہذیب کے طلسم میں گرفتار ہیں، دوسری بڑی بات یہ ہے کہ یہ حکومتیں خواہ کتنے ہی آزاد خیال اور ترقی پسند ہوں، بہرحال مسلمان ہیں اور ان پر رائے عامہ کا اتنا دباؤ ہوتا ہے کہ وہ کوئی اقدام ایسا نہیں کرسکتیں جس سے مسلمانوں کی ملی خصوصیت کو نقصان پہنچے۔اس وقت اسلامی حکومتوں میں ٹرکی اور مصر سب سے زیادہ ترقی پسند اور مغربی تہذیب سے متاثر ہیں۔اس کے باوجود ان کے یہاں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کا پورا نظام اور مذہبی امور کی وزارتیں قائم ہیں۔اس لیے ان کی ترقی پسندی سے جو نقصان پہنچتا ہے، اس کی تلافی کی شکلیں بھی موجود ہیں۔ مصطفیٰ کمال نے اپنے زمانہ میں بہت سی مذہبی چیزیں ختم کردی تھیں، لیکن ترک قوم مسلمان ہے، اس لیے بعد کی حکومت کو انہیں پھر سے جاری کرنا پڑا اور آج ٹرکی میں ہر مسلمان کے لیے مذہبی تعلیم لازمی ہے، بڑے بڑے مذہبی ادارے قائم ہیں اور مصر تو دنیائے اسلام میں مذہبی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز ہے، اس لیے حکمراں طبقہ کی آزادی پسندی سے جو دینی نقصان پہنچتا ہے، اس کی تلافی مذہبی تعلیم اور مذہبی نظام وغیرہ سے ہوجاتی ہے اور مسلمانوں کی ملی خصوصیات میں فرق نہیں آنے پاتا بلکہ خود حکومت اس کو قائم رکھتی ہے، اس لیے اسلامی ملکوں پر ہندوستان کے مسلمانوں کا قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ یہاں تو کوئی چیز بھی مسلمانوں کے اختیار میں نہیں ہے۔اس لیے کسی نقصان کی تلافی نہیں ہوسکتی، باقی مغرب زدہ اور حکومت وقت کے چشم وابرو کے پابند مسلمانوں کی کسی زمانہ میں بھی کمی نہیں رہی ہے، جب جن سنگھ تک کو مسلمان مل جاتے ہیں تو حکومت کا کیا سوال۔

اس سلسلہ میں دو باتیں خاص طور سے قابل غور ہیں۔ایک یہ کہ ہندوستان کے کتنے مسلمان ایک سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں، اس زمانہ میں جب ایک بیوی اور اس کے بچوں کا بار اٹھانا مشکل ہے، ایک سے زیادہ شادی کرنے کی ہمت کون کرسکتا ہے۔اس سے زندگی میں جو تلخیاں پیدا ہوتی

ہیں وہ مستزاد ہیں، ہزار دو ہزار مسلمانوں میں شاید ایک دو مثالیں اس کی مل سکیں۔ ان کی سزا کے لیے زندگی کی تلخیاں کافی ہیں، دوسرے کلام مجید میں بیویوں کے درمیان عدل و مساوات کی شرط کے ساتھ چار شادیوں کی اجازت ہے، ورنہ ایک پر قناعت کرنے کا حکم ہے۔ اگر اس اجازت سے کوئی مسلمان غلط فائدہ اٹھاتا ہے اور دوسری بیوی کے حقوق ادا نہیں کرتا تو اس کے لیے شرعی عدالت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اس کا تدارک کرنا علماء کا فرض ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے مسائل میں دشواریوں کا حل اس لیے نہیں نکلتا کہ مسلمانوں کا شرعی نظام قائم نہیں ہے، ورنہ یہ دشواریاں پیش نہ آتیں۔ علماء کو ان کا حل سوچنا ہے، ورنہ زمانہ کی رد کو روکنا دشوار ہو جائے گا۔

(معارف، جولائی ۱۹۷۰ء)

دارالمصنّفین کی کتابیں اور پاکستان

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کتابوں کی تجارت عرصہ سے بند ہے۔ اب پاکستان نے اخبارات اور رسالوں پر بھی پابندی عائد کر دی ہے۔ نہ وہاں کے اخبارات یہاں آسکتے ہیں اور نہ یہاں سے وہاں جا سکتے ہیں، جس سے دونوں کے علمی حلقوں کو پریشانی ہے۔ معارف کے قدردان پاکستان میں زیادہ ہیں، کچھ خریدار تو ہر پرچہ رجسٹری منگانے کے لیے تیار ہیں لیکن اس میں مصارف زیادہ ہیں، اس لیے پرچے معمولی محصول پر بھیجے جاتے ہیں، جو کسٹم والوں کی مہربانی سے بہت کم پہنچتے ہیں اور اکثر و بیشتر خریداروں کو دو دو مرتبہ پرچہ بھیجنا پڑتا ہے، پھر بھی نہ پہنچنے کی شکایت برابر آتی رہتی ہے۔ اگر یہ بندش قابل اعتراض لٹریچر کو روکنے کے لیے کی گئی ہے تو ہم کو کوئی اعتراض نہیں، لیکن خالص علمی و ادبی پرچوں کو روکنا جن کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے، سخت زیادتی اور علم و فن پر ظلم ہے۔ حکومت پاکستان سے ہماری درخواست ہے کہ ایسے پرچوں کو مستثنیٰ کرکے ان کی فہرست شائع کر دے۔ معارف کے خریدار پاکستان میں زیادہ ہیں، اس لیے اس بندش سے اس کو اتنا مالی خسارہ ہو رہا ہے کہ ادارہ دارالمصنّفین کا آرگن نہ ہوتا، جس کو ہر حال میں جاری رکھنا ہے، تو محض اس کی آمدنی سے اس کا چلنا مشکل تھا، ہندوستان میں اتنے خریدار نہیں ہیں کہ تنہا اس سے اس کے مصارف پورے ہو سکیں۔ کاش ہماری آواز حکومت پاکستان تک پہنچ سکتی۔ ہندوستان کے اسلامی اداروں سے علمی ہمدردی یہاں کے مسلمانوں کی بڑی خدمت ہے۔ (معارف، جولائی ۱۹۷۰ء)

مسلم یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی کے سلسلہ میں اختلاف

مسلم یونیورسٹی کی گولڈن جوبلی کے مسئلہ میں دو فریق ہو گئے ہیں۔اس کے ارباب حل وعقد دسمبر میں جوبلی کرنا چاہتے ہیں لیکن اولڈ بوائز کا ایک طبقہ ان حالات میں جبکہ یونیورسٹی کا دستور معطل ہے۔اس کی آزادی سلب ہوگئی ہے۔اس کا نظم ونسق حکومت کے نامزد کردہ ممبروں اور عہدہ داروں کے ہاتھ میں ہے اور یہ بھی نہیں معلوم کہ آیندہ جو بل پیش ہونے والا ہے۔اس میں یونیورسٹی کی کیا شکل ہوگی اور اس کا کردار کہاں تک باقی رہے گا، جوبلی منانا بے موقع ہے۔ان دونوں کا جذبہ اخلاص اور یونیورسٹی سے تعلق ہی پر مبنی ہے۔اس لیے کسی فریق کی نیت پر شبہہ کرنا صحیح نہیں ہے۔مناسب صورت تو یہی تھی کہ جب تک یونیورسٹی ایکٹ نہ بن جاتا اور اس کی واضح شکل سامنے نہ آجاتی اس وقت تک کے لیے جوبلی ملتوی کردی جاتی تاکہ سارے مسلمان دلی مسرت کے ساتھ شریک ہوتے۔اس میں کوئی قباحت نہیں تھی، جوبلی سے جو فوائد اس وقت حاصل ہوں گے، وہی بعد میں بھی ہوتے لیکن اب جبکہ جوبلی کے انتظامات شروع ہوگئے ہیں اس کی مخالفت مناسب نہیں ہے۔

مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے مسلمانوں کی بڑی عزیز متاع، ان کی تقریباً ایک صدی کی محنت کا سرمایہ، ان کے دل ودماغ کا سرچشمہ اور ان کی تہذیب وثقافت کا مرکز ہے۔اس سے ان کو بڑا جذباتی لگاؤ ہے، وہ اس کی ادنیٰ ٹھیس پر بے قرار ہوجاتے ہیں اس لیے اس کی یہ حیثیت قائم رہنی چاہیے، جس کا ہم بارہا اظہار کرچکے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اب یونیورسٹی کے مصارف جس کی مقدار دو کرور سالانہ ہے، حکومت برداشت کرتی ہے، اس لیے اگر وہ اس کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتی ہے، تو مسلمان کس منہ سے اعتراض کرسکتے ہیں، اگر وہ اس کا نصف حصہ بھی فراہم کرسکتے یا ان میں اپنے مطالبات منوانے کی طاقت ہوتی، اس وقت البتہ وہ حکومت سے جرأت کے ساتھ بات کرسکتے تھے، لیکن جب یہ دونوں صورتیں نہیں ہیں تو اب یونیورسٹی کا معاملہ حکومت کے رحم وکرم پر ہے۔

اگر یہ معاملہ مسز اندرا گاندھی یا ان کے جیسے سیکولر ذہن کے لوگوں کے اختیار میں ہوتا تو امید تھی کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ رکھیں گے۔لیکن قانون بنانا پارلیمنٹ کے اختیار میں ہے۔اس کے ممبروں کی خاص تعداد جن میں کانگریسی ممبر بھی ہیں یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو پسند نہیں

کرتی اور فرقہ پرور پارٹیوں کے ممبر تو اس کے کھلے ہوئے دشمن ہیں۔ حکومت کے باہر بھی مختلف تدبیروں سے یونیورسٹی کے کردار کو ختم کرنے کی کوشش جاری ہے، مسلمان وزراء میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ کھل کر مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کر سکیں۔ اس لیے حکومت کی راہ میں بھی دقتیں ہیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ مسئلہ اس کی سیکولرزم کا امتحان بھی ہے اور بیرونی سیاسی مصالح کا تقاضا بھی۔ اس سے وہ مسلمانوں کے زخموں پر مرہم رکھ سکتی ہے، اس لیے توقع یہی ہے کہ جو ایکٹ بنے گا اس میں یونیورسٹی کی آزادی اور مسلمانوں کی اکثریت باقی رہے گی اور اس کا نظام انہی کے ہاتھوں میں رہے گا، لیکن وہ بہرحال پرانے یونیورسٹی ایکٹ سے مختلف ہوگا اور اس کی انتظامی مجالس اور کلیدی عہدوں پر حکومت کے نامزد کردہ ممبروں اور ایسے سیکولر مسلمانوں کے آنے کی پوری گنجائش بلکہ سہولت ہوگی، جن کو اسلامی کردار سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی، بلکہ وہ اس کو سیکولرزم کے خلاف تصور کریں گے۔ اس لیے جو خطرہ ہے وہ اسی قسم کے مسلمانوں سے ہے، پہلے بھی انہی سے یونیورسٹی کو نقصان پہنچا ہے اور آیندہ بھی انہی سے اندیشہ ہے۔ ان حالات میں یونیورسٹی کے اسلامی کردار کو قائم رکھنے کی ذمہ داری سب سے زیادہ خود اس کے ارباب حل وعقد اور اساتذہ اور طلبہ پر عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ اس کا نمونہ بن جائیں تو پھر کوئی طاقت اس کو نہیں مٹا سکتی اس کے کردار کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس میں مسلمانوں کی اکثریت رہے، مگر اس کا نظام ان مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہے، جن کو اسلام سے کوئی تعلق نہ ہو اور وہ ان کے حصول جاہ و مال کا ذریعہ بنی رہے۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ یونیورسٹی کی فضا اسلامی رہے، اسلامی شعائر کا پورا احترام کیا جائے، اس کے خلاف کوئی بات یونیورسٹی کے حلقہ میں نہ ہونے پائے، اس کو دارالعلوم دیو بند یا ندوہ نہ بنایا جائے لیکن کارل مارکس اور لینن کی پرستش گاہ بھی نہ بننے پائے، کم سے کم یونیورسٹی میں وہ فضا ہونی چاہیے جس کا مظاہرہ اسلامی ملکوں کے سربراہوں کی آمد کے موقع پر کیا جاتا ہے۔

اس کا اعتراف ہے کہ ایک محدود حلقہ کو چھوڑ کر یونیورسٹی کے طلبہ اور اساتذہ کی اکثریت میں اسلامی حمیت اور ایک طبقہ میں خاصی دین داری موجود ہے اور کسی شخص میں یہ ہمت نہیں ہے کہ وہ علانیہ غیر اسلامی خیالات کا اظہار یا تبلیغ کر سکے، ورنہ اب تو ان اداروں تک کا جن کا سنگ بنیاد بڑی مقدس ہستیوں نے رکھا تھا اور جن کا مقصد قوم پرور لیکن سچے مسلمان پیدا کرنا تھا، یہ حال ہے کہ اس کے ذمہ دار تک علانیہ اسلام کی نیش زنی کرتے اور مسلمانوں کے لیے دل خراش باتیں لکھتے رہتے

ہیں، اس کے مقابلہ میں مسلم یونیورسٹی بہت غنیمت ہے۔(معارف، اگست ۱۹۷۰ء)

مسلمانوں کی غیر سیاسی جماعتیں

مسلمانوں کی غیر سیاسی تنظیمیں بھی ایک طبقہ کی نگاہ میں کھٹکتی ہیں اور ان پر بے تکلف فرقہ پروری کا الزام لگا دیا جاتا ہے، جس سے جمعیۃ العلماء بھی مستثنیٰ نہیں ہے، جماعت اسلامی خاص طور سے اس کا نشانہ ہے اور جب سے حکومت اور ملک کے سنجیدہ طبقہ نے کھل کر فرقہ پرور جماعتوں کی مخالفت شروع کی ہے، یہ لے اور تیز ہوگئی ہے۔ ترازو کے دونوں پلڑے برابر کرنے کے لیے ان کے ساتھ جماعت اسلامی کو بھی شامل کرلیا گیا ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں، جماعت اسلامی خالص دینی جماعت ہے اس نے سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا بلکہ سیاست میں حصہ لینا اس کے اصول کے خلاف ہے، اس نے کسی فرقہ کی مخالفت کی، نہ کسی کے خلاف جارحانہ اقدام کیا اور نہ فتنہ وفساد برپا کیا، بلکہ اس کو ہمیشہ فرو کرنے کی کوشش کی، اس کا مقصد اور کام بالکل کھلا ہوا ہے، اس کا مقصد مسلمانوں کو صحیح معنوں میں دین دار بنانا اور دوسرے مذاہب والوں کو خدا کے احکام اور ان کے فلسفہ کی اخلاقی تعلیمات پر عمل کی دعوت دینا ہے، وہ سارے فرقوں سے کہتی ہے ”تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم“ چنانچہ وہ اپنے عام اجتماعوں میں ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دیتی ہے اور وہ ان میں شریک بھی ہوتے ہیں، اس لیے اس کی دعوت تو دین کی مشترک تعلیمات پر اتحاد کی دعوت ہے نہ کہ اختلاف اور فرقہ پروری کی، اس لیے حکومت کو اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے کہ جو کام وہ سیکولرزم کی وجہ سے انجام نہیں دے سکتی، وہ جماعت اسلامی انجام دے رہی ہے، اس کی دعوت بالکل کھلی ہوئی ہے، اس کا لٹریچر چھپا ہوا موجود ہے، ان کے مقررین عام مجمعوں میں تقریریں کرتے ہیں، اگر حکومت جماعت اسلامی کو حقیقتاً فرقہ پرست جماعت سمجھتی ہے تو ان چیزوں سے اس کا ثبوت فراہم کرنا چاہیے، ورنہ محض شعر کا وزن برابر کرنے کے لیے جماعت اسلامی کو فرقہ پرور قرار دینا بڑی زیادتی ہے۔(معارف، اگست ۱۹۷۰ء)

اردو رسم الخط بدلنے کی تجویز

اردو کو ختم کرنے کی جو تدبیریں کی جارہی ہیں، ان میں سب سے زیادہ خطرناک اس کا رسم الخط بدلنے کی تجویز ہے جو بظاہر اس کی ہمدردی میں کی جارہی ہے کہ اگر اردو کا رسم الخط دیوناگری کردیا

جائے تو ہندی والوں کی مخالفت ختم ہوجائے گی اور وہ اردو کو قبول کرلیں گے، اردو کے مخالفین کی طرف سے تو یہ تجویز سمجھ میں آتی ہے کہ اس سے کسی جھگڑے کے بغیر خود اردو والوں کے ہاتھوں ان کا مقصد حاصل ہوجاتا ہے لیکن اردو کے نادان دوستوں کی طرف سے اس کی تائید حیرت انگیز ہے، یہ صحیح ہے کہ رسم الخط بدل جانے سے زبان ختم نہیں ہوجاتی لیکن اردو کی پوزیشن ایسی ہے کہ وہ ہندوستان میں صرف اپنے رسم الخط کی وجہ سے زندہ ہے، اردو ہندی میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، دونوں کے قواعد ایک ہیں، مصادر ایک ہیں، ضمیریں ایک ہیں، بہت سے اسماء مشترک ہیں، اگر اردو میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ بڑھا دیے جائیں، تو وہ ہندی بن جائے گی اور ہندی میں عربی اور فارسی کے الفاظ بڑھا دیے جائیں تو وہ اردو ہوجائے گی، ان دونوں میں مابہ الامتیاز صرف رسم الخط ہے، اگر اردو کا رسم الخط دیوناگری کردیا جائے، تو وہ چند دنوں میں ہندی کا قالب اختیار کرلے گی اور ہندی والوں کے رد و قبول کا سوال ہی باقی نہ رہ جائے گا۔

رسم الخط بدلنے سے اردو کی بہت سی خصوصیات مٹ جائیں گی۔ اس کی مختصر نویسی، اس کے حروف والفاظ کے تلفظ کی صحت وشائستگی اور اس کا حسن سب غارت ہوجائیں گے، خط نستعلیق اتنا حسین و دلکش ہے کہ نستعلیق کی اصطلاح ہی مہذب شایستہ اور کڑھے ہوئے آدمیوں کے لیے استعمال ہونے لگی، نسخ اور نستعلیق کے فنکاروں نے خطاطی کو ایک فن لطیف بنا دیا اور ایسے ایسے بوقلموں اور حسین وجمیل خط ایجاد کیے گئے جو آرٹ کا بہترین نمونہ ہیں۔ اور جن کی صناعی اعلیٰ درجہ کی مصوری کی ہمسری کرتی ہے۔ یہ سب کے سب آثار قدیمہ کے کتبات بن جائیں گے، رسم الخط بدلنے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اردو کا سارا علمی ذخیرہ جو صدیوں کی محنت وجانکاہی کا نتیجہ ہے، برباد ہوجائے گا۔ اس کا دیوناگری میں منتقل ہونا ناممکن ہے، ہندوستان کے مسلمانوں کا مذہبی ذخیرہ عربی کے بعد اردو ہی میں ہے اور عربی سے ناواقف مسلمانوں کی معلومات کا تنہا ذریعہ ہے۔ اس سارے ذخیرے سے وہ محروم ہوجائیں گے۔

اردو رسم الخط کی بین الاقوامی اہمیت یہ ہے کہ وہ وسط ایشیا سے لے کر شمالی افریقہ تک کے سارے اسلامی ملکوں میں رائج ہے، ایشیا اور افریقہ کے وہ اسلامی ملک بھی جن کی زبان اور رسم الخط عربی اور فارسی سے جدا ہے۔ قرآن مجید اور مذہبی تعلیم کی بدولت اردو رسم الخط سے بیگانہ نہیں ہیں۔ ان

کے یہاں عربی کی تعلیم اسی کے رسم الخط میں ہوتی ہے اور ان کی زبانوں میں بھی اس کے گہرے اثرات ہیں۔ اس لیے اردو رسم الخط ان ملکوں سے ربط و تعلق کا ایک بڑا ذریعہ ہے، یاد ہوگا کہ پنڈت جواہر لال نہرو جب تاشقند گئے تھے تو وہاں کے باشندوں نے السلام علیکم سے ان کا استقبال کیا تھا۔ پنڈت جی نے بھی اس کے جواب میں وعلیکم السلام کہا تھا اور لال بہادر شاستری نے تاشقند میں کسی رجسٹر پر اردو میں دستخط کیے تھے، جس کو ہندوستان کے اخبارات نے جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اس لیے جو لوگ اردو زبان اور اس کے رسم الخط کی مخالفت کرتے ہیں، وہ درحقیقت اسلامی ملکوں سے ربط و تعلق کے ایک بڑے رشتے کو کمزور کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ترکی زبان کے رسم الخط کی تبدیلی کی مثال پیش کرنا کئی وجہوں سے صحیح نہیں ہے، وہاں ترکی کی کوئی ایسی حریف زبان موجود نہیں تھی، جن میں اتنی قربت اور مشابہت ہو جتنی اردو اور ہندی میں ہے۔ اور جن میں صرف رسم الخط کا فرق ہو، بلکہ وہاں ترکی کے علاوہ کوئی دوسری زبان ہی نہیں ہے اس لیے رسم الخط کی تبدیلی سے اس کو کسی نقصان کا اندیشہ نہیں تھا، دوسرے اس نے ایک بالکل اجنبی رسم الخط اختیار کیا، جس کا ٹرکی میں پہلے کوئی وجود نہ تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ترکی پوری قوم کی زبان ہے، اس لیے اس کو کسی حال میں بھی نقصان پہنچنے کا امکان نہ تھا۔ اردو کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے، وہ ہر سمت سے نرغہ میں ہے۔ ایک سمت رسم الخط کی تبدیلی کی بھی ہے، پھر بھی رسم الخط کی تبدیلی سے ترکی قوم کو یہ نقصان تو بہر حال پہنچا کہ اس کی نئی نسل اپنے پرانے ذخیرہ سے بیگانہ ہوگئی لیکن ترکی قوم اور حکومت دونوں کی زبان ہے اس لیے اس کی تلافی کی کوشش بھی جاری رہی اور حکومت کی سرپرستی ہر نقصان کی تلافی کر سکتی ہے، اس کے مقابلہ میں اردو حکومت کی سرپرستی سے نہ صرف محروم ہے بلکہ اس کو سب سے زیادہ نقصان اسی سے پہنچا ہے جس کی تلافی نہیں ہوسکتی، ترکی کے رسم الخط کی تبدیلی بھی مصطفیٰ کمال کی ایک اپج تھی جس کو پوری قوم نے دل سے قبول نہیں کیا تھا اس لیے ترکی سے عربی رسم الخط کا بالکل خاتمہ نہیں ہوگیا اور وہاں آج بھی عربی رسم الخط میں بھی کتابیں چھپتی ہیں۔

اردو رسم الخط کی بعض خامیوں سے انکار نہیں لیکن خامیوں سے کسی زبان کا رسم الخط بھی خالی نہیں۔ اس سے اردو کی ابتدائی تعلیم میں ضرور دقت ہوتی ہے لیکن اس کی اصلاح کی کوششیں بھی جاری ہیں اور ماہرین تعلیم نے ایسی ریڈریں تیار کردی ہیں، جن سے یہ دقتیں بڑی حد تک دور ہوگئی ہیں۔

اردو کی پوری تعلیم کے بعد پھر کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔اس کے لکھنے پڑھنے دونوں میں اتنی تیزی اور روانی پیدا ہوجاتی ہے کہ ہندوستان کی کوئی زبان اس میں اردو کا مقابلہ نہیں کرسکی، ہندی لکھنے پڑھنے میں جتنا وقت اور تحریر و کتابت کے جس قدر لوازم صرف ہوتے ہیں، اردو لکھنے پڑھنے میں اس سے کہیں کم صرف ہوتے ہیں اور پڑھنے میں صرف نگاہ کام کرتی ہے۔اس لیے اردو کا رسم الخط بدلنے کی تجویز کسی حیثیت سے بھی مفید نہیں ہر پہلو سے سراسر مضر ہے، البتہ یہ تجویز مناسب ہے کہ ہندی والوں کے استفادہ کے لیے اردو کی بعض ضروری اور اہم کتابیں دیوناگری رسم الخط میں بھی لکھی اور شائع کی جائیں۔اس کا سلسلہ شروع ہوگیا اور مسلمانوں کی بعض مذہبی جماعتیں اپنا مذہبی لٹریچر ہندی زبان اور دیوناگری رسم الخط میں شائع کررہی ہیں اور آیندہ یہ سلسلہ بڑھتا جائے گا۔(معارف، نومبر ۱۹۷۰ء)

مڈٹرم الیکشن اور مسلمان

پارلیمنٹ کا درمیانی الیکشن اس حیثیت سے بڑا اہم اور فیصلہ کن ہے کہ ملک کو جمہوریت اور سیکولرزم کے راستہ پر لے جانا ہے یا فرقہ واریت اور رجعت پسندی کی راہ پر۔اس لیے اس الیکشن کے نتائج کا اثر مسلمانوں پر خصوصیت کے ساتھ زیادہ اثر پڑے گا، اس لیے ان کو بڑے غور و فکر سے فیصلہ کرنا ہے، غلط فیصلہ سے ان کی مشکلات اتنی بڑھ جائیں گی جس کا اندازہ الیکشن کے بعد ہی ہوگا۔ ایک طرف حکمراں کانگریس اور ترقی پسند پارٹیاں ہیں، دوسری طرف تنظیم کانگریس اور متضاد نقطۂ نظر رکھنے والی پارٹیوں کا محاذ ہے۔اس میں شبہہ نہیں کہ مسلمانوں کو کانگریس کا بڑا تلخ تجربہ ہے۔ان کی اکثریت نے ہمیشہ کانگریس کا ساتھ دیا، جس سے اس کو فائدہ پہنچا لیکن مسلمانوں کی ساری حق تلفیاں اور ان پر ساری زیادتیاں اسی کے دور میں ہوئیں اور حکومت نے زبانی طفل تسلیوں کے علاوہ اس کا کوئی تدارک نہیں کیا اور مسلمانوں کے ایک طبقہ نے مایوس ہوکر اپنے مسائل کے حل کے لیے اپنی الگ تنظیم قائم کی، جو درحقیقت جمہوریت اور سیکولرزم کی ناکامی کا نتیجہ ہے۔اگر ہندوستان میں صحیح معنوں میں جمہوریت اور سیکولرزم ہوتی اور اقلیتوں کے حقوق محفوظ ہوتے تو ان کو اپنی تنظیم قائم کرنے کی ضرورت ہی نہ پیش آتی۔

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمان ملک کے ہر حصہ میں اقلیت میں ہیں۔اس لیے ان کی کوئی تنظیم بھی اکثریت کی امداد و ہمدردی کے بغیر محض اپنے بل بوتے پر اپنے مسائل حل

نہیں کرسکتی اور نہ اس کا کوئی امیدوار الیکشن میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ البتہ کانگریس کے امیدوار کو نقصان پہنچ جائے گا اور اس کا فائدہ مسلمان دشمن پارٹیوں کو پہنچے گا۔ اس لیے اس الیکشن میں مسلمان تنظیموں کا اپنے امیدوار کھڑے کرنا بالکل بے نتیجہ ہے، بالفرض اگر ان کے کچھ امیدوار کامیاب بھی ہوگئے تو دو چار ممبر کیا کرسکتے ہیں۔ یہ تسلیم ہے کہ مسلمانوں کے معاملات میں عمل کے لحاظ سے کانگریس اور دوسری پارٹیوں میں زیادہ فرق نہیں ہے لیکن اپنے اصولوں کے اعتبار سے کانگریس ایک جمہوری سیکولر اور ترقی پسند پارٹی ہے اور حکمراں کانگریس ایک حد تک فرقہ پرور کانگریسیوں سے پاک ہوچکی ہے، اگر مسلمانوں کو آیندہ کچھ امید ہوسکتی ہے تو اسی سے ہوسکتی ہے۔ اس لیے ان کو ایک تجربہ اور کرنا چاہیے اور پوری طرح حکمراں کانگریس کا ساتھ دینا چاہیے۔ اس کے سوا ان کے لیے کوئی چارۂ کار نہیں ہے، اگر ان کے کچھ امیدوار کامیاب بھی ہوگئے تو آخر میں ان کو بھی حکمراں کانگریس کا ساتھ دینا پڑے گا۔ (معارف، جنوری ۱۹۷۱ء)

مڈٹرم الیکشن اور مسلمان

موجودہ الیکشن کے بارہ میں ہم گذشتہ مہینہ اپنے خیالات ظاہر کرچکے ہیں۔ اب اس کی تاریخیں بالکل قریب آگئی ہیں۔ اس الیکشن کی حیثیت گذشتہ الیکشنوں سے بہت مختلف ہے۔ اس کے نتائج پورے ملک خصوصاً مسلمانوں کے حق میں بڑے دوررس نکلیں گے، جس کا احساس ان کو بھی ہے۔ اسی لیے ان کا عام رجحان نئی کانگریس کی طرف ہے لیکن بعض مسلم تنظیموں نے بھی اپنے امیدوار کھڑے کیے ہیں، پرانی کانگریس سے مسلمانوں کی شکایتیں بالکل بجا ہیں، اس الیکشن میں اگر اس کا مقابلہ ہوتا تو مسلمان تنظیموں کا اپنے امیدوار کھڑے کرنا اگرچہ بے نتیجہ ہوتا لیکن حق بجانب ہوتا لیکن اب پرانی کانگریس ختم ہوچکی ہے اور اس الیکشن میں جمہوری سیکولر ترقی پسند نئی کانگریس اور اس کی مخالف پارٹیوں کے متحدہ محاذ کا مقابلہ ہے، یعنی یہ الیکشن درحقیقت جمہوریت، سیکولرزم، ترقی پسندی اور فرقہ پروری اور رجعت پسندی کے درمیان جنگ ہے۔ ان دونوں کے فتح و شکست کے جو نتائج پورے ملک خصوصاً مسلمانوں کے حق میں نکلیں گے، وہ ظاہر ہیں۔ یہ بھی مسلم ہے کہ مسلمان تنظیموں کا کوئی امیدوار یا آزاد مسلمان تنہا مسلمانوں کے ووٹ سے کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اس کی حمایت میں جو ووٹ بھی دیا جائے گا، اس سے اس کو تو کوئی فائدہ نہ ہوگا، البتہ نئی کانگریس کے امیدوار

کو نقصان پہنچ جائے گا۔ اور اس کا فائدہ اس کی مخالف پارٹیوں کو پہنچے گا، اسی لیے وہ پارٹیاں جو مسلمان تنظیموں کا نام تک سننا گوارا نہیں کرتی تھیں، ان کے امیدواروں کی حمایت کررہی ہیں۔

بہت سے حلقوں میں اس وقت مسلمانوں کو فیصلہ کن قوت حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ اس سے وہ پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اگر اس موقع کو انہوں نے ضائع کردیا تو اس کی تلافی مدتوں نہ ہوسکے گی۔ اس لیے مسلمانوں کو اپنا ووٹ بہت سوچ سمجھ کر استعمال کرنا چاہیے، اگر مسلمان تنظیموں کے دوچار امیدوار یا آزاد مسلمان کسی طرح کامیاب بھی ہوگئے تو ان کی آواز کا کیا اثر ہوسکتا ہے۔ ان کو بہرحال کسی نہ کسی پارٹی کا ساتھ دینا پڑے گا اور وہ نئی کانگریس ہی ہوسکتی ہے۔ اس لیے پہلے ہی سے اس کو تقویت پہنچانا زیادہ مفید ہوگا۔ اس سے کانگریس پر مسلمانوں کا اثر قائم ہوگا، صوبوں میں مخلوط حکومتوں کا پورا تجربہ ہوچکا ہے، اس کے نتائج سب کی نگاہ کے سامنے ہیں۔ اگر یہی صورت حال مرکز میں بھی پیدا ہوگئی تو پورا ملک انتشار اور بدنظمی کا شکار ہوجائے گا۔ خاص طور سے مسلمانوں کو جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا اس کا اندازہ دشوار نہیں ہے۔ اس لیے اس وقت مسلمانوں کو جو موقع ملا ہے اس سے ان کو پورا فائدہ اٹھانا چاہیے اور اپنی پوری قوت نئی کانگریس کی حمایت میں صرف کردینی چاہیے اور یہ باعث اطمینان ہے کہ مسلمانوں کا عام رجحان نئی کانگریس کی طرف ہے اور ان کا وہ طبقہ اور عاقبت اندیش مسلمان تنظیمیں بھی جو پرانی کانگریس کی مخالف تھیں، نئی کانگریس کی حمایت میں ہیں۔ اس لیے یقین ہے کہ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نئی کانگریس کا ساتھ دے گی۔ (معارف، فروری ۱۹۷۱ء)

فرقہ وارانہ منافرت اور الجمعیۃ

فرقہ وارانہ منافرت روکنے والی دفعہ کی زد میں سب سے زیادہ مسلمان اخبارات آئے ہیں اور اس کے ماتحت متعدد اردو اخبارات پر مقدمات چل رہے ہیں، ان میں الجمعیۃ بھی ہے۔ اس کے فاضل اڈیٹر مولانا محمد عثمان فارقلیط کو سزا ہوگئی ہے اور ان کے جیسے ضعیف العمر اور محترم شخصیت کو سی کلاس دیا گیا، جو ادنٰی درجہ کے مجرموں کے لیے ہے۔ گو مولانا ضمانت پر رہا ہوگئے ہیں اور اس فیصلہ کی اپیل ہوگئی ہے مگر اس سے اس دفعہ کے اصل منشا کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں فرقہ پرور پارٹیوں کے اخبارات مسلمانوں کی ہر طرح کی دل آزاری کرتے رہتے ہیں اور ان سے کوئی باز پرس نہیں۔ مولانا فارقلیط اگرچہ بہت ضعیف ہوچکے ہیں لیکن ان کی ہمت اور ان کا قلم جوان ہے اور ان کی پوری

زندگی قلمی جہاد میں گذری۔ اس لیے مجاہدین ملت کی اس سنت سے کیوں محروم رہتے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس امتحان میں استقامت اور اس کا اجر عطا فرمائے۔ (معارف، فروری ۱۹۷۱ء)

مادری زبان میں تعلیم اور اردو

مادری زبان میں تعلیم کا مسئلہ ایسا متفقہ ہے جس سے کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ ہندوستان کے دستور نے بھی اس کا حق دیا ہے اور کانگریس ورکنگ کمیٹی، ایجوکیشن کمیشن، وزارت تعلیم، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن وغیرہ سب نے اس کی پوری حمایت کی ہے۔ چودہ قومی زبانوں میں اردو بھی شامل ہے۔ چنانچہ ان زبانوں میں تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے حکومت نے جو خطیر رقم منظور کی ہے اس میں ایک کرور اردو کا بھی حصہ ہے۔ دوسری علاقائی زبانوں میں تعلیم کا آغاز ہو گیا ہے اور جلد ہی اس کی یونیورسٹیاں بھی قائم ہوجائیں گی۔ اردو زبان میں تعلیم اور اردو یونیورسٹی کا مسئلہ تیا نہیں ہے برسوں سے چل رہا ہے۔ ریاست حیدرآباد نے تو ہندوستان کی آزادی سے مدتوں پہلے اردو کی یونیورسٹی قائم کردی تھی، جس میں سارے فنون کی تعلیم اردو میں ہوتی تھی مگر آزادی کے بعد حالات نے اردو کے خلاف ایسی فضا پیدا کردی کہ اردو میں تعلیم اور اردو یونیورسٹی کا سوال الگ رہا، اس کو اس کے مرکزوں تک سے نکال دیا گیا۔ جامعہ عثمانیہ بھی اس کی بھینٹ چڑھ گئی مگر اردو کی مخالفت اب رفتہ رفتہ ختم ہورہی ہے۔ فرقہ پرور پارٹیوں کو چھوڑ کر ہر سطح پر اس کے حقوق کا اعتراف کیا جانے لگا ہے۔ اس لیے مادری زبان میں تعلیم کے فیصلہ کے بعد اردو یونیورسٹی کا مسئلہ پھر سامنے آگیا ہے۔

اردو کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کو کسی ریاست کی علاقائی زبان نہیں مانا جاتا اور خوش قسمتی یہ ہے کہ پورا ہندوستان اس کا علاقہ ہے اور وہ ہندی ریاستوں کے بڑے حصہ کی مادری زبان ہے۔ اس کے بولنے والوں کی تعداد کئی کرور ہے، علمی حیثیت سے ہندوستان کی تمام زبانوں میں امتیازی درجہ رکھتی ہے اور ہندوستان کے سیکولر کردار کی سب سے بڑی نشانی ہے، اس لیے ہر حیثیت سے یونیورسٹی کی مستحق ہے، اس لیے خواجہ احمد فاروقی صاحب صدر شعبہ اردو دلی یونیورسٹی نے اس مہم کو اٹھایا ہے اور ''اردو یونیورسٹی کی تجویز'' کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا ہے۔ اس میں بڑی خوبی سے اس کی وکالت کی ہے اور اردو کی اہمیت اور اردو یونیورسٹی کی تجویز کو بڑے مدلل طریقہ سے پیش کیا ہے۔ اس تجویز سے کس کو اختلاف ہوسکتا ہے، یہ تو اردو والوں کی دلی آرزو ہے، سوال جو کچھ ہے وہ اس راہ کی

رکاوٹوں کا ہے، اس میں سب سے بڑی رکاوٹ صوبائی حکومتیں ہیں، وہ زبانی تو اردو کے حقوق کا اعتراف کرتی ہیں اور کبھی کبھی اردو کی تعلیم کے متعلق کوئی سرکلر بھی جاری کر دیتی ہیں لیکن اس پر عمل نہیں ہوتا اور اردو کا قدم جہاں تھا وہیں ہے، اس لیے جب تک اردو میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا انتظام نہ ہو، یونیورسٹی کا قیام بے معنی ہے، اس میں پڑھنے والے کہاں سے آئیں گے، اس لیے سب سے پہلے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی رکاوٹیں دور کرنا ضروری ہے جو اردو والوں کے اختیار میں نہیں ہے۔ دوسری رکاوٹ خود اردو والوں کی غفلت اور لاپرواہی ہے، حکومت نے اردو کو تعلیم سے خارج کر کے اتنا غیر اہم بنا دیا ہے کہ عملی زندگی میں اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے، بلکہ وہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھی جاتی ہے، اس لیے جن کی زبان اردو ہے وہ بھی اس کی تعلیم سے گریز کرتے ہیں، اس کا جواب خواجہ صاحب نے دیا ہے مگر وہ تشفی بخش نہیں ہے، اس لیے یونیورسٹی کے قیام سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے اردو میڈیم اسکول اور کالج قائم کیے جائیں، اس کے بغیر یونیورسٹی کا تخیل کامیاب نہیں ہوسکتا، جب بنیاد ہی غائب ہوگی تو عمارت کس پر تعمیر ہوگی۔ (معارف، مئی ۱۹۷۱ء)

اردو اور حکومت

مسز اندرا گاندھی نے الیکشن کے زمانہ میں اردو زبان اور اقلیتی اداروں کے بارہ میں جو وعدے کیے تھے، اس کے نتیجہ میں اردو کے لیے فضا سازگار ہونے کے کچھ آثار ہیں۔ چنانچہ اتر پردیش کی حکومت نے مختلف شعبوں میں اردو کو جو سہولتیں دی ہیں یا دینے والی ہے، اس کی تفصیل شائع کی ہے لیکن اصل سوال ان پر عمل کا ہے، اس سے پہلے کی حکومتیں بھی اس قسم کی سہولتوں کا اعلان کر چکی ہیں، مگر عملاً اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، اس میں حکومت کا تصور ہو یا ماتحت عملہ کا، مگر اس کی اصل ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ سنجیدگی سے کوئی حکم نافذ کرنا چاہے تو ماتحت عمال اس کو نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے، آخر اردو ہی کے معاملہ میں ان کی یہ آزادی کیوں ہے، بہر حال اس قسم کے وعدے تو بہت سننے میں آچکے ہیں، اس نئے وعدہ کا بھی تجربہ کرنا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک پہلو قابل غور ہے۔ اردو کے حقوق میں اصل اور بنیادی مسئلہ اس کی تعلیم کا ہے، جب تک یہ خاطر خواہ طریقہ سے حل نہیں ہوتا، اردو کو جو حقوق بھی ملیں گے ان سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب بقدر ضرورت اردو کی تعلیم لازمی کر دی جائے۔ طلبہ کی

تعداد کی شرط سے اسکولوں کے منتظمین کو اس کی تعلیم میں طرح طرح کی رکاوٹیں پیدا کرنے کا موقع ملتا ہے، جس سے مطلوبہ تعداد پوری نہیں ہونے پاتی۔ اردو کے اساتذہ اور نصاب کی کتابیں بھی نہیں ملتیں۔ اگر کسی طرح ان دشواریوں پر قابو بھی پالیا جائے تو یہ واقعہ ہے کہ اردو پڑھنے والے طلبہ صرف مسلمان ہوتے ہیں جن کا ملازمتوں میں بہت کم گذر ہے اور اعلیٰ عہدوں پر تو خال خال ہی نظر آتے ہیں اور ان کی تعداد روز بروز گھٹتی جاتی ہے۔ ہندو طلبہ میں ہزاروں میں مشکل سے دو چار اردو پڑھنے والے نکلیں گے اور یہی ملازمتوں میں جاتے ہیں جو اردو سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ اس لیے عدالتوں اور دوسرے شعبوں میں اردو کو جو حقوق ملیں گے اس کے سمجھنے والے کہاں ہوں گے۔ اردو کے ٹرینڈ اساتذہ تک مشکل سے میسر آئیں گے۔ اسی لیے اردو کے بارہ میں حکومت جو ہدایتیں جاری کرتی ہے ان پر عمل نہیں ہو پاتا۔ اس کا حل صرف یہ ہے کہ آٹھویں جماعت تک اردو کی تعلیم لازمی کردی جائے، اس کے بغیر اردو کو دی ہوئی سہولتوں سے بہت کم فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس سے ہندی کی برتری میں کوئی فرق نہیں آتا، وہ تو حکومت کہ مسلمہ زبان ہے اور شروع سے آخر تک لازمی ہے، قومی یکجہتی کے نقطہ نظر سے بھی ضروری ہے کہ ہندی اور اردو والوں میں جو دوری اور بیگانگی ہے، وہ دور کی جائے، اس کا ایک بڑا ذریعہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی زبان سے واقف ہوں۔ (معارف، اگست ۱۹۷۱ء)

اتر پردیش میں اردو اکیڈمی کی تاسیس

اتر پردیش کی حکومت نے جو اردو اکیڈمی قائم کی ہے، بعض حلقوں میں اس کا بڑا خیر مقدم ہو رہا ہے اور اس سے اردو کے بارہ میں بڑی امیدیں قائم کی جارہی ہیں۔ اکیڈمی کے جو اغراض و مقاصد شائع ہوئے ہیں۔ اس سے اتنا اندازہ تو ضرور ہوتا ہے کہ اب اردو سے وہ عناد باقی نہیں رہا، اگر ان مقاصد پر عمل ہو تو اردو کو پنپنے کا کچھ موقع مل سکتا ہے۔ پہلے اردو کے نام سے چڑھ تھی، اردو کتابوں پر انعامات اور ان کی طبع و اشاعت اور اردو لائبریریوں میں ان کی خریداری کے لیے جو حقیر رقم ملتی تھی، وہ بھی ہندی کے طفیل میں مگر اب ان کاموں کے لیے ایک معقول رقم اردو کے نام سے مخصوص کردی گئی ہے، باقی اردو کی بقا و ترقی کے وسائل اور اس سے متعلق شکایتوں کے ازالہ وغیرہ کے بارہ میں جو باتیں کہی گئی ہیں۔ اصل سوال ان پر عمل کا ہے، ورنہ اس قسم کے وعدے تو ہر حکومت کرتی چلی آئی ہے، جن پر آج تک عمل نہیں ہوا۔ اب اکیڈمی کے ذریعہ اس کا تجربہ کرنا ہے۔

اردو کا اصل مسئلہ اس کی تعلیم کا ہے، جب تک ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں اس کا قابل اطمینان انتظام نہیں ہوتا۔ اس قسم کی اکیڈمیوں کے قیام سے کوئی بڑا فائدہ نہیں، اردو کے مطالبات سے حکومت پوری طرح واقف ہے۔ مرکزی انجمن ترقی اردو اور دوسری مجالس ان کو بار بار پیش کر چکی ہیں۔ اگر واقعی حکومت اردو کے معاملہ میں مخلص ہے تو ان مطالبات کو مان کر اس کا ثبوت دینا چاہیے، ورنہ کم سے کم اردو کو جو حقوق بھی ملیں اس کی حیثیت قانونی ہونی چاہیے، محض اردو اکیڈمی کے قیام سے اردو زندہ نہیں رہ سکتی۔

اگر اکیڈمی کے اغراض و مقاصد پر عمل درآمد ہو تو بھی غنیمت ہے جو بڑی حد تک اردو کے ساتھ اس کے ممبروں اور عہدہ داروں کی ہمدردی اور دلچسپی پر موقوف ہے۔ ممبروں کے نام کا تو ابھی اعلان نہیں ہوا ہے۔ اس کے صدر اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کملا پتی ترپاٹھی اور سکریٹری تربھون پرشاد ہوئے ہیں، جن کو اردو سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر اکیڈمی کے ذریعہ واقعی کچھ کرنا ہے تو ان دونوں عہدوں کے لیے ایسے اشخاص کا انتخاب ہونا چاہیے جو اردو سے پوری طرح واقف ہوں اور جن کو اس سے ہمدردی بھی ہو، سرکاری آدمی کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس لحاظ سے صدارت کے لیے سب سے موزوں شخصیت پنڈت آنند نرائن ملّا کی ہے۔ سکریٹری کے عہدہ کے لیے بھی ایسے اشخاص مل سکتے ہیں۔ ایک نام تو حیات اللہ صاحب انصاری کا ہے، جن کی حیثیت سرکاری بھی ہے اور وہ اردو کے مشہور وکیل اور ادیب بھی ہیں۔ (معارف، نومبر ۱۹۷۱ء)

مسلم پرسنل لا

مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی کا مسئلہ کچھ دنوں سے سرد پڑ گیا تھا۔ حکومت کے ذمہ داروں نے بار بار اس کا یقین دلایا کہ مسلمانوں کی مرضی کے بغیر اس میں تبدیلی نہ کی جائے گی، مگر اب کچھ نام نہاد مسلمانوں نے اس کا مطالبہ شروع کر دیا ہے، اس مسئلہ کو سمجھنے میں بنیادی غلطی یہ کی جاتی ہے کہ اس کو مذہبی نہیں بلکہ سماجی مسئلہ سمجھا جاتا ہے، حالانکہ مسلمانوں کا پرسنل لا کلام مجید اور احادیث نبویؐ پر مبنی ہے جو مسلمان اس کا مطالبہ کرتے ہیں، ان میں سے کچھ تو حسن نیت سے مگر مذہب سے ناواقفیت کی بنا پر کرتے ہیں اور کچھ وہ لوگ ہیں جن کو مذہب سے کوئی علاقہ نہیں۔ وہ کلام مجید کے صریح احکام کو بھی قابل ترمیم سمجھتے ہیں اور علانیہ اس کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسے لوگ مسلمان کہلانے کے کب مستحق

ہیں اوران کو مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کا کیا حق ہے، محض مسلمان گھرانے میں پیدا ہونے اور مسلمانوں جیسا نام رکھ لینے سے کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا، جب تک کلام مجید کے احکام پر پورا ایمان نہ ہو۔

پرسنل لا کے منصوص اور صریحی احکام میں تو کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوسکتی لیکن مصلحت اور ضرورت کے لحاظ سے بعض پہلوؤں میں ترمیم واصلاح کی گنجائش ہے، مگر مصلحت وضرورت کا معیار محض زمانہ کا رجحان اور دوسروں کی تقلید نہیں، بلکہ واقعی ضرورت ہے، جس کے بغیر مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا قوی اندیشہ ہو، اس صورت میں بھی اس کا اختیار ماہرین شریعت کو ہے۔ ہر کس و ناکس کو نہیں کہ وہ شریعت کے دائرے کے اندر اس کے اصولوں کی روشنی میں اس کا حل نکالیں، اگر زمانہ کے رجحان و مذاق کو معیار مان لیا جائے تو وہ ہر زمانہ میں بدلتا رہتا ہے، اس لیے ہر دور کے مذاق کے مطابق شریعت کے قوانین میں تبدیلی کرنا پڑے گی، اور وہ بازیچۂ اطفال بن جائے گی۔

یہ مسرت کا مقام ہے کہ دارالعلوم دیوبند نے اس مسئلہ کی طرف توجہ کی ہے اور مولانا محمد طیب صاحب نے اس پر غور کرنے کے لیے علماء کا ایک اجتماع طلب کیا ہے۔ اس قسم کے مسائل پر غور اور ان کے متعلق فیصلہ کا سب سے زیادہ حق دارالعلوم دیوبند ہی کو ہے۔ امید ہے کہ مولانا محمد طیب صاحب کی رہنمائی میں یہ ضروری کام صحیح طریقہ سے انجام پائے گا۔ پرسنل لا کے بعض فقہی مسائل ہیں، اگر کسی خاص مکتب فقہ کی پابندی نہ کی جائے تو بہت سی مشکلات کا حل نکل سکتا ہے اور ہر دور کے فقہاء نے ضرورت کے وقت اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس لیے اس زمانہ میں بھی اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ (معارف، مارچ ۱۹۷۲ء)

مسلم یونیورسٹی بل

برسوں کے انتظار کے بعد بالآخر مسلم یونیورسٹی بل پاس ہوگیا اور سارے وعدوں اور یقین دہانیوں کے برخلاف اس کا اقلیتی کردار بڑی حد تک ختم کردیا گیا، ایسے اہم بل کو جس پر بڑے غور و فکر اور بحث و مباحثہ کی ضرورت تھی، اس عجلت سے پاس کیا گیا کہ اس جھگڑے میں پڑنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس نے ہندوستان کے دستور سے اقلیتوں کا اعتماد متزلزل کردیا، دستور نے اقلیتوں کو اپنی ضرورت اور پسند کے مطابق تعلیمی ادارے قائم کرنے کا حق دیا ہے اور حکومت ان کو امداد دینے کی

ذمہ دار ہے، وہ اپنی گرہ سے نہیں بلکہ اقلیتوں ہی کے ادا کردہ ٹیکس سے دیتی ہے، اس لیے محض امداد دینے کی بنا پر اس کو کسی ادارے کے کردار کو بدلنے کا حق نہیں ہے، لال بہادر شاستری سے لے کر اس وقت تک حکومت کے سارے ذمہ دار اس کا یقین دلاتے رہے کہ مسلم یونیورسٹی کا کردار باقی رکھا جائے گا۔ مسز اندرا گاندھی نے بھی اپنے الیکشنی منشور میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا، مسٹر نورالحسن اپنی تقریروں اور بیانات میں بھی اس کا یقین دلاتے رہے، مگر یہ سارے وعدے طاق نسیان کے حوالے کر دیے گئے اور مسٹر چھاگلہ نے جو کار خیر شروع کیا تھا، مسٹر نورالحسن نے اس کو تکمیل تک پہنچا دیا اور مسلمانوں کی جھوٹی تسلی کے لیے اقلیتی کردار کے بجائے تاریخی کردار کی نئی اصطلاح وضع کی گئی ہے اور اس کو باقی رکھنے کا وعدہ کیا گیا ہے، ان دونوں کے دقیق فرق کو حکومت ہی سمجھ سکتی ہے۔ یونیورسٹی کے اقامتی کردار کے علاوہ اور کون سا تاریخی کردار باقی رکھا گیا ہے، اس بل میں یہی ایک چیز ایسی ہے، جس سے کسی حد تک یونیورسٹی کا پرانا کردار باقی رہنے کی امید ہے۔

مسلمان اقتصادی اور تعلیمی دونوں حیثیتوں سے پچھڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے تعلیمی سہولتوں کے مستحق ہیں۔ ان کو مسلم یونیورسٹی میں جو سہولتیں حاصل تھی، اس بل نے اس کا دروازہ بند کر دیا، مسلمانوں کی اقتصادی اور تعلیمی پس ماندگی کی وجہ سے دوسری یونیورسٹیوں میں حصول تعلیم میں ان کے لیے مختلف قسم کی دشواریاں ہیں۔ مسلم یونیورسٹی میں ان کو ایسی سہولتیں حاصل تھیں کہ غریب اور معمولی ذہن کے طلبہ بھی تعلیم حاصل کر لیتے تھے۔ یونیورسٹی کا نظم و نسق مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا، ہر شعبہ میں ان کی اکثریت تھی، اس بل میں اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے، اس لیے رفتہ رفتہ ان کی تعداد اتنی گھٹ جائے گی کہ بالکل غیر موثر ہو جائے گی، اس میں اور دوسری یونیورسٹیوں میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔ اس طرح مسلمانوں پر تعلیم کا دروازہ تنگ ہو جائے گا اور یہ سب کچھ سیکولرزم، قومی وحدت و یکجہتی اور قومی دھارے کے نام سے کیا جا رہا ہے، جو در حقیقت اس کے خلاف ہے۔ سیکولرزم اور قومی یکجہتی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ملک کے سارے باشندوں کو ایک رنگ میں رنگ دیا جائے۔ صحیح سیکولرزم اور جمہوریت یہ ہے کہ ہر اقلیت کو اس کی تہذیب و ثقافت کے مطابق نشو و نما اور ترقی کا موقع دیا جائے، جس میں تعلیم بھی داخل ہے۔ اسی لیے ہندوستان کے دستور میں اس کی ضمانت دی گئی ہے۔ کسی سیکولر اور جمہوری حکومت خصوصاً ہندوستان جیسے براعظم کا حسن جو مختلف

مذہبوں اور تہذیبوں کا گہوارہ ہے، یک رنگی نہیں، بلکہ رنگارنگی میں ہے۔قانون کے ذریعہ یک رنگی اور یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش دستور کے بھی خلاف ہے اور تاریخی حقائق کے بھی۔ چنانچہ کبیر اور اکبر کے زمانہ سے اس وقت تک اس کی جس قدر کوشش ہوئیں سب ناکام رہیں اور آیندہ بھی ناکام رہیں گی، کوئی خوددار اقلیت بھی اپنی خصوصیات بدلنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتی اور مسلمان تو ایک شاندار تہذیب اور درخشاں تاریخ کے مالک ہیں۔مولانا ابوالکلام اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے قوم پرور اپنی تہذیب و روایات کا ایک جز بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے، جس پر ان کی تقریریں شاہد ہیں۔ حکومت کے قومی وحدت و یک رنگی کے اس تصور اور جن سنگھ کے بھارتیہ کرن میں الفاظ کی خوبصورتی اور بھدّے پن کے علاوہ اور فرق کیا ہے؟

اس سے انکار نہیں کہ قومی وحدت و یکجہتی قومی دھارے میں اقلیتوں کی شرکت خود ان کے اور ملک دونوں کے لیے مفید اور ضروری ہے مگر اس کی جو شکلیں اختیار کی جاتی ہیں۔اس سے وحدت کے بجائے اور انتشار پیدا ہوتا ہے۔ یہ چیزیں قانون اور جبر کے ذریعہ نہیں بلکہ باہمی اتحاد اور خیر سگالی سے پیدا ہوتی ہیں، جبر سے اور دوری ہوتی ہے۔اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ دستوری تحفظات کے ساتھ مسلمانوں کو عمل سے بھی اس کا یقین دلایا جائے کہ وہ اس ملک کے شہری اور ملکی حقوق میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ بے بس اقلیت نہیں، مگر عمل یہ ہے کہ اردو زبان قریب قریب ختم کردی گئی، اب اترپردیش کی حکومت نے اس کی طرف کچھ توجہ کی ہے۔مسلمانوں کا پرسنل لا بدلنے کی تمہید شروع ہوگئی ہے۔مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار باقی رکھ کر حکومت مسلمانوں کا دل جیت سکتی تھی، مگر ان کے متفقہ مطالبہ کے باوجود اس کو مسخ کردیا گیا۔اس کا ان پر کیا اثر پڑے گا۔وہ قومی دھارے سے قریب ہوں گے یا دور ہوجائیں گے، یہ ایسا زخم ہے جو مشکل سے مندمل ہوگا، اب بھی حکومت اس بل میں مناسب ترمیم کرکے اس کی تلافی کرسکتی ہے۔یہ جبر نہ صرف مسلمانوں بلکہ ملک کے لیے ضروری ہے، ہندوستان میں دوسو کے قریب اور اس صوبہ میں سات آٹھ خالص سیکولر، قومی وحدت، یکرنگی کی معلم اور قومی دھارے کی ساگر یونیورسٹیاں ہیں، اگر ایک مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو قائم رکھا جاتا تو ان چیزوں پر کیا اثر پڑتا، جبکہ مسلم یونیورسٹی بھی اس حیثیت سے قومی اور سیکولر ہے کہ اس کا دروازہ کسی کے لیے بند نہیں ہے ورنہ تنہا لفظ مسلم سے کیا حاصل۔اس کو بھی نکال دینا چاہیے تاکہ وہ ہر

حیثیت سے خالص سیکولر بن جائے۔

مسلمانوں کے مسائل میں حکومت بڑی غلطی یہ کرتی ہے کہ ان کے اصلی نمایندوں کے بجائے ان لوگوں پر اعتماد کرتی ہے، جن کو مسلمانوں کے مفاد سے کوئی ہمدردی نہیں۔ان کا مقصد صرف ذاتی جاہ و اقتدار ہے۔اس لیے اس کو ان کی ترجمانی پر کوئی حق نہیں ہے، جب تک مولانا ابوالکلام، ڈاکٹر ذاکر حسین بلکہ ہمایوں کبیر تک حومت کے مشیر کار رہے، انہوں نے اس کو غلط قدم اٹھانے سے روک رکھا، ان کے ممبران کے جانشین وہ لوگ ہوئے جو اپنی غرض کے بندے اور حکومت کے چشم و ابرو کے اشارے کے پابند ہیں، ان کو مسلمانوں کے مفاد سے کوئی تعلق نہیں، یہی وجہ ہے کہ ایک مولانا ابوالکلام تھے، جنھوں نے اس وقت مسلم یونیورسٹی کو بچایا، جب اس کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا اور ایک ان کے جانشین ہیں، جنھوں نے اس کا کردار مسخ کر کے دم لیا، مگر یہ فیصلہ مشکل ہے کہ حکومت ان کو اپنے اغراض کے لیے استعمال کرتی ہے یا وہ حکومت کو اپنے اغراض کے لیے۔

(معارف، جون ۱۹۷۲ء)

قوم پروری، سیکولرازم اور مسلمان

ہندوستان کے جمہوری اور سیکولر دستور نے ملک کے سارے باشندوں کو اس کا شہری اور ملکی حقوق میں برابر کا حصہ دار مانا ہے اور اقلیتوں کے مذہب، زبان اور کلچر کے تحفظ کی پوری ضمانت دی ہے۔اگر کسی سبب سے اس پر عمل میں کوتاہی ہوتی ہے تو اس کا مطالبہ اور اس کے لیے پر امن احتجاج کو فرقہ پروری کس طرح کہا جا سکتا ہے۔اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ تو جمہوریت اور سیکولرزم کی جان ہے اور اس کے لیے کوشش اس کی بہت بڑی خدمت ہے اور تحفظ وہی معتبر مانا جائے گا، جس کا خود اقلیتوں کو اعتراف ہو۔ہندوستان میں صحیح معنوں میں سیکولرزم اسی لیے قائم نہیں ہو سکی کہ اقلیتوں کے مسائل کو نظر انداز کیا گیا۔

سیکولرزم کا مفہوم یوں تو بہت وسیع ہے لیکن زیر بحث معاملہ میں اس کا تعلق صرف حکومت اور ملکی معاملات سے ہے۔سیکولر حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اس کا کوئی مذہب نہیں، اس کی نگاہ میں سارے مذاہب اور ان کے ماننے والے برابر اور ملکی حقوق میں یکساں ہیں اور وہ مذہب کی بنا پر کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کرتی، سیکولر نقطہ نظر کے معنی یہ ہیں کہ ملکی معاملات کو مذہبی نقطہ نظر کے

بجائے ملک کے مصالح اور مفاد کے لحاظ سے دیکھا جائے، اس میں اقلیتوں کے مذہبی، لسانی اور تہذیبی حقوق کہیں سے نہیں آتے۔ کیونکہ خود سیکولر دستور نے ان کے تحفظ کی ضمانت دی ہے۔ اس لیے ان کا مطالبہ اور اس کے لیے آئینی احتجاج کسی حیثیت سے بھی سیکولرزم کے خلاف نہیں، ورنہ پھر جمہوریت اور ڈکٹیٹرشپ میں فرق کیا رہ جاتا ہے۔ قومی وحدت اور سیکولرزم کا دائرہ اتنا وسیع کردینا کہ زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس سے باہر نہ رہ جائے، نہ صحیح ہے اور نہ ملک کے لیے مفید۔

قوم پروری اور سیکولرزم کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ ہندوستان کے سارے باشندے ایک رنگ میں رنگ دیے جائیں۔ ایسی وحدت و یک رنگی تو سیکولرزم کے سراسر خلاف ہے۔ صحیح سیکولرزم کے معنی ہی یہ ہیں کہ ملک کے ہر فرقہ اور ہر طبقہ کو اس کی خصوصیات کے ساتھ زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا موقع دیا جائے۔ وطنی حیثیت اور مشترک ملکی مفاد کے لحاظ سے بلاشبہ ہندوستان کے سارے باشندے ایک قوم ہیں لیکن مذہبی، تہذیبی اور لسانی حیثیت سے ان میں اتنا اختلاف ہے کہ مسلمان تو مسلمان سارے ہندوؤں کو بھی ایک قوم کہنا مشکل ہے۔ چنانچہ خود ہندوستان کے بہت سے مفکرین کا خیال ہے کہ ہندوستان ایک قومی ملک نہیں، بلکہ مختلف قوموں کا مجموعہ ہے۔ اس لیے ان میں تہذیبی وحدت پیدا کرنے کی کوشش جمہوریت اور سیکولرزم کے بھی خلاف ہے اور ملکی مفاد کے بھی۔ ملک کی ہواخواہی اسی میں ہے کہ ان میں تہذیبی وحدت پیدا کرنے کی کوشش نہ کی جائے، بلکہ ہر فرقہ کو اس کی خصوصیات کے ساتھ زندہ رہنے کا موقع دیا جائے۔

اس کے اعتراف سے کہ اس قسم کے معاملات میں حکومت اور اکثریت کے کچھ مسلمان بھی ہم نوا بن جاتے ہیں، مگر ان کو کوئی حیثیت نہیں، یہ جنس ہر زمانہ میں رہی ہے اور حکومتیں ان کی پرورش کرتی اور ان سے فائدہ اٹھاتی رہی ہیں۔ ان کا کام ہی حکومت سے خود فائدہ اٹھانا اور اس کو فائدہ پہنچانا ہے۔ غیر مذہبی معاملات تو الگ رہے، مذہبی معاملات میں بھی ایسے لوگ حکومت کے اشارے کے پابند ہوتے ہیں اور قرآن مجید کے صریحی احکام کو بھی قابل ترمیم بلکہ مذہب اسلام کو نام نہاد ترقی کی راہ میں حائل سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ مسلمان کب ہیں اور ان کو مسلمانوں کی ترجمانی کا کیا حق ہے لیکن بدقسمتی سے حکومت انہی کو ان کا نمایندہ سمجھتی ہے۔

اگر حکومت کا مقصد مسلمانوں پر اپنی مرضی مسلط کرنا نہیں ہے بلکہ وہ واقعی ان کو مطمئن کرنا

چاہتی ہے تو اس کو قوم پروری، فرقہ واریت اور دستوری حقوق کے مطالبہ میں فرق کرنا چاہیے، مسلمانوں پر فرقہ واریت کا الزام لگا کر ان کو خاموش تو کیا جاسکتا ہے لیکن مطمئن نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں ان کے اصلی نمایندے اور ترجمان علماء اور دیندار مسلمان ہیں اور دوسرے مسائل میں مسلم عوام، اس لیے ان دونوں معاملات میں علماء اور مسلم عوام کی رائے معتبر ہے، نام نہاد مسلمانوں کی نہیں۔ ہندوستان کی حکومت جمہوری ہے، اس میں فیصلہ جمہور کی رائے سے ہوتا ہے، اس لیے مسلمانوں کے معاملات میں بھی جمہور مسلمانوں کی رائے اصل رائے ہے۔ اشخاص کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں، مسلمانوں کو مطمئن کرنے کا صحیح طریقہ یہی ہے لیکن اس کے ساتھ مسلمان کو بھی اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ احتجاج میں کوئی غیر آئینی طریقہ اختیار نہ کریں، جس سے حکومت کے لیے دشواری پیدا ہو، بلکہ اپنا مطالبہ جمہوری طریقہ سے پیش کریں۔ (معارف، جولائی ۱۹۷۲ء)

اردو، ابتدائی تعلیم اور مسلم یونیورسٹی

ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ یوں تو مسلمانوں کے بہت سے مسائل ہیں مگر ان میں تین زیادہ اہم ہیں۔ ابتدائی تعلیم، اردو زبان اور مسلم یونیورسٹی۔ ان تینوں کے بارہ میں حکومت کی پالیسی صحیح نہیں ہے۔ ابتدائی تعلیم کا نصاب تمامتر اکثریت کے مذہب اور کلچر کا ترجمان ہے جو مسلمانوں کے عقائد کے سراسر خلاف ہے، ان کے احتجاج اور حکومت کی مقرر کردہ تحقیقاتی کمیٹی کی سفارش کے باوجود نہیں بدلا گیا اور مسلمان بچے اس کو پڑھنے پر مجبور ہیں، مسلمانوں نے اسلامی مکاتب قائم کر کے اس کی تلافی کی کوشش کی ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ وہ حکومت کے نظام تعلیم کے متوازی نظام قائم نہیں کر سکتے، جس سے ان کو بڑا تعلیمی نقصان پہنچ رہا ہے۔ مسلمانوں نے جو کچھ کیا وہ تو ان کا کام تھا، ایک سیکولر حکومت کا فرض کیا ہے۔

اردو کی حق تلفی کا اعتراف فرقہ پرست پارٹیوں کے علاوہ اکثریت کے بھی ہر طبقہ کو ہے اور اس کی حمایت میں آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں، اس لیے اب مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے بھی اس طرف توجہ کی ہے۔ مرکزی حکومت نے اردو بورڈ قائم کیا ہے اور دوسری زبانوں کے ساتھ اردو کی ترقی کے لیے بھی ایک کرور کی رقم منظور کی ہے۔ اردو کے مسائل کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی قائم کی ہے جو مختلف ریاستوں کا دورہ کر کے ان مسائل کا جائزہ لے رہی ہے۔ اتر پردیش کی حکومت نے اردو

اکیڈمی قائم کی ہے اور اردو کی تعلیم کے لیے وقتاً فوقتاً احکام جاری کرتی رہتی ہے اور اس کی نگرانی کے لیے ایک آفیسر بھی مقرر کیا ہے لیکن اردو کے تحفظ اور ترقی کی جو واقعی شکل ہے، اس کو نہ مرکزی حکومت اختیار کرتی ہے اور نہ صوبائی حکومتیں۔ اصل مسئلہ اردو کی قانونی حیثیت کا ہے، جب تک یہ متعین نہ ہوگی، ساری تدبیریں بے کار ہیں۔ حکومت کی نیت کتنی ہی نیک کیوں نہ ہو لیکن اردو کے معاملہ میں اس کے پورے عملہ کی ذہنیت خراب ہے اور اس سے کوئی مواخذہ بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے اردو کے بارہ میں اس کے احکام کی تعمیل نہیں ہوتی۔

دوسرے اردو کی تعلیم کا جو فارمولا بھی بنایا جاتا ہے اس میں بھی بہانہ جوئی اور اردو کا راستہ روکنے کی پوری گنجائش رہتی ہے۔ چنانچہ سہ لسانی فارمولا اس لیے بنایا گیا تھا کہ علاقائی زبانوں کی تعلیم کی گنجائش نکل سکے لیکن اتر پردیش کی حکومت نے اس میں سنسکرت کو ٹھونس کر اردو کی تعلیم کا دروازہ بند کر دیا۔ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم کا اصول سب کے نزدیک مسلم ہے لیکن دس اور چالیس فی صدی طلبہ کی قید نے اردو کی تعلیم عملاً ناممکن بنادی ہے، جہاں یہ تعداد پوری بھی ہوجاتی ہے، وہاں بھی مختلف بہانوں سے اردو کی تعلیم کا انتظام نہیں کیا جاسکتا۔ ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی یہی حال ہے بلکہ اس کی مثالیں بھی موجود ہیں کہ اسکول کے منتظمین اردو کی تعلیم کا انتظام کرنا چاہتے ہیں مگر افسران بالا اس میں رکاوٹیں ڈالتے ہیں۔ ان ساری مشکلات کا حل صرف یہ ہے کہ جن صوبوں میں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ تعداد ہے، خاص طور سے اتر پردیش اور بہار میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے یا کم سے کم آٹھویں تک اردو کی تعلیم لازمی اور اہم سرکاری کاموں میں اردو کا استعمال ضروری قرار دیا جائے، اس کے بغیر اردو کا تحفظ ممکن نہیں ہے۔ اب آخری امید گجرال کمیٹی سے ہے، دیکھیں اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

مسلم یونیورسٹی ایکٹ نہ صرف مسلمانوں کے بلکہ جمہوری نقطۂ نظر سے بھی قابل ترمیم ہے۔ اس سے اس کا اقلیتی کردار ہی ختم نہیں ہوگیا بلکہ اس کی آزادی بھی سلب ہوگئی۔ وائس چانسلر کو مختار کل بنادیا گیا ہے اور اس کا انتخاب حکومت کرے گی، کورٹ ایکزکٹیو کونسل اکیڈمک کونسل سب میں بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومت کے نامزد کردہ ارکان کی کثرت ہے۔ کورٹ کی حیثیت جو سب سے بڑی اور با اختیار مجلس تھی، اب صرف مشیر کی رہ گئی ہے۔ یونین کی موجودگی میں طلبہ کی کونسل کا قیام ایک مستقل

فتنہ ہے، غرض اب مسلم یونیورسٹی وزارت تعلیم کا ایک ماتحت شعبہ بن گئی ہے، اس لیے اب یہ مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں رہا بلکہ آزادی اور جمہوریت کے تحفظ کا بن گیا ہے۔ اسی لیے کانگریس کے علاوہ ساری پارٹیاں اس کی مخالفت میں شریک ہیں۔ مسلمانوں میں ان کے علاوہ جن کے اغراض حکومت سے وابستہ ہیں، کوئی بھی اس کا حامی نہیں، جن کی حیثیت حکومت کے کارندوں سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ حقیقتاً حکومت کے بھی مخلص نہیں، ان کا مقصد صرف اظہار وفاداری ہے، وہ اپنے غلط مشوروں سے حکومت کو بھی مشکل میں پھنسا دیتے ہیں۔ ان کا کردار یہ ہے کہ ایک طرف وہ مسلمانوں کے ترجمان بنتے ہیں، مگر پھر حکومت کا منشا دیکھ کر اس کے ہم نوا بن جاتے ہیں۔ چنانچہ اس طبقہ کے مسلمان وزراء سے لے کر پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبران تک برابر اپنے بیانات اور تقریروں میں اس کا یقین دلاتے رہے کہ یونیورسٹی کا کردار نہ بدلا جائے گا، بلکہ وزیر اعظم کو اس کے لیے میمورنڈم بھی پیش کیا، مگر جب اس کے خلاف ایکٹ بن گیا تو اس کے پرزور وکیل بن گئے، ایسے لوگوں کی کیا وقعت ہوسکتی ہے، حقیقتاً وہ حکومت کے اعتبار کے بھی قابل نہیں، مگر اس کو کام ان ہی سے لینا ہے۔

مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ اگر دب بھی جائے تو اس کا زخم مسلمانوں کے دلوں سے مندمل نہ ہوگا اور ناسور بن کر رستا رہے گا، جو نہ ملک کے لیے مفید ہے اور نہ خود مسلمانوں کے لیے، دونوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ حکومت اس کو اپنے وقار کا سوال نہ بنائے اور اس میں ایسی ترمیم کردے کہ کم سے کم یونیورسٹی کی آزادی باقی رہے۔ جب دوسری مرکزی یونیورسٹیوں کا ایکٹ بنے گا تو اتنی ترمیم بہرحال کرنا پڑے گی۔ اگر پہلے سے یہ ترمیم کردی جائے تو مسلمانوں کی بھی دل جوئی ہوجائے گی۔ جمعیۃ العلماء کی مجلس عاملہ نے جو ترمیمیں پیش کی ہیں وہ بہت مناسب ہیں۔ اس سے حکومت کو سچے قوم پرور مسلمانوں کے جذبات کا بھی اندازہ ہوگا۔ (معارف، ستمبر ۱۹۷۲ء)

مسلم پرسنل لا کنونشن بمبئی

بمبئی کے مسلم پرسنل لا کنونشن میں مسلمانوں کا بڑا نمایندہ اجتماع ہوا۔ پورے ہندوستان کی مسلم تنظیموں اور ہر مکتب خیال کے کئی سو نمایندے شریک ہوئے اور سب نے متفقہ طور سے مسلمانوں کے پرسنل لا میں حکومت کی مداخلت اور تبدیلی کی پرزور مخالفت کی، اس سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ مسلمانوں کی کوئی جماعت بھی تبدیلی گوارا نہیں کرتی، باقی ایسے افراد تو ہمیشہ رہے ہیں جو پرسنل لا کیا کلام اللہ کے

بہت سے صریحی احکام میں تبدیلی کے مبلغ ہیں مگر ان کی جو حیثیت ہے وہ سب پر ظاہر ہے۔

پرسنل لا میں تبدیلی کے جواز کی جتنی دلیلیں دی جاتی ہیں، ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں ہے، سب سے بڑی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ بعض اسلامی ملکوں نے تبدیلی کی ہے۔اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ جس ملک نے بھی احکام قرآنی کے خلاف کوئی تبدیلی کی ہے، اس نے غلطی کی، کسی قانون شکن کے عمل کو قانون شکنی کے جواز میں پیش نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کسی ایسے اسلامی ملک کا عمل ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے دلیل نہیں بن سکتا، دوسرے اس دلیل میں بھی مغالطہ ہے، ٹرکی کے علاوہ کسی ملک نے نص قرآنی کے خلاف کوئی تبدیلی نہیں کی ہے، البتہ بعض ملکوں نے شریعت کے اصولوں کی روشنی میں پرسنل لا کے غلط استعمال کو روکا ہے اور اس سے پیدا شدہ خرابیوں کو دور کیا ہے۔ اس قسم کی اصلاح ہندوستان میں بھی کی جاسکتی ہے، مگر اس کا حق صرف اسلامی شریعت کے ماہروں کو ہے، عام مسلمانوں کو بھی نہیں اور کسی تیسرے کا تو کوئی سوال ہی نہیں، اس سلسلہ میں یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ جن اسلامی ملکوں نے کوئی تبدیلی کی ہے تو اپنے پرسنل لا میں کی ہے، کسی دوسرے فرقہ پر اس کو مسلط نہیں کیا ہے۔اس میں اور سب کے لیے یکساں کوڈ بل میں بڑا فرق ہے، اس لیے اس سے بھی مسلمانوں کے پرسنل لا میں تبدیلی کا جواز نہیں نکلتا۔

جو لوگ اسلامی ملکوں کو مثال میں پیش کرتے ہیں، وہ ان کے اور ہندوستان کے حالات کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اسلامی ملکوں میں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت اور ان کی حکومت ہے۔ دوسرے فرقے برائے نام ہیں، اس لیے اگر کوئی ملک کوئی ایسی تبدیلی بھی کرتا ہے، جس کا اس کو شرعاً حق نہیں ہے تو اس سے یہاں کے مسلمانوں کی ملی حیثیت میں فرق نہیں آتا، وہ قائم رہتی ہے، کسی دوسرے فرقے میں ان کے ضم ہونے کا خطرہ نہیں ہوتا، لیکن جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں، اور حکومت میں بھی ان کی موثر حیثیت نہیں ہے اور ایسی جماعتیں بھی موجود ہیں، جو ان کی ملی خصوصیات کو مٹانا چاہتی ہیں، وہاں ان کا وجود صرف ان کے مذہب، کلچر اور زبان سے قائم ہے، ان میں سے جس چیز کو بھی نقصان پہنچے گا، ان کا ملی وجود خطرے میں پڑ جائے گا، اسی لیے ہندوستان کے جمہوری اور سیکولر دستور نے اقلیتوں کے مذہب، کلچر اور زبان کے تحفظ کی ضمانت دی ہے، خود اسلامی ملکوں نے بھی کسی دوسرے فرقے کے پرسنل لا میں کوئی مداخلت نہیں کی ہے۔

مسلمانوں کا پرسنل لا ان کے مذہب پر مبنی ہے اور اتنا مکمل ہے کہ دوسری قومیں اس کی تقلید کرتی ہیں، طلاق اور خلع کا حق وراثت میں عورتوں کا حصہ وغیرہ اسی تقلید کا نتیجہ ہے، اس لیے مسلم پرسنل لا میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں اور وہ ہندوستان کی دستوری ضمانت کے بھی خلاف ہے، جو لوگ مسلمانوں کی خیرخواہی ان کے مظلوم طبقہ کی حمایت اور ان کی اصلاح وترقی کے لیے پرسنل لا میں تبدیلی ضروری سمجھتے ہیں، ان سے سوال ہے کہ کیا مسلمانوں کی ساری خیرخواہی اور ان کی اصلاح وترقی پرسنل لا میں تبدیلی ہی پر موقوف ہے، جو چیزیں مسلمانوں کی حقیقی خیرخواہی اور ان کی ترقی کی ہیں، ان کی طرف نہ ان مصلحین کی توجہ ہے نہ حکومت کی، مسلمانوں کے خلاف خوں ریز فسادات اور ان کی جانی و مالی، تباہی و بربادی کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ ملازمت کے دروازے ان پر تنگ ہیں، اردو زبان اور مسلم یونیورسٹی کا حشر سب کی نگاہوں کے سامنے ہے، اگر حقیقتاً مسلمانوں کی خیرخواہی مقصود ہے تو پہلے ان چیزوں کی اصلاح کی ضرورت ہے، مگر اس کے بارہ میں سارے مصلحین کی زبانیں خاموش ہیں، اس کے بغیر مسلمانوں کی اصلاح وترقی کا درد

تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

کا مصداق ہے۔

مگر یہ امر باعث اطمینان ہے کہ اس بارہ میں حکومت کو بھی مسلمانوں کے جذبات کا احساس ہو گیا ہے اور اس کے ایک ترجمان محمد شفیع قریشی نائب وزیر ریلوے نے اعلان کیا ہے کہ مسلمانوں کا پرسنل لا ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ حکومت اس میں تبدیلی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ خدا کرے یہ بیان مسلم یونیورسٹی کے متعلق بیانات کی طرح نہ ہو۔ کاش یہی طرز عمل وہ مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں اختیار کرتی تو مسلمانوں کو بدگمانی کا موقع نہ ملتا۔ اب بھی وہ اس کی تلافی کر سکتی ہے۔

پرسنل لا کے غلط استعمال سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، وہ اصل میں اسلامی نظام قضا نہ ہونے کا نتیجہ ہے، ورنہ آسانی سے ان کا تدارک ہو سکتا تھا۔ مگر یہ چیز ہندوستان میں ممکن نہیں ہے، اس لیے یہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ خرابیوں اور دشواریوں کو دور کرنے کی کوشش کریں، کنونشن نے جو بورڈ بنایا ہے، یقین ہے کہ اس کے پیش نظر یہ مسائل ہوں گے۔ (معارف، جنوری ۱۹۷۳ء)

مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ

مسلم یونیورسٹی کے بارہ میں مسلمانوں میں جو اضطراب اور جس طرح اس مسئلہ میں ان کی آواز متحد ہے، اس سے حکومت کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ وہ کسی حال میں بھی اس سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مسلم یونیورسٹی ان کی عزیز ترین متاع، ان کی تمناؤں کا مظہر، ان کی ایک صدی کی محنت کا پھل اور ان کے دل و دماغ کا سرچشمہ ہے، ان کی تقریباً تمام بڑی بڑی شخصیتیں اسی نے پیدا کیں، جنھوں نے ہر میدان میں نمایاں کارنامے کیے اور ملک و ملت دونوں کی بہترین خدمات انجام دیں، مسلمان اس کو کس طرح گوارا کر سکتے ہیں کہ اس کے اقلیتی کردار کو ختم کر کے اس کی روح نکال لی جائے اور اس سرچشمہ کو ہمیشہ کے لیے خشک کر دیا جائے۔

مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ جمہوریت، سیکولرزم اور تعلیم کی آزادی کا ہے۔ اسی لیے بہت سی جمہوری پارٹیاں اور آزادی تعلیم کے حامی، مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ یونیورسٹیوں میں بھی اس کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے، درحقیقت تعلیم گاہیں ہی وہ سرچشمے ہیں، جن سے روشن دماغ اور اعلیٰ صلاحیتوں کے افراد پیدا ہوتے ہیں جو ملک کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں اور حکومت کو اس کی غلط روی پر ٹوک بھی سکتے ہیں، اس لیے روس کے علاوہ سارے مہذب ملکوں میں تعلیم حکومت کے اثر سے آزاد ہے۔ اس کو صرف اس حد تک مداخلت کا حق ہے کہ ان کا کوئی عمل ملک کے مفاد کے خلاف نہ ہو، اگر انہیں بھی انسانوں کو ایک خاص سانچے میں ڈھالنے کی فیکٹری بنا لیا جائے تو ملک آزاد عالی دماغ انسانوں سے محروم ہو جائے گا، جو جمہوریت کے لیے بڑا المیہ ہوگا۔

ہندوستان کا دستور جمہوری اور سیکولر ہے، اس نے اقلیتوں کو اپنی ضرورت کے مطابق ادارے قائم کرنے کا حق دیا ہے، اس لیے کسی اقلیتی ادارہ کو اس کے کردار سے محروم اور ان کی متحدہ آواز کو نظر انداز کرنا دستور کے بھی خلاف ہے اور جمہوریت کے بھی، باقی کچھ مسلمان تو ہر مسئلہ میں حکومت کے ہم نوا مل جائیں گے، مگر ان کی جو حیثیت ہے، وہ خود حکومت کی نگاہوں سے مخفی نہیں، ان میں وہ مسلمان بھی ہیں، جو کلام مجید کے صریح احکام میں تبدیلی چاہتے ہیں اور وہ بدبخت بھی ہیں، جو اس کو نام نہاد ترقی میں مزاحم دقیانوسی کتاب سمجھتے ہیں، ایسے لوگ مسلمان کہلانے کے کب مستحق ہیں اور ان کو مسلمانوں کا ترجمان سمجھنا کہاں تک صحیح ہے، اگر جان بوجھ کر حکومت ان کا سہارا لیتی ہے تو

دونوں فائدہ اٹھانے کے لیے ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں، ہندوستان مختلف نسلوں، مختلف مذہبوں اور مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے اور اس کا حسن اسی رنگارنگی میں ہے، اسی لیے اس کا دستور سیکولر رکھا گیا ہے اور ان سب کو اپنے مذہب اور تہذیب وروایات کو قائم رکھنے کا پورا حق دیا گیا ہے، اس لیے قومی ایکتا اور قومی دھارے کے نام پر ان سب کو ایک رنگ میں رنگنے کی کوشش دستوری ضمانت کے سراسر خلاف ہے۔ قومی ایکتا اور قومی دھارے کا مطلب آپس کے تعلقات میں اتحاد وخوش گواری اور ملک کی خدمت اور اس کے مفاد میں اتحاد ویکجہتی ہے۔ یہ ہرگز نہیں کہ سارے فرقے اپنی خصوصیات مٹا کر ایک ہی دھارے میں بہ جائیں، اس کو کوئی فرقہ بھی گوارا نہیں کرسکتا، اس سے اتحاد ویکجہتی کے بجائے اور اختلاف وانتشار پیدا ہوگا۔

کچھ لوگوں کو مسلم یونیورسٹی میں فرقہ پروری کی بو آتی ہے اور ان کے نزدیک اس کا علاج یہ ہے کہ اس کا اقلیتی کردار ختم کردیا جائے۔ اس کا بھی الٹا اثر پڑے گا، اس سے فرقہ وارانہ جذبات اور ابھریں گے لیکن یہ الزام ہی سرے سے غلط ہے۔ جس یونیورسٹی نے مولانا محمد علی، شوکت علی، عبدالمجید، خواجہ تصدق احمد خاں شیروانی، ڈاکٹر سید محمود، رفیع احمد قدوائی اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے سینکڑوں قوم پرور پیدا کیے ہوں اور جنھوں نے اس زمانہ میں انگریزوں کے نظام تعلیم کا بائیکاٹ کیا ہو اور مسلم یونیورسٹی کے مقابلہ میں ایک آزاد قومی یونیورسٹی قائم کردی ہو، جب کہ مالوی جی نے قوم پرور ہندوؤں کو ہندو یونیورسٹی میں قدم نہ رکھنے دیا تھا، اس پر فرقہ پروری کا الزام سراسر بہتان ہے۔ یہ قومی یونیورسٹی آج بھی قوم پروری اور سیکولرزم کی سب سے بڑی معلم ہے، باقی کسی تعلیمی ادارے سے سو فی صدی ایک خیال کے لوگ پیدا نہیں ہوتے۔ کیا ہندو یونیورسٹی سے مہا سبھائی اور جن سنگھی نہیں پیدا ہوئے، وہ تو آج بھی آر۔ ایس۔ ایس کا گڑھ ہے لیکن کیا اس جرم میں کسی میں اس پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت ہے، یہی معاملہ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ بھی ہونا چاہیے۔

ہمارا نقطہ نظر تو یہ ہے کہ ہندو اور مسلم دونوں یونیورسٹیوں کو تعلیم کے ساتھ ہندو اور مسلم تہذیب وثقافت کا بھی مرکز ہونا چاہیے۔ یہ فرقہ پروری نہیں بلکہ حکومت کی سیکولرزم کا عملی نمونہ ہوگا۔ کسی تہذیب وثقافت کا مرکز ہونا قطعی فرقہ پروری نہیں، بلکہ دوسری تہذیبوں کی مخالفت فرقہ پروری ہے، ان دلائل سے قطع نظر حکومت کو اپنے وعدوں کا بھی تو لحاظ کرنا چاہیے۔ وہ گذشتہ الیکشن سے پہلے

کیا وعدہ کرتی چلی آئی تھی اور اب اس کا عمل کیا ہے۔اس کا اثر مسلمانوں پر کیا پڑے گا۔اس لیے یقین ہے کہ وہ بھی دیر سویر صحیح نتیجہ پر پہنچے گی لیکن جس قدر جلد اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے، اسی قدر بہتر ہوگا۔(معارف، مارچ ۱۹۷۳ء)

اکبر علی خاں دارالمصنّفین میں

مرکزی حکومت کے پرانے ارکان میں پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام اور ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سے دارالمصنّفین کے بزرگوں کے پرانے تعلقات تھے۔اس لیے ان کے زمانہ میں مختلف موقعوں پر حکومت ہند نے دارالمصنّفین کی مدد کی۔مگر اتر پردیش کی حکومت سے ہمیشہ بیگانگی رہی، اس نے صرف دارالمصنّفین کی جوبلی کے موقع پر دس ہزار روپے دیے تھے۔اتر پردیش کے موجودہ گورنر عالی جناب اکبر علی خاں صاحب نہ صرف دارالمصنّفین کے کاموں اور اس کی اہمیت سے پوری طرح واقف ہیں بلکہ دارالمصنّفین کے پرانے ارکان سے ان کے تعلقات رہ چکے ہیں اور وہ خود بھی علم دوست اور علم نواز ہیں۔اب سے چند مہینے پہلے جب موصوف اعظم گڑھ کے دورے پر آئے تھے،تو خاص طور سے دارالمصنّفین کو دیکھنے کے لیے تشریف لائے اور اس کے کاموں کو دیکھ کر مسرور ہوئے اور بعض مفید مشورے بھی دیے اور اس کی مالی حالت سن کر حکومت اتر پردیش سے اس کے لیے ایک لاکھ کی امداد کی سفارش کی اور اپنے قلم سے اس کی منظوری دی۔یہ امداد قلمی نسخوں کے تحفظ کے لیے ملی ہے جس میں تعمیر بھی شامل ہے۔جو اسی مصرف میں صرف ہوگی۔دارالمصنّفین کے کارکن اور اس کی مجلس انتظامیہ کے ارکان اس گراں قدر عطیہ کے لیے عالی جناب اکبر علی خاں صاحب اور حکومت اتر پردیش کے دل سے شکر گذار ہیں۔اتنی بڑی رقم دارالمصنّفین کو پہلی مرتبہ ملی ہے،جس سے اتر پردیش کی حکومت کی بے توجہی کی پوری تلافی ہوگئی۔اس کا جس قدر بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔

(معارف، جولائی ۱۹۷۳ء)

اتر پردیش میں اردو کی تعلیم

ایک مدت کے بعد اب مرکزی اور اتر پردیش کی حکومت کو اردو کی حق تلفی کا احساس ہوا ہے اور ....انہوں نے اس کی طرف توجہ کی ہے۔اتر پردیش کی حکومت اس سے پہلے اردو اکیڈمی قائم کر چکی ہے، جو مختلف طریقوں سے اردو کی حوصلہ افزائی کر رہی ہے۔اب اس نے پرائمری اسکولوں سے لے کر

ڈگری کالجوں تک میں اردو کی تعلیم کا انتظام کیا ہے اور بعض دوسرے محکموں میں بھی اس کو کچھ حقوق دیے ہیں، جن کی تفصیل اخبارات میں شائع ہوچکی ہے۔اس میں شبہہ نہیں کہ اب اردو کو پہلے کے مقابلہ میں بہت سے حقوق مل گئے ہیں، اگران پر پورا عمل ہوا تو اردو کو قدم جمانے کا موقع مل جائے گا۔

مگر پچیس سال میں اردو اتنی پچھڑ چکی بلکہ قریب قریب ختم ہوچکی ہے کہ اس کی تلافی آسان نہیں ہے۔دوسرے حکومت کی نیت کتنے ہی نیک ہو لیکن اس کے پورے عملہ کی ذہنیت اردو کے بارہ میں بہت خراب ہے۔اس سے اندیشہ ہے کہ وہ اب بھی اس طرح کی رکاوٹیں پیدا کرنے کی کوشش کرے گا کہ اس کی گرفت آسان نہ ہوگی مگر اس وقت حکومت اردو کی تعلیم چاہتی ہے اس لیے اگر اردو والے مستعدی سے کام لیں تو یہ رکاوٹیں دور ہوسکتی ہیں۔سب سے بڑی رکاوٹ معاشی ہے جب تک کسی زبان سے معاشی فائدہ متعلق نہ ہو محض زبان کی خاطر اس کے پڑھنے والے مشکل سے ملیں گے۔ اس لیے ان طول طویل انتظامات کے مقابلہ میں آسان شکل یہ ہے کہ اردو کو اس صوبے کی دوسری سرکاری زبان بنادیا جائے جو اردو والوں کا اصل مطالبہ ہے، ورنہ کم ازکم اس کی متوسط تعلیم لازمی کردی جائے۔بڑی ملازمتوں کے لیے اردو سے واقفیت ضروری قراردی جائے اور ان کے امتحانات میں ایک پرچہ اردو کا بھی رکھا جائے۔اس کے بغیر اردو کی تعلیم کا مسئلہ پوری طرح حل نہ ہوگا۔

تاہم سردست حکومت نے اردو کی تعلیم کا جو انتظام کیا ہے اور اس کو جو سہولتیں دی ہیں، ان سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔اس سے اور راہیں بھی کھلیں گی۔اس لیے اردو کے تمام بہی خواہوں اور اس کی تنظیموں کا یہ فرض ہے کہ وہ اردو پڑھنے والے طلبہ فراہم کریں اور اردو مادری زبان کے جو طلبہ زیر تعلیم ہیں ان کو اردو پڑھنے پر آمادہ کریں۔ثانوی اسکولوں میں سہ لسانی فارمولے میں سنسکرت کے بجائے مادری زبان رکھی جائے، جو اس کا اصل مقصد ہے۔اس سلسلہ میں ایک مسئلہ اردو میڈیم اسکولوں کا ہے، اس کے بغیر مادری زبان میں تعلیم کا مقصد پورا نہں ہوتا۔ہر جگہ تو اس کی ضرورت نہیں ہے لیکن بڑے شہروں میں بقدر ضرورت اردو میڈیم اسکول قائم کیے جائیں۔مسلمانوں کے جونیر اور ہائر سکنڈری اسکولوں کے پرائمری درجات کو آسانی سے اردو میڈیم بنایا جاسکتا ہے، جس کی پہلے سے اجازت موجود ہے، ہندی تو ان سب میں لازمی ہوگی۔اس لیے آیندہ چل کر ہندی میڈیم کے درجوں میں کوئی زحمت نہ پیش آئے گی اور اگر کچھ ہوئی تو تھوڑی سی محنت سے دور ہوسکتی ہے اردو کے لیے اتنا تو کرنا ہی پڑے گا

اگر اس وقت بھی اردو والوں نے بے توجہی سے کام لیا تو حکومت کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ وہ تو اردو کی تعلیم چاہتی ہے۔اردو والے خود ہی پڑھنا نہیں چاہتے۔اس سے موجودہ انتظام کو ختم کرنے کا جواز بھی نکل آئے گا اوراس کی تعلیم کی جو راہ نکلی ہے،وہ ختم ہوجائے گی اور آیندہ اردو والوں کو کسی نئے مطالبہ کا حق نہ رہ جائے گا۔(معارف،جولائی ۱۹۷۳ء)

جامعہ ملیہ کے نئے وائس چانسلر

جامعہ ملیہ کے نئے وائس چانسلر ڈاکٹر مسعود حسین خاں مقرر ہوئے ہیں،ان کا انتخاب ہر حیثیت سے نہایت موزوں ومناسب ہے،وہ پرانے جامعی ہیں اور اپنی علمی قابلیت اور تعلیمی تجربے، سلامت روی،خیالات کے اعتدال وتوازن اور شرافت ومعقولیت ہر لحاظ سے اس کے مستحق ہیں، وراثت کے اعتبار سے بھی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کی جانشینی کا سب سے زیادہ حق انہی کو ہے۔

جامعہ کے قیام کا مقصد حکومت کے اثر سے آزاد،ایسی تعلیم تھا جو ملک وملت دونوں کے تقاضوں کی جامع ہو اور اس کے تعلیم یافتہ صحیح اسلامیت اور سچی قوم پروری کا نمونہ ہوں لیکن آزادی کے بعد وہ اس مقصد سے ہٹ گئی تھی اور دوسری سرکاری تعلیم گاہوں کی طرح ایک تعلیم گاہ اور اس دور کی مختلف ازموں کا گڑھ بن گئی تھی،خود دلی میں جامعہ سے بڑی یونیورسٹیاں بلکہ اس سے بڑے پوسٹ گریجویٹ کالج موجود ہیں۔اس کا جو کچھ امتیاز تھا وہ اس کی خصوصیات اور مقاصد کی بنا پر تھا اور آج بھی اس کی امتیازی حیثیت ان ہی سے قائم رہ سکتی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر بے موقع نہ ہوگا۔ایک زمانہ میں جامعہ سخت مالی مشکلات میں مبتلا ہوگیا تھا،کسی ہندو لیڈر نے کہا کہ اگر جامعہ سے اسلامیہ کا لفظ نکال دیا جائے تو اس کے لیے سرمایہ فراہم ہوسکتا ہے۔گاندھی جی نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ جامعہ کو اس کی اسلامی خصوصیات کے ساتھ قائم رہنا چاہیے،تاکہ اگر کوئی غیر مسلم اسلام کو سمجھنا اور اس کا مطالعہ کرنا چاہے تو جامعہ میں کرسکے۔کاش اہل جامعہ گاندھی جی کے اس نقطہ نظر ہی پر عمل کریں۔

ہم کو خوشی ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے عزم ظاہر کیا ہے کہ وہ جامعہ کے "بنیادی مقاصد کو فراموش نہ کریں گے اور ماضی سے اس کا رشتہ استوار رکھیں گے اور اس کی کوشش کریں گے کہ اس کے وجود میں وہ شرر باقی رہے جس نے اس ادارہ کو جنم دیا تھا اور جس کے خاطر ہمارے بزرگوں اور

استادوں نے اپنی زندگیاں وقف کی تھیں"۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس عزم میں کامیاب فرمائے، یہ ان کا بڑا کارنامہ ہوگا۔ (معارف، دسمبر ۱۹۷۳ء)

ندوۃ العلماء کی خصوصیات

دارالعلوم ندوۃ العلماء محض ایک دینی درس گاہ نہیں بلکہ دینی تعلیم کی تجدید و اصلاح اور زمانہ کے حالات اور تقاضوں کے مطابق علم و دین کی خدمت کی ایک مستقل تحریک ہے، جس سے کم و بیش ہندوستان کے سارے دینی مدارس اور اسلامی اور علمی ادارے متاثر ہوئے۔ ان مقاصد کی اشاعت و تبلیغ کے لیے ایک زمانہ میں ہندوستان کے مختلف مرکزی شہروں میں اس کے سالانہ جلسے بڑے دھوم دھام سے ہوا کرتے تھے، جن میں ہندوستان کے نامور علماء و مشاہیر شریک ہوتے تھے، مگر مختلف اسباب خصوصاً ملک کے ناسازگار حالات کی بنا پر برسوں سے ان کا سلسلہ بند ہوگیا تھا۔ اب ندوہ کی روزافزوں توسیع و ترقی کے ساتھ ان کو دوبارہ شروع کرنے کا ارادہ ہے لیکن اب اسلامی ملکوں میں ندوہ کے ناظم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شہرت اور تعلقات کی بنا پر ندوہ ہندوستان کے اندر ہی نہیں محدود رہ گیا ہے، بلکہ اس کی شہرت اسلامی ملکوں تک پھیل چکی ہے اور اس کی حیثیت دنیائے اسلام کی ایک مرکزی درس گاہ کی ہوگئی ہے۔ چنانچہ اس وقت مختلف اسلامی اور عرب ملکوں کے طلبہ ندوہ میں زیر تعلیم ہیں۔ اس لیے اسی پیمانہ پر جلسہ کرنے کا بھی خیال ہے، جس میں ہندوستان کے علاوہ اسلامی دنیا کے علماء اور اہل علم بھی مدعو کیے جائیں گے۔ اس لیے دینی تعلیم اور موجودہ عہد کے دینی مسائل کے متعلق ان کے خیالات اور تجربات سے بھی فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا۔ اس کے مصارف کا تخمینہ تین لاکھ روپے ہے۔ اگر حالات سازگار رہے اور مطلوبہ رقم فراہم ہوگئی، تو فروری یا مارچ تک جلسہ ہوگا۔ ہم کو امید ہے کہ مسلمان اس کار خیر میں اپنی ذمہ داری کو بھی محسوس کریں گے اور سرمایہ کی فراہمی میں پورا حصہ لیں گے۔ (معارف، ستمبر ۱۹۷۴ء)

اردو اور مسلمان

ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ بڑی خامی ہے کہ وہ وقتی جوش میں آکر ایک مرتبہ بڑی سے بڑی قربانی کرسکتے ہیں مگر کسی معاملہ میں متحد اور منظم ہوکر مسلسل جد و جہد نہیں کرسکتے۔ حالات کی ناسازگاری نے ان کو اور بھی پست ہمت بنادیا ہے۔ ہر حال میں قناعت یا حکومت کا شکوہ ان کا مزاج

بن گیا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کو جو دستوری حقوق حاصل ہیں یا جو دوسری اقلیتوں کے طفیل میں مل جاتے ہیں، ان سے بھی فائدہ نہیں اٹھاتے مثلاً اب مرکزی اور اترپردیش کی حکومتوں نے پہلے کے مقابلہ میں اردو کو بہت سی تعلیمی سہولتیں دی ہیں اور اقلیتوں کے تعلیمی اداروں کو قومیانے سے مستثنیٰ کردیا ہے۔گو یہ رعایتیں اردو والوں کے مطالبہ کے مقابلہ میں بہت کم ہیں لیکن اگر ان سے فائدہ اٹھایا جائے تو اردو کو پنپنے کا موقع مل سکتا ہے۔اس لیے مسلمانوں کو ان سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے، اپنے بچوں کو اردو میڈیم میں تعلیم دلائیں، اردو میڈیم اسکول اور کالج قائم کریں، قائم شدہ اسکولوں اور کالجوں کے پرائمری سیکشن میں اردو میڈیم میں تعلیم دیں، اونچے درجوں میں ہر درجہ میں ایک سیکشن اردو میڈیم کا قائم کریں۔ یہ ان کا مانا ہوا حق ہے، اس میں کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں، مسلم درس گاہوں میں اسلامی روایات کا پورا احترام کیا جائے، اس سے اردو زبان اور مسلمانوں کی تہذیب و روایات دونوں کا تحفظ ہو جائے گا۔

اگر وہ اتنا بھی نہیں کر سکے تو پھر ان کو حکومت کی شکایت اور اپنی زبان و تہذیب کے تحفظ کے مطالبہ کا کیا حق ہے اور مسلم اور غیر مسلم یا سرکاری تعلیم گاہوں میں کیا فرق رہ جائے گا اور اس کا خطرہ ہے کہ اگر مسلمانوں نے اردو کو ذریعہ تعلیم نہ بنایا تو آیندہ چل کر حکومت یہ کہہ سکتی ہے کہ جب زبان اور ماحول کے اعتبار سے مسلم اور غیر مسلم اسکولوں اور کالجوں میں کوئی فرق نہیں ہے تو پھر ان کی الگ حیثیت کیوں قائم رکھی جائے۔ یہ صحیح ہے کہ ابھی تک حکومت کے تمام محکموں میں فرقہ واریت کا اثر ہے۔اس لیے ان سب امور میں رکاوٹیں پیدا ہوں گی، لیکن جب حکومت صراحت کے ساتھ ان حقوق کو مان چکی ہے اور سپریم کورٹ کے فیصلہ نے معاملہ کو بالکل صاف کردیا ہے تو ان حقوق کے حصول میں زیادہ دشواری نہ ہوگی۔ مگر جائز حق بھی جدوجہد کے بغیر نہیں ملتا۔اس لیے ان مشکلات کا مقابلہ بہرحال کرنا پڑے گا۔لیکن آخر میں مسلمانوں کو کامیابی ہوگی۔اپنے جائز اور دستوری حق کے لیے لڑنا فرقہ واریت نہیں بلکہ جمہوریت، سیکولرزم اور ملک کی بہت بڑی خدمت ہے، جن اداروں کو اس سلسلہ میں کوئی دشواری پیش آئے، وہ ظفر احمد صاحب صدیقی انجمن تعلیمات دین گوین روڈ لکھنؤ کی طرف رجوع کریں۔انھوں نے اقلیتی اداروں کے حقوق اور ان کے حصول کے طریقوں پر پورا لٹریچر جمع کردیا ہے۔اس کو بھی منگا کر مطالعہ کرنا چاہیے۔(معارف، ستمبر ۱۹۷۴ء)

مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر

مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر ڈاکٹر علی محمد خسرو مقرر ہوئے ہیں، ان کی فنی شہرت ایک خاص حلقہ میں محدود تھی اس لیے ان سے کم لوگ واقف تھے۔وائس چانسلری کے سلسلہ میں ان کے اوصاف اور کمالات کا علم ہوا، دلی کے مسلم اخبارات نے ان کے متعلق بہت اچھے خیالات اور ان سے بڑی توقعات ظاہر کی ہیں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یونیورسٹی کے لیے مفید ثابت ہوں گے، انہوں نے اپنی ایک تقریر میں بھی کہا ہے کہ وہ یونیورسٹی کی آزادی بحال کرانے کی کوشش کریں گے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ میں حکومت کی پالیسی کچھ بدلی ہے، ورنہ علانیہ وہ اس قسم کا خیال ظاہر نہ کرتے مسلم یونیورسٹی کا سب سے بڑا مسئلہ اس کے اقلیتی کردار کا تحفظ ہے، اس کے بغیر اس کی آزادی کے کوئی معنی نہیں، اگر اس میں نئے وائس چانسلر صاحب کامیاب ہوجاتے ہیں تو یہ ان کا بڑا کارنامہ ہوگا اور یونیورسٹی کی تاریخ میں ان کا نام زندہ رہے گا، اس معاملہ میں حکومت نے بعض نام نہاد مسلمانوں کے مشورے سے ایک غلط قدم اٹھادیا، جس سے مسلمانوں میں بے اعتمادی اور بددلی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا، جو حکومت کے لیے کوئی اچھی شکل نہیں رہے، اس غلط فیصلہ پر قائم رہنا دوسری غلطی ہوگی، مسلم یونیورسٹی آزادی اور کردار کو برقرار رکھنے میں حکومت کا کوئی نقصان نہیں ہے۔اس سے وہ مسلمانوں کا دل جیت سکتی ہے۔(معارف، اکتوبر ۱۹۷۴ء)

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ

کوٹھاری رپورٹ

اب سے کئی سال پہلے حکومت ہند کی طرف سے ایک تعلیمی کمیشن مقرر ہوا تھا۔ اس کی رپورٹ کوٹھاری رپورٹ کے نام سے شائع ہوگئی ہے، اس کی تعریف بھی ہورہی ہے اور اس پر تنقیدیں بھی جاری ہیں۔ جناب آصف فیضی صاحب سابق سفیر متحدہ عرب جمہوریہ کا ایک مراسلہ اسٹیٹسمین کلکتہ میں شائع ہوا ہے، جس میں انہوں نے یہ توجہ دلائی ہے کہ اس رپورٹ میں انگریزی، فرانسیسی، جرمن، روسی، جاپانی، اسپینی اور چینی زبانوں کی تعلیم کے لیے تو سفارش کی گئی ہے۔ لیکن ان زبانوں کے ساتھ جدید عربی کا نام نہیں ہے جو قابل افسوس ہے۔ جاپانی، اسپینی اور چینی زبانوں سے زیادہ حق جدید عربی کا ہے۔

جناب آصف فیضی نے جدید عربی کے حق میں بہت سے دلائل پیش کیے ہیں۔ یہ ریڈیو، پریس، پارلیمانی ایوانوں اور اہم تصانیف کی زبان ہے۔ یہ ہندوستان کے پانچ کرور مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ یہ ادارۂ اقوام متحدہ کی پندرہ ریاستوں کی زبان ہے۔ یہ ادارہ بین الاقوامی مسائل کو جن چھ زبانوں میں ترجمے کراتا ہے، ان میں ایک زبان جدید عربی بھی ہے۔ اس زبان کے ذریعہ معلومات عامہ، فلسفہ، مذاہب عالم، معاشرتی سائنس، لغات، سائنس، عربی ادب و تاریخ پر اہم کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں، جن سے جدید علم و ادب میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے، پھر اسی زبان کے ذریعہ مشرق وسطیٰ اور دوسرے عرب ممالک کی سیاسی، علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کی روز افزوں ترقی کی رفتار سمجھی جاسکتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

عربی زبان کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے جناب آصف فیضی صاحب کو دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس کی بین الاقوامی اہمیت روز روشن کی طرح ظاہر ہے لیکن معلوم نہیں کوٹھاری

رپورٹ میں اس کو کیوں نظر انداز کردیا گیا ہے۔ اس کمیشن میں ایسے رکن بھی تھے جو اس زبان کی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لیے یہ تاویل نہیں کی جاسکتی ہے کہ اس کا نام سہواً رہ گیا ہے اور اگر واقعی یہ سہو ہے تو پھر جدید عربی کو بھی اور زبانوں کے ساتھ شریک کرکے اس فروگذاشت کی تلافی کا اعلان کیا جاسکتا ہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ ہندوستان کا گہرا دوست ہے۔ اس اعلان سے دونوں ملکوں کے سیاسی اور ثقافتی تعلقات کی استواری میں بڑی مدد ملے گی ورنہ وہاں کے سیاسی اور ثقافتی حلقوں میں بدگمانی پیدا ہوجانے کا احتمال ہے اور پھر ہندوستان کے پانچ کرور مسلمانوں کو یہ سوء ظن تو ضرور پیدا ہوجائے گا کہ یہ زبان اس لیے نظر انداز کردی گئی ہے کہ یہ ان کی مذہبی زبان سمجھی جاتی ہے۔

اس کمیشن کو فارسی زبان بھی اپنی فہرست میں شامل کرنی چاہیے تھی۔ ہندوستان کا بہت بڑا دوست افغانستان بھی ہے، جس کی علمی، ثقافتی اور سیاسی زبان فارسی ہی ہے۔ اس سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے میں فارسی زبان کی تعلیم مفید اور موثر ہوگی۔ ہندوستان اور ایران کے تعلقات بھی قدیم زمانہ سے قائم ہیں، ایرانی تہذیب وتمدن کے آثار ہندوستانی زندگی کے مختلف شعبوں میں نظر آتے ہیں۔ اگر ہندوستان کے لیے فارسی اجنبی ہوگئی تو اس کے کلچر میں رنگارنگی کی جو خوبیاں ہیں اور ان کا جو تاریخی اور تہذیبی پس منظر ہے وہ ہماری آیندہ نسلوں کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہوجائے گا جو ہندوستان کے متحدہ کلچر کے حامیوں کے لیے ایک دردناک حادثہ ہوگا۔ (معارف، جنوری ۱۹۶۷ء)

وزیراعظم، گورنر یوپی اور
مرکزی نائب وزیر قانون کی دارالمصنّفین میں آمد

۱۲/ دسمبر ۱۹۶۸ء کو اترپردیش کے گورنر جناب بی، گوپال ریڈی صاحب دارالمصنّفین تشریف لائے اور اس کی ۱۳۸ مطبوعات اور معارف کی ۱۰۲ جلدوں کو خاص طور پر دیکھا۔ ان میں سے جن کے ترجمے فارسی، عربی، پشتو، ہندی، انگریزی اور تامل زبانوں میں ہوئے ہیں۔ ان کو دیکھ کر متاثر ہوئے۔ ازراہ کرم خود سے اس ادارہ کے دوامی رکن بننے کی خواہش ظاہر کی جس کے لیے یہ ادارہ ان کا شکر گذار ہے۔ ان کی تشریف آوری کے موقع پر ان سے جو باتیں ہوئیں، ان سے ان کے ایک بیدار مغز، علم دوست، ہمدرد اور فراخ دل حاکم ہونے کا اندازہ ہوا۔ ہماری دلی تمنا ہے کہ اس ریاست میں ان کا دور حکومت ہر لحاظ سے مفید اور کارآمد ہو۔

۲۷/دسمبر ۱۹۶۸ء کو حکومت ہند کی وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی بھی دارالمصنّفین کو اپنی تشریف آوری سے نوازا۔ان کے طوفانی دورہ کی وجہ سے ان کا قیام یہاں مختصر رہا لیکن انہوں نے بھی اس کے علمی کاموں سے پوری دلچسپی دکھائی۔انہوں نے اپنے والد محترم پنڈت جواہر لال نہرو کی وہ تصویر بھی دیکھی، جب وہ ۱۹۲۰ء میں دارالمصنّفین میں معزز مہمان کی حیثیت سے مقیم ہوئے تھے۔ان کے دادا پنڈت موتی لال نہرو اوران کے والد بزرگوار جب کبھی اعظم گڑھ تشریف لائے تو ان کی میزبانی یہی ادارہ کرتا رہا۔پنڈت جواہر لال نہرو اس ادارہ کی میزبانی کا اعتراف آخر وقت تک کرتے رہے۔شریمتی اندرا گاندھی نے یہاں آکر اپنے خاندانی تعلقات کی تجدید کی۔ان کی آمد پر اعظم گڑھ کے جلسہ میں جو کثیر مجمع ہوا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے والد محترم ہی کی طرح لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

۲۹/دسمبر ۱۹۶۸ء کو حکومت ہند کے نائب وزیر قانون واوقاف جناب یونس سلیم صاحب بھی دارالمصنّفین آئے اور دن کا کھانا یہاں کے کارکنوں اور شہر کے معززین کے ساتھ کھایا۔انہوں نے بھی یہاں کے علمی کاموں کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔وہ جس اخلاق، یگانگت اور موانست سے یہاں کے کارکنوں سے ملے اس کا بڑا خوش گوار اثر چھوڑ گئے۔اگر وہ سیاست اور حکومت کے کاموں میں لگے رہے تو وہ ایک اچھے مسلمان ہو کر ایک اچھے ہندوستانی بھی ثابت ہوں گے۔ایک اچھا مسلمان ہی اچھا محب وطن ہو کر اچھا ہندوستانی بھی ہوسکتا ہے۔اچھے مسلمان اور اچھے ہندوستانی ہونے میں کوئی تضاد نہیں ہے، جو مسلمان یہ کہتا ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی ہے پھر مسلمان ہے۔وہ ارباب حکومت کو خوش کر کے ان کو فریب میں مبتلا کرتا ہے۔نام کا مسلمان کام کا ہندوستانی نہیں ہوسکتا۔اس حقیقت کا احساس خود ہندوستان کے ارباب حکومت کو ہوتا جاتا ہے۔(معارف، جنوری ۱۹۶۹ء)

دارالمصنّفین اور پاکستانی ناشرین

پاکستان کے بعض غیر ذمہ دار ناشروں نے دارالمصنّفین کی بہت سے مطبوعات چھاپ لی ہیں، جس سے ان کو کچھ ذاتی فوائد تو ضرور حاصل ہورہے ہوں گے لیکن اس علمی ادارہ کو بہت مالی نقصان پہنچ رہا ہے، مگر خوشی ہے کہ پاکستان میں اس کے بہت سے مخلص قدردانوں نے اس کی مطبوعات کے دست برد کے خلاف احتجاج بھی کیا ہے۔ان میں سب سے نمایاں نام جناب سید حسام الدین راشدی

صاحب کا ہے، جن کو پاکستان میں اپنی اعلیٰ علمی قابلیت کے ساتھ اپنی باوقار اور دل نواز شخصیت کی وجہ سے بڑی عزت، اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے۔ انہوں نے پاکستان کے اہم روزنامہ اور ہفتہ وار اخبارات میں دارالمصنّفین کے ساتھ اس بدسلوکی کی طرف وہاں کے لوگوں کی توجہ دلائی، ان کی ہم نوائی جناب ممتاز حسن صاحب سابق سکریٹری محکمہ خزانہ حکومت پاکستان، جناب جمیل الدین عالی صاحب معتمد انجمن ترقی اردو پاکستان اور رائٹرز گلڈ جناب ابن انشا ڈائریکٹر نیشنل بک سنٹر آف پاکستان، جناب حامد علی خاں صاحب موسس مطبوعات فرینکلن اور جنگ ، امروز، نوائے وقت، حریت، مشرق اور کتاب کے ایڈیٹروں نے کی۔ جناب افضل اقبال صاحب (سابق ڈپٹی ہائی کمشنر پاکستان، نئی دہلی) نے بھی دارالمصنّفین کے ساتھ اس بے انصافی کی طرف اپنی حکومت کو توجہ دلائی۔

اس پرزور احتجاج کے بعد حکومت پاکستان کی طرف سے ایک آرڈیننس بھی جاری ہوا ہے، جس میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ پاکستان کا کوئی ناشر حکومت کی اجازت کے بغیر کسی غیر ملکی مصنف کی کوئی کتاب شائع نہیں کرسکتا۔ اس سے وقتی طور پر بعض ناشروں کی غلط قسم کی سرگرمیوں کی روک تھام تو ضرور ہوگئی ہے۔ پھر بھی ضرورت تھی کہ دارالمصنّفین کی مطبوعات کی مستقل نگہداشت کے لیے کوئی موثر کارروائی کی جائے۔ یہ خاکسار گذشتہ دو مہینے پاکستان میں رہا تو اس سلسلہ میں جناب سید حسام الدین راشدی صاحب کے حسن وساطت اور اخلاص سے بہت سی مفید باتیں انجام پاگئیں، جن کے لیے دارالمصنّفین ان کا مزید شکر گذار ہے۔

سید حسام الدین راشدی صاحب نے اپنے دولت کدہ پر ایک پرتکلف ڈنر میں کراچی کے ممتاز اہل علم اور دوسرے اکابر کو مدعو کیا۔ جن میں سے کچھ کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ جناب ممتاز حسن صاحب سابق سکریٹری محکمہ خزانہ حکومت پاکستان، جناب جمیل الدین عالی صاحب معتمد رائٹرز گلڈ، انجمن ترقی اردو ڈائریکٹر معین الحق سکریٹری پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، جناب شان الحق حقی صاحب ڈائریکٹر اردو ترقی بورڈ، جناب الطاف بریلوی صاحب سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ابن انشا صاحب ڈائریٹر نیشنل بک سنٹر آف پاکستان، حکیم سعید احمد صاحب مالک ہمدرد دواخانہ، ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی بانی انجمن الفلاح، جناب ابن الحسن صاحب چیف پبلک، جناب مشفق خواجہ صاحب انجمن ترقی اردو، جناب سیمیں خاں صاحب ڈائریکٹر کاپی رائٹ، پروفیسر ریاض الاسلام سفینہ

تاریخ کراچی یونیورسٹی، جناب ایوب قادری صاحب لکچرر اردو کالج، جناب اعجاز الحق قدوسی صاحب مصنف صوفیائے سندھ و پنجاب و جناب رازق الخیری صاحب اڈیٹر عصمت۔ان کے علاوہ اخبارات کے کچھ نمایندے اور ناشرین کتب بھی تھے۔ جناب سید حسام الدین صاحب نے دارالمصنّفین کی خدمات پر ایک پرمغز تقریر کی۔ ان کے بعد خاکسار نے حاضرین کی توجہ دارالمصنّفین کی ان مشکلات کی طرف دلائی جو پاکستان کے بعض ناشروں کے اس کی مطبوعات کے چھاپ لینے کے بعد پیدا ہوگئی ہیں۔تمام حاضرین نے اس ادارہ سے اپنی پوری ہمدردی کا اظہار کیا اور اس کی مطبوعات کی نگہداشت کی تجویزیں پیش کیں۔ مباحثہ میں جناب ممتاز حسن، جمیل الدین عالی صاحب، ابن انشا اور الطاف حسین بریلوی صاحبان نے خاص طور پر حصہ لیا۔

ایک دوسری نشست میں یہ طے پایا کہ دارالمصنّفین سے باضابطہ اختیارات لے کر ایسے ناشرین کے خلاف آیندہ قانونی کارروائی کی جائے جو اس کی مطبوعات چھاپ کر اس کو نقصان پہنچاتے ہیں۔راقم نے دارالمصنّفین کی طرف سے ایسے اختیارات جناب ابن الحسن صاحب کو تفویض کیے ہیں، جو جناب ظہور الحسن صاحب سابق رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنّفین کے صاحبزادے ہیں۔ ان کو دارالمصنّفین کی علمی سرگرمیوں سے بڑی دلچسپی ہے۔ امید ہے کہ ان کی توجہ سے دارالمصنّفین کی مطبوعات کی دست برد رک جائے گی، اس کی ساری علمی خدمات زیادہ تر اس کی مطبوعات کی آمدنی سے انجام پاتی ہیں۔اگر پاکستان کے ناشرین اسی طرح اس کی کتابیں چھاپ کر اس کو نقصان پہنچاتے رہے تو علوم وفنون کی خدمت کرنے والا یہ پرانا ادارہ موت کے منھ میں آجائے گا۔(معارف، دسمبر ۱۹۶۹ء)

دارالمصنّفین کے مسائل

دارالمصنّفین اس وقت مالی مشکلات سے دوچار ہورہا ہے۔اس کا سالانہ بجٹ تقریباً ایک لاکھ روپے کا ہوتا ہے۔اس کے مختلف شعبوں میں چالیس آدمی کام کرتے ہیں۔ان سب کی تنخواہیں عام معیار کے لحاظ سے بہت کم ہیں، مگر ان میں زیادہ تر ایسے خدمت گذار ہیں، جنھوں نے اپنی پوری زندگی اس کے لیے وقف کردی ہے۔ان کی قناعت پسندی ضرور قابل قدر ہے مگر ادارہ کی طرف سے ان کو قوت لایموت کا جو سامان ہوتا تھا۔اس کا بھی اب فراہم کرنا مشکل ہورہا ہے۔

دارالمصنّفین کو یوپی یا مرکز کی حکومت کی طرف سے کوئی مستقل سالانہ امداد نہیں ملتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی زندگی کے آخر زمانہ میں حکومت کشمیر سے پانچ ہزار سالانہ کی امداد مقرر کرائی تھی۔ انہوں نے ازراہ سرپرستی وعدہ فرمایا تھا کہ آیندہ یہ رقم اور بھی زیادہ بڑھوادی جائے گی، مگر وہ اس رقم کے جاری ہونے کے بعد جلد ہی اللہ کو پیارے ہوئے، یہ پانچ ہزار کی سالانہ امداد اب تک مل رہی ہے لیکن ہر سال یہ خیال ہوتا ہے کہ کہیں بند نہ ہو جائے، نظام ٹرسٹ حیدرآباد کی طرف سے پانچ سو روپے ماہانہ کی رقم گذشتہ دو سال سے مل رہی ہے لیکن یہ مستقل نہیں ہے، اس ٹرسٹ کو مسلسل امداد دینے کا شاید قانونی حق بھی نہیں، ان قلیل رقموں سے تھوڑا سہارا ضرور مل جاتا ہے، ورنہ اور تمام اخراجات کا بار ادارہ کو خود اٹھانا پڑتا ہے، جو مطبوعات کی فروخت سے اب تک پورے ہوتے رہے ہیں، لیکن اس کی فروخت اب بہت کم ہوگئی ہے، اس کے بہت سے اسباب ہیں، تقسیم سے پہلے پاکستان میں اب جو علاقے ہیں، وہاں بہ کثرت وی پی کے ذریعہ سے کتابیں جایا کرتی تھیں، تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں وی پی اور منی آرڈر کا بھیجنا بند ہوگیا، تو ایک بڑی آمدنی جاتی رہی، پھر وہاں کے تاجر لائسنس کے ذریعہ سے کتابیں منگوانے لگے۔ اس طرح بھی ہماری کتابیں پہلے کی طرح تو نہیں، پھر بھی وہاں بہت کافی تعداد میں جایا کرتی تھیں، جس سے تقریباً پچاس ہزار روپے کی آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ ۱۹۶۵ء سے جب دونوں ملکوں کا تجارتی لین دین بند ہوگیا تو گذشتہ سات سال سے ادارہ کو تقریباً اتنی ہی رقم کا سالانہ خسارہ ہو رہا ہے، جو اب تک محض رحمت ایزدی سے پورا ہوتا رہا لیکن اب اس ادارہ کی قوت برداشت جواب دے رہی ہے۔

ہندوستان میں ہماری مطبوعات کی فروخت اتنی نہیں ہوتی کہ اس سے ہمارے اخراجات پورے ہوں، ایک تو یہاں کے اردو پڑھنے والوں کی قوت خرید کسی زمانہ میں زیادہ نہیں رہی، وہ کتابوں کو شوق سے ضرور پڑھتے ہیں لیکن خرید کر پڑھنا پسند نہیں کرتے، پھر جو اصحاب ذوق خریدنا بھی چاہتے ہیں، تو ان کی مالی حالت ایسی نہیں ہوتی کہ اپنے اور اخراجات پورا کرکے کتابیں بھی خرید سکیں، جن کے پاس کافی دولت ہے وہ کتابوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتے۔ ادارہ کی طرف سے اچھی خاصی تنخواہ پر ایک نمایندہ بھی مقرر کیا گیا ہے کہ وہ مختلف شہروں میں جاکر اس کی مطبوعات کی فروخت و اشاعت کی کوشش کرے، مگر یہ تجربہ کامیاب نہیں ہو رہا ہے۔ اس کی تنخواہ کی گراں باری سے مالی مشکلات کا اور اضافہ ہوگیا ہے۔

ہمارے اخراجات دو قسم کے ہیں۔ ایک تو یہاں کے خدمت گذاروں کو پابندی کے ساتھ ہر مہینہ تنخواہیں ادا کرنا، کیونکہ ان کو جو تھوڑی بہت تنخواہ مل جاتی ہے، وہ بھی نہ ملے تو محض خدمت وایثار کا جذبہ اب زیادہ کارگر نہیں بنایا جاسکتا۔ دوسرے نئ مطبوعات میں اضافہ کرنا اور پرانی مطبوعات کو چھاپتے رہنا، الحمدللہ اس وقت تک اس کی طرف سے تقریباً ڈیڑھ سو کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان میں سے ہر سال کچھ نہ کچھ کتابوں کا پرانا ایڈیشن ختم ہوتا رہتا ہے، اگر یہ نہ چھاپی جائیں تو تجارتی آمدنی پر اثر پڑ جاتا ہے، کوشش اب تک یہی رہی کہ پرانی کتابوں کے ساتھ ہر سال کم سے کم دو نئ کتابیں بھی ضرور شائع ہوتی رہیں۔ ہماری کتابوں کی اوسطاً ضخامت چار سو سے کم نہیں ہوتی، بعض کی ضخامت تو نو نو سو صفحے کی بھی ہے، نئ اور پرانی دونوں کتابوں کی طباعت میں کافی اخراجات ہوتے ہیں جن کو اب پورا کرنا مشکل ہو رہا ہے۔

دارالمصنّفین اپنی امداد کے سلسلہ میں کسی سے کوئی چندہ یا عطیہ نہیں مانگتا ہے، آج تک اس نے کوئی چندہ قبول نہیں کیا، وہ صرف اس کا خواستگار ہے کہ اس کی کتابیں زیادہ سے زیادہ خرید کر پڑھی جائیں، اس کے علاوہ اس کی طرف سے دو قسم کی دوامی رکنیت بھی ہے، ایک ایک ہزار کی اور ایک پانچ سو کی۔ جو صاحب ایک ہزار کی رقم دیتے ہیں ان کی خدمت میں گذشتہ مطبوعات میں سے پانچ سو قیمت کی کتابیں فوراً بھیج دی جاتی ہیں، پھر تاحیات نئ مطبوعات اور رسالہ معارف ہدیۃً بھیجا جاتا ہے۔ جو صاحب پانچ سو کی رقم دیتے ہیں ان کے پاس ڈھائی سو کی کتابیں فوراً بھیج کر تاحیات نئ مطبوعات اور رسالہ معارف جاتا رہتا ہے۔ ہماری اپیل ہے کہ لوگ یہاں کی مطبوعات زیادہ سے زیادہ خرید کر یا کافی تعداد میں اس کے رکن دوامی بن کر اس کی مالی مشکلات کو دور کرنے میں مدد کریں، ورنہ خدانخواستہ یہ مالی پریشانیوں سے ختم ہوگیا تو جہاں اس کے وابستگان پر یہ الزام آئے گا کہ وہ اس شاندار علمی ادارہ کو برقرار نہ رکھ سکے۔ وہاں اردو داں طبقے بھی موردالزام قرار پائیں گے کہ وہ ایک مفید ادارہ کو قائم رکھنے میں مدد نہ پہنچا سکے۔ اس کو برقرار رکھنے میں، ان کی حمیت اور علم دوستی کا بھی امتحان ہے۔ (معارف، نومبر ۱۹۷۲ء)

اردو تعلیم میں عدم دلچسپی

ابھی حال ہی میں اتر پردیش کی اردو اکاڈمی کی طرف سے دو گشتی مراسلے جاری ہوئے

ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ اتر پردیش کی میونسپلٹیوں کے پرائمری اسکولوں میں اس وقت تک سے تین ہزار استاد اردو پڑھانے کے لیے مقرر ہو چکے ہیں۔ایک ہزار جونیر اسکولوں اور ۲۴۰ گورنمنٹ ہائر سکنڈری اسکولوں میں بھی اردو کے استاد مقرر کیے جارہے ہیں۔کسی ڈگری کالج میں اگر اردو کا شعبہ کھولا جائے گا تو حکومت اس کو بھی مالی امداد دے گی۔

مگر ان مراسلوں میں یہ بھی ہے کہ ان اسکولوں میں اردو پڑھنے کے لیے بہت کم بچوں نے داخلہ لیا ہے، جو ایک افسوس ناک امر ہے۔جس کے بعد اردو کے اساتذہ کا تقرر بے معنی ہوتا نظر آتا ہے۔اس کے علاوہ درجہ تین سے درجہ آٹھ تک اردو میڈیم کی جو کتابیں حکومت نے چھپوائیں، وہ کم تعداد میں فروخت ہوئیں، آخر میں اردو اکاڈمی کی طرف سے اپیل ہے کہ اردو دوست اس کی پوری کوشش کریں کہ ہر شہر کی درس گاہوں میں بچے کافی تعداد میں ''ہندوستان جنت نشان'' کی مشترکہ تہذیب کی علامت یعنی اردو پڑھتے نظر آئیں۔

اب تک اتر پردیش کی حکومت پر اعتراض تھا کہ اس کی طرف سے اردو پڑھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔حکومت نے اپنی طرف سے تو اس اعتراض کو دور کردیا ہے لیکن اب اس کی نیت پر شکوک کا اظہار یہ کہہ کر کیا جارہا ہے کہ یہ محض آیندہ انتخابات میں ووٹ حاصل کرنے کی ایک چال ہے۔اس کے پیچھے اردو دوستی کا کوئی مخلصانہ جذبہ نہیں ہے۔اس کی تائید میں محکمۂ تعلیم کے ان ملازموں کے رویے کو پیش کیا جاتا ہے، جو اردو سے متعلق ضروری اور مفید احکام کو دبائے رکھتے ہیں یا ان کو عملی شکل دینے میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہیں۔یہ بھی کہا جارہا ہے کہ اردو اساتذہ کے تقرر کی جو تعداد بتائی جاتی ہے، وہ صحیح نہیں ہے۔اگر کاغذ پر ان سب کا تقرر ہو گیا ہے تو ابھی وہ بہت سے اسکولوں میں بھیجے نہیں گئے ہیں۔ایسے لوگوں کا یہ بھی اعتراض ہے کہ اردو کی جو ریڈریں بچوں کو پڑھانے کے لیے تیار کی گئی ہیں، وہ بعض وجوہ سے پڑھانے کے لائق نہیں، پھر یہ کتابیں آسانی سے بازار میں ملتی بھی نہیں۔غیر ضروری اہتمام کے بعد مختلف ناشروں سے منگوائی جاتی ہیں تو وقت پر نہیں پہنچتی ہیں، جن اسکولوں کو اردو پڑھانے کے سلسلہ میں امداد ملتی ہے، اس کا وقت پر حاصل کرنا بھی صبر آزما ہوتا ہے اور اگر کسی وجہ سے رک جاتی ہے تو اس کو پھر سے اجرا کرانے کی ساری کارروائیاں دفتری کاغذات کے ڈھیر کی نذر ہوجاتی ہیں۔

اردو بولنے والوں کی نگرانی میں جو ثانوی اسکول قائم ہیں۔ ان میں سے بعض جگہوں پر ابتدائی درجوں میں تعلیم اب تک ہندی میں دی جارہی ہے۔ ان کا عذر یہ ہے کہ اگر ان میں اردو میڈیم کردیا جائے تو ہندو طلبہ داخلہ لینا پسند نہ کریں گے، جس سے تعداد میں اتنی کمی ہوجائے گی کہ مالی آمدنی پر اثر پڑے گا اور اگر ان کا داخلہ لیا جائے تو علاحدہ ہندی سیکشن کھولنا ہوگا، جس کے لیے اساتذہ اور عمارت میں اضافہ کرنا ناگزیر ہوجائے گا۔ یہ آسانی سے ممکن نہیں، اس کے علاوہ ان کی یہ بھی ذہنی کشمکش ہے کہ اردو میں ابتدائی اور ثانوی درجوں میں تعلیم پانے کے بعد یونیورسٹیوں میں ہندی کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا کیسے ممکن ہوسکے گا، پھر صرف اردو میں تعلیم پا کر طلبہ سرکاری ملازمتوں کے لیے مفید اور قابل ترجیح سمجھے بھی جائیں گے کہ نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ مشکلات اور اعتراضات صحیح ہوں لیکن نجی مجلسوں میں بیٹھ کر سینے کے داغوں سے دل کے پھپھولوں کو جلاتے رہنے میں اردو کے مشکل مسئلوں کا حل نہیں ہے، زبان اسی وقت زندہ رہتی ہے جب اس کے بولنے والے اس کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ غیرت وحمیت کا بھی یہ تقاضا نہیں کہ ہم خود تو کچھ نہ کریں لیکن امید لگائے بیٹھے رہیں کہ حکومت سب کچھ ہمارے لیے کردے گی، پھر محض حکومت کے سہارے کسی زبان کا زندہ رہنا ضروری نہیں۔ مغلوں کے دور حکومت میں فارسی زبان کو ہر قسم کی سرپرستی حاصل رہی لیکن وہ اس ملک میں اس لیے زندہ نہیں رہ سکی کہ اس کے بولنے والوں نے اس کو زندہ رکھنے کی صحیح کوشش نہیں کی۔ زبان کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ اس کے لیے حکومت کچھ کرے یا نہ کرے، اس کے بولنے والے اس کے لیے اپنی طرف سے سب کچھ کرتے رہیں۔ مغلوں کے زمانے میں کچھ ایسے منصب دار بھی تھے جو کچھ بھی نہ کرتے لیکن گھر بیٹھے تنخواہ پاتے رہتے، ایسے منصب دار احدی کہلاتے، اب اردو میں یہ اصطلاح کاہلوں کے لیے استعمال ہونے لگی ہے۔ اردو بولنے والے اردو کی خدمت احدی منصب دار بن کر نہیں کرسکتے۔

اقلیت خواہ سیاسی ہو یا لسانی، رعایتوں کی بھیک مانگ کر اثر انداز نہیں ہوسکتی ہے۔ وہ اسی وقت باعزت اور باوقار ہوسکتی ہے جب وہ اپنی جد وجہد بلکہ پامردی اور سرفروشی سے ہر شکل کا سامنا کرنے میں سینہ سپر رہتی ہے، پھر جب پوری نہ سہی تھوڑی ہی بہت رعایتیں مل رہی ہوں تو ان پر شکوک کا اظہار کرنا خود شکستگی اور کوتاہ دستی کی دلیل ہے، زندگی کے میخانہ میں جو بڑھ کر خود ہاتھ میں مینا

اٹھا لیتا ہے، جینا اسی کا جینا ہوتا ہے، تعلیم حاصل کرنے میں ملازمت حاصل کرنے کی اقتصادی منفعت کا لحاظ ضرور سامنے ہونا چاہیے لیکن اس کا بھی احساس رکھنا ضروری ہے کہ مادری زبان کی محرومی کے بعد قوم یا ملت گونگی اور بہری بن کر رفتہ رفتہ فنا ہوجاتی ہے۔ اندھرا پردیش، میسور، مہاراشٹر اور بہار میں اسکول اور کالج اردو میڈیم کے ذریعہ چل رہے ہیں جو زبان حال سے اتر پردیش کے اردو بولنے والوں پر یہ طنز کررہے ہیں کہ وہ اردو کے کعبہ میں رہ کر اردو کو کفر کا درجہ دیے ہوئے ہیں، پھر بھی اقتصادی طور پر ان سے کچھ بہتر نہیں ہیں۔ (معارف، اکتوبر ۱۹۷۳ء)

حکومت ہند اور دارالمصنّفین

حکومت ہند ہمارے ادارہ کی طرف مائل ہوئی ہے۔ اس کو ایک قومی اہمیت کا ادارہ قرار دے کر سالانہ امداد دینے پر غور کرنے کے لیے تیار ہے۔ گذشتہ سال حکومت ہند کے کچھ نمایندے اس کی ضروریات کا اندازہ لگانے کے لیے بھی آئے تھے۔ وہ اس کے علمی کارناموں سے متاثر ہوئے۔ ان کا مشورہ تھا کہ آیندہ اب ایسے نوجوان نہیں ملیں گے جو خدمت وایثار کے جذبے سے کام لے کر یہاں اپنی ساری زندگی وقف کردینے کو تیار ہوں۔ ان کو مالی منفعت حاصل ہوگئی تو یہاں رہ کر علمی خدمت میں بھی لگے رہیں گے۔ یہ مالی وسائل کتابوں کی فروخت سے پیدا کرنا ممکن نہیں۔ اس میں وسعت صرف حکومت کی امداد سے پیدا ہوسکتی ہے۔ انھوں نے زبانی طور پر کہا کہ اگر یہ ادارہ حکومت کی امداد لینا پسند کرے گا تو اس کو دو سے تین لاکھ روپے تک امداد دی جاسکتی ہے، جب حکومت ادارہ کی طرف مائل ہے تو امداد حاصل کرنا آسان ہے، لیکن ہم پر یہ الزام آسانی سے رکھ دیا جائے گا کہ علامہ شبلیؒ کی وراثت کو ان کے نااہل جانشینوں نے حکومت کے ہاتھوں فروخت کردیا اور یہ اب علمی خدمت کرنے کے بجائے حکومت کا خدمت گذار بن کر رہے گا۔ ہم خود حکومت کا ضمیمہ بننا نہیں چاہتے، بشرطیکہ ہماری قوم ہماری سرپرستی کرتی رہے اور ہم یہ سرپرستی صرف اپنی مطبوعات کی زیادہ سے زیادہ خریداری کی صورت میں چاہتے ہیں۔ یا اہل ثروت ایک ہزار کے لائف ممبر بن کر ادارہ کی خدمت کرسکتے ہیں، جس کے بدلے میں ان کو اتنی ہی قیمت کی کتابیں فراہم ہوتی رہیں گی، مگر یقین ہے کہ یہ اپیل پہلے کی طرح رائیگاں جائے گی، پھر ادارہ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوکر حکومت کی طرف مائل ہوجائے تو ہماری قوم کو علامہ شبلیؒ کے جانشینوں کو قابل الزام ٹھہرانے کا حق نہ ہوگا۔ اس وقت اپنی اپنی

مجبوریوں کی بنا پر سارے علمی ادارے حکومت سے سالانہ امداد قبول کررہے ہیں، صرف دارالمصنّفین ہی اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ (معارف، فروری ۱۹۷۴ء)

دارالمصنّفین کے مسائل

جناب شاہ صاحب کی اچانک رحلت سے دارالمصنّفین کی فضا اب تک سوگوار ہے۔ ان کو بھلایا نہیں جاتا، ان کی کسی چیز پر نظر پڑ جاتی ہے تو ع دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ

ان کے ساتھ چالیس سال تک جتنے کیف آگیں دن گذرے، اب اسی کی یاد اندوہ گیں بنی ہوئی ہے

ان کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھئے جیسے کسی کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا

بار الٰہا! ان کی تربت کو اپنے انوار رحمت سے معمور اور جنت الفردوس کے پھولوں سے معطر فرماتا رہ، آمین۔

اسی مہینہ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی دارالمصنّفین میں قیام کے لیے تشریف لے آئے ہیں۔ ان کی آمد سے یہاں سوگواری میں نہ صرف کمی پیدا ہو جائے گی، بلکہ ان کے علم و فضل سے پورا فیض اٹھانے کا موقع ملے گا۔ وہ استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عزیز شاگرد رہ چکے ہیں۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک عرصہ سے مدرس رہنے کے بعد جامعہ ملیہ، نئی دہلی میں دینیات اور تاریخ اسلام کے استاد بھی رہے، جہاں اپنی نیکی، پرہیز گاری، اخلاص مندی اور فرض شناسی کی وجہ سے مقبول تھے، ڈاکٹر عابد حسین کے ادارہ اسلام اور عصر جدید کے سہ ماہی رسالہ کی مجلس ادارت کے رکن بھی ہیں، اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم بھی ہیں۔ اس سال سے پہلے حج کے موقع پر شاہ صاحب مرحوم کے ساتھ وہ بھی سعودی عرب کے امیر فیصل کی طرف سے زیارت خانہ کعبہ کے لیے مدعو تھے اور دونوں ہم سفر بھی رہے، شگفتہ اور باوزن تحریر لکھنے میں دبستان شبلی ہی کے مقلد ہیں۔ دارالمصنّفین سے ان کی دو کتابیں ''ہماری بادشاہی'' اور ''ہندوستان کی کہانی'' شائع ہوئی ہیں۔ ان کی تشریف آوری سے ہمارے رفقائے کار خوش ہیں، ہم بھی یہ کہہ کر اپنے دیدہ و دل سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں ع تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں۔

دارالمصنّفین کو قائم ہوئے اب ساٹھ سال ہو رہے ہیں۔ اس کے اسلاف اور اس کے

اخلاف نے جو کچھ کیا۔ اس کو مولانا جامی کی ایک تمثیل میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ جب انہوں نے خاقانی کے ایک مشہور قصیدہ کی زمین میں ایک قصیدہ لکھ کر طبع آزمائی کی، جس میں امیر خسرو بھی اپنے فن کا کمال دکھا چکے تھے۔ تو اپنا قصیدہ ختم کر کے لکھا کہ خاقانی نے خوان نعمت بچھایا۔ امیر خسرو نے اس کو نمک ڈال کر بامزہ بنایا مگر خود انہوں نے کھانے والوں کے محض ہاتھ دھلوا دیے۔ اسی طرح علامہ شبلیؒ نے جو خوان نعمت بچھایا تھا۔ اس کو ان کے شاگردوں نے سجایا، ان کے شاگردوں کے شاگردوں نے اس خوان پر کھانے والوں کے محض ہاتھ دھلانے کا فرض انجام دیا، مگر اب یہ ہاتھ دھلانے والے بھی رفتہ رفتہ ختم ہو رہے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ہر زمانہ میں شبلی و سلیمان، سلام و مسعود نہیں پیدا ہو سکتے، مگر ان کا کام ایک پوری جماعت کے ذریعہ سے انجام پاسکتا ہے، جو زیادہ سے زیادہ باصلاحیت افراد کے جمع کرنے کے بعد ہی بنائی جاسکتی، مگر اس کی تشکیل کے مادی وسائل کی فراہمی کے سوال پر ہر طرف سے یہ خاموش آواز سنائی دیتی ہے ع داغ لالہ کے لیے کیا فکر مرہم کیجیے۔

دارالمصنّفین کے اسلاف نے جس ایثار کے ساتھ اس کی خدمت کی۔ اس کی قدر ان کی زندگی میں نہیں، بلکہ ان کے بعد ہوئی۔ اسی طرح دارالمصنّفین کے شاید سقوط کے بعد ہی اس کے کارناموں کی مشعل روشن کر کے اس کو خراج تحسین پیش کیا جائے گا۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

اس ادارہ میں برسوں خون جگر پی پی کر ایک کتاب تیار کی جاتی ہے۔ اس کی اشاعت پر علمی حلقوں میں تو مدح و تحسین کے پھول برسائے جاتے ہیں، مگر یہ گودام میں برسوں کیا قرنوں پڑی رہتی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم نے دارالمصنّفین کی طلائی جوبلی کے موقع پر اپنے صدارتی خطبہ میں فرمایا تھا کہ دارالمصنّفین کے قدردانوں، معترفوں اور شکرگذاروں کو اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا بہت ضروری ہے کہ قدردانی، تعریف اور شکرگذاری اپنی جگہ پر اچھی چیزیں ہیں، لیکن ان سے نہ انجن کی بھٹی گرم ہوتی ہے، نہ بھاپ بنتی ہے، نہ گاڑی چلتی ہے۔ اس عالم مادی میں دینی اور روحانی کاموں کے لیے بھی مادی وسائل کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر ہم آپ واقعی دارالمصنّفین کے قیام کو علم و ادب اور ملک و قوم کے لیے مفید اور اہم سمجھتے ہیں تو ہمارا فرض ہے اور فرض کفایہ ہی نہیں بلکہ فرض ذاتی ہے کہ

قدمے اور سخنے سے آگے بڑھ کر دامے درمے اس کی دل کھول کر مدد کریں۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی مراد دامے درمے سے عطیات اور چندے کے بجائے یہ تھی کہ اس کی مطبوعات کے خریدار زیادہ سے زیادہ ہوں۔ بقول ان کے ''یہ کوئی احسان نہیں ہوگا بلکہ ایک سودا جس میں چاندی کے چند ٹکوں، بلکہ کاغذ کے چند پرزوں کے بدلے علم و حکمت کی دولت ہاتھ آئے گی، جو بے بہا اور لازوال ہے''۔

اس اپیل کی خاطر خواہ سماعت نہیں ہوئی تو پھر میری آہ کو بھی اثر ہونے کے لیے ایک عمر چاہیے لیکن میرے بے مہر کہنے سے کوئی مہربان کیوں ہو، دار المصنّفین کی بزم کے آشفتہ سروں کو تشنہ کام ہی رہ کر اس کے مقصد کی تکمیل میں استواری دکھانی ہے اور جب اس کے لیے ترک وفا کا سوال ہی نہ ہو تو چارہ ساز اور غم گساری نہ سہی۔ ع دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

دار المصنّفین کے پچھڑے ہوئے علمی کاموں میں ابھی طباعت و اشاعت کے لیے حسب ذیل مسودے تیار ہیں: (۱۔۲) مقالات سلیمان جلد چہارم و پنجم (۳) مقالات عبدالسلام جلد دوم (۴) تذکرۃ المحدثین جلد دوم (۵) تبع تابعین جلد دوم (۶) محمود غزنوی (۷) بزم تیموریہ جلد دوم (۸۔۹) غالب مدح و قدح کی روشنی میں جلد اول و دوم (۱۰) ہندوستان کے عہد مغلیہ سے پہلے کے مسلمان فرماں رواؤں کی مذہبی رواداری (۱۱) شاہان مغلیہ کی مذہبی رواداری (۱۲) فارسی میں نعت گوئی (۱۳) مولانا محمد علی کی یاد میں (۱۴) علامہ سید سلیمان ندوی کی علمی و ادبی خدمات (۱۵) خریطۂ جواہر۔

یہاں سے ہر سال دو نئی کتابوں کی طباعت و اشاعت کی روایت رہی ہے۔ اس طرح صبر آزما حالات کی ناسازگاری کے باوجود اللہ تبارک و تعالیٰ کے فضل سے ابھی آیندہ چھ سات سال تک اس کی علمی روایات میں کمی نہ آئے گی ع نقش پا میں ہے تپ گرمئ رفتار ہنوز (معارف، فروری ۱۹۷۵ء)

اردو کی حفاظت کا مسئلہ

دار المصنّفین کے مہمان خانہ میں لکھنؤ کے رہنے والے ایک مسلمان سرکاری عہدے دار ٹھہرے تو انھوں نے اثنائے گفتگو میں بیان کیا کہ ان کا لڑکا اچھی غزل کہتا ہے مگر اس کو ہندی رسم الخط میں قلم بند کرتا ہے، کیونکہ وہ اردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا۔ ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

ایک مشہور درس گاہ کے ایک استاد نے بتایا کہ وہاں کے کافی طلبہ درود شریف اور تشہد کو

ہندی میں لکھ کر یاد کرتے ہیں۔ یو پی کے بہت سے والدین کی زبانی سننے میں آتا ہے کہ ان کی لڑکیاں بھی ہندی ہی میں خط و کتابت کرنے لگی ہیں۔ یو پی ہی کے ایک وکیل صاحب کہنے لگے کہ اردو میں لکھا ہوا کوئی خط گاؤں پہنچ جاتا ہے تو مکتوب الیہ اس کو رکھے رہتا ہے کہ کوئی اردو داں کہیں ملے تو اس سے پڑھایا جائے۔

اگر کوئی قوم یا فرقہ یا نسل اپنی مادری زبان کھو بیٹھتی ہے تو وہ جیتے جی ہلاک ہو جاتی ہے۔ اردو بولنے والے طلبہ کے لیے اپنی مادری زبان نہ پڑھنا اور اس کے پڑھانے کی سہولتیں فراہم نہ کرنا نسل کشی ہے۔ طلبہ اردو اس لیے نہیں پڑھتے کہ سرکاری ملازمتوں میں یہ کام نہیں آتی۔ اگر زندگی کا مقصد صرف پیٹ پالنا ہو تو مادری زبان چھوڑی جاسکتی ہے۔ پھر اسی پیٹ کی خاطر دین بھی چھوڑنے میں تامل نہ ہوگا، جس کے بعد تہذیبی، ملی اور مذہبی روایات کا وارث بن کر زندہ رہنے کا حق نہیں رہتا۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

یو پی میں عام شکایت یہ ہے کہ درس گاہوں میں اردو پڑھانے کا خاطر خواہ انتظام نہیں، اسی لیے طلبہ اردو پڑھ نہیں پاتے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اس ریاست میں اردو پر جو آفت آئی اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ گذشتہ ۷۲ برسوں میں اس کو نیم جاں کر دیا گیا اور جب یہ جاں بلب ہونے لگی تو اس کی تعلیم کی سہولتوں کا اعلان کیا گیا، مگر اردو کی زبان پر اس رحمت کے پیامبر سے یہ فریاد ہے۔

آیا تو سہی وہ کوئی دم کے لیے لیکن ہونٹوں پہ مرے جب نفس باز پسیں ہے

مرکزی حکومت اور اتر پردیش کے موجودہ فراخ دل اور روادار وزیر اعلیٰ تو اردو کو اس کا حق دینا چاہتے ہیں مگر حکومت اور عہدے دار خصوصاً دفتری ملازمین اپنے دلوں کو ٹٹول کر خود فیصلہ کریں کہ وہ اس اعلان کی خانہ پری اردو بولنے والوں کا محض منہ بند کرنے یا واقعی اس زبان کو اپنے سنگھاسن پر بٹھانے کی خاطر کرتے ہیں، کچھ دن پہلے ملک کے ایک مشہور رہنما جو حکومت ہند کا اعلیٰ ترین عہدہ پانے کی بھی تمنا رکھتے ہیں، دارالمصنّفین تشریف لائے۔ یہاں کے علمی کاموں کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ سارا کام اردو کے بجائے ہندی میں ہوتا تو زیادہ مفید ہوتا، کیونکہ آیندہ اردو پڑھنے والوں کی تعداد ہی کتنی رہ جائے گی۔ اس سے ہندی کے حامیوں کے اندرونی جذبات اور اصلی خواہشات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے ع تقدیر کو تدبیر کے شاطر نے کیا مات۔

اگر کوئی لسانی اقلیت اپنی زبان کو محفوظ رکھنے کا عزم بالجزم نہیں رکھتی تو حکومت کی چوکھٹ کی دریوزہ گری سے زندہ نہیں رکھی جاسکتی ہے۔ وہ گل نغمہ یا پردۂ ساز اپنے بل بوتے ہی پر بن سکتی ہے۔ ورنہ اس کو اپنی شکست کی آواز بن کر رہنا پڑے گا۔ ہر ملک کی اکثریت اقلیت سے اپنی ہر چیز کو تسلیم کرانے کے حق کو استعمال کرنے میں گریز نہیں کرتی۔ یہ اس کا فطری تقاضا ہوتا ہے اس کے لیے وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر جارحانہ رنگ بھی اختیار کرتی رہتی ہے۔ مگر اقلیت کا بھی یہ فطری حق ہے کہ وہ اپنی ہر چیز کو برقرار رکھنے کے لیے پوری مدافعت کرے جو مختلف صورتوں سے ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ اس جارحیت اور مدافعت کے ٹکراؤ میں اگر مدافعت کمزور پڑ جاتی ہے تو جارحیت غالب آجاتی ہے اور اگر مدافعت کی قوت بڑھتی جاتی ہے تو جارحیت کو مدافعت کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ جھکنے اور جھکانے کا کھیل ہر زمانے میں رہا کیا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو ہندی کے سامنے جھک کر رفتہ رفتہ ختم ہو جاتی ہے یا اپنی فطری قوت نمو سے باقی رہتی ہے۔ اس کے حامیوں کو حکومت پر نکتہ چینی اور الزام تراشی کرنے کے بجائے اپنی کوتاہ اندیشی، سہل پسندی، حیلہ جوئی اور بے عملی کا بھی جائزہ لینا ہے۔ شکست خوردگی اور گریز پائی کی ریت کے اندر سر چھپا کر آندھی کے گزر جانے کا انتظار کرنا زندگی کی حقیقت کا سامنا کرنے کے بجائے اس سے منہ موڑنا ہے۔ زمانہ قیامت کی چال چل چکا ہے ع

اٹھو ورنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی

مگر خود اردو اپنے سے زیادہ مایوس نہیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد سے اب تک ہندوستان میں اردو میں جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں، ہندی کے علاوہ کسی اور علاقائی زبان میں شاید ہی ہوئی ہوں۔ مہاراشٹر، بہار، آندھرا اور کرناٹک میں اردو بولنے والے طلبہ اسی زبان میں ثانوی تعلیم پا رہے ہیں۔ تیج، ملاپ، پرتاب اور شیر پنجاب وغیرہ جیسے اخبارات کی اشاعت سے اس کی شہادت ملتی ہے کہ ابھی تک غیر مسلموں میں بھی مقبول ہے۔ پاکستان میں اردو اخبارات کی تعداد و اشاعت وہاں کے انگریزی اخباروں سے زیادہ ہے۔ اب تو لندن سے بھی ایک اردو اخبار شائع ہونے لگا ہے۔ دنیا کے تمام اہم ملکوں کے ریڈیو اسٹیشنوں سے اردو کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی بعض یونیورسٹیوں میں اردو کے شعبے بھی کھولے گئے ہیں۔ بیرونی ممالک میں اس کی قدر و منزلت اتر پردیش کے ان اردو بولنے والوں کے باعث عبرت و غیرت ہے جو غزل کو اردو رسم الخط میں نہیں لکھ پاتے۔ دکھ اس کا بھی

ہے کہ غزل اب گجل ہورہی ہے۔اس کا عاشق آسک اور معشوق ماسوک ہورہا ہے۔عاشق کا سوز دل، سوج دل اور معشوق کا ظلم، جولم اور اس کی زلف جلپھ بنتی جارہی ہے۔ یہ انقلاب انیس، دبیر، ناسخ، آتش، نسیم، سرشار، چکبست اور شبلی کی سرزمین میں آرہا ہے۔ ع محمل جو گیا، عزت بھی گئی، غیرت بھی گئی، لیلا بھی گئی

(معارف، مارچ ۱۹۷۵ء)

دینی تعلیمی کونسل

دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش گذشتہ سولہ سال سے کام کررہی ہے۔اس کا مقصد مسلمان بچوں اور بچیوں کے لیے اردو کے ذریعہ ایسی دینی تعلیم کا انتظام کرنا ہے، جس سے وہ اچھے شہری ہونے کے ساتھ اچھے مسلمان بن کر اپنی ایمانی، روحانی اور تہذیبی خصوصیات کو باقی رکھیں۔

اس کی ابتدائی تحریک ۱۹۵۹ء میں مشرقی یو پی کے ایک ضلع بستی میں ہوئی مگر اس کے کچھ مخلص کارکنوں کی قوت ارادی کی بدولت اب یہ پورے اتر پردیش کی ایک منظم جماعت بن گئی ہے۔اس کی طرف سے اب تک یو پی کے مختلف حصوں میں نو ہزار خود کفیل مکاتب کھولے جاچکے ہیں، جن میں تقریباً سات لاکھ بچے اور بچیاں اس کی تیار کردہ درسی کتابوں کے ذریعہ زیر تعلیم ہیں۔اس وقت اتر پردیش میں ۳۶ لاکھ مسلمان بچے اور بچیاں ہیں، جن کے لیے بھی ایسے مکاتب کھولنے کی ضرورت ہے مگر یہ کام مالی وسائل کی کمی اور قانونی دقتوں کی وجہ سے آسان نہیں، مگر اس کے کارکنوں کا اخلاص اور عزم کی پختگی اس نسل کا اصلی سرمایہ ہے۔امید ہے کہ وہ ساری مشکلات پر قابو پالیں گے۔مولانا ابوالحسن علی ندویؒ اس کے دل، جناب قاضی عدیل عباسی صاحب اس کے دماغ، جناب ظفر احمد صدیقی، ڈاکٹر اشتیاق قریشی، جناب ریاض الدین احمد اور مولوی محمود الحسن اس کے اعضاء ہیں، انھی کی بدولت یہ سرگرم عمل ہے، جس سے متاثر ہوکر بہار، کرناٹک، آندھرا اور مدھیہ پردیش میں بھی اس قسم کی سرگرمیاں جاری ہوچکی ہیں۔اس کے کارکن اپنی مخلصانہ کوششوں کے لیے تعریف و مبارک باد کے مستحق ہیں۔

یہ کاؤنسل کچھ وقفے کے بعد اپنی ریاستی کانفرنس بھی کرتی ہے۔اس کی چوتھی کانفرنس ۲۲، ۲۳ر جون کو لکھنؤ میں ہوئی۔اس کے کھلے اجلاس سے پہلے ایک سمینار بھی ہوا، جس میں اردو کی اہمیت

اور افادیت پر مفید مقالے پڑھے گئے، مگر اردو زبان اب مقالہ نگاری کی خواہاں نہیں۔ وہ اپنے بولنے والے اور حامیوں سے ایسی عملی قربانی اور خون جگر کی لالہ کاری چاہتی ہے جو اس کو وہ مقام دلا سکے جس کی وہ مستحق ہے ع

پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

کھلے اجلاس میں بڑی تعداد میں مسلمان شریک ہوئے، اس کا افتتاح مولانا منت اللہ رحمانی صاحب امیر شریعت بہار نے کیا۔ انہوں نے اپنے پر مغز اور کارآمد خطبہ میں مسلمانوں کو یہ پیغام دیا کہ ان کے بچوں کا اپنے دینی تصورات اور اعتقادات پر قائم رہنا ان کا فطری حق ہے جو چھینا نہیں جا سکتا ہے۔ اس کو حاصل کرنا انسانی فریضہ ہے۔ امید کہ یہ پیام ہندوستان کے ہر حصہ میں پہنچے گا۔

اس کانفرنس کی صدارت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے کی ان کے خطبہ صدارت میں ان کی جراحت دل کا درد تھا، بڑی تلخ نوائی سے اپنی ملت کا بھی احتساب کیا کہ وہ خود فیصلہ کرے کہ اس نے اپنی دینی، روحانی، اخلاقی اور لسانی امنگوں کی تکمیل کرنے میں کون سی جدوجہد کا ثبوت دیا۔ انہوں نے اس اجلاس کے آخر میں ایک بہت ہی موثر اور مدلل تقریر میں یہ بھی کہا کہ اگر مسلمان اپنی غفلت اور بے عملی سے اپنی ملی صحت خود بگاڑ چکیں گے تو پھر بڑے سے بڑے صلحاء اور اتقیا بھی زندہ ہو کر اس کو توانا اور صحت مند نہیں بنا سکتے۔ ان کا یہ احتساب اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے اس وقت تو صرف ع

تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب

لیکن تقدیر ہی تدبیر سے ہر زمانہ میں یہ کہتی رہی ہے۔

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے　　بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تخت جم و کے

مگر یہ بھی صحیح ہے کہ سامعین کی خاموش نگاہیں یہ کہہ رہی تھیں۔

خون رگ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر　　میخانۂ حافظ ہو کہ بت خانہ بہزاد

اس وقت مسلمان ایسے معمار کے منتظر ہیں جو اپنے خون رگ کی گرمی سے ان کی زندگی کی تعمیر از سرنو کر دے۔ وہ بے عمل ضرور ہو رہے ہیں، مگر ان کا نفسیاتی ذہن بہت زیادہ نہیں بگڑا ہے۔ وہ ایمان کے جمال لازوال سے یکسر محروم نہیں ہوئے ہیں۔ ان کی اکثریت اس کی خواہاں ہے کہ وہ اپنے اخلاق و کردار سے اچھے شہری اور محب وطن بھی بنیں اور ان کے ذہنی حصار کی سرحدیں بھی ہر

طرح کے جارحانہ یلغار سے محفوظ رہیں۔مگر سوال یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں کیسے حاصل ہوں، قیادت مقتدیوں میں حرکت چاہتی ہے۔مقتدی قیادت کی دست گیری کے طلب گار ہیں، مگر دونوں طرح طرح کی مشکلات میں محصور ہیں جن سے دونوں کی تعمیری اور عملی قوتیں دبتی چلی جاتی ہیں۔دونوں کی نگاہیں غیر شعوری طور پر ایک دوسرے سے پوچھ رہی ہیں کہ دبی قوتیں کیسے ابھریں اور کیوں کر ابھاری جائیں۔ابھرنے اور ابھارنے کی اس کشمکش میں زیادہ ذمہ داری قیادت پر آتی ہے۔

ع　جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

(معارف، جولائی ۱۹۷۵ء)

ندوۃ العلماء کا پچاسی سالہ جشن

اب سے پچاسی سال پہلے علامہ شبلی نعمانیؒ نے یہ آواز بلند کی تھی کہ ہندوستان میں ایک ایسا مثالی دینی مدرسہ ہو جو اپنی جامعیت وعظمت کے لحاظ سے مدرسۂ اعظم کہلانے کا مستحق ہو۔اس میں دینی علوم کی تعلیم ایسی ہو کہ یہاں کے فارغ شدہ طلبہ اسلام کے مخالفوں کے اعتراضات کا جواب زمانہ کے مذاق کے مطابق دے سکیں۔

مولانا محمد علی مونگیریؒ کی بھی آرزو تھی کہ ایک ایسا مدرسہ قائم کیا جائے جس سے ایسی جماعت پیدا ہو جو اپنی واقفیت واطلاع، انتظام وتدبیر اور حزم ومصلحت اندیشی میں قرون اولیٰ کے بزرگان دین کی یاد تازہ کرسکے۔ان دونوں بزرگوں نے جو خواب دیکھا تھا۔اس کی تعبیر اس وقت پوری ہوئی جب ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۸ء میں لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء قائم ہوا، جو ایک دینی تعلیمی اور علمی تحریک بھی بن گیا۔اس کے ذریعہ سے دینی مدارس کے نصاب میں ایسی اصلاحات کی گئیں کہ رفتہ رفتہ یہ جدید وقدیم گروہ کا ایک سنگم بن گیا۔اس درس گاہ میں اطوار وافکار کی جو روشن ضمیری اور رعنائی ملی اس سے مرصع اور مسلح ہوکر کچھ ایسے علماء وفضلاء پیدا ہوئے، جنھوں نے اسلام اور اسلامی علوم کی بڑی قابل قدر خدمت انجام دی۔

ان میں سب سے نمایاں نام استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کا ہے، جو اپنی علمی عظمت وفضیلت کی وجہ سے فخر ملت اسلامیہ بن گئے۔ان کے قلم سے چراغ مصطفوی کی تابناک ضیاء جس طرح پھیلی اس سے ندوۃ العلماء کی دعوت وتحریک کو بڑی تقویت پہنچی۔وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء

کو اپنی زندگی کا شہ رگ سمجھتے رہے۔ اس سے وابستہ رہ کر اپنے زمانہ کے لحاظ سے اس کو فروغ دینے میں ہر ممکن کوشش کی۔ دارالعلوم ندوہ کو ان پر فخر ہے، تو خود ان کو اپنی اس مادر درس گاہ پر ناز رہا۔

ان ہی کے لائق شاگرد مولانا ابوالحسن علی ندوی ہیں، جو اس وقت ندوۃ العلماء کی روح رواں بن کر اس کی دعوت و تحریک کو آگے بڑھانے بلکہ بعض حیثیتوں سے ان سے بہت آگے جا چکے ہیں۔ جب دارالعلوم ندوۃ العلماء قائم ہو رہا تھا تو علامہ شبلی نعمانیؒ کی یہ تمنا ہوئی کہ اس کی عمارت وسیع، پر فضا اور عظیم الشان ہو۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے دور نظامت میں اس کے ہر گوشہ میں علامہ شبلی نعمانی کی تمنا پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے احاطہ میں داخل ہو کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسی درس گاہ میں کھڑے ہیں جو دنیا کی ممتاز درس گاہوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ ان ہی کی کاوشوں سے یہ درس گاہ ایک علمی مرکز بھی بن گئی ہے۔ یہاں سے اردو، عربی، انگریزی میں ایسی باوزن اور مفید کتابیں شائع ہو رہی ہیں، جو اسلام کے ذہنی، فکری اور تبلیغی لٹریچر کا بہت ہی قیمتی سرمایہ بن رہا ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی اس وقت اسلامی علوم و فنون کے شاہین بنے ہوئے ہیں۔ اسی کے ساتھ علم و فن کے شاہیں بچوں کو بال و پر دینے کا بھی بڑا ملکہ رکھتے ہیں۔

ان ہی کی نگرانی میں ۳۱/ اکتوبر سے ۲/ نومبر ۱۹۷۵ء تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ۸۵ سالہ جشن تعلیمی منایا جا رہا ہے۔ جس میں اندرون ملک کے علاوہ اسلام کے اہل فکر و نظر کو بھی مدعو کیا گیا ہے۔ یہ معلوم کر کے خوشی ہے کہ سعودی عربیہ، مصر، الجزائر، ٹیونس، لیبیا اور شام کی حکومتوں نے اس میں شرکت کرنے کے لیے اپنے سرکاری وفود بھیجنے کا پورا وعدہ کیا ہے۔ اس سے اسلامی ممالک میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کی شہرت اور مقبولیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ جس میں بلاشبہ روز افزوں اضافہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کی ذات گرامی کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ضمیر اور سفیر بن کر اس دینی اور تعلیمی ادارہ کے تعلقات کو اسلامی ممالک سے جس طرح استوار کیا ہے۔ وہ اس کی تاریخ کا بڑا زریں کارنامہ شمار کیا جائے گا۔ اس شاندار اجتماع میں اسلامی ممالک کے نمایندوں کو یہ مطالعہ کرنے کا موقع ملے گا کہ نہ صرف اس ملک بلکہ عالم اسلام کے مذہبی، علمی اور تہذیبی دور میں ندوۃ العلماء کا کیا حصہ رہا ہے۔ اس سے اسلامی ممالک میں ہمارے وطن کی عظمت بھی بڑھے گی۔ امید ہے کہ حکومت ہند بھی اس بین الاقوامی اجتماع کو قدر کی نگاہ سے دیکھے گی۔ کیونکہ

اس سے ہمارے ملک اور اسلامی ممالک کے درمیان خوش گوار ثقافتی، علمی اور تعلیمی تعلقات بھی پیدا ہونے کی توقع ہے، جس کی ضرورت اس وقت بہت محسوس کی جارہی ہے۔

دعا ہے کہ یہ اجتماع ہر لحاظ سے کامیاب ہو، ندوۃ العلماء کی دعوت وتحریک صحیح معنوں میں قدیم وجدید اور عقل ونقل کا قابل قدر امتزاج ہو۔ دارالمصنّفین بھی ندوۃ العلماء کی دعوت وتحریک کی ایک زریں کڑی ہے۔ اس کی طرف سے اس کے وارثوں اور حامیوں کے لیے اس جشن کے موقع پر یہ پیام ہے

تیرے سینے میں ہے پوشیدہ ، راز زندگی کہہ دے
مسلمان سے حدیث سوز و ساز زندگی کہہ دے

(معارف، اگست ۱۹۷۵ء)

پاکستان میں دارالمصنّفین کی کتابوں کا حق طباعت

خاکسار ایک طویل عرصہ کی غیر حاضری کے بعد دارالمصنّفین کے علمی گل کدہ اور اپنی روح کے عشرت کدہ میں واپس آیا ہے۔ گذشتہ مارچ میں حکومت ہند کی اجازت سے سیرت کی بین الاقوامی کانگریس میں شرکت کے لیے پاکستان گیا، جس کی روداد مئی ۱۹۷۶ء کے معارف میں چھپ چکی ہے۔

اس سفر میں حکومت پاکستان کی توجہ ایک بار پھر وہاں کے بعض ناشروں کی زیادتی کی طرف دلائی جو دارالمصنّفین کی مطبوعات کو غیر قانونی طور پر چھاپ کر اس کو غیر معمولی نقصان پہنچا رہے تھے۔ معارف میں پہلے ذکر آیا ہے کہ اس کے خلاف ایک اخباری مہم جناب سید حسام الدین راشدی نے چلائی تھی، جن کو اپنی علمی تحقیق وکاوش کی وجہ سے پاکستان میں اونچا مقام حاصل ہے۔ انھوں نے دارالمصنّفین کی فریاد پاکستان کے وزیر امور مذہبی مولانا کوثر نیازی تک پہنچائی جو بڑے لائق اور فاضل اہل علم ہونے کے ساتھ بڑے علم نواز اور علم دوست بھی ہیں۔ انھوں نے بڑی کشادہ دلی سے اس مسئلہ کی طرف جناب ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم پاکستان کی توجہ دلائی۔ جنھوں نے اپنی معارف شناسی اور ہندوستان سے خیر سگالی کی خاطر اس سے اپنی پوری ہمدردی کا اظہار کیا۔

مولانا کوثر نیازی نے پاکستان کے وزیر تعلیم جناب عبدالحفیظ پیرزادہ پر بھی اس معاملہ کی نوعیت کو اچھی طرح واضح کیا۔ جنھوں نے اپنی فراخ دلی سے پاکستانی ناشروں کی بدعنوانی پر اظہار افسوس

کر کے اپنی علم پروری کا ثبوت دیا۔ مولانا ظفر احمد انصاری پاکستان کی قومی اسمبلی کے آزاد ممبر ہیں۔ وہ ایوان کے بڑے باوقار، بااحترام اور قابل اعتبار رکن سمجھے جاتے ہیں۔ انہوں نے بھی جناب پیرزادہ صاحب سے کئی بار مل کر اس معاملہ کو طے کرانے کی کوشش فرمائی، بالآخر جناب پیرزادہ صاحب نے کمال عنایت سے اپنی وزارت کو تفصیلات پر غور کرنے کی ہدایت فرمائی۔

دارالمصنّفین کی مجلس انتظامیہ نے خاکسار کو اس کی مطبوعات کا حق طباعت وہاں کے کسی سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ کو دے کر اس کے بدلے میں خاطر خواہ رائلٹی حاصل کرنے کا اختیار دیا تھا۔ اس کے لیے درخواست مرتب کرتے وقت جناب قدرت اللہ شہاب آئی، سی، ایس نے مفید قانونی مشورے دیے۔ وہ اس وقت محکمہ تعلیم میں ثقافتی امور کے سکریٹری تھے۔ اب ریٹائر ہو گئے ہیں، بڑا اچھا ادبی ذوق رکھتے ہیں، بڑے مذہبی بھی ہیں۔ اردو کے مشہور شاعر جناب فیض احمد فیض کو بھی اس درخواست سے دلچسپی ہوئی۔ وہ اس وقت وزارت تعلیم میں تعلیمی مشیر ہیں، جب یہ درخواست وزارت تعلیم میں پہنچی تو اس کے لائق سکریٹری ڈاکٹر محمد اجمل نے اس کی طرف پوری توجہ کی۔ وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں۔ ان کا خاص علمی موضوع نفسیات ہے۔ معلوم ہوا کہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ملفوظات اور مواعظ کا نفسیاتی تجزیہ کرنے میں مشغول ہیں۔ جناب قدرت اللہ شہاب کی جگہ پر محکمہ تعلیم کے ثقافتی امور کے سکریٹری جناب ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ہوئے تو انہوں نے اپنی غیر معمولی شرافت، اخلاق، دل نواز، عجز و انکسار اور علم نوازی سے اس معاملہ میں ہر طرح کی مخلصانہ کوشش کی۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اولڈ بوائے ہیں۔ اپنی علمی بصیرت اور قابلیت کی وجہ سے پاکستان میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

دفتری کارروائی کے سلسلے میں سب سے پہلے جناب زاہد ملک جوائنٹ سکریٹری وزارت امور مذہبی نے بڑی خوش اخلاقی اور محنت سے اس معاملہ کو آگے بڑھایا، پاکستان، لسانی جوائنٹ سکریٹری وزارت تعلیم، جناب محمد زعیم الرحمٰن اڈیشنل سکریٹری محکمۂ خزانہ اور ان ہی کے محکمہ کے جوائنٹ سکریٹری جناب امین اللہ نے بڑے لطف و کرم سے نوازا، وزارت تعلیم کے ڈپٹی سکریٹری حسن شوکت صاحب نے دفتری کارروائی کو جلد از جلد انجام دینے میں پوری مدد کی۔ شاہ محی الحق صاحب (سیکشن آفیسر محکمہ قانون) نے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں، نسیم احمد صاحب (سیکشن آفیسر

محکمۂ خزانہ) کی وجہ سے دفتری کارروائی میں آسانی ہوئی۔

یہ معاملہ آخر میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کے حوالہ کیا گیا۔ جو وزارت تعلیم کے ماتحت نشر و اشاعت کا ایک اہم ادارہ ہے۔ اس کی شہرت بیرونی ممالک میں بھی پہنچ رہی ہے۔ اس کے انتظامی امور کے ڈائریکٹر جناب یونس سعید ہیں، جو انگریزی زبان میں اپنی قابلیت کی وجہ سے پاکستان کے علمی حلقہ میں مقبول ہیں۔ وہ دارالمصنّفین کی مطبوعات میں سیرت النبیؐ سے کچھ ایسے متاثر تھے کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں کرنے کے خواہاں ہوئے مگر جب میں نے ان سے پہلے خطبات مدراس کا ترجمہ انگریزی میں کرنے کی خواہش ظاہر کی تو وہ اس کے لیے ایسے مستعد ہوئے کہ دن رات کی عرق ریزی کے بعد میرے قیام پاکستان ہی کے زمانہ میں اس کا پورا ترجمہ ختم کر ڈالا اور خوش تھے کہ ایک اہم اور لائق ثواب کام انجام پا گیا۔ ان کے ساتھ ان کے ڈپٹی ڈائریکٹروں میں سے جناب محمد شمیم رضوی، ڈاکٹر اے، آر ملک، جناب اکرام قمر اور منظور احمد صاحبان نے نیشنل بک فاؤنڈیشن اور دارالمصنّفین کے درمیان معاہدہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہر قسم کا تعاون کیا۔ جس کی شرط یہ قرار پائی کہ نیشنل بک فاؤنڈیشن پندرہ لاکھ پاکستانی روپے دے کر دارالمصنّفین کی ۱۱۵ کتابوں کا حق طباعت خرید لے، جو صرف پاکستان کے لیے محدود ہو۔

اس معاہدہ پر دستخط کرتے وقت پاکستان کے اہم روزانہ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے نمایندے موجود تھے۔ ان کو مخاطب کرنے کا بھی موقع ملا۔ پاکستان کے ارباب حکومت نے ازراہ کرم و انصاف دارالمصنّفین کو اپنے یہاں کے بعض ناشروں کو بے جا حرکتوں سے جس طرح بچا لیا۔ اس کا دلی شکریہ اس موقع پر ادا کیا۔ جب اس معاملہ کی کارروائی شروع کی گئی تھی تو ہمارا ہندوستانی سفارت خانہ باضابطہ طور پر پاکستان میں قائم نہ تھا، لیکن کراچی میں معاہدہ پر دستخط ہوا تو اس کی عکسی نقل اپنے سفارت خانہ کو اسلام آباد بھیج دی۔ (معارف، اکتوبر ۱۹۷۶ء)

قومی دھارا اور مسلمان

آج کل ملک میں قومی دھارے کا ذکر برابر آتا ہے مگر اس کی وضاحت کی ضرورت ہے کہ اس کی تشکیل کن اجزاء سے ہوتی ہے؟ اس کے لیے ذہن کیسے تیار کیا جا سکتا ہے؟ اس کو فروغ دینے والے کون لوگ ہوں گے اور وہ کون سے موثر ذرائع اختیار کریں گے؟

اس سلسلہ میں بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ملک کی سب سے موثر، طاقت ور اور مقبول سیاسی جماعت کانگریس جو کچھ کہتی یا کرتی ہے، کیا وہی قومی دھارا ہے؟ غیر کانگریسی جماعتیں جو کہتی یا کرتی یا جو تحریکیں چلاتی ہیں۔ کیا وہ قومی دھارے کے منافی ہیں؟ اس میں مذہب کا کیا رول ہونا چاہیے؟ کیا مذہب اس کے لیے مفید ہوسکتا ہے یا یہ رکاوٹ پیدا کرسکتا ہے؟ کچھ تاریخی شخصیتیں ایسی بھی ہیں جن کو ملک کا ایک طبقہ اپنا ہیرو مانتا ہے، مگر دوسرا طبقہ ایسا بھی ہے جو ان کو ہیرو کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں، ایسے طبقہ کا کردار قومی دھارے کے سلسلہ میں کیا ہونا چاہیے؟ ملک کے بعض تہوار قومی سمجھے جاتے ہیں، کچھ گروہ ایسے بھی ہیں جو کسی تہوار کو بھی قومی تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں۔ ایسے لوگوں کو قومی دھارے میں کیا جگہ دی جاسکتی ہے؟

ملک کی تہذیب اور تمدن میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو مختلف علاقوں اور جماعتوں کے درمیان مشترک ہیں اور کچھ چیزیں غیر مشترک ہیں، جن کو اپنانے والوں کے ساتھ قومی دھارے کے حامیوں کا کیا رویہ ہونا چاہیے؟ اگر تہذیبی اور تمدنی عناصر بھی قومی دھارے کے ضروری اجزاء ہیں تو ملک میں لباس، وضع قطع، کھانے پینے کے آداب اور معاشرتی رسوم وغیرہ میں جو نیرنگیاں نظر آتی ہیں، کیا وہ قومی دھارے میں یک رنگی پیدا کرنے میں مضر تو نہیں، کیا یوروپی لباس، ہوٹلوں اور پارکوں میں یوروپی تہذیب کی مختلف قسموں کے فاسقانہ اور عیاشانہ مظاہرے ہمارے قومی دھارے کی روایات کے مطابق ہیں یا وہ ہمارے قومی ذہن اور مزاج کو برباد کرنے والے اجزاء ہیں؟

قومی دھارے کے لیے خوش گوار اور تنومند ذہن کی نشوونما کن ذرائع سے ہوسکتی ہے؟ فرقہ واریت، قومیت اور وطنیت کیا ہے؟ ان کے تخیل کو روشن کرنے کی ضرورت ہے، کسی فرقہ کی اکثریت کسی مطالبہ میں متحد ہوجائے تو کیا اس کا یہ اتحاد فرقہ واریت پر محمول ہوگا یا اس کو جائز قرار دیا جائے گا؟ ایک فرقہ کے متحدہ مطالبہ کو دوسرا فرقہ متحدہ طور پر رد کردے تو ان میں کون قومی دھارے کا حامی اور کون مخالف سمجھا جائے گا؟ اگر کوئی یہ کہے کہ وہ خدا کے احکام کا اطاعت گذار رہ کر وطن کا بھی فرماں بردار ہوسکتا ہے یا سچا ہندو اور سچا مسلمان ہی سچا اور اچھا محب وطن ہوسکتا ہے تو کیا وہ قومی دھارے کا حامی نہیں سمجھا جائے گا؟ یا کوئی یہ کہے کہ وہ پہلے ہندو یا مسلمان ہے، بعد میں ہندوستانی ہے، تو کیا وہ قومی دھارے کے رخ اور سمت کو غلط راستے کی طرف موڑ دینے والا سمجھا جائے گا؟ یا کوئی یہ کہے کہ پہلے

ہندو یا مسلمان ہونے اور بعد میں ہندوستانی ہونے میں کوئی تضاد نہیں، وطن دشمنی نہیں تو کیا قومی دھارے کے مسلک کے لحاظ سے اس کا یہ کہنا صحیح ہوگا؟ یا کوئی یہ کہے کہ جو ہندو یا مسلمان اپنے مذہب کا وفادار نہیں، وہ وطن کا بھی وفادار نہیں ہوسکتا، تو یا ایسا کہنے والا قومی دھارے میں انتشار پیدا کرنے والا تصور کیا جائے گا؟ یا کوئی یہ کہے کہ سیاست میں مذہب خلل نہیں ڈالتا بلکہ مذہب میں سیاست دخیل ہوجاتی ہے تو مذہب اور سیاست دونوں میں خلل پڑ جاتا ہے تو کیا ایسا دعویٰ کرنے والا قومی دھارے کو نقصان پہنچانے والا قرار دیا جائے گا؟

ان تمام سوالات کا بس ایک ہی جواب ہے کہ مذہبی، سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی سرگرمیاں خواہ کیسی ہی ہوں۔ اگر ان میں وطن دوستی کی روح موجود ہے تو وہ عین قومی دھارے کے تقاضے کے مطابق ہیں۔ ہم وطنوں میں مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور تمدنی اختلافات خواہ کتنے ہی ہوں، ان میں باہمی رواداری، دل جوئی، نیک نیتی، فراخ دلی اور سیر چشمی کے دھارے بہتے رہیں تو اصل وطن دوستی یہی ہے۔ اگر اکثریت اقلیت کے دلوں کی تسخیر کرتی رہے اور اقلیت اکثریت پر پورا اعتماد کرکے ان کے دلوں کو موہ لیتی رہے تو سچے معنوں میں یہی صحیح قومی دھارے ہیں، مگر دلوں کی یہ تسخیر سیاسی مصلحت اور وقتی ضرورت کی خاطر نہ ہو، بلکہ الفت و یگانگت کی مشک آگیں اور عنبریں فضا میں اس طرح ہو کہ دونوں ایک زباں ہوکر کہتے رہیں۔ ع

وہ ہم سے جیتتے ہم ان سے ہارتے ہیں

ذہن کو مفلوج اور مرعوب کر کے کسی مسلک یا عقیدہ کو تسلیم کرانا کوئی مدبرانہ مآل اندیشی نہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو خود مقبول ہوکر رہے گا اور کوئی اسے قبول کرنے سے گریز کرتا ہے تو وہ گویا مریضانہ ذہنیت میں مبتلا ہے جو مہر و محبت کے موثر علاج سے نہ کہ دل آزاری، آبروشکنی، بیزاری اور خوں ریزی سے دور ہوسکتی ہے۔

ان سطروں کے لکھتے وقت قومی یکجہتی کے ورکنگ گروپ نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے حصول کے لیے ایک سات نکاتی لائحۂ عمل مرتب کرکے شائع کیا ہے، جس میں یہ کہا گیا ہے کہ اقلیتوں کے معاملہ میں اکثریتی فرقہ کے رویہ میں مثبت تبدیلی ہونی چاہیے تاکہ ان کے اندیشے دور ہوں اور وہ قوم کے خاص دھارے میں شریک ہوسکیں۔ انتہا پسند عناصر کی گرفت توڑی جائے، سرکاری ملازمتوں میں

اقلیتوں کو جگہ دلائی جائے، اکثریتی فرقوں کے کنٹرول کی صنعتوں کو آمادہ کیا جائے کہ وہ اقلیتوں کو اپنے کارخانوں میں جگہ دیں، اقلیتوں کے خلاف کسی قسم کی تفریق برتی جائے تو اس پر سخت کارروائی ہو، قومی دھارے پر مہر و محبت کی یہ چاندنی جو چھٹکتی نظر آرہی ہے، وہ ملک کے تابناک مستقبل کے لیے نوید مسرت ہے، مگر تجویزوں سے زیادہ عمل کی ضرورت ہے۔ ع

چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

(معارف، دسمبر ۱۹۷۶ء)

اردو اکیڈمی اور اردو کو علاقائی زبان بنانے کا مطالبہ

گذشتہ ماہ اتر پردیش کی اردو اکاڈمی کے سالانہ جلسہ کے خطبۂ صدارت میں بیگم حامدہ حبیب اللہ نے حکومت سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ اگر اتر پردیش میں اردو کو علاقائی اور سرکاری زبان کو تسلیم کرنے کے فیصلہ میں وقت درکار ہو تو فوری طور پر کم از کم آٹھویں درجہ تک اردو کی تعلیم سکنڈ فارم کی حیثیت سے ضروری قرار دی جائے۔ یہ مطالبہ ایسا نہیں ہے جو قابل قبول نہ ہو، البتہ اس میں حکومت کی فراخ دلی اور رواداری کے ساتھ ع

گلستاں میں نسیم دل شکن کی آزمائش ہے

بیگم حامدہ حبیب اللہ اپنی صدارت کے فرائض بہت ہی جمہوری انداز میں انجام دیتی ہیں۔ جلسہ کی کارروائی میں مفید مشوروں کو بڑی خندہ پیشانی سے قبول کرتی ہیں۔ مباحثہ کی فضا کبھی مکدر ہو جاتی ہے تو وہ اپنے تکدر کا اظہار بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ کرتی ہیں۔ انہوں نے اپنے خطبہ میں اس کا اعتراف کیا کہ نادانستگی میں اکاڈمی سے غلطی سرزد ہو سکتی ہے، مگر ان کی خواہش ہے کہ اس کی طرف توجہ نیک نیتی سے مبذول کرائی جائے تاکہ اس کا ازالہ ہو، ورنہ ان کا خیال ہے کہ صرف مخالفت کے جذبے میں اعتراضات کی بوچھار سے اردو کا بھلا نہ ہوگا۔

ان کی ہم نوائی جناب آنند نرائن ملا بھی کرتے ہیں، جو اکاڈمی کی مجلس انتظامیہ کے صدر ہیں۔ اردو زبان نے ہندوستان کی جس ملی جلی تہذیب کو سنوارا ہے۔ وہ اس کی پوری نمایندگی کرتے ہیں۔ وہ اردو زبان کو اپنی شیریں بنا کر اس کے فرہاد بنے ہوئے ہیں، گو ابھی تک ان کو وہ تیشہ ہاتھ نہیں

آیا ہے، جس سے وہ اپنی شیریں کے لیے جوئے شیر جاری کرسکیں۔ اکاڈمی کے جلسہ کے بعض ارکان جب کبھی اعتراضات کی بوچھار کرتے ہیں تو ان کے جواب میں ان کی بردباری اور شرافت اخلاق کے آبدار موتی جھلملاتے نظر آتے ہیں۔ وہ ایک لائق جج بھی رہ چکے ہیں۔ اس لیے ان کی سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ ''اردو کی فلاح و بہبود کی ساری سرگرمیاں بے سود ہیں، جب تک کہ ریاست میں اس کو سرکاری اور علاقائی زبان ہونے کا حق نہیں مل جاتا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے''۔

اگر اس کو یہ قانونی حق مل جائے تو اس کی اقتصادی قدریں بھی بڑھ جائیں گی، جب تک طلبہ کو اس کا احساس نہ ہوگا کہ اس کی تعلیم سے ان کی معاشی حالت بھی درست ہوسکتی ہے، وہ اس کو پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ ایسے طلبہ کی تعداد بہت تھوڑی ہوا کرے گی، جو اس کو ایک مادری زبان کی حیثیت سے اپنے سینہ سے لگائے رکھنا پسند کریں گے۔ آنند نرائن ملا صاحب کا یہ بھی خیال ہے کہ اردو زبان کا پانی پت اتر پردیش ہے، یعنی اس ریاست میں اردو کی جنگ جیتی اور ہاری بھی جاسکتی ہے۔ یہ جنگ لڑنے کے بجائے اکاڈمی کی سرگرمیاں احتساب اور محاسبہ کے دور سے گذر رہی ہیں۔

اس کے سکریٹری جناب صباح الدین عمر صاحب کو ان کی محنت اور تندہی کی داد ضرور ملتی ہے، مگر اکاڈمی کے جنرل کاؤنسل کے جلسہ میں ان کی نگاہیں ارکان کو دیکھ کر زبان حال سے کہتی رہتی ہیں کہ ان کے لیے دو ہی گھڑیاں سخت گزرتی ہیں ع

اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

ان سے جو بعض سوالات کیے جاتے ہیں۔ ان کے صحیح ہونے میں تو ان کو بھی شک نہیں ہوتا مگر کچھ اعتراضات کے انداز تخاطب اور شیوۂ تکلم میں ایسے بھی لمحات آجاتے ہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے یہ خیال جاتا رہتا ہے کہ یہ اکاڈمی کے چیدہ دل و دماغ کا بہت ہی شائستہ مجمع ہے۔

اکاڈمی اپنی مختلف سرگرمیوں میں پہلے سے بہت زیادہ ترقی کرگئی ہے۔ اس کا سالانہ بجٹ سترہ لاکھ تک پہنچ چکا ہے، مگر جب تک اردو کو اس ریاست میں سرکاری زبان کا درجہ نہیں ملتا، یہ سترہ لاکھ کا سالانہ بجٹ اردو کا ایک اچھا خوں بہا ہے۔ دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، برج نرائن چکبست اور پریم چند کی زبان کے لیے جب دار و رسن کا سامان ہوچکا، سرسید، شبلی، شرر اور مہدی افادی کے اسلوب بیان کی سادگی، رعنائی اور دلآویزی کی تدفین کی تیاری ہوچکی، حسرت نے پرچھائیوں کو جو آب و رنگ

دیا تھا، جگر کی شاعری میں عشق کی بندگی اور بے چارگی حسن کی تمام جابرانہ استبدادیت پر طنز کے ساتھ جو مسکراتی نظر آتی تھی، فانی نے غم کی روح پگھلا کر اس سے آگ کا کام لینے والی جو تاثیر پیدا کی تھی، ان سب کو بھلا دینے کی مہم پوری ہو چکی، تو اردو کو صرف کفن پہنانے کی ضرورت تھی۔ حکومت نے اس کو ناتواں پا کر اس کو ہلکا کفن پہنانے میں اپنے آنچل کا سایہ اردو اکاڈمی کی صورت میں دے دیا، جو آرزو، ناسخ کو اپنے معشوق کے ذریعہ سے پوری نہیں ہوئی تھی، وہ ان کی اضطراب زدہ، جفا دیدہ اور اجل رسیدہ زبان اردو کے ذریعہ سے پوری ہوتی نظر آئی، ناسخ نے اسی سرزمین میں اردوئے معلیٰ کو اردوئے مطلا بنا کر ایک مرمریں محل میں بٹھا دیا تھا، مگر وہ آج وہیں غریب الوطن ہے، اس کو کہیں گھنی چھاؤں نہیں مل رہی ہے۔

اگر حکومت اردو اکاڈمی کو اپنی امداد بند کر دے، اس کی طرف سے مصنفوں کو انعامات بھی نہ ملیں، طلبہ و طالبات اس کے وظائف سے بھی محروم ہو جائیں، نادار بیمار مصنفوں کو علاج کے لیے مالی سہولتیں بھی نہ دی جائیں۔ اکاڈمی کے لیے عمارت بھی نہ بنے تو اردو بولنے والوں کو کوئی شکایت نہ ہوگی، بشرطیکہ اردو ریاست کی ایک سرکاری اور علاقائی زبان تسلیم کر لی جائے، مگر حکومت اردو کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہے، وہ اس کو سرکاری زبان کا درجہ دینے کے لیے آمادہ نہیں۔ یہ شاید اس لیے بھی کہ اردو بولنے والوں میں اس کو آمادہ کرنے کا دم خم بھی نہیں۔ اس کے بعد اردو اکاڈمی کی حیثیت بس یہ ہے کہ

نشانی ہم نے رکھ چھوڑی ہے اک اگلی بہاراں کی ‏ ‏ ‏ بہار آئی گلے میں ڈال لی دھجی گریباں کی

جب اپنی بے بسی اور مجبوری میں گریباں کی دھجی ہی غنیمت ہے تو ہوش مندی سے اکاڈمی کو فعال اور متحرک بنانے ہی میں مصلحت ہے، جو شاید یہ کہہ کر حکومت پر اثر انداز ہو کہ ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا، بدلے ہوئے حالات میں حکومت میں فراخ دلی اور اپنے شہریوں کی دل نوازی اور دل جوئی کا جو جذبہ پیدا ہو رہا ہے، اس بنا پر کیا عجب ہے کہ اردو بولنے والوں کو وہ قانونی حق مل جائے، جو وہ اپنی کوتاہیوں اور مجبوریوں سے خود نہیں منوا سکتے۔

ان سطروں کے لکھتے وقت خبر ملی کہ بہار میں اردو زبان وہاں علاقائی اور سرکاری زبان تسلیم کر لی گئی، جہاں اس کے بولنے والے پندرہ فی صدی ہیں، بہار کی اس سبقت سے آتش، انیس، دبیر،

اکبرالہ آبادی اور ڈاکٹر ذاکرحسین کے ہم وطنوں کو یہ پیام ملا ہے کہ وہ اپنی گراں خوابی کو چھوڑ کر اپنی جگرتابی کا ثبوت دیں، ورنہ ان پر یہ الزام رہے گا ع

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے

(معارف، مئی ۱۹۷۷ء)

پیام انسانیت کا کل ہند کنونشن

گذشتہ مہینہ لکھنؤ میں حلقۂ پیام انسانیت کا ایک کل ہند کنونشن ہوا۔اس کے بانی اور روح رواں ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا ابوالحسن علی ندوی ہیں، جو اپنے انسانی اخلاق کی بلندی، کردار کی پاکیزگی اور محبوب شخصیت کی دل آویزی سے قرون اولیٰ کے بزرگوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

وہ اب سے تین سال پہلے ملک کی بگڑتی ہوئی صورت اور انسانی اور اخلاقی قدروں کی پامالی سے بہت دلگیر ہوئے تھے تو انہوں نے حلقۂ پیام انسانیت قائم کیا تھا، جس کے ذریعہ سے ہندوستان کے شہریوں اور خصوصاً مسلمانوں کو للکار کر ان کو انسانیت اور اخلاق کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی کوشش کی، ممکن ہے کہ ان کی آواز آزاد ہندوستان کے عام شہریوں تک نہ پہنچی ہو، لیکن مسلمانوں کو ان کے پیام کو لازمی طور پر اپنانا ہے۔اس برصغیر میں بنگلہ دیش اور پاکستان کے مسلمان تو اپنے سارے مسائل اپنی حکومتوں کے ذریعہ سے طے کرسکتے ہیں، مگر ہندوستان کے مسلمانوں کو اب سلاطین دہلی یا مغل بادشاہوں کی طرح یہاں کی حکومت حاصل نہیں ہوسکتی ہے، جو مسلمان قومی دھارے کا ساتھ دیتے رہیں گے، ان کو بڑے سے بڑا عہدہ بھی ملتا رہے گا یا مختلف ریاستوں میں ان کو وزارت میں کچھ حصہ بھی دیا جاتا رہے گا، مگر ان افراد کے معزز عہدوں سے مسلمانوں کی اجتماعی مشکلات دور نہیں ہوسکتی ہیں پھر سوال یہ ہے کہ وہ کریں تو کیا کریں۔ان کو کوئی الہ دین کا چراغ بھی نہیں مل سکتا، جس سے وہ اپنے مذہبی، سیاسی، عمرانی اور معاشرتی مسائل کو حل کرتے رہیں۔

مگر الہ دین کے چراغ سے بڑھ کر ان کے اخلاق، کردار اور سیرت کا چراغ ہے بشرطیکہ وہ خود اس کو روشن رکھیں، وہ اچھے انسان بن کر اپنی ہر قسم کی مشکلات کو دور کرسکتے ہیں اور اس ملک کے قومی دھارے پر بھی اجتماعی طور سے اثر انداز ہوسکتے ہیں، اگر وہ سچے مسلمان بن جائیں تو اچھے انسان خود بخود بن جائیں گے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب بیت المقدس فتح ہوا تو اس کے فاتح

حضرت ابوعبیدہؓ نے ان کو وہاں آنے کی دعوت دی، جب وہ وہاں داخل ہو رہے تھے تو ان کے معمولی لباس اور بے سروسامانی کو دیکھ کر مسلمان شرمائے کہ عیسائی ہنسیں گے۔اس لیے انہوں نے اپنے امیر المومنین کو ترکی گھوڑے اور قیمتی پوشاک لا کر دی۔ان کو دیکھ کر حضرت عمرؓ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو عزت دی ہے، وہ اسلام کی عزت ہے۔ہمارے لیے یہی بس ہے حضرت عمرؓ کے خیال میں مسلمان ہونا بیت المقدس کے غیر مسلموں کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھا، ہندوستان کے مسلمان سوچیں کہ کیا وہ ایسے مسلمان ہیں جو یہاں کے غیر مسلموں کو متاثر کر سکتے ہیں۔ ع

تم سب ہی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

انسانیت کو سنوارنے کے لیے ایمان، تزکیہ نفس، زہد، تقویٰ، عفت، دیانتداری، حیا، رحم، عدل، عہد کے پابندی، عفو، درگذر، حلم تواضع، خوش کلامی، ایثار، اعتدال پسندی، خودداری، شجاعت، استقامت، حق گوئی اور استغناء وغیرہ جیسے اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے۔ان سب کی تعلیمات ہمارے رسول اکرمؐ نے دیں، اور خود بھی ان پر عمل کر دکھایا، آپ کا ارشاد ہے کہ میں مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں، آپ نے اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دی کہ سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں، قیامت کی ترازو میں حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی اور چیز نہ ہوگی، لوگوں کو قدرت الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئی ہیں، ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں، ہندوستانی مسلمان اپنا محاسبہ کریں کہ وہ قدرت کے اس بہترین عطیہ کے حصہ دار کس حد تک ہیں، آج سے پون صدی پہلے مسلمانوں کے متعلق شاعر اسلام نے جو یہ کہا تھا

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

کیا یہ اب بھی ان پر اطلاق نہیں ہوتا ہے؟

مسلمان سوچیں کہ ان کی اجتماعی زندگی کی نشاۃ الثانیہ کا ذریعہ وہی اخلاق بن سکتا ہے جس کی تعلیم ان کے مذہب نے دی ہے یا کسی سیاسی مفکر کا نظریہ ان کو حیات نو دے سکتا ہے؟ یہ دور مذہب سے بیزاری کا ہے، اس کی فرسودگی، عدم رواداری، انسانوں کے درمیان افتراق انگیزی اور جنگ میں اس کی خون آشامی سے متعلق اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اس کے خلاف ذہن بری طرح مسموم ہو چکا ہے، مگر اسی دور میں ہیروشیما اور ویٹ نام میں انسانیت کے خون سے جو ہولی کھیلی گئی ہے، وہ

مذہب کی تاریخ میں نہیں پڑھی جاسکتی ہے، فرنگی مدنیت کی مے خواری، فحاشی، عریانی اور نظری و فکری عیاشی کے جب تمام تجربات ختم ہو چکے ہوں گے تو پھر روحانی سکون کی تلاش ہوگی جو مذہب ہی کے ذریعہ سے ملے گا، مذہب کی بیزاری کا امام روس سمجھا جاتا ہے، مگر وہ بھی اب مذہبی اجتماعات کرانے کی فکر میں رہنے لگا ہے۔

ہندوستان کی سیکولرزم کا خوش آیند پہلو یہ ہے کہ یہاں ہر مذہب کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا گیا ہے، جبلی طور پر ہندوستان کا مزاج بھی مذہبی واقع ہوا ہے، جدید نظر و فکر سے وقتی طور پر اس کا مذہبی شعور دب جاتا ہے، مگر پھر ابھر آتا ہے۔ ہندوستان کی سیاست میں گاندھی جی کی مہاتمائیت کا پلڑا ہمیشہ بھاری رہے گا، جنگ آزادی میں ان کی مذہبیت کے نیچے تمام نیتاؤں کی نظری اور فکری موشگافیاں دب کر رہ گئی تھیں، مولانا محمد علیؒ پر الزام تھا کہ ان پر مذہب کا جنون طاری رہا مگر انہوں نے لندن کی گول میز کانفرنس میں اپنی مشہور تقریر میں یہ کہا تھا کہ ہم ہندوستان میں ریاست ہائے متحدہ کے بجائے مذاہب متحدہ کے مالک ہوں گے، جو ایک دوسرے سے بالکل مشابہ تو نہیں لیکن ان کی نیرنگی میں یک رنگی ہوگئی، ہم اپنی آپ عزت کر کے دوسروں کی عزت کریں گے، انفرادی حیثیت سے مختلف ہوں گے لیکن اس میں اس طرح ملے ہوں گے، جس طرح محبت کرنے والے ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔ یہ کوہ سینا کا کوئی وعظ نہیں بلکہ رسول عربیؐ کی آواز بازگشت ہے، آپ کا ارشاد ہے کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، اس کے نزدیک سب پسندیدہ لوگ ہیں جو اس کے کنبہ کے ساتھ نیکی کریں۔

اگر ہندوستان کے مسلمان یہ ثابت کردکھائیں کہ رحمت للعالمینؐ نے انسانی اخوت کا جو درس دیا ہے اس کے وہ عملی نمونے ہیں تو ان کے ہاتھ میں الہ دین کا چراغ آجائے گا، جس کے بعد دنیا ان کے پیچھے دوڑے گی، وہ دنیا کے پیچھے دوڑتے نظر نہ آئیں گے ع تو مسلمان ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

اگر مسلمانوں کا یہ طرز فکر ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کے حلقۂ پیام انسانیت کو ایک سیاسی پارٹی تو نہیں بلکہ ایک نئی اور نامانوس صدا لگانے والوں کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم بنانے میں کامیاب نہ ہوں۔ (معارف، جون ۱۹۷۷ء)

اردو اور جنتا حکومت

ہمارے وزیر اعظم جناب مرار جی ڈیسائی کو اس وقت بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ وہ نہ

صرف اپنی سیاسی جماعت کے قابل قدر رہنما ہیں بلکہ عالم لوگوں میں بھی مقبول ہیں، جن کے دلوں کی تسخیر کے لیے بار بار کہہ رہے ہیں کہ اس ملک کی جمہوریت کی بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس کا ہر شہری نڈر ہوکر اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہے۔

اس سے اردو بولنے والوں کو بھی نڈر ہوکر کچھ بولنے کا موقع مل گیا ہے۔ ہمارے دستور میں ہر زبان کو ترقی کرنے کا آئینی حق دیا گیا ہے مگر ۴۷ء کے بعد سے اس ملک خصوصاً یوپی اور بہار میں بادشاہوں کو تاج و افسر اور حسینوں کو زیور پہنانے والی اردو ایک مظلوم، مقہور اور مفلوج زبان کی حیثیت سے دن کاٹ رہی ہے، اس کی ساری شاندار اور باوقار تاریخ نظر انداز کر دی گئی ہے۔ اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ ہندو مسلم کے میل ملاپ کے ایک مخصوص ماحول کی پیداوار نہیں ہے اور اس کا اصلی وطن برج کا سبزہ زار نہیں ہے۔ اس نے عربی، فارسی، پراکرت، ہندی اور انگریزی ادب کا رس نچوڑ کر اسلوب بیان کو ایک نیا رنگ اور نیا ڈھنگ دیا ہے۔ اس کے لیے لطافت و حلاوت آنکھیں بچھاتی ہیں، اس کے قدموں میں برجستگی اور بے تکلفی لوٹتی ہیں، اس کو خود یہاں کی ملی جلی تہذیب نے سنوارا ہے تو اس نے بھی یہاں کی تہذیب کو نکھار کر اس میں بانکپن پیدا کیا ہے۔ یہ عالم گیر تہذیب و تمدن کی دولت سے بھی مالا مال ہے، مختلف مذاہب کے لوگوں نے بڑھ کر اس کے گلے میں مرصع ہار بھی پہنایا ہے۔

اس کی آواز واشنگٹن، ماسکو، تاشقند، لندن، بغداد، ٹوکیو اور انقرہ وغیرہ کی ریڈیائی لہروں میں بھی سنائی دیتی ہے۔ یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں بھی اس کی اعلیٰ تعلیم کے لیے شعبے بھی کھولے گئے ہیں، خود ہماری مرکزی اور ریاستی حکومتیں اس کے مصنفوں اور شاعروں کو گراں قدر انعامات دے کر نوازتی بھی رہتی ہیں۔ پڑوسی ملک پاکستان سے جب جب لڑائیاں ہوئیں تو اسی کا سہارا لے کر وہاں کے لوگوں سے اعصابی جنگ بھی کی گئی، آزادی سے پہلے تو یہ فخر کے ساتھ کہہ سکتی تھی　ع

جہاں جایئے گا، ہمیں پایئے گا

اس کی تاریخی، تہذیبی، لسانی اور افادی اہمیت کے باوجود اب اس کو نہ صرف آئینی مراعات بلکہ زندہ رہنے کے حق سے بھی محروم کیا جا رہا ہے، گذشتہ تیس برس تک ہماری حکومت نے اس کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلنے میں بڑی مہارت دکھائی　ع

تسلیاں مجھے دے دے کے بے قرار کیا

اسی بے قراری کے دور میں ملک کی جنتا گذشتہ حکومت کی زیادتیوں کے خلاف کھڑی ہوئی تو اردو بولنے والے بھی اس کے ہراول، چپاول یمین و یسار میں پیش پیش رہے، جب جنتا کے بقول یہ جابر حکومت ختم ہوئی تو اردو بولنے والے بھی اس کے ساتھ شادیانے بجانے میں مشغول تھے۔ان کو قوی امید تھی کہ اردو کو جو حق گذشتہ تیس سال کے اندر نہیں ملا تھا، وہ جنتا کی فراخ دل، روادار اور ہر دل عزیز حکومت میں ضرور مل جائے گا، مگر یکا یک مرکزی حکومت کے وزیر داخلہ اور پھر وزیر اعظم نے بھی اردو کے لیے ماتمی بگل بجا کر یہ اعلان کیا کہ اردو عوام کی اکثریت پر مسلط نہیں کی جا سکتی۔اس کو سن کر اردو بولنے والے کلیجہ تھام کر رہ گئے کہ ع

اک اجڑا ہوا دل ہے کہ نہ پھولا نہ پھلا اور سوکھا ہی کیا

یوپی اور بہار میں یہ زبان علاقائی قرار نہیں دی گئی، تو اس کو زندہ رکھنے کے لیے کوئی زہر مہرہ کام نہیں دے سکتا، کسی اقلیت سے اس کی مادری زبان چھیننے کے معنی اس کی نسل کشی ہے، جو ملک کے آئین کے سراسر خلاف ہے، مگر جب کوئی اقلیت سیاسی کھلونے اور جھنجھنے سے بہلائی جا سکتی ہے اور وہ چھوٹے بڑے عہدے لے کر مطمئن ہو سکتی ہے یا اس کا کوئی خوش باش، خوش پوش اور خوش گو سیاست داں تھوڑی سی رعایتیں پا کر اس کے سارے اجتماعی مفاد کو پس پشت ڈال سکتا ہے تو ایک طاقتور اکثریت کو پورا حق ہے کہ اقلیت کی نہ صرف لسانی بلکہ تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی وراثت کو رفتہ رفتہ ختم کر کے اس کے وجود کو غیر موثر بلکہ ناکارہ بنا دے۔

آج سے تقریباً ۳۵ سال پہلے جب اس ملک میں زبان کا جھگڑا شروع ہوا تھا تو بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے اردو کے مخالفوں کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ وہ جو چاہیں کریں، مگر اردو بولنے والے بھی کچھ ایسے ہیٹے نہیں، مگر اب یہی اردو بولنے والے ہیٹے ہو چکے ہیں، وہ کسی جلسہ میں سینہ کوبی یا تفریحی مجلسوں میں گلہ مندی یا اپنی کوتاہی کی کوئی نہ کوئی تاویل کرنے ہی میں اپنے پورے فرض کی ادائیگی سمجھتے ہیں، گورمکھی بولنے والے بھی اقلیت میں ہیں، مگر انھوں نے اپنے حق کی بھیک نہیں مانگی ہے، بلکہ اپنا حق حاصل کیا ہے۔ان کے اکالی دل پر فرقہ واریت کا الزام آتا رہا، مگر انھوں نے اسی تنظیم کے ذریعہ سے اس کا عملی ثبوت دیا کہ زندگی کی بزم میں کوتاہ دستی ہی سے محرومی حاصل ہوتی رہتی ہے۔مینا اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو بڑھ کر خود اس کو اٹھا لیتا ہے۔

ہماری حکومت اس سے بے خبر نہیں کہ زبان کا معاملہ بہت ہی جذباتی ہوتا ہے۔لسانی مسئلہ ہی پر مشرقی پاکستان مشتعل ہو کر بنگلہ دیش بن گیا۔آسامی اور بنگلہ دیش کے اختلاف پر کئی بار سخت خوں ریزی ہو چکی ہے۔جنوبی ہند شمالی ہند کی لسانی سامراجیت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں،ملک کی مختلف زبانیں یکجہتی کے نام پر کسی ایک رسم الخط کو بھی اپنانے کے لیے آمادہ نہیں،کیا ہماری حکومت کو اس کا احساس نہیں کہ اردو بولنے والوں میں بھی ان کے جذبات کی پامالی پر ناخوش گوار ردعمل ہو سکتا ہے یا وہ سمجھ چکی ہے کہ یہ غیرت وحمیت سے خالی ہو کر بے کفن کی ایک میت ہے،جس کو ان کے شاندار ماضی کے مقبرہ کے اندر دفن کرنے کی دیر ہے۔ہماری موجودہ حکومت کے سامنے یہ تاریخی فیصلہ ہے کہ گذشتہ حکومت نے دل شکنی،دل آزاری اور دل خراشی کرکے اپنے سارے شاندار اور زریں کارنامے پر پانی پھیر دیا۔بدلے ہوئے حالات میں کیا دل جوئی،دل نوازی اور دل آرائی کے مستحق صرف وہی لوگ ہیں جو اردو نہیں بولتے ہیں اور کیا اردو بولنے والے اس ملک میں یہ سمجھ کر اپنی زندگی گزاریں کہ ع

دل پر داغ ہی اپنا چمن ہے

(معارف،جولائی ۱۹۷۷ء)

اردو رسم الخط

ہماری مرکزی حکومت کے ایک بہت ہی بااثر وزیر نے اردو کو ناگری رسم خط میں لکھنے کا مشورہ دیا ہے جس کے بعد ان کا خیال ہے کہ اردو کا مستقبل محفوظ ہو جائے گا۔اس سے پہلے بھی یہ آواز سنی گئی تھی،مگر وہ قابل اعتنا نہیں سمجھی گئی۔اب پھر دہرائی جارہی ہے۔

کسی سیاسی رہنما کا مشورہ سیاسی مصلحتوں سے خالی نہیں ہوتا ہے۔زبان وادب کا معاملہ بھی سیاست کی نذر ہو رہا ہے۔یہ مہم برابر جاری ہے کہ قومی دھارے کی یکسانیت کی خاطر ایک زبان کا ہونا ضروری ہے،ہندی زبان کا رواج ابھی پورے ملک میں قائم نہیں ہو رہا ہے،بعض علاقوں میں اس کی مخالفت بھی ہو رہی ہے۔اس کے حامی اب ناگری رسم خط کا سہارا لینا چاہتے ہیں اور یہ کہہ کر اس کے دائرہ کو وسیع کرنے کی کوشش میں ہیں کہ رسم خط مشترک ہو گیا تو ملک کے لسانی جھگڑے آسانی سے طے ہو جائیں گے۔یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اگر دنیا کے تمام لوگ ایک

ہی قسم کا لباس پہننا شروع کردیں تو سارے عالمی اختلافات ختم ہوجائیں گے۔ یورپ میں رسم خط اورلباس دونوں یکساں ہیں، مگر وہاں ہر قسم کی باہمی آویزش جاری ہے، جس کی انتہا دو عالم گیر لڑائیوں میں دیکھی جا چکی ہے۔

اردو ناگری لیپی میں لکھنی شروع ہوجائے گی تو اردو پڑھنے والوں کی آیندہ نسلوں کے لیے اس کے گذشتہ لٹریچر کو دریا برد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا، کیونکہ اگر ہماری مرکزی حکومت کا کل سالانہ بجٹ اس کو ناگری رسم خط میں منتقل کرنے میں خرچ کردیا جائے گا تو بھی یہ ممکن نہ ہوسکے گا۔ اس طرح ناگری رسم خط کی خاطر اردو زبان کو اپنی ساری تہذیبی علمی اور ادبی وراثت سے منھ موڑنا ہوگا، علم ادب اور تہذیب کا بہت بڑا سرمایہ عربی اور فارسی کتابوں میں بھی ہے جو اردو رسم خط کے ذریعہ سے پڑھ لی جاتی ہیں۔ وہ کیا ہوں گی، کس میوزیم میں رکھی جائیں گی؟

ناگری رسم خط میں اردو کو لکھنے کی تلقین کرنے والے اردو زبان کے مزاج، اس کے حروف تہجی کی صورت، اس کے اعراب کی امتیازی خصوصیات، اس کے ساکن اور متحرک آواز کے طرز ادا، اس کے تلفظ کے حسن سے واقف نہیں، وہ اس کے الف ممدودہ، الف مقصورہ اور الف تنوین، تائے دراز، تائے مدور، تائے موقوفہ، واو معروف، واو مجہول، واو عطف، واو معدولہ، ہائے ملفوظ، ہائے مخلوط، ہائے مختفی، ہائے معروف، ہائے مجہول اور ہمزہ وغیرہ کی اہمیت کو کچھ نہیں سمجھتے، اگر سمجھتے تو پھر اردو کو ناگری رسم خط میں لکھنے کی نصیحت نہ کرتے۔ وہ بتائیں کہ ناگری میں اردو کے صحیح املا اور ہیئت کے ساتھ اعلیٰ، ادنی، دعویٰ، عیسیٰ، موسیٰ، علیٰ حالہ، یقیناً، حکماً، نسلاً بعد نسلٍ، ذوالنون، ذوالفقار، البشر، کعبہ، شگفتہ، صلوٰۃ، زکوٰۃ، خواجۂ خویش، منبر اور جنبش وغیرہ کو کیسے لکھا جاسکتا ہے۔ وہ ناگری لیپی میں اثر اور عصر، نذر اور نظر، آسی اور عاصی، زہیر اور ظہیر، زفر اور ظفر، حال اور ہال، سمر اور ثمر لکھ کر کوئی فرق پیدا نہیں کرسکتے، وہ غور کریں کہ ژند، پاژند، ژالہ اور ژولیدہ بیانی کو کیسے لکھ سکتے ہیں، پھر کسی زبان کی لطافت اور نزاکت کو قومی دھارے کے ایک بے جا تخیل کی بنا پر قربان کرنا کہاں تک صحیح ہے؟

ہندی میں ث، ذ، ژ، ص، ض، ط، ظ، ع، غ اور ء کے ساتھ کے الفاظ کا صحیح املا لکھا ہی نہیں جاسکتا ہے۔ اردو رسم خط کی خوبی یہ ہے کہ ہندی کیا اس کو عربی، فارسی اور انگریزی حروف تہجی پر بھی برتری حاصل ہے۔ عربی اور فارسی میں ٹ، ڈ اور ڑ نہیں۔ فارسی میں چ، ژ اور گ ہیں تو عربی میں یہ

حروف نہیں، عربی اور فارسی بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، ڈھ اور ڑھ وغیرہ جیسی آوازوں سے بالکل آشنا نہیں۔ انگریزی خ، ط، ض، ع اور ق وغیرہ سے بالکل مانوس نہیں، اردو میں ان تمام زبانوں کے حروف تہجی کی آواز سنائی دے گی۔ اس میں ہر لفظ کا تلفظ پوری صحت کے ساتھ ادا ہو سکتا ہے۔

ایک عرب مرچ کو مرش، چائے کو شائے، آگرہ کو آکرہ بول جائے گا۔ ایک ایرانی اردو کا لفظ ڈال بولنا چاہے گا تو وہ دال کہہ سکے گا۔ انگریز اعظم گڑھ کو اعظم گرہ، علی گڑھ کو علی گرھ، الٰہ آباد کو الہاباڈ، دہلی کو ڈلہی بولتا ہے۔ ہندی بولنے والے ابوالفضل کو ابوالپھجل، عاشق کو آسک، معشوق کو ماسوک، عشق کو اِسک، زلف کو جلپھ، فریاد کو پھریاد اور انصاف کو انساپھ بولنے یا لکھنے میں جھجھک یا غلطی محسوس نہ کریں گے اردو بولنے والے کو ان تمام الفاظ کو صحیح مخرج کے ساتھ ادا کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا۔ ناگری رسم خط میں اضافت کا بھی اہتمام نہیں۔ ہماری شاعری اگر ناگری رسم خط میں اضافت کے بغیر لکھی گئی تو اس کی ساری لطافت جاتی رہے گی۔

اورنگ زیب عالم گیر پر یہ الزام رکھا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کے جذبات کا لحاظ نہیں رکھتا تھا۔ اردو کے رسم خط سے اردو بولنے والوں کو جو جذباتی لگاؤ ہے، اس سے وہ محروم کر دیے گئے تو کیا کوئی مورخ یہ لکھنے کا حق نہیں رکھ سکتا ہے کہ اس دور کے اورنگ زیب نے وہی سب کچھ کیا، جس کے لیے گذشتہ تاریخ کے اورنگ زیب کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے۔ مسلمان حکمرانوں پر یہ بھی الزام ہے کہ وہ بے جا طور پر غیر مسلموں سے جزیہ لیا کرتے تھے، موجودہ دور میں جزیہ لینے اور ادا کرنے کی صورتیں بدلی ہوئی ہیں۔ برسر اقتدار جماعت کی خاطر زبان قربان کر دی جائے، ضمیر کو گروی رکھ دیا جائے، ایمان کو نیلام گھر کے حوالہ کر دیا جائے اور کردار کو دوسروں کے ہاتھوں کھلونا بننے دیا جائے، تو یہی اس دور کا قابل قبول جزیہ ہے، مگر صاف ذہن رکھنے والے محبان وطن کو یہ سوچنا ہے کہ یہ جزیہ لینا اور دینا کہاں تک ملک کے لیے مفید ہے۔ (معارف، مئی ۱۹۷۸ء)

متوقع مسلم یونیورسٹی ایکٹ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے متعلق ایک ایکٹ لوک سبھا میں زیر غور ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی نظر اس کی طرف اٹھی ہوئی ہے کہ یہ منظور ہو کر ان کی امنگوں اور تمناؤں کو کہاں تک پورا کرتا ہے اور حکومت اپنی وطنی رواداری اور سیاسی فراخ دلی کا ثبوت کس طرح دیتی ہے۔

مسلم یونیورسٹی کا کردار خصوصی ہے یا تاریخی یا اقلیتی۔اس پر بحث جاری ہے۔جمہوریت میں الفاظ کی بڑی پرفریب دل آویزی ہوتی ہے،جن سے دلوں کو بہلانے،جذبات سے کھیلنے،قانونی فوائد اٹھانے اور ضرورت کے وقت باہمی آویزش پیدا کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔مسلم یونیورسٹی بھی جمہوریت کی تماشا گاہ بنی ہوئی ہے۔یہ تلقین جاری ہے کہ یہاں فرقہ واریت نہ ہو،یہ قومی دھارے سے الگ تھلگ نہ ہو،سیکولرزم کا نمونہ نہ ہو،مگر جب کسی اسلامی ملک کا کوئی سربراہ یا ممتاز شخص ہندوستان آتا ہے تو اس کو اس کی زیارت کے لیے ضرور بھیجا جاتا ہے،تاکہ وہ دیکھ کر خوش ہو کہ یہاں کی سیکولر حکومت میں یہاں کی اقلیت اپنی تعلیمی،تہذیبی اور دینی روایات کے ساتھ ایک عظیم ادارہ کو کس طرح قائم کیے ہوئے ہے،مگر سیکولرزم کے اس نشان کے ہاتھی کو دکھا کر یہ بھی اعلان ہوتا ہے کہ اس کے اقلیتی کردار کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

اس راج ہٹ کے نتیجہ کا کوئی کبریٰ اور صغریٰ نہیں ہے،کیرالا میں عیسائیوں کی درس گاہوں کا اقلیتی کردار تسلیم کرلیا گیا ہے۔خود یوپی میں مسلمانوں کے بعض کالجوں کی طرح اعظم گڑھ کے شبلی پوسٹ گریجویٹ کالج کو اقلیتی ادارہ مان لیا گیا ہے۔اس کا سارا نظم ونسق مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے،حالانکہ یہاں پڑھنے والے طلبہ کی اکثریت غیر مسلموں کی ہے،مگر مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار محض اس لیے تسلیم نہیں کیا جائے گا کہ حکومت نہیں چاہتی کہ اس کا کردار اقلیتی ہو۔

حکومت کو یہ شبہہ ہے کہ کہیں یہ اپنے اقلیتی کردار کی وجہ سے سیکولرزم کے خلاف ایک زبردست محاذ نہ بن جائے۔اس ملک کے ہر حصہ میں یونیورسٹیاں ہیں،جو یہاں کی اکثریت کے مزاج اور مرضی کے مطابق چل رہی ہیں۔ان کے ذریعہ سے اگر سیکولرزم پنپ نہیں سکتی اور صرف ایک مسلم یونیورسٹی کی وجہ سے سیکولرزم سپرد خاک ہوسکتی ہے،تو اس سے ظاہر ہے کہ سیکولرزم کے عاشقوں کی برات محض شاخ آہو پر ہے۔

مسلم یونیورسٹی ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی سرگرمیوں،آرزوؤں اور تمناؤں کا سومناتھ ہے۔محمود غزنوی نے اپنے فاتحانہ اور سپاہیانہ جوش میں سومناتھ کو مسمار کیا تھا تو وہاں کے پجاری اپنی بے چارگی اور بے بسی میں اس کو مسمار ہوتے دیکھتے رہے،مگر ہندو مورخین محمود غزنوی کی اس غیر روادارانہ بلکہ بقول ان کے اس سفاکانہ حرکت کو آج تک نہیں بھولے ہیں،موجودہ دور حکومت

کے محمود غزنوی مسلمانوں کے سومناتھ کو برباد کردیں اور اس کے پجاری اپنی بے چارگی اور بے بسی میں اس کی غارت گری کو دیکھتے رہ جائیں۔تو کیا مسلم مورخین اس غیر روادارانہ حرکت کو بھول جائیں گے یا اس کو اپنی تاریخ کے صفحات پر اسی طرح تازہ رکھیں گے،جس طرح غیر مسلم مورخین گجرات کے سومناتھ کی بربادی کو تازہ رکھے ہوئے ہیں۔

حکومت اگر واقعی سیکولرزم کی کامیابی کی خواہاں ہے تو مسلم یونیورسٹی کو اپنی رواداری اور فراخ دلی کی تجربہ گاہ بنائے،تاکہ یہاں اس ملک کی سب سے بڑی اقلیت کے جذبات واحساسات کی نشوونما اس کی مرضی کے مطابق ہوتی رہے۔ یہاں اقلیت کے زیادہ سے زیادہ طلبہ جمع ہوکر اچھے سائنس داں،اچھے ڈاکٹر،اچھے انجینئر،اچھے اہل قلم،اچھے ماہر تعلیم اور اچھے صاحب دماغ پیدا ہوتے رہے تو کیا وہ ملک کی سیکولرزم کے لیے مفید ثابت نہ ہوں گے؟اور اگر اقلیت کے طلبہ حصول تعلیم کی آسانیوں سے محروم ہوکر بددل،غیر مطمئن،حکومت سے بدظن اور مشکوک رہے تو کیا وہ ملک کے سیاسی،اقتصادی اور معاشرتی ڈھانچے کے لیے بار نہ ہوں گے؟ اقلیت کو اکثریت کا اعتماد حاصل کرنا ضروری ہے تو اکثریت کو اقلیت کو مطمئن رکھنا بھی کم ضروری نہیں۔

رہا یہ شبہہ کہ اقلیتی کردار کے تسلیم کر لینے سے مسلم یونیورسٹی فرقہ واریت کا مرکز بن جائے گی،جس سے سیکولرزم اور قومی دھارے کو نقصان پہنچے گا تو یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ دلوں کی تسخیر راج ہٹ کے ذریعہ سے نہیں ہوتی۔اکبر کے دین الٰہی اور سیاسی حکمت عملی میں بظاہر بڑی رواداری اور سیکولرزم تھی،مگر وہ اپنی راج ہٹ کے تمام ذرائع استعمال کرنے کے باوجود ملک کو اپنی مرضی کے مطابق نہ بنا سکا،بلکہ مسلمانوں میں تو وہ غیر مقبول رہا،اورنگ زیب پر یہ الزام ہے کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کو تو خوش کرسکا،لیکن غیر مسلموں کو اپنے سے برگشتہ رکھا،مگر شیر شاہ سوری اور کشمیر کے زین العابدین ہندوستان کے وہ مثالی حکمراں ہیں جن پر ملک کے ہر طبقے کو اعتماد رہا۔وہ کسی جبر واستبداد،دباؤ اور راج ہٹ کے بغیر یہاں کے لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے رہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ ہماری موجودہ اور آیندہ حکومت اکبر یا اورنگ زیب کی روش پر چلتی ہے یا شیر شاہ سوری اور زین العابدین کی روایت کو اختیار کرنا پسند کرتی ہے۔اس کا فیصلہ خود اصحاب حکومت نہیں بلکہ آیندہ کے مورخین ہی کریں گے۔(معارف،جون ۱۹۷۸ء)

نیشنل بک فاؤنڈیشن پاکستان اور دارالمصنّفین کی کتابوں کی طباعت کا معاہدہ

معارف کے ناظرین کو یاد ہوگا کہ دارالمصنّفین اور حکومت پاکستان میں اس ادارہ کی مطبوعات کے حق طباعت واشاعت کا ایک معاہدہ ۱۹۷۶ء میں ہوا تھا۔ وہاں کی وزارت تعلیم نے یہ حق اپنے نشر واشاعت کے ایک ادارہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کے لیے پندرہ لاکھ پاکستانی روپے میں خرید لیا تھا۔ اس کی پہلی قسط ۱۹۷۶ء ہی میں مل گئی تھی۔ اس کی دوسری قسط وہاں کے بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے اکتوبر ۱۹۷۸ء میں ملی۔

اس سلسلہ میں خاکسار کا قیام پاکستان میں ۱۶/ جون سے ۱۲/ اکتوبر ۱۹۷۸ء تک رہا۔ اس دوسری قسط کی منظوری پاکستان کے چیف مارشل لا ایڈ منسٹر جناب جنرل ضیاء الحق نے دی، جس کے لیے ہمارا ادارہ ان کا بہت شکر گذار ہے۔ وہاں کے موجودہ وزیر تعلیم جناب محمد علی صاحب ہوتی کے سابق نواب کے خاندان سے ہیں۔ ان سے ملا تو معلوم ہوا کہ وہ ان دنوں کلام پاک کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ محکمہ تعلیمات کے سکریٹری جناب ڈاکٹر ام۔ اے قاضی صاحب ہیں۔ جو سندھ یونیورسٹی کے بہت ہی مایہ ناز استاذ رہ چکے ہیں۔ ان دونوں حضرات نے اس رقم کی ادائیگی کی کارروائی میں اپنے کریمانہ اخلاق اور علم دوستی کا ثبوت دیا۔ اس محکمہ کے جوائنٹ سکریٹری جناب ڈاکٹر طاہر حسین صاحب نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں دس سال تعلیم پائی ہے۔ انہوں نے ازراہ کرم بقایا رقم کی ادائیگی کی پرزور سفارش کی، اس کے ڈپٹی سکریٹری جناب حسن بھٹو صاحب نے اس کام کو آخری مرحلہ تک اس طرح پہنچایا جیسے یہ ان کا ذاتی کام تھا۔ ان سے ملنے میں خوشی اور لذت محسوس ہوتی تھی، اس کے ڈپٹی فنانسل ایڈوائزر جناب ممتاز احمد برنی صاحب بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے ہیں۔ وہ مجھ سے علی گڑھ کے اولڈ بوائے کی حیثیت سے چھوٹے بھائی ہی کی طرح ملتے جلتے رہے۔ کسی موقع پر بھی دفتری کارروائیوں کی تاخیر سے مجھ کو پریشان ہوتے دیکھنا پسند نہیں کیا۔

محکمہ خزانہ کے جوائنٹ سکریٹری نے بہت ہی عاجلانہ طریقہ سے کاغذات کو آگے بڑھا کر حوصلہ افزائی کی۔ اس کے ڈپٹی سکریٹری جناب محی الحق فاروقی صاحب تو میرے سایہ بن کر ساتھ رہے۔ ان کے مفید مشوروں سے بہت سی دقتیں دور ہوئیں، اس کے سیکشن آفیسر جناب نسیم احمد صاحب

نے تو ہر قسم کی مدد دینے میں سبقت کی، جب ہمارے کاغذات جنرل ضیاء الحق کے سکریٹریٹ میں پہنچے تو وہاں کے جوائنٹ سکریٹری جناب ضیاء الرحمٰن صاحب اور ڈپٹی سکریٹری سید جمال علی نے کارروائی کو آگے بڑھا کر بڑی عنایت کی۔

تمام سرکاری عہدہ دار جس ہمدردی، اخلاق اور محبت سے پیش آئے، اس کی یادیں ذہن میں برابر باقی رہیں گی۔ اسی اثنا میں جناب مولانا ابوالحسن علی ندوی رابطہ اسلامیہ کی طرف سے ہونے والی ایشیائی کانفرنس میں شرکت کے لیے پاکستان تشریف لائے تو وہاں ان کی غیر معمولی محبوبیت اور بے پناہ پذیرائی سے بھی ہر طرح کے فوائد پہنچے۔ انہوں نے اپنی کرم گستری سے جنرل ضیاء الحق اور جناب اے، کے بروہی وزیر قانون وامور مذہبی سے گفتگو فرما کر اس بقایا رقم کی ادائیگی کے لیے زور دیا، کچھ تاخیر ہوئی تو میں نے بھی جناب اے، کے بروہی سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ اپنی علم نوازی اور معارف پروری کی بدولت ایک علم دوست ہی کی طرح ملے۔ میری بہت سی مشکلیں آسان کیں، ان کے بلند اخلاق اور شریفانہ طبیعت کا گہرا اثر دل پر ہے۔ ان کو تصوف اور تاریخ ہند کے مطالعہ کا بھی ذوق ہے۔ میری کتاب بزم صوفیہ کا ذکر آیا تو میں نے ایک نسخہ ان کی خدمت میں پیش کیا۔ دارالمصنّفین واپس آیا تو یہاں کی مطبوعات میں سے ان کے مذاق کی کچھ اور کتابیں ارسال کیں۔

اس کام کو انجام دینے میں جناب افضل چیمہ سے بھی مدد کا خواہاں ہوا۔ وہ لاہور ہائی کورٹ کے جج رہ چکے ہیں۔ اس وقت اسلامی نظریاتی کونسل کے صدر ہیں۔ ان کو پاکیزہ اخلاق کا بہت اچھا نمونہ پایا، جب ان کو میرے قیام کی طویل مدت معلوم ہوئی تو افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ میں یہ کام ان کے ذمے کر دیتا تو وہ خود اس کو انجام دینے میں خوشی محسوس کرتے۔ ان کی اس ہمدردی سے رہین منت ہونا ضروری تھا۔

ماہ جون کی جھلسی ہوئی لُو اور گرمی میں اسلام آباد پہنچا تو سب سے پہلے جناب نبی احمد خاں بلوچ سے ملا جو پہلے سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اور آج کل وزارت تعلیم کے ثقافتی امور کے آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے، دارالمصنّفین کے علمی کارناموں کے بڑے مداح ہیں۔ میری حقیر تصانیف سے بھی ان کی دلچسپی ہے۔ ۱۹۷۶ء میں دارالمصنّفین سے جو معاہدہ ہوا تھا تو اس کے ایک ہیرو وہ بھی ہیں، وہ اس سفر میں بھی ایک شفیق عزیز کی طرح ملے، میری

مشکلیں سن کر اپنے دفتر لے گئے، میری طرف سے ایک درخواست لکھی، ٹائپ کرائی اور خود ایک عرضی گذار بن کر وزارت تعلیم کے سکریٹری کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور جو کچھ مجھ کو کہنا چاہیے تھا، وہ سب کچھ کہہ گئے۔ اس کے بعد خوبی سے اس کام کا انجام پانا یقینی ہوگیا، وہ ہر مرحلہ میں میری دست گیری کرتے رہے۔ ان سے مل کر باتیں کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا کہ قرون اولیٰ میں ایسے ہی اخلاقی اوصاف کے لوگوں کی وجہ سے مسلمانوں کے معاشرہ میں ہر قسم کی ترقی ہوتی رہی ہوگی۔

اس کام میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ بھی میرے لیے فرشتۂ رحمت بنے رہے۔ وہ اپنی من موہنی باتوں سے دل اور دماغ دونوں کی تسخیر کرتے رہے، ان کی ضیافتوں سے محظوظ ہونے کے علاوہ ان کی تواضع، کسر نفسی اور شرافت اخلاق کے بارے جھکا رہا۔ جب کبھی ان سے کسی کام کے لیے کچھ عرض کیا تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ اپنے تمام اخلاق حسنہ کا سونا پگھلا کر ہی دم لیں گے۔ ایسے ہی افراد کے نمونہ سے ایک اچھی قوم کا خمیر تیار ہوا کرتا ہے۔

پروفیسر قدرت اللہ فاطمی اسلام آباد میں ترکی، ایران اور پاکستان کے علاقائی تعاون کے ثقافتی امور کے ڈائریکٹر ہیں۔ ان کے نحیف جسم کے جس حصہ کو کھرچا جائے تو اس میں صرف علم ہی ملے گا۔ ان کا دفتر میرے لیے گوشۂ عافیت بنا ہوا تھا۔ ان کا مرنجاں مرنج علمی گفتگو سے طویل قیام کا تکدر دور ہوتا رہتا، ان کے گھر والوں کے ساتھ بیٹھنے میں اپنے ہی گھر کی لذت ملتی۔ ان کے دفتر کے ٹیلی فون سے میری بہت سی مشکلیں آسان ہوئیں۔ ان کے دست راست جناب امین احمد صاحب نے ہر قسم کی دل جوئی کی۔

اسلام آباد کے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ریسرچ فیلو جناب محمود غازی اور ان کے بھائی محمد غزالی نے اپنے عزیزانہ برتاؤ سے وہاں کے قیام کو خوش گوار بنائے رکھا۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی کے قریبی عزیز ہیں۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی ایڈیٹر فکر و نظر خاندانی طور پر اعظم گڑھ کے ہیں۔ اب پاکستانی ہیں۔ انہوں نے وہ سارے حقوق ادا کیے جن کی توقع ان سے ہوسکتی تھی۔ جناب حسان کلیمی صاحب سعودی عرب کے خاص نامہ نگار ہیں، وہ اپنی سیاسی معلومات سے محظوظ کرنے کے علاوہ کام و دہن کو بھی لذت آشنا کرتے رہے۔ ان کے قہقہوں کی پریم بتیسی برابر یاد آئے گی۔ جناب بشیر احمد صاحب پہلے اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ میں تھے، اب ایسوسی اٹیڈ پریس آف پاکستان

کے سب سے بڑے عہدے دار ہیں۔ ان کے مفید مشوروں سے بڑی مدد ملی۔

نیشنل بک فاؤنڈیشن سے جب معاہدہ ہوا تھا تو اس وقت کے منیجنگ ڈائریکٹر جناب یونس سعید صاحب تھے، جن کی پوری ہمدردی شامل حال رہی۔ وہ شکر گذاری کے جذبہ کے ساتھ برابر یاد آتے رہیں گے، اب ان کی جگہ پر جناب رضی الرحمٰن صاحب ہیں، جو پاکستان کے سول سروس کے بہت ہی لائق کارگذار اور دیانت دار افسر سمجھے جاتے ہیں۔ یہ تحریر لکھ رہا ہوں اور ان کا حسن سلوک یاد آرہا ہے۔ جب معاہدہ کی دوسری قسط کی رقم وزارت تعلیم سے ملی تو انہوں نے اپنے دفتر میں ایک پرتکلف افطار پارٹی دی جس میں بہت سے معززین شریک ہوئے۔ ان سے آخری ملاقات ان کے ایک قریبی عزیز کے ساتھ اسلام آباد کے ایک بہت ہی مشہور ہوٹل ہالی ڈے ان کے ایک ڈنر میں ختم ہوئی۔

معاہدہ کی رقم کی ادائیگی کے سارے مراحل اب ختم ہوگئے۔ اس نیک اور مفید کام میں مخلصانہ ابتداء کرنے کا سہرا جناب سید حسام الدین راشدی کے سر ہے۔ جو پاکستان کے بہت مشہور اہل علم ہونے کے ساتھ دارالمصنّفین کے علمی کارناموں کے بے حد قدرداں ہیں۔ پاکستان کے ناشر دارالمصنّفین کو جو نقصان پہنچا رہے تھے، اس کے خلاف انہوں نے پاکستان کے سارے اخبارات میں ایک مہم چلائی۔ ان کی آواز حکومت پاکستان کے ایوان میں بھی گونجی، اس کام کو انجام تک پہنچانے میں مولانا کوثر نیازی نے پوری دلچسپی لی، جو اس وقت حکومت پاکستان میں مذہبی امور کے وزیر تھے۔ ان ہی کی مساعی جمیلہ سے یہ مسئلہ سرکاری سطح پر پہنچ کر طے ہوا۔ وہ اب وزیر نہیں رہے لیکن احسان شناسی کا جذبہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے ادارہ کے لیے جو حسن خدمت انجام دیا، اس کی یاد یہاں کے لوگوں کے دلوں میں برابر باقی رہے۔ اسی جذبہ سے اسلام آباد میں ان سے ملاقاتیں کیں۔ پہلی دفعہ جب میں ان کے بنگلے پر پہنچا تو دیکھتے ہی ننگے پاؤں اپنے ڈرائنگ روم سے باہر نکلے اور کہنے لگے کہ یہ فقیر وزیر نہیں رہا لیکن علم دوست برابر رہے گا۔ ان کی علم دوستی ضرور یاد آتی رہے گی۔ جب وہ وزیر تھے تو ان کی وزارت کے جوائنٹ سکریٹری جناب زاہد ملک تھے۔ اب وہ اسلام آباد میں نوائے وقت کے ایڈیٹر ہیں۔ انہوں نے بھی معاہدہ کی تکمیل میں ہر طرح کی اعانت کی تھی۔ ان سے ملا تو اپنی دیرینہ محبت کی لپک سے ملے، جس کے لیے ان کا شکر گذار ہوں۔ (معارف، نومبر ۱۹۷۸ء)

مسلم یونیورسٹی۔وعدے اور اندیشے

صد ہزار نمکدان لے کر ہندوستانی مسلمانوں کی جراحتِ دل کی پرسش کرنی ہو تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ذکر چھیڑ دیجیے۔اس کا مسئلہ راج ہٹ کے برف خانے اور قانونی موشگافیوں کے سرد خانے میں عرصہ سے پڑا ہوا ہے۔کہیں ہمیشہ کے لیے نہ پڑا رہ جائے۔

جنتا پارٹی مسلمانوں کے جذباتی جوش وخروش سے بھی برسر اقتدار آئی تھی۔ان کو امید تھی کہ یہ مسلم یونیورسٹی کو وہ سارے دیرینہ حقوق دے دے گی جن سے وہ محروم کردی گئی ہے،مگر اب تک ان کی امیدوں کی شاخِ آہو پر صرف دلآویز وعدوں کی برات ہی سجائی جارہی ہے۔حکومت ان کی کوئی طاقتور تنظیم اور موثر قیادت کے نہ ہونے سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔مگر جب جذبات ابھر کر مشتعل ہوتے ہیں تو تنظیم اور قیادت خود بخود پیدا ہوکر طاقتور اور مؤثر ہوجاتی ہیں،پاکستان کی تحریک جذبات ہی کے سہارے بڑھی اور ایک ہولناک منزل پر آکر رکی۔خود پاکستان کے اندر بنگلہ دیش کے لوگ جذبات سے مغلوب ہوکر خون کی ہولی کھیلنے پر آمادہ ہوگئے،ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف عوام کے جذبات بھڑکے تو ان کی وزارت عظمیٰ کا تخت ان کی پھانسی کا تختہ بن کر رہ گیا۔مسز اندرا گاندھی جذبات میں درگا دیوی بنا کر چاندی میں تولی گئیں تو جذبات کے سنگھاسن سے اتار کر قید خانہ میں بھی بند کی گئیں۔ہماری حکومت سمجھ رہی ہے کہ مسلمان مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں جذبات سے خالی ہیں۔وہ شاید کبھی مشتعل نہ ہوں گے۔ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو،مگر ایسا سمجھنا کوتاہ اندیشی بھی ہے۔

حکومتوں کی ضد سے ملکوں میں کیا کچھ نہیں ہوا ہے۔انگلستان میں بادشاہ جان کے زمانہ کا میگنا کارٹا ہو یا فرانس میں لوئی شانز دہم کے عہد کا خونی انقلاب ہو،چائے کے ایک معمولی ٹیکس پر برطانوی امپائر سے امریکہ کی علاحدگی ہو یا گزشتہ دو عظیم عالمگیر لڑائیوں کی خونریزی ہو،ہٹلر اور مسولینی کے عبرتناک انجام کی داستان ہو یا جرمنی کی غیور قوم کا بٹوارہ ہو،روڈیسیا میں کالے اور گورے کی جنگ ہو یا عربوں اور یہودیوں کے درمیان لامتناہی تصادم کی ہلاکت آفرینی ہو،ان سب میں راج ہٹ ہی کی کارفرمائی ہے۔

خود ہندوستان کے اندر بیسویں صدی کے شروع میں تقسیم بنگال کو منسوخ کرنے کی ضد نہ ہوتی تو اس ملک کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔قانون ساز اسمبلیوں میں چند نشستوں کے نہ دینے کی ہٹ

نہ ہوتی تو ہندو مسلمان کے اختلافات کی خلیج وسیع نہ ہوتی۔کلچر کی تعریف منوانے پر اصرار نہ ہوتا تو دوقومی نظریہ وجود میں نہ آتا۔سر اسٹیفورڈ کرپس کی تجاویز کو رد کرنے پر بے جا دباؤ نہ ڈالا جاتا تو اس برصغیر کی تقسیم نہ ہوتی۔

مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ میں بھی راج ہٹ کی اعصابی جنگ جاری ہے۔اگر اس کی آڑ میں دباؤ ڈال کر یہاں کے مسلمانوں کو چین اور روس کے مسلمانوں کی طرح بنانے کا خیال ہو تو یہ ممکن نہیں ہوسکے گا،کیوں کہ اس سرزمین کے چپہ چپہ پر ان کے مذہبی،روحانی،تاریخی،تہذیبی،تمدنی،ثقافتی اور علمی آثار زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ ان کو یہاں باعزت طریقہ پر رہنے کا حق ہے۔وہ یہاں باہر سے ضرور آئے۔آریائی نسل کے ہندو بھی باہر سے آئے مگر انھوں نے یہاں چھوت چھات پھیلا کر انسانوں میں جو تفریق پیدا کی،وہ اب تک دیکھی جاسکتی ہے۔مسلمان یہاں آئے تو نہ صرف انسانی مساوات کا پیام لائے بلکہ یہاں کی خاک کو اپنی امیدوں کا تجلی کدہ بنا کر تاتاریوں،منگولوں،نادر خانیوں،احمد ابدالیوں اور انگریزوں جیسے بیرونی حملہ آوروں کے خلاف اس کے لیے اپنا خون بھی بہاتے رہے۔اس کی ہر صبح کو جاں نواز اور اس کی شام کو دلنواز دیکھنے میں لذت محسوس کی اور یہ کہہ اٹھے کہ اس کی سرزمین تمام روئے زمین کے لیے زینت ہے۔اسی طرح جیسے نازنین کے رخسار پر تل ہو۔

سوادش شدہ زیب روے زمیں چو خالے بہ رخسار ہر نازنیں

پھر اسی محبت میں یہاں کے اصلی باشندوں سے زیادہ وطن دوست بن کر اپنے فن تعمیر کے شاہکاروں،نئے نئے شہروں،سڑکوں،پلوں،نہروں،باغبانی،چمن آرائی اور فنونِ لطیفہ کے اعلیٰ نمونوں اور روزمرہ زندگی کی زینت و آرائش کے جلووں سے ہندوستان کو جنت نشان بنایا اور یہ راگ الاپا ع کشورِ ہند است بہشت بہ زمیں

ع ہند تو آں گفت کہ خلدست بریں

اس بہشت اور خلد بریں کو ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کا جہنم بنا دیا گیا تو کیا وہ اس کو گوارہ کریں گے؟

ہماری حکومت مشرق وسطیٰ اور افغانستان کے مسلمانوں کے دلوں کی تسخیر کرنے میں لگی ہوئی ہے مگر اپنے یہاں کے مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی رعایتوں کے دینے میں فراخ دلی اور فیاضی

نہیں دکھاتی، حالانکہ یہاں کے مسلمانوں کی تعداد افغانستان کیا بلکہ مشرقِ وسطیٰ کے تمام ملکوں کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے، اگر ان کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو وہ سب سے بڑی اسلامی مملکت کے مالک بن جائیں۔ سیاسی مصلحتوں سے ان کو اس ملک کی اقلیت قرار دے دیا گیا ہے، مگر صحیح معنوں میں وہ اس کی دوسری بڑی اکثریت تسلیم کیے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کو مطمئن رکھنا اسلامی ممالک سے بھی اچھے تعلقات پیدا کرنے کا موثر ذریعہ ہے۔

مسلم یونیورسٹی ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کا ایک صنم کدہ ہے، جس کی صنم تراشی میں وہ خود اس کے آزر بننا چاہتے ہیں۔ یہ ان کے احساسات کا ایک گل کدہ بھی ہے جس کے وہ خود باغباں ہونے کے خواہاں ہیں۔ یہ ان کے خیالات کا ایک میکدہ بھی ہے جس کے ساقی بن کر اس کے شیشہ و ساغر کی گردش اپنے ہاتھوں میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ یہ کوئی بڑی رعایت نہیں، شبنم چاٹ کر پیاس بجھانے کی اجازت طلبی ہے جو اگر نہیں دی گئی تو خود حکمرانی اور جہانبانی کو خیر اندیشی اور سلامت روی سے محروم کرنا ہے۔

جمہوری حکومت میں ایک سیاسی جماعت کی اکثریت کو ایک سیاسی جماعت کی اقلیت کو دبا کر رکھنے کا حق حاصل ہے، مگر کیا ایک مستقل مذہبی اکثریت کو ایک مستقل مذہبی اقلیت کو دبا کر رکھنے کا وہی حق ہے؟ کیا ایسی مذہبی اکثریت اپنے ہر حکم کو بہ جبر منوانے کا اختیار رکھتی ہے؟ کیا اس کی ہر خواہش حکم اور قانون کی حیثیت رکھتی ہے؟ اس کا کوئی فیصلہ اقلیت کش ہو تو کیا اقلیت اس کو بھی ماننے کے لیے مجبور ہے؟ ان سوالات کے پارلیمانی انداز کے جوابات سے ملک کے مزاج کا صحیح قوام نہیں بن سکتا ہے جو کہا جائے واقعی اس پر عمل کیا جائے۔ اس وقت ہماری حکومت کے لیے مسلم یونیورسٹی ایک تجربہ گاہ ہے جہاں مسلمانوں کا شیشۂ دل توڑا یا جوڑا جا سکتا ہے۔

ع ٹھوکر بھی وہ کھائے ہے جو اترا کے چلے ہے

(معارف فروری ۱۹۷۹ء)

دارالعلوم دیوبند اختلاف کی زد میں

دارالعلوم دیوبند کی تاسیس کے سلسلہ میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ بے شمار لوگوں کی پیشانیاں اوقاتِ سحر میں سربسجود ہوئیں۔ جن کی دعائیں یہ تھیں کہ ”خداوندا! ہندوستان میں بقائے اسلام اور

تحفظ مسلم کا ذریعہ پیدا کر۔'' حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ خوش تھے کہ یہ دارالعلوم ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔

یہاں جو تعلیمی نظام قائم ہوا اس سے دینی و روحانی تربیت کا ایک عمدہ سانچہ بن گیا، جس میں ڈھل کر نکلنے والوں میں اعتقادی و عملی اور ظاہری و باطنی عناصر کا ایک ایسا امتزاج دیکھنے میں آیا کہ ابنائے دارالعلوم فخر سے کہنے لگے کہ اس کی مثال ہندوستان تو ہندوستان شاید بیرون ہند کے کسی اسلامی ملک میں آسانی سے نہیں مل سکتی، مگر اسی شہرۂ آفاق ادارہ میں وہاں کے موجودہ علما میں جو باہمی لااعتباری، بے مقداری، آبروریزی، الزام تراشی، بہتان طرازی، عیب جوئی اور ہرزہ سرائی کے نمونے برسر عام آرہے ہیں۔ اس سے برصغیر کے مسلمانوں کی گردنیں ندامت اور ذلت سے جھکی ہوئی ہیں۔

وہاں کے اختلافات میں کون فریق حق پر ہے اور کون نہیں ہے، اس پر فیصلہ کرنے کا وقت نہیں رہا۔ دور کے تماشائی کو یہ کہنے کا حق حاصل ہوگیا ہے کہ جب تک یہ خدمت اور ایثار کا مرکز تھا تو اپنی مالی تنگی اور صبر آزما عسرت کے باوجود سارے برصغیر کے مسلمانوں کے ذہن کا الحمرا، الزہرا، قصر شیریں اور لال قلعہ بنا رہا، اس سے ان کی نشاط انگیز اور انبساط آمیز عقیدت کا اظہار اس کے صد سالہ جشن کے موقع پر ۱۹۸۰ء میں ہوا۔ ایک بے پناہ ہجوم نے اس فخر روزگار اور مایۂ ناز درسگاہ کی عظمت و جلالت کے غیر مرئی پیکر کو اپنی مدہوشانہ اور سرشارانہ محبت کا مرصع کا ہار پہنایا۔ اس پر مختلف گوشوں سے دولت کی ایسی بارش ہوئی کہ اس کے خزانہ میں اتنا بڑا سرمایہ جمع ہوگیا جو کبھی نہیں ہوا تھا۔

مگر اس جشن کے بعد ہی وہاں جو اختلاف مذموم کا آغاز ہوا تو یہ کہنے کی گنجائش نکل آئی کہ اس سحر گاہی دعاؤں کے ثمرہ کے احاطہ میں دولت آئی تو اس کے پیچھے دنیا کی برائی بھی آئی۔ حضرت فاروق اعظمؓ کے عہد کا یہ سبق آموز واقعہ ہے کہ ۱۶ھ میں جلولا فتح ہوا تو تین کروڑ کا مال غنیمت ہاتھ آیا اس میں سے پانچواں حصہ مدینہ منورہ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس بھیجا گیا تو مسجد نبویؐ میں اس کا ڈھیر لگا دیا گیا۔ شام ہو چکی تھی اس لیے تقسیم نہیں ہو سکی۔ اس پر چادر ڈال دی گئی۔ رات بھر پہرہ پڑا۔ صبح ہوئی تو حضرت عمرؓ تشریف لائے، مجمع عام میں چادر ہٹائی گئی، درہم و دینار کے انبار اور جواہرات پڑے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ ان کو دیکھ کر بے ساختہ رو پڑے، لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ یہ

رونے کا کیا محل ہے؟ فرمایا کہ جہاں دولت کا قدم آتا ہے وہاں رشک بھی آتا ہے اور حسد بھی۔

رشک اور حسد عموماً بدگمانی سے پیدا ہوتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کے مطابق شیطان بن کر انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتی ہے مگر ہماری تاریخ میں علمائے ربانی کی ایک کثیر جماعت ایسی بھی رہی ہے جنہوں نے رشک وحسد سے بالاتر ہو کر مسلمانوں کی مذہبی، ملی اور معاشرتی زندگی سنواری ہے۔ ابراہیم بن یزید تیمیؒ بڑے جلیل القدر تابعی تھے۔ ان کا مسلک ان ہی کے قول کے مطابق یہ تھا کہ میں آسمان سے منہ کے بل گرنا پسند کرتا ہوں مگر یہ گوارا نہیں کہ کسی کے ساتھ کسی قسم کا سوءِ ظن رکھوں۔ حضرت جعفر صادقؒ کی رگوں میں صدیقیت کا بھی خون تھا۔ وہ فرماتے کہ جب تمہارے بھائی کی جانب سے تمہارے لیے کوئی ناپسندیدہ بات ظاہر ہو تو اس کے جواز کے لیے ایک سے ستر تک تاویلیں تلاش کرو، اگر پھر بھی نہ ملے تو سمجھو کہ اس کی کوئی تاویل ضرور ہوگی جس کا تم کو علم نہیں۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ اگر تم کسی مسلمان سے کوئی کلمہ سنو تو اس کو بہتر سے بہتر معنی پر محمول کرو، جب وہ محمول نہ ہو تو اپنے نفس کی ملامت کرو۔

اس وقت دارالعلوم دیوبند کے علما اپنے اپنے نفس کا محاسبہ کریں تو ان کو مشہور تابعی حضرت مطرف بن عبداللہؒ کے اس قول کی تائید کرنی ہوگی کہ فتنہ رہبری اور رہنمائی کے لیے نہیں بلکہ مومن کو اس کے نفس سے لڑا دینے کے لیے اٹھتا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے کہ انسان کا سب سے بڑا دشمن خود اس کا نفس ہے جو اس کو فریب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ وہ شرک اور فریب نفس کو برابر سمجھتے۔ کہتے کہ اگر مسلمان اپنے نفس کا جائزہ نہیں لیتا اور اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں تو اس کے جوتوں کی چاپ ضعیف انسان کے دل کو برباد کرنے کے لیے کافی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے علما اپنے نفس کو ٹٹولیں اور پھر فیصلہ کریں کہ کیا ان کے جوتوں کی چاپ سے ایک ضعیف نہیں بلکہ ایک عظیم الشان مدرسہ تباہی کے دہانے میں نہیں آ گیا ہے؟ یہ دونوں فریقین سے زبان حال سے کہہ رہا ہے ؎

آنکھیں کہیں کہ دل ہی نے مجھ کو کیا خراب   دل یہ کہے کہ آنکھوں نے مجھ کو ڈبو دیا
بگڑا کسی کا کچھ نہیں اے دردِ عشق میں   دونوں کی ضد نے مجھ کو بلا میں ڈبو دیا

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہٗ کی وفات پر سرسید احمد خانؒ نے لکھا تھا کہ ”ہم

مولوی محمد قاسم مرحوم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے ناراضی یا خوشی کا ہو، کسی طرح ہوائے نفسانی یا ضد اور عداوت پر محمول نہیں کر سکتے۔ ان کے تمام کام اور افعال بلاشبہ للّٰہیت اور ثواب آخرت کے لیے تھے، ان کا کسی سے ناراض ہونا اور خوش ہونا بھی خدا کے واسطے تھا، کسی شخص کو وہ اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ برے کام کرتا ہے یا بری بات کہتا ہے، خدا کے واسطے برا جانتے تھے۔ مسئلہ حب فی اللہ اور بغض للہ ان کا خاص برتاؤ تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی تھیں"۔

حضرت مولانا سید احمد حسین احمد مدنیؒ (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند) کی تعلیم یہ رہی کہ "کسی کو اپنے عمل پر نازاں نہ ہونا چاہیے۔ حبّ جاہ نہایت برباد کرنے والی چیز ہے۔ یہ اس قدر لیچڑ مرض ہے کہ صوفیہ فرماتے ہیں کہ میرے بھائی نفس اعدی عدو انسانی ہے، اس کے مکر و فریب سے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہم لوگوں سے اپنے قلبی اور نفسانی شرارتوں کو چھپا سکتے ہیں مگر جس سے سابقہ پڑتا ہے اس سے چھپا نہیں سکتے۔ نجات صرف صاحب قلب سلیم کو ہے"۔ (مکتوبات شیخ الاسلام، ج ا ص ۳۰-۳۲۸)

دارالعلوم دیوبند کے علما کے لیے اب بھی موقع ہے کہ وہ ان علمائے ربانی کے اسوۂ حسنہ کو اختیار کریں ورنہ ان پر ایسے ہی دنیادار علما کا الزام آئے گا جن سے گزشتہ تاریخ میں ہمارے مذہبی اور ملی معاشرہ کو بڑا نقصان پہنچا ہے۔ ایک مشہور تابعی بزرگ سعید بن جبیرؒ سے ہلال بن خباب نے پوچھا کہ مسلمانوں کی ہلاکت کہاں سے ہوگی؟ فرمایا کہ ان کے علما کے ہاتھوں۔ علما سے ان کی مراد دنیادار علما ہی تھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ فرما گئے ہیں کہ جس طرح مخلوقات کی خلاصی علما کے وجود سے وابستہ ہے، اسی طرح دنیا کا خسارہ بھی ان ہی سے مربوط ہے۔ بہترین علما دنیا کی بہترین مخلوق ہیں۔ بدترین علما دنیا کی بدترین مخلوق ہیں۔ تمام دنیا کی ہدایت اور گمراہی ان ہی پر موقوف ہے۔ حضرت مجددؒ کے خیال میں علما کے لیے دنیا کی محبت اور رغبت ان کے جمال کے چہرہ پر بدنما داغ ہیں، وہ علما کو پارس پتھر کی طرح دیکھنا چاہتے تھے کہ تانبا اور لوہا بھی اس سے مس ہوجائے تو سونا ہوجاتا ہے"۔

اس برصغیر کے مسلمان دارالعلوم دیوبند کے علما کے جھگڑے کو دور سے دیکھ کر اس کے انجام کے منتظر ہیں۔ کلام پاک میں بتایا گیا ہے کہ سمجھنے والے بسا اوقات جس چیز کو سمجھتے ہیں کہ وہ بری ہے

وہی انجام کے لحاظ سے بھلی بن جاتی ہے۔خدا کرے دیو بند کے جھگڑے کا انجام بھی کلام پاک کی اسی بشارت کے مطابق ہو۔

آخر میں ہم برصغیر کے عام مسلمانوں کی طرف سے حضرت حسن بصریؒ کے الفاظ میں بارگاہِ الٰہی میں گڑگڑا کر یہ دعا کرتے ہیں کہ ''اے مقلب القلوب! فریب نفس اور نفسانیت سے بچا کر ہمارے اور ہمارے علما کے دلوں کو اپنے دین پر قائم اور استوار رکھ اور اسلام قیم کو ہمارا اور ہمارے علما کا دین بنا''، آمین۔(معارف دسمبر ۱۹۸۱ء)

مسلم یونیورسٹی بل کی منظوری

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی بل ہماری پارلیمنٹ میں منظور کرلیا گیا۔اخباروں میں اس کی تفصیل شائع نہیں ہوئی۔صرف اتنا معلوم ہوا کہ حزب مخالف اس سے خوش نہیں تھا اور بعض مسلمان اراکین کو اس سے مایوسی ہوئی۔

اس بل کو صحیح طور سے ماہرین قانون ہی سمجھ سکتے ہیں۔مگر اس سے یہ خوشی ہوئی کہ اس میں یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ اس کو مسلمانوں نے قائم کیا۔یہ ان کی مرضی کا تعلیمی ادارہ ہے اور یہ ان کی تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے ہے۔مگر اس کی بھی صراحت ہے کہ اس کا دروازہ ہر مذہب وفرقہ کے لیے کھلا رہے گا اور ایسا ہونا بھی چاہیے۔اس بل میں کہیں اقلیتی کردار (مائی نوریٹی کیریکٹر) جیسے الفاظ استعمال نہیں کیے گئے جو مسلمانوں کا اصلی مطالبہ تھا۔ریاستی حکومتوں کی طرف سے مسلمانوں کے تعلیمی اداروں کے اقلیتی کردار کو تسلیم کرلیا گیا ہے لیکن معلوم نہیں ہماری مرکزی حکومت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو تسلیم کرنے میں کیوں حساس اور محتاط واقع ہوئی ہے۔اس سے اس بل سے متعلق بعض حلقوں میں اب بھی سوءظن ہے۔اقلیتی کردار ایک متنازعہ فیہ مسئلہ بنتا جارہا ہے۔ماہرین قانون اپنی ماہرانہ تعبیر سے اس کے مفہوم کو کچھ سے کچھ بدلنے کی کوشش کررہے ہیں۔اس بل میں یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو صاف اور واضح الفاظ میں تسلیم نہیں کیا گیا ہے تو معلوم نہیں آئندہ اس کی تعبیر کس کس طرح سے کی جائے۔اس طرح یہ بل پہلے سے بہتر صورت میں ضرور منظور ہوا جس کے لیے ہماری حکومت مبارکباد کی مستحق ہے لیکن اس سے مسلمانوں کے مطالبہ کی تکمیل نہیں ہوتی۔

اس بل کا خوش آئند پہلو یہ بھی ہے کہ یونیورسٹی کا کورٹ پھر بحال کر دیا گیا ہے اور اسی کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوگا۔ اس کی تعداد یونیورسٹی کے تعلیمی شعبوں کے صدر، پروفیسروں، پرنسپلوں، لکچرروں، غیر تدریسی ملازموں، طلبائے قدیم، عطیہ دہندگان، صنعت، تجارت، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، پارلیمنٹ، مسلمانوں کے ثقافتی اور علمی اداروں، اردو زبان کے ادیبوں، وقف بورڈ اور طلبہ کے نمائندوں وغیرہ کو ملا کر ایک سو چھیاسٹھ کر دی گئی ہے۔ ان میں کچھ کو وزیٹر، چیف ریکٹر اور چانسلر نامزد کریں گے، پارلیمنٹ کے اراکین کا انتخاب خود پارلیمنٹ میں ہوگا۔ طلبائے قدیم اور عطیہ دہندگان اپنے اپنے نمائندے منتخب کریں گے۔ طلبہ کی یونین کے صدر، نائب صدر اور سکریٹری اپنے عہدوں کی وجہ سے ان کے اراکین ہو جائیں گے۔ ایک کو یونین کی مجلس انتظامیہ نامزد کرے گی، بقیہ گیارہ طلبہ کا انتخاب طلبہ خود اپنے ووٹوں سے کریں گے۔ اساتذہ اور غیر تدریسی عملے کے نمائندے بھی اپنے اپنے حلقوں کے ووٹوں سے منتخب کیے جائیں گے، بقیہ اور اراکین کا انتخاب کورٹ کی طرف سے ہوگا۔

اس طرح یہ کورٹ یونیورسٹی کی باضابطہ منتخب شدہ اراکین کی ایک جمہوری پارلیمنٹ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ خدا نہ کرے کہ اس کے اراکین کے انتخاب میں وہی کشمکش اور کشاکش نہ پیدا ہو جائے جو جمہوری طرز کے انتخاب میں ہوا کرتی ہے۔ تجربہ یہی ہے کہ جمہوری طریقۂ انتخاب سے اچھے افراد کم آتے ہیں، اس لیے انتخاب کے بعد ایسے جمہوری ادارے پنڈورا کے بکس بن جاتے ہیں جس کے اندر گروپ بندی، نفاق پروری، مفاد پرستی اور باہمی آویزش کی آفتیں چھوٹ کر باہر نکلتی رہتی ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ ایسے جمہوری انتخاب میں ان لوگوں کی بھی نمائندگی ہوتی رہے جن کو مسلمانوں کے تعلیمی مفاد، ان کے علوم وفنون کے فروغ اور یونیورسٹی کے بنیادی مقاصد اور نصب العین سے مطلق دلچسپی نہ ہو۔ خدا کرے یہ احتمالات غلط ثابت ہوں۔

یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ میں طلبہ کے یونین کا صدر، دو پوسٹ گریجویٹ طلبہ، ایک ریسرچ اسٹوڈنٹ اور ایک انڈر گریجویٹ بھی اس کے ارکان ہوں گے جن کا انتخاب طلبہ خود کریں گے۔ یونیورسٹی کے کورٹ اور مجلس انتظامیہ میں طلبہ کو جو قانونی نمائندگی دی گئی ہے اس سے امید ہے کہ وہ مطمئن رہ کر اپنی تعلیم کے اعلیٰ مقاصد کو پورا کرتے رہیں گے۔ طلبہ اور اساتذہ کے درمیان جو مقدس

اور باوقار رشتہ ہے اس میں فرق نہ آنے پائے گا۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا طرۂ امتیاز یہ نہیں ہے کہ یہ ایک جمہوری ادارہ بن کر اساتذہ اور طلبہ میں مساویانہ رشتہ قائم کردے۔ سرسید احمد خانؒ نے جب اس تعلیمی ادارہ کو قائم کیا تھا تو طلبہ کے لیے ان کا پیام تھا کہ وہ شریفانہ اور باقاعدہ اطاعت وفرمانبرداری کی عادت ڈالیں کہ یہی ایک قوم کا زیور ہوتا ہے۔ وہ اس کے قائل نہ تھے کہ طلبہ امرت تھوکیں اور زہر نگلیں یا ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ تو جھٹک دیں اور مگرمچھ کے منہ میں ہاتھ دے دیں۔ ان کا خیال ان ہی کے الفاظ میں یہ بھی رہا کہ ہمارے عزیز بچے اگر آسمان کے تارے ہوجائیں مگر مسلمان نہ رہیں تو ہم کو کیا؟ امید کہ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ اس بل کے نفاذ کے بعد اپنے اس ادارہ کے بانی کی ان نصیحتوں کو اپنا لائحہ عمل بنائیں گے۔

بل میں اس کی بھی اجازت ہے کہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کو اپنی تعلیمی اور ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کا حق ہے، کیا یہاں کے طلبہ کی تعلیمی اور ان کی ثقافتی سرگرمیاں ہم آہنگ نہیں ہوسکتیں ہیں؟ کیا یہاں کے طلبہ کو علوم طبیعی، ریاضیات، سائنس، فلسفہ، اقتصادیات، تاریخ، آرٹ اور کلچر کی تعلیم اس طرح نہیں دی جاسکتی ہے کہ وہ جدید دنیا کے ہر قسم کے تغیرات سے متمتع بھی ہوں اور ان کی مذہبی روح کو صدمہ بھی نہ پہنچے۔ اس کی ذمہ داری یہاں کے اساتذہ پر آتی ہے۔ اسلامی روح اور موجودہ دور کے مادی اقدار کے درمیان ایک کشاکش جاری ہے جس سے مسلمان طلبہ ایک روحانی کرب اور ذہنی الجھن میں مبتلا ہیں، وہ مسلمان رہنا چاہتے ہیں لیکن دنیا سے منہ موڑ کر زندگی بھی بسر کرنا پسند نہیں کرتے۔

ان طلبہ کے جذبات اور احساسات کا صحیح امالہ ان کے اساتذہ اپنی ذہنی، فکری اور عملی کاوشوں سے کرسکتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی تندہی سے ایسا کرنا چاہیں۔ اگر اس یونیورسٹی میں ایسی تعلیم نہیں ہوتی جہاں کے مسلمان طلبہ خالصۃً اپنے ثقافتی کردار کے حامل نہیں ہوتے تو پھر اس میں اور دوسری یونیورسٹیوں میں کیا فرق رہے گا۔ یہ موجودہ بل کے ذریعہ سے ہر قسم کی سرکاری رعایتیں حاصل کرنے کے باوجود ایک بودے معاشرہ کے بودے افراد کی درسگاہ سمجھی جائے گی۔ یہاں کے اساتذہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے طلبہ کی بے راہ روی پر ان کو مطعون کرنے کے بجائے ان میں افکار کی بلندی اور کردار کی خوبی ایسی پیدا کریں کہ وہ جو بقول ڈاکٹر ذاکر حسین حیات طیبہ اسلامیہ کے حامل اور

رحمۃ اللعالمین کے نام لیوا ہیں، اپنے وطن اور اہل وطن کے لیے مثال اور رحمت کا کام دیں۔ڈاکٹر ذاکر حسین کے نزدیک قومیت اور اسلامیت میں کوئی تناقض نہیں۔ جو ان دونوں میں تناقض پاتے ہیں وہ دونوں کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتے۔

موجودہ وائس چانسلر جناب سید حامد کا دور کچھ دنوں ہنگامہ خیز بلکہ خونیں رہا لیکن اب اس لحاظ سے بھی یاد کیا جائے گا کہ انہی کے عہد میں مسلم یونیورسٹی کا یہ ترمیمی بل منظور ہوا جس سے مجموعی حیثیت سے مسلمان زیادہ خوش نہیں۔جناب سید حامد صاحب ایک چھوٹی سی مملکت کے حکمراں ہیں، مسلمانوں کی سیاسی اصطلاح میں ایک حکمراں کو راعی کہا جاتا ہے جس کے معنی چرواہے کے ہیں۔ ایک حکمراں کی حیثیت ایک شفیق ومحافظ چرواہے کی ہے جو اپنے گلے کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا ہے، ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے۔درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے۔اچھا حکمراں وہی ہے جو قانون کی بالادستی کا لحاظ رکھنے کے ساتھ ہر حال میں دلسوز اور دلدار بن کر دلوں کی تسخیر بھی کرتا رہے۔(معارف جنوری ۱۹۸۲ء)

یکساں سول کوڈ

قومی یک جہتی کے فروغ کے سلسلہ میں ہماری حکومت کی طرف سے اس کی بھی خواہش ظاہر کی گئی کہ ملک میں ہندو مسلمان کا پرسنل لا یکساں ہو۔

عام مسلمانوں نے اس کو پسند نہیں کیا۔ہمارے علما بھی اس کی مخالفت میں متحرک ہوئے تو حکومت کو اعلان کرنا پڑا کہ مسلمانوں کی مرضی کے خلاف ان کے پرسنل لا میں مداخلت نہیں کی جائے گی جب مسلمان بڑی حد تک مطمئن تھے تو ادھر ادھر پھر آواز بلند ہونے لگی ہے کہ ملک کا پرسنل لا ایک کر دیا جائے۔اس کی حمایت میں کچھ ایسے مسلمانوں کے نام بھی لیے جا رہے ہیں جو عام طور سے جمہور مسلمانوں کی رائے کے خلاف حکومت یا یہاں کی اکثریت کی ہم نوائی کیا کرتے ہیں، حکومت کی حکمت عملی اور زیرکی اس میں بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مطلب کے کچھ افراد کو عہدے اور دوسرے الطاف واکرام سے نواز کر کے اس طرح تیار کرے کہ وہ اس کے ہم نوا ہو کر اس کی مطلب برآری میں مدد دیتے رہیں۔حکومت کی حکمرانی کا تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں جو اس کے ہم خیال نہ ہوں ، پھوٹ، اختلاف اور نفاق پیدا کرتی رہے تا کہ وہ خود کامیابی کی شاہراہ پر گامزن رہے۔

حکومت کو اپنی مطلب برآری کے لیے ایسے حربے کو استعمال کرنے کا پورا حق ہے، مگر جو ایسے حربے کی زد میں آتے ہیں ان کو بھی یہ حق ہے کہ وہ اپنی قوت مدافعت کو برقرار رکھ کر آسانی سے سپر انداز نہ ہوجائیں۔ ہماری حکومت کو یہ تلخ تجربہ بھی ہوتا رہا ہے کہ محض چند افراد کو سر آنکھوں پر بٹھا کر ان کے ہم مذہبوں کو رام کرنا ضروری نہیں۔ یہ چند افراد اپنی ظاہری حب الوطنی کا ثبوت دے کر ذاتی فائدے تو ضرور اٹھاتے رہے، مگر ہوا وہی جو ان کے ہم مذہبوں کے سوادِ اعظم نے چاہا۔ مسلمانوں کے پرسنل لا کے سلسلہ میں حکومت کے ہوا خواہ اور نمک خوار اپنی قانون دانی، تجدد پسندی اور بظاہر جذباتی ہم آہنگی کا طبل بجا کر ایک مشترکہ پرسنل لا کی وکالت چاہے جتنی بھی کریں مسلمانوں کی رائے عامہ کو نظر انداز کرنا حکومت کے لیے بالکل مناسب نہیں۔ اگر یہ اپنی طاقت یا خوش فہمی میں ایسا کر بیٹھی تو یہ آگ سے کھیلنا ہوگا۔

مسلمانوں کے پرسنل لا کے جن احکام کی صراحت قرآن اور سنت میں موجود ہے، ان میں تو ہمارے علما بھی کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے، بعض دنیادار، جاہ طلب اور ضمیر فروش مسلمان، حکومت کی خوشنودی کی خاطر ایسا کرنا چاہیں تو ان کی جگہ حکومت کے بلند ایوان میں بن سکتی ہے۔ عام مسلمانوں کے دلوں کے نہاں خانوں میں وہ کوئی جگہ نہیں پا سکتے۔ اسلامی ممالک کے کسی دانشور یا مدبر کی ذاتی رائے بھی اس سلسلہ میں قابل اعتنا نہیں، البتہ پرسنل لا کے ان فقہی احکام میں جس کی صریح سند قرآن اور حدیث میں نہیں ہے اور وہ فقہا اور ائمہ کے قیاس اور اجتہاد پر مبنی ہیں۔ ان میں ضرورت زمانہ اور وقتی مصالح کے مطابق ترمیم کی گنجائش ہے۔ اس ترمیم کا حق علما، فقہا اور مجتہدین ہی اپنے اجتماعی فیصلے کے ذریعہ سے استعمال کر سکتے ہیں۔ اسلامی حکومت بھی ان کے اس حق کو سلب نہیں کر سکتی۔ یہ انہی کے فیصلے کی پابند ہو کر کوئی قانون بنا سکتی ہے، مثلاً حالات کے تقاضے اور ضرورت کی بنا پر علما و فقہا تعدد ازدواج کو مناسب نہیں سمجھتے تو اسلامی حکومت اس کو روک سکتی ہے، مگر کسی حال میں علما اور نہ اسلامی حکومت اس کو مستقل طور پر ممنوع قرار دے سکتی ہے، اسی طرح علما و فقہا معاشرہ کی خاص خاص برائیوں کے انسداد کے لیے تعدد ازدواج کو زیادہ سے زیادہ رواج دینا ضروری سمجھتے ہوں تو اسلامی حکومت اس کے لیے ان کی معاون ہوسکتی ہے۔

مگر ہندوستان میں ہماری حکومت کو یہ حق حاصل نہیں۔ یہ بڑی روادار، اعلیٰ قسم کی سیکولر اور

مسلمانوں کی خیر خواہ کیوں نہ ہو، کسی لحاظ سے اسلامی حکومت نہیں، اس کی رواداری، فراخ دلی اور ملک کی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان مسائل میں مداخلت کر کے ان کے جذبات کو مجروح نہ کرے۔

۱۹۴۷ء سے اب تک کل چھتیس برس گزرے ہیں، اس تھوڑی سی مدت میں مسلمانوں کو شعوری یا غیر شعوری، جا یا بیجا طریقے پر کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ کہیں ان کا ملی اور مذہبی وجود ختم نہ ہو جائے حالانکہ مسلمانوں نے یہاں صدیوں حکومت کی، ہندوؤں کو یہ خطرہ کبھی نہیں ہوا کہ ان کا وجود ختم ہو جائے گا۔ اس حقیقت کا اعتراف یہاں کے غیر جانبدار مؤرخوں نے بھی کیا ہے۔ کے۔ ام پینکر نے اپنی کتاب 'اے سروے آف انڈیا' میں لکھا ہے کہ "مسلمانوں کے زمانہ میں ہندوؤں کی سوسائٹی جوں کی توں رہی"۔ یہ اس لیے کہ مسلمانوں نے پرسنل لا اور مذہبی مراسم و عقائد میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی۔ رام پرشاد کھوسلا نے اپنی کتاب 'کنگ شپ اینڈ نوبی لیٹی انڈر دی موغلز' میں تو یہاں تک رقم طراز ہیں کہ عدل و انصاف میں اہتمام اور مذہبی رواداری کی پالیسی کی وجہ سے مغلوں کی حکومت میں عوام ہمیشہ مطمئن رہے۔ اسلامی ریاستوں میں سیاست اور مذہب کا گہرا لگاؤ رہا ہے لیکن مغلوں کی مذہبی رواداری کی وجہ سے کوئی سیاسی خطرہ نہیں ہونے پایا اور کسی زمانہ میں یہ کوشش نہیں کی گئی کہ حکمراں قوم کا مذہب محکوموں کا مذہب بنایا جائے حتیٰ کہ اورنگ زیب نے بھی ملازمت کے لیے اسلام کی شرطیں نہیں رکھی تھیں۔ مغلوں کے عہد میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ لوگوں کے ضمیر کے خلاف کوئی قانون بنایا گیا۔

سی۔ ایف۔ اینڈریوز، گاندھی جی کے قدردانوں اور دوستوں میں تھے۔ انہوں نے منشی ذکاء اللہ پر ایک کتاب لکھی ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں کہ جب کبھی میں دہلی کے قدیم باشندوں کے پاس گیا، انہوں نے کسی پس و پیش کے بغیر یہ بات بیان کی کہ آخری مغل بادشاہوں کا برتاؤ ان کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ ان سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ یہ ساری باتیں صدیوں کی کوششوں کا نتیجہ تھیں۔ دوسرے امور میں مغل شاہنشاہوں کے خلاف بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن وہ بجا طور پر اس نیک نامی کے مستحق ہیں کہ مذہبی تعصب ان پر غالب نہیں رہا، اس بنا پر وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ اپنی ہندو رعایا کے ساتھ مہربانی کا سلوک اور غیر جانبدارانہ انصاف کریں۔ انہوں نے شاہی دربار

کے امرا پر بھی اچھی طرح ذہن نشین کر دیا تھا کہ وہ ہندوؤں کے احساسات وجذبات کا خیال انھی کی طرح کریں۔ (معارف جون ۱۹۸۳ء)

متبنّیٰ بل اور مسلمان

معارف کے ان صفحات پر برابر ذکر آیا ہے کہ حکومت ہند کو مسلمانوں کے پرسنل لا میں کسی قسم کی مداخلت کرنا اس کی سیاسی مصلحت کوشی اور مآل اندیشی کے لیے بالکل مناسب نہیں۔

ادھر اخباروں میں یہ خبریں شائع ہو رہی ہیں کہ اقلیتی کمیشن کی پیش کردہ تجاویز کی بنا پر حکومت متبنّیٰ بل کو مسلمانوں پر بھی نافذ کرنے پر غور کر رہی ہے۔ حالانکہ دو سال پہلے مسلم پرسنل بورڈ کے احتجاج پر اس کی طرف سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اس بل سے مسلمانوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔ اب اگر اخباروں کی خبر صحیح ثابت ہوئی تو پھر اس سے یا تو مسلمانوں کی دینی غیرت اور حمیت کا امتحان لینا مقصود ہے یا ان کو ذہنی اور فکری انتشار میں مبتلا کرنا ہے کیونکہ ان پر اس کا نفاذ نص قرآنی کے خلاف ہوگا جس سے معلوم نہیں ان میں کتنا اشتعال پیدا ہو، اسلام میں متبنّیٰ کی حیثیت حقیقی اولاد کے مساوی نہیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہؓ کو منہ بولا بیٹا بنایا تھا لیکن ان کی حیثیت حقیقی بیٹے کے برابر تسلیم نہیں کی گئی، اسی لیے آپؐ نے ان کی مطلقہ سے نکاح کیا، اگر ان کی حیثیت حقیقی بیٹے کے برابر ہوتی تو یہ نکاح نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نکاح سے قدیم رسم کو بھی توڑنا تھا، جس سے منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹا سمجھا جاتا تھا۔

کلام پاک میں اللہ تعالیٰ نے بڑی وضاحت سے فرمایا ہے کہ ''ہم نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا حقیقی بیٹا نہیں بنایا، یہ تو وہ باتیں ہیں جو تم لوگ اپنے منہ سے نکال دیتے ہو، مگر اللہ وہ بات کہتا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے اور وہی صحیح طریقہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت سے پکارو، یہ اللہ کے نزدیک زیادہ منصفانہ بات ہے اور اگر تمہیں معلوم نہ ہو کہ ان کے باپ کون ہیں تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں''۔ (الاحزاب آیت: ۳۔۴)

اگر متبنّیٰ بل مسلمانوں پر نافذ کیا گیا تو ان کا قانون وراثت لازمی طور پر زیر بحث آئے گا، اسلام میں ذاتی ملکیت یا جائداد اسی وقت جائز تسلیم کی جاتی ہے جب یہ قرآن پاک کے قانون وراثت کے ماتحت ہو۔ اس کا صریح حکم ہے کہ میراث بہر حال تقسیم ہونی چاہیے خواہ یہ کم ہو یا بیش۔ (النساء۔۶)

اس میں منقولہ اور غیر منقولہ، زرعی یا غیر زرعی، آبائی اور غیر آبائی کی کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے۔متوفی کے پورے مال کی تقسیم لازمی ہے۔اس ترکہ میں کون کون وارث ہوتے ہیں اس کی پوری تفصیل قرآن پاک میں بتادی گئی ہے جس میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ کی اجازت کسی کو حاصل نہیں۔

کلام پاک میں ہے کہ متوفی پر قرض ہو تو پہلے یہ ادا کیا جائے یا اگر اس نے کوئی وصیت کی ہو تو وہ پوری کی جائے۔اس کے بعد اس کی اولاد ہو تو لڑکوں کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہو، اگر اس کی صرف لڑکیاں ہوں تو اس کے کل ترکہ کا ۲/۳ حصہ ان لڑکیوں میں تقسیم ہو، اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے، اولاد رہنے کے باوجود اس کے والدین کو چھٹا حصہ ملنا چاہیے، اور اگر وہ صاحب اولاد نہ ہو تو والدین ہی اس کے وارث ہوں گے۔اس میں ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے گا اور اگر اس کے بھائی بہن بھی ہوں تو ماں چھٹے حصے کی حقدار ہوگی، اگر بیوی یا بیویوں نے کچھ چھوڑا ہو اور وہ بے اولاد ہوں تو اس کا آدھا حصہ شوہر کو ملے گا اور اگر وہ اولاد رکھتی ہوں تو ترکہ میں شوہر کا ایک چوتھائی حصہ ہوگا اور اگر بے اولاد شوہر نے کچھ چھوڑا ہو تو بیویاں اس کے ترکہ میں چوتھائی حصہ کی حقدار ہوں گی اور اگر وہ صاحب اولاد ہوں تو بیویوں کا حصہ آٹھواں ہوگا۔

اگر کوئی مرد یا عورت بے اولاد ہو اور اس کے ماں باپ بھی نہ ہوں مگر اس کا ایک بھائی یا ایک بہن موجود ہو تو بھائی بہن ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو کل ترکہ کی ایک تہائی میں وہ سب شریک ہوں گے۔یہ بھی حکم ہے کہ جب تقسیم کے موقع پر کنبہ کے لوگ، یتیم اور مساکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو کچھ دیا جائے۔(النساء:۱۱-۱۲) اس میں کہیں ذکر نہیں کہ کوئی لاولد ہو تو وہ کسی کو متبنیٰ بنالے اور اس کو ترکہ میں وہی شرعی حق دے، جو حقیقی اولاد کو دیا جاتا ہے۔

ہاں اگر بعض مقامی رسم و رواج کے مطابق ایک لاولد شخص کسی کو متبنیٰ بنالے تو وہ اپنی زندگی میں تو اس کو اپنی ملکیت، مال اور جائداد کا ۱/۳ حصہ دے سکتا ہے یا اپنا پورا ترکہ عصبہ کی اجازت سے اس کو دے دے یا اس کو دینے کے بعد عصبہ اپنے حصوں کے دعویدار نہ ہوں تو متبنّیٰ کا قبضہ اس پر ہوسکتا ہے مگر کسی اسلامی حکومت کو بھی یہ حق نہیں کہ کوئی قانون بنا کر متبنی کو وہی شرعی حق دلائے جو کلام پاک میں حقیقی اولاد کو دیا گیا ہے۔کسی قانون کے ذریعہ سے تمام عصبہ کو ان کے حق وراثت سے محروم کرکے متبنی کو سارا ترکہ دلا یا جائے تو یہ انسانی قانون کلام پاک میں خدا کے بنائے ہوئے

قانون کی نفی کرے گا جو مسلمانوں کے لیے ہرگز قابل قبول نہیں۔

ابن ماجہ اور ترمذی کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''وراثت کا علم سیکھو، اس لیے کہ وہ نصف علم ہے وہ بھلا دیا جائے گا اور وہ پہلی چیز ہوگی جو میری امت کے سینوں سے کھینچ لی جائے گی''۔ اگر واقعی اس کو یا ہماری اور پرسنل لا کو ہماری حکومت نے مسلمانوں کے سینوں سے کھینچ لیا تو یہاں کی سیاسی زندگی میں آسام، پنجاب اور کشمیر سے کم الجھاؤ نہ پیدا ہوگا۔ ہماری حکومت کے دردِ سر کے لیے کیا کم مسائل ہیں جو اس کے بعض بظاہر فہیم لیکن دراصل نادان مشیروں کی وجہ سے اس کی پریشانیوں میں کچھ اور اضافہ ہو جائے۔ (معارف جولائی ۱۹۸۳ء)

نئے وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی
کچھ معروضات

ہم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نئے وائس چانسلر جناب سید ہاشم علی اختر کا دلی خیر مقدم ان کے اس احاطہ میں تشریف آوری پر کرتے ہیں۔

اسی کے ساتھ ان کی خدمت میں یہ بھی گزارش ہے کہ وہ یہاں اس تصور سے قیام نہ کریں کہ ان کی کوٹھی کا نرم اور گداز بستر ان کے لیے استراحت کا سامان فراہم کرے گا یا وہ کنیڈی ہال کے جلسوں میں معطر اور نکہت بیز پھولوں کا ہار پہنتے رہیں گے یا یونیورسٹی کی لائبریری کے لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں پر ایٹ ہوم میں شرکت کر کے محظوظ ہوتے رہیں گے یا اپنے حاشیہ نشینوں کی باتوں سے اپنی نجی محفلوں کو گرماتے رہیں گے یا حکومت کی چشم و ابرو پر نگاہ رکھ کر اپنے اعزاز اور رتبے میں اضافہ کرتے رہیں گے، اس کے برخلاف وہ یہاں آئے ہیں تو وہ برابر یہ خیال رکھیں کہ وہ کانٹوں کی سیج پر لیٹنے، راتوں کو اپنی نیند حرام کرنے، اپنے جسم کے ہر بُن مو کو چنگاریوں اور شعلوں کے نذر کرنے آئے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری ملک کی اور یونیورسٹیوں کی وائس چانسلری سے بالکل مختلف ہے۔ یہ آٹھ کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کی تمناؤں کا مرغزار، ان کی آرزوؤں کا گلزار اور ان کی خواہشوں کا سبزہ زار ہے، پھر انہی مسلمانوں کی اولادوں کے جذبات کا خم کدہ ہے، ان کے احساسات کا گل کدہ ہے اور ان کے تخیلات کا عشرت کدہ ہے۔ اس رنگارنگی کے ساتھ اس کو سرسبز اور شاداب رکھنا آسان نہیں۔

اس تعلیمی ادارہ کے سربراہ سے یہ بلند توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ سرسید کی مآل اندیشی، وقارالملک کی معاملہ فہمی، محسن الملک کی ہوش مندی، طلبہ کے ساتھ سرضیاءالدین کی بے پناہ ہمدردی اور سرشاہ سلیمان کے کردار کی بلندی کا مجموعہ بن کر آئے۔ ایسا بننا آسان نہیں، لیکن ان روایتوں کو سینے سے لگا کر رکھنا مشکل بھی نہیں، اگر وہ اپنے جان ودل ہی کو عزیز رکھنا گوارا کرتا ہو تو پھر اس گلی میں آئے کیوں؟

مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی حکومت ہے۔ احادیث میں حکومت کے سربراہ کو راعی بھی کہا گیا ہے جس کے معنی چرواہے کے ہیں یعنی اس کی حیثیت ایسے محافظ کی ہوتی ہے جو اپنے گلہ کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا ہے، ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے، درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے۔ حدیث میں یہ بھی ہے کہ سب سے برا راعی وہ ہے جو اپنی رعیت کو توڑ ڈالے۔

ہر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو بالک ہٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے نئے وائس چانسلر کو بھی اس سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ہر خاندان میں بھی یہ مسئلہ اٹھتا رہتا ہے، اس کے مضرت رساں پہلوؤں سے انکار نہیں مگر اس سے عہدہ برآ ہونے میں خاندان کا شفیق بزرگ پولیس اور فوج کو طلب نہیں کرتا بلکہ اپنی شفقت اور محبت کو بروئے کار لاکر اس پر قابو پالیتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی بھی ہندوستانی مسلمانوں کا ایک بڑا خاندان ہے، اس کے بالکوں کی ہٹ سے ہر زمانہ میں ناخوشگوار اور تکلیف دہ فضا پیدا ہوتی رہی ہے مگر ان کی ہٹ سے نپٹنے کے لیے اس کے سربراہ سے وہی توقع کی جاتی ہے جو ایک خاندان کے شفیق بزرگ سے کی جاتی ہے۔

بگڑوں کو سنوارنا، بدکرداروں کو باکردار بنانا اور روٹھوں کو منانا بہت مشکل کام ضرور ہے مگر اس پر قابو پانا اپنی کارکردگی، کارگزاری اور زیرکی کا بھی ثبوت دینا ہوتا ہے مگر ان کو مطعون کرکے اور ناہنجار قرار دے کر پولیس اور فوج کے حوالہ کردینے میں اپنی فرض شناسی، جذبۂ خدمت گزاری اور مخلصانہ ہوش مندی کو متنازع فیہ بھی بنانا ہے اور مسائل درمسائل بھی کھڑے کردینا ہے۔ نظم ونسق قائم کرنے میں تنقیدوں اور خطروں سے ڈرنا بھی صحیح نہیں۔ مگر تنقید جب غیر معمولی تنقیص میں تبدیل ہوجائے یا خطرہ مول لینے کے بعد تباہی سامنے آجائے تو پھر اس کی تاویل کی نہ گنجائش ہوتی ہے اور نہ اس کا کوئی جواز ہوتا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی بہت سی باتیں اصلاح طلب ہیں ۔اس کو گلزار بنانے کی کوشش میں اس کو وادی خارزار بنا دینا تدبر کی دلیل نہیں۔کوئی کام خواہ کتنے ہی اخلاص سے کیا جائے لیکن اس سے طرح طرح کی پیچیدگیاں اور گتھیاں پیدا ہو جائیں تو ایسے اخلاص کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ۔یہی اخلاص اس وقت سونا بن جاتا ہے جب یہ پورے طور پر کارفرما بھی ہو،لیکن کوئی مجادلہ، مناقشہ اور ہنگامہ بھی نہ ہو۔(معارف مئی ۱۹۸۵ء)

کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن مجید کے خلاف مقدمہ

کلکتہ ہائی کورٹ میں ایک درخواست دی گئی کہ قرآن مجید کی طباعت اور اشاعت قانونی طور پر ہندوستان میں روک دی جائے،اس لیے کہ جیسا کہ اخباروں میں شائع ہوا تھا اس میں کفار کے خلاف تشدد کی تعلیم ہے۔درخواست دہندے قرآن کو صحیح معنوں میں سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھنے کی وجہ سے اس کے متعلق جو چاہے رائے قائم کریں لیکن اگر اس کو کافر اور کفار کے لفظ سے برہمی ہے تو کافر کم از کم ملیچھ کے مقابلہ میں ہلکا لفظ ہے۔کافر کے معنی اللہ کے منکر کے ہیں، ہندو اپنی مورتی پوجا کے باوجود اپنے کو اللہ کا منکر نہیں کہتے ہیں بلکہ ان کے یہاں تو ایشور کے وجود کا اتنا اونچا تخیل ہے کہ ہندو عوام اس کو سمجھ نہیں پاتے ہیں تو مورتی پوجا ہی کو اصلی پرارتھنا سمجھتے ہیں۔قرآن میں کفار کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مخاطب اگر ہندو اپنے ہی کو قرار دیتے ہیں تو یہ ان کے احساس کمتری کی دلیل ہے۔

اگر ہندو کھلے ذہن سے قرآن مجید کا گہرا مطالعہ کریں تو وہ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ قرآن مجید میں ایک دین رحمت کا پیام ہے۔انسانیت کی تکمیل کے لیے جتنے فضائل اخلاق کی ضرورت ہے،ان سب کی تعلیم اس میں ہے۔ایمان، تزکیۂ نفس، زہد، تقویٰ، عفت، پاک بازی، دیانت داری، شرم، رحم، عدل، عہد کی پابندی، احسان، عفو و درگزر، خودداری، شجاعت، استقامت، حق گوئی، استغنا، محبت اور شفقت وغیرہ کی جو اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیمات ہو سکتی ہیں وہ اس میں ہیں۔ جتنے رذائل اخلاق ہیں ان سب کی مذمت اور ممانعت کی گئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ کہنے میں فخر محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کا رب رب المسلمین ہی نہیں بلکہ رب العالمین ہے اور اس میں اپنے رسولؐ کے ذریعہ جو پیام دیا گیا ہے،اس بنا پر آپ رحمۃ للمسلمین کے بجائے رحمۃ اللعالمین ہیں،اگر کوئی اس میں حقیقت کو

تسلیم کرنے سے گریز کرے تو یا تو یہ اس کا مذہبی تعصب ہے یا قرآن کی تعلیمات سے ناواقفیت اس کے بیچ میں حائل ہے یا وہ غلط رائے قائم کرنے کی منفیانہ ذہنیت میں مبتلا ہے۔

قرآن کی پہلی سطر اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ہے۔اس کی ہر سورہ کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوئی ہے یعنی اللہ تعالیٰ بہت مہربانی کرنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے، قرآن مجید میں رحمان کے نام کی تکرار ۵۳ دفعہ کی گئی ہے، پھر بے شمار طریقے سے اپنے کو ستار، غفار، غفور، کریم، ذوالجلال والاکرام کہا ہے، ہاں وہ قہار اور جبار بھی ہے، اسی طرح جس طرح ہماری کیا دنیا کی ہر حکومت اپنے مجرموں اور غداروں کو پھانسی دیتی ہے، باغیوں، منکروں اور شورش پسندوں کے پورے علاقے کو اپنی پولیس کی گولیوں اور فوج کے توپ و تفنگ سے ہلاک اور برباد کر دیتی ہے۔

قرآن مجید میں اللہ کی قہاری کے مقابلہ میں اس کی رحیمی، کریمی، ستاری اور غفاری کی کوئی حد نہیں۔قرآن مجید ہی میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسلام کا پیام دے کر اس دنیا میں بھیجا تو آپ کو مخاطب کر کے بار بار ارشاد فرمایا ”میں نے تم کو سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے“۔(الانبیاء:۱۰۷)”اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو گواہی دینے والا، نیکیوں کی خوش خبری سنانے والا، غافلوں کو ہشیار کرنے والا، اللہ کی طرف اس کے حکم سے پکارنے والا اور ایک روشن کرنے والا چراغ بنا کر بھیجا ہے“۔(الاحزاب:٦)”ہم نے نہیں بھیجا ہے تم کو اے محمد لیکن تمام انسانوں کے لیے خوش خبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر“۔(سبا:۲۰)”بے شک اللہ سب کے ساتھ عدل، احسان اور سلوک کا حکم دیتا ہے، تم دوسروں کے ساتھ نیکی کرو اور بھلائی کرو، جیسا کہ اللہ تمہارے ساتھ بھلائی کرتا ہے“۔(قصص:۷۷)”جو چاہے ایمان لائے، جو چاہے کفر اختیار کرے“۔(کہف:۲۹)”دین کے بارے میں کسی قسم کا جبر نہیں ہونا چاہیے“۔(بقرہ:۲۵٦)”اپنے رب کے راستہ کی طرف دانشمندی اور اچھی اچھی باتوں کے ذریعہ بلاؤ اور بہت پسندیدہ طریقے سے بحث کرو“۔(نحل:۱۲۵)”تمہارے ذمہ تو صرف اللہ کا پیام پہنچا دینا ہے“۔(شوریٰ:۴۸)”پھر اگر لوگ اعراض کریں تو تمہارے ذمہ تو صاف صاف پہنچا دینا ہے“۔(نحل:۸۲)”تم ان پر مسلط نہیں ہو“۔(غاشیہ:۲۲)”اور نہ تم ان پر مختار ہو“۔(بنی اسرائیل:۵۴)”ہم نے تم کو ان کا نگراں کر کے نہیں بھیجا ہے“۔(نساء:۸۰)ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اس

کے پیام سے روگردانی کرنے والوں سے کوئی تعرض نہ کیا جائے، ان پر کوئی زور، جبر اور زبردستی نہیں۔

یہ باتیں تو ان کے لیے ہیں جو افہام و تفہیم اور مہر و محبت کے جویا ہیں، ان کے لیے نہیں جو آنکھوں کو بند کر کے اور کانوں میں روئی دے کر ایسی باتیں سوچتے ہیں جن سے مخلوق خدا کو دھوکہ دیں اور اپنی خودسرائی اور خودنمائی کا راگ الاپ کر اپنے کو حقیقی اور صادق رہنما سمجھیں۔

ایسے رہنماؤں کو یہ بھی سوچنا ہے کہ ان ہی کی سرزمین میں ایسی مقدس کتاب ہے جس میں اشرف المخلوقات انسان کے ایک بہت بڑے طبقہ کو شودر کہا گیا ہے۔ ان کے ساتھ ہزاروں برس تک جو نفرت انگیز، اخلاق سوز اور شرمناک سلوک کیا گیا ہے اس سے انسانیت کی گردن ذلت سے جھکی ہوئی ہے۔ ان کو ملیچھ کہا گیا جس کے معنی غلیظ، ناپاک، اگھوری، اور جن سے لوگوں کو گھن آنے کے ہیں، ان کو کسی عبادت گاہ میں جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ ان کے کانوں میں مقدس وید کے کسی اشلوک کی صدا پہنچ جائے تو ان کے کانوں میں سیسہ پلا دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ وید صرف برہمن اور کشتر سیکھ سکتے ہیں کیونکہ ان ہی کے لیے نجات ہے، کسی اور کے لیے نہیں، ایسی مقدس کتاب پر کسی ہائی کورٹ میں بحث ہوسکتی ہے؟ پھر ملاپ جیسے اخبار میں ۳۰/اکتوبر ۱۹۲۹ء کی اشاعت میں یہ تحریر شائع ہوئی تھی کہ گئو ہتیارے کو سیسے کی گولی سے اڑا دینے کے لیے شاستروں میں آگیا ہے، چاہے گئو گھاتک کوئی گورا ہو یا کالا، اگر یہ صحیح ہے تو کیا ایسے شاستروں کے خلاف بھی کسی ہائی کورٹ میں درخواست دی جاسکتی ہے؟

کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن مجید کے خلاف درخواست دینے والوں کو یہ معلوم رہا ہوگا کہ ان کی درخواست رد کر دی جائے گی، لیکن اس سے تو وہ مسلمانوں کی اہانت چاہتے تھے، ان کی یہ مراد شاید پوری نہیں ہوئی۔ اس کے بجائے مسلمان اپنے خواب غفلت سے اس طرح جھنجھوڑ دیے گئے کہ ان کا بڑے سے بڑا رہنما نہیں جھنجھوڑ سکتا تھا، عدو کے شر میں بعض اوقات خیر کی بے پناہ قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس درخواست کے بعد اسلامی ممالک میں قرآن مجید سے بے پناہ احترام کا جذبہ پیدا ہوا، ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی اور ملی وجود کے خطرات کا بھی احساس ہوا اور ان کے بقا کی فکر بھی دامن گیر ہوئی۔ کلکتہ کے مسلمانوں کے ساتھ وہاں کے ہائی کورٹ کے مسلمان وکلا کی ایمانی حرارت

اور مذہبی غیرت پورے طور پر بروئے کار آئی، جیسا کہ وہاں کے مشہور اور ممتاز ایڈوکیٹ جناب خواجہ محمد یوسف کے ایک درد بھرے مکتوب سے معلوم ہوا، انہوں نے اس درخواست کے خلاف اپنے اور رفقا کے ساتھ اس کی پیروی کرنے میں سربراہی کی خدمت انجام دی، وہ اور ان کے رفقاء ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے مبارک باد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس درخواست کے رد کرانے میں مغربی بنگال اور مرکز کی حکومتوں نے بڑی فراخ دلی، رواداری اور مآل اندیشی کا ثبوت دیا جو یقیناً قابل تحسین ہے۔ (معارف جون ۱۹۸۵ء)

اردو کے سلسلہ میں تحقیر آمیز رویہ

گزشتہ مہینہ معارف کے شذرات میں مسلمانوں کی مطلقہ عورتوں کو نان نفقہ دینے کے فیصلہ اور کلکتہ ہائی کورٹ میں قرآن مجید کی اشاعت پر پابندی لگانے کی درخواست کے دودھماکوں کا ذکر آیا تھا۔

اب تیسرا دھماکہ اتر پردیش کی حکومت کے ایک وزیر کا وہ بیان ہے جو نہ صرف اس ریاست کی اردو اکاڈمی کے عہدیداروں بلکہ اردو بولنے والوں کے لیے بھی نہایت اہانت آمیز سمجھا جارہا ہے، ان تمام دھماکوں سے مسلمانوں کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ سوچیں کہ وہ اپنی مذہبی حمیت، ملی غیرت اور لسانی خودداری کو برقرار رکھ کر اس ملک میں کس طرح باعزت اور باوقار زندگی بسر کرسکتے ہیں جو ان کے دستوری اور جمہوری حقوق کا لازمی جز ہے لیکن ملکی مفاد کی خاطر یہ بھی سوچنا ضروری ہے کہ ایسے اقدام اور بیانات ملک کے لیے کہاں تک مفید ہیں؟

اس وقت پنجاب جوالا مکھی بنا ہوا ہے۔ کشمیر میں بڑی بے چینی ہے، آسام میں برسوں سے بغاوت ہے، تری پورہ اور میزورام دردسر ہیں، گجرات میں خون کی ہولی کھیلی جارہی ہے، جنوبی ہند اور مرکزی حکومت میں بے اعتمادی اور لااعتباری کی خلیج حائل ہے، اونچی ذات اور ہریجنوں میں سخت آویزش ہے، جابجا بلوے، فسادات ہوتے رہتے ہیں، اونچی ذات کے ہندوؤں کے مختلف گروہوں کے باہمی نفاق سے حکومت کی کارکردگی میں جو انتشار پھیلا ہوا ہے، اس پر پردہ نہیں ڈالا جاسکتا ہے۔ ان ناسازگار حالات میں مسلمانوں اور اردو بولنے والوں کے ذہن اور دماغ پر ایٹم بم گرا کر ان کو ہیروشیما اور ناگاساکی بنادینے کی کوشش کہاں تک صحیح ہے؟

یہ جو کچھ ہورہا ہے وہ نیشنلزم کے نام پر ہی کیا جارہا ہے۔ نیشنلزم ملک کی قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کے لیے بہت ضروری ہے، اس میں عاقبت اندیشانہ روشن ضمیری، مصالحانہ فراخ دلی اور مدبرانہ رواداری ہو تو یہ ملک کے لیے رحمت ہے اور اسی سے ہندوستان جنت نشان بن سکتا ہے، لیکن جب یہ بگڑ جائے اور اس میں جارحیت، سامراجیت اور فرعونیت پیدا ہو جائے تو یہ ملک کے لیے رحمت کے بجائے اذیت ہے، اس سے بیزار ہو جانے والوں کو شورش پسند، شرانگیز، ملک دشمن اور غیر وفادار قرار دے کر ان کو دبا کر رکھنا اچھی نیشنلزم اور حکمرانی کی دلیل نہیں، دلوں کو تسخیر کر کے ان پر حکومت کرنے ہی میں اچھی نیشنلزم اور حکمرانی کا ثبوت دیا جاسکتا ہے۔

اردو ملک کے دستور میں ایک تسلیم شدہ زبان ہے، یہ صحیح ہے کہ یہ کسی علاقہ کی اکثریت کی زبان نہیں، انگریزی بھی یہاں کسی علاقہ کی زبان نہیں مگر اس کو ہمارے ملک کے اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور سرکاری دفتروں میں اپنے حق سے زیادہ باعزت جگہ دی جارہی ہے محض اس لیے کہ یہ ایک بین الاقوامی زبان ہے، اگر تعصب کی عینک آنکھوں پر نہ ہو تو اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اردو ملک گیر یعنی آل انڈیا بین المملکتی زبان نہیں ہے، اب تو اس میں بین الاقوامیت بھی پیدا ہورہی ہے اور سب سے بڑھ کر تو یہ ہندوستان کے میل ملاپ کی زبان ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزی زبان نے ہمارے ملک کو اونچا کیا ہے تو اردو نے اس کو مہذب بنایا ہے، انگریزی زبان یہاں معزز جگہ پاسکتی ہے تو پھر اردو اس سے زیادہ باعزت جگہ پانے کی مستحق ہے۔

اردو بولنے والوں کے مطالبات کو غیر معمولی بلکہ حقارت آمیز اعصابی جنگ کے ذریعہ سے جس طرح اب تک ٹھکرایا گیا ہے، اس کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرنے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں ہمارے وطن کے بہت بڑے سیکولرسٹ اور محب وطن رہنما مولانا ابوالکلام آزاد ہماری رہنمائی کر چکے ہیں، ۱۹۵۲ء میں لوک سبھا میں ہندی کے بڑے پریمی پرشوتم داس ٹنڈن نے ان پر اردو نوازی کا الزام رکھا تو انہوں نے اسی ایوان میں ایک بہت ہی پرزور اور جاندار تقریر میں فرمایا کہ اردو زبان کسی ایک مذہبی گروہ کی زبان نہیں ہے، اس کے بولنے والوں میں ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں اور سکھ بھی ہیں اور مان لیجیے کہ صرف مسلمان ہی اردو بولتے ہیں گو کہ یہ صحیح نہیں، پھر بھی جو کروڑوں مسلمان یہاں بستے ہیں ان کی خاطر اس زبان کی کوئی خدمت کی جائے تو کون ایسی چیز ہے

جس کو بہت زیادہ محسوس کیا جائے۔

اسی سلسلہ میں مولانائے محترم نے یہ بھی فرمایا کہ جو لوگ اردو کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس لیے نہیں کرتے کہ ان کو ہندی سے محبت ہے بلکہ اس لیے کہ وہ یہ نہیں دیکھنا چاہتے کہ کوئی اور دوسری زبان بڑھے، یہ جذبہ صحیح نہیں، ہندی بولنے والے زیادہ سے زیادہ اپنے قد کو اونچا کرلیں لیکن وہ کیوں چاہتے ہیں کہ دوسرا ٹھگنا ہو جائے، انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ جہاں تک ہندی کا تعلق ہے کوئی ایک آدمی بھی شمالی ہند میں ایسا نہیں ہے جو ہندی کی ترقی نہ چاہتا ہو یا ہندی کا مخالف ہو، جو لوگ ہندی نہیں جانتے وہ بھی اپنے بچوں کو ہندی پڑھا رہے ہیں مگر ہندی کے ترقی کے راستہ میں کوئی رکاوٹ ہے تو ایسے دماغوں کی طرف سے ہے جو دوسری زبانوں کو آگے بڑھنے کا موقع دینا نہیں چاہتے بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ باقی نہ رہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہندی کی ترقی نہیں چاہتے بلکہ دوسری زبانوں کی گراوٹ چاہتے ہیں، یہ جذبہ غلط ہے، پھر اسی تقریر کو ختم کرتے ہوئے بڑی آزردگی کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ میں بہت صاف صاف کہوں گا کہ ہندوستان پر جو مصیبت ٹونیشن تھیوری کی آئی یا پاکستان بنانے کے پوائنٹ آف ویو اور پاکستان بننے کی جو مصیبت آئی اس کی جتنی ذمہ داری گمراہ مسلمانوں اور مسلم لیگ پر ہے اتنی ہی ذمہ داری اس طرح کے دماغوں پر بھی ہے۔

ان دلائل سے ہمارے وطن کا وہ طبقہ ضرور متاثر ہوگا جو سیکولرزم، قومی یک جہتی اور وطن دوستی کا قائل سچے دل سے ہے۔ ایسے ہی فراخ دل محبان وطن کی نیشنلزم سے ہمارے ملک میں محبت کی گنگا، یگانگت کی جمنا اور موانست کی برہم پتر بہنے کی امید ہے، مگر اسی ملک میں ایک انتہا پسند، تنگ نظر اور ناعاقبت اندیش طبقہ ایسا بھی ہے جو ہندوستان کو ہندواستھان تصور کرتا ہے، اس کی نیشنلزم کا تخیل یہ ہے کہ یہاں غیر ہندو اسی کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر اکتفا کریں، اگر وہ بھکاری بن کر کبھی بھیک مانگیں تو ان کی زاری اور بے مقداری کے پیالہ میں جو کچھ ڈال دیا جائے اسی پر قناعت کریں، سوچنا یہ ہے کہ کیا ایسی ہی نیشنلزم میں وطن کا مفاد ہے جس سے تفرقہ کا سیلاب، اختلاف کا طوفان اور نفاق کا جھکڑ امنڈ پڑنے کا خطرہ ہو۔ (معارف جولائی ۱۹۸۵ء)

مطلقہ کا نفقہ

سپریم کورٹ کے فاضل ججوں نے مسلمان مطلقہ عورت سے متعلق جو فیصلہ دیا ہے، اس کا

پورا متن جون ۱۹۸۵ء کے کریمنل جرنل میں شائع ہوا ہے، وہ پیش نظر ہے۔

اس فیصلہ کے دو جز ہیں، ایک میں مسلمان مطلقہ عورت کو اس کی دوسری شادی تک نان نفقہ کا حق دلایا گیا ہے، دوسرے میں مشترکہ سول کوڈ پر زور ہے، مطلقہ عورت کی ہمدردی میں جو فیصلہ ہے اس میں ایک فاضلانہ اور محققانہ علمی مقالہ کا رنگ پیدا ہو گیا ہے، لیکن اس پر اصحاب تحقیق اور ارباب نظر ہی اچھی طرح غور کر سکتے ہیں۔ بنیادی بات تو یہ ہے کہ اس قسم کے مذہبی معاملات میں ایڈ ورڈ ولیم، لین، آرتھر آربری حتی کہ طیب جی اور ملا کی تحریروں کے حوالے مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتے، سر ظفر اللہ کی رائے بھی مستند نہیں مانی جا سکتی، جن کا مسلمان ہونا ہی متنازعہ فیہ بن گیا ہے، عبد اللہ یوسف علی اور مارماڈیوک پکتھال کے ترجمے ضرور مستند ہیں لیکن قرآن فہمی کا اصول یہ ہے کہ جب کسی آیت کے مفہوم میں دو رائے پیدا ہو جانے کا احتمال ہو تو پھر ان مفسرین کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے جو رجوع کرنے والوں کے مسلک کے ہوں۔

فاضل ججوں نے قرآن مجید کی اس آیت پر اپنا فیصلہ صادر کر دیا ہے:

وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (بقرہ:۲۴۱)

اس کے مختلف ترجمے دیے گئے ہیں اور کچھ تفسیریں بھی پیش کی گئی ہیں، ان میں آرتھر آربری کی تصریح بھی شامل ہے جو مسلمانوں کے لیے قابل اعتنا نہیں۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کے مستند علما نے اس آیت کے جو معانی اور مطالب پیش کیے، ان کو فاضل ججوں نے رد کر دیا، اس لیے کہ ان کے نزدیک یہ قابل قبول نہیں تھے لیکن فیصلہ میں جن حوالوں کا سہارا لیا گیا ان کو مسلمانوں کا سوادِ اعظم غیر مستند قرار دے کر رد کر دے تو کیا یہ فاضل ججوں کے لیے قابل قبول ہوگا؟

اس آیت میں 'متاع بالمعروف' سے کیا مراد ہے اور کلام مجید میں کس موقع اور کس کے لیے کہا گیا ہے، وہ غور طلب ہے۔ کلام مجید میں ہر قسم کی طلاق کے احکام کا ذکر کرنے کے بعد یہ آیت درج ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد بہت ہی روشن خیال اور فراخ دل مفسر قرآن سمجھے گئے ہیں، وہ اس آیت کا ترجمہ یہ کرتے ہیں کہ "(یاد رکھو) جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہو تو چاہیے کہ انہیں مناسب طریقہ سے فائدہ پہنچایا جائے، متقی انسانوں کے لیے ایسا کرنا لازمی ہے"۔ وہ اس کی یہ بھی تشریح

کرتے ہیں کہ ”یعنی ان کے ساتھ جس قدر حسن سلوک کیا جا سکتا ہے، کیا جائے“۔ (ترجمان القرآن، ج۱،ص ۲۹۰) ’متاع بالمعروف‘ سے حسن سلوک مراد ہے نہ کہ نان نفقہ۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ ’متاع‘ کی تین قسمیں ہیں: واجب، مستحب اور نہ واجب نہ مستحب، واجب ایسی مطلقہ کے لیے ہے جس سے خلوت صحیحہ نہیں ہوئی اور نہ ہی مہر مقرر ہوا اور مستحب اس مطلقہ کے لیے جس کو خلوت صحیحہ کے بعد طلاق دی گئی اور نہ واجب اور نہ مستحب اس مطلقہ کے لیے ہے جس سے خلوت صحیحہ نہیں ہوئی لیکن مہر مقرر تھا۔ متاع بالمعروف ہی کے سہارے فاضل ججوں نے اپنا فیصلہ صادر فرمادیا ہے لیکن کسی مفسر کے نزدیک متاع بالمعروف سے نان نفقہ مراد نہیں ہے، حسن سلوک کی توتوجیہ کی گئی ہے مگر حسن سلوک کا درجہ فرض کا نہیں۔

فاضل ججوں نے احادیث کے بھی حوالے دیے ہیں، قرآن مجید اور احادیث مقدسہ کی تفسیر، تعبیر اور تشریح بڑی احتیاط اور ذمہ داری سے کی جاتی ہے، اسی لیے یہ حق صرف جید اور مستند علما کو دیا گیا ہے، جو چیز نص قرآنی سے ثابت ہو اس کے خلاف کوئی بات یا رائے یا فیصلہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں، اس کے خلاف اسلامی حکومت کے قاضی القضاۃ کو بھی فیصلہ دینے کا حق نہیں، اسلامی حکومت بھی چاہے تو اس میں ترمیم نہیں کرسکتی، اجماع امت بھی اس کو نظرانداز نہیں کرسکتا، ہماری سیکولر حکومت کے دائرہ سے تو یہ دستوری، قانونی اور اخلاقی لحاظ سے بھی باہر کی چیز ہے۔

مسلمان مطلقہ عورت کی کفالت کی ذمہ داری اس کے بالغ بیٹوں پر عائد ہوتی ہے، اگر اس کے بیٹے بالغ نہ ہوں تو اس کے باپ اور بھائی اس کی کفالت کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور اگر وہ بالکل لاوارث ہو تو پھر اس کی کفالت کی ذمہ داری حکومت پر ہو جاتی ہے بشرطیکہ اسلامی حکومت ہو، مسلمان عورتوں کی فلاح و بہبود سے متعلق قرآن پاک اور احادیث شریفہ میں ہر قسم کی ہدایتیں موجود ہیں، مسلمان اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے کیا مدارج اور کیا حقوق ہیں، گذشتہ چودہ سو سال سے ان ہی ہدایتوں کی بدولت اس کشمکش گاہِ عالم میں مسلمانوں کے لیے یہ عورتیں مرکز لطف و محبت اور مایۂ سکون بنی ہوئی ہیں، اس میں کسی عدالتی فیصلہ اور مشترکہ سول کوڈ کے ذریعہ سے خلل نہ ڈالا جائے۔

ان صفحات میں بارہا کہا گیا ہے کہ قومی یکجہتی ملک کے لیے بے حد مفید ہے، ہر محب وطن اس کا قائل ہے لیکن اس کو بروئے کار لانے کی مہم ایسی نہ بنادی جائے جس سے بیزاری، بے چینی اور

بددلی پیدا ہوجائے، جو ملک کے لیے بالکل مفید نہیں، حکومت تو ایسی ہو جس کے اندر ہر باشندہ چاہے جس مذہب اور عقیدہ کا ہو بہ طیب خاطر زبان حال سے کہتا نظر آئے ع

جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

(معارف اگست ۱۹۸۵ء)

بابری مسجد کا تالہ کھول دیا گیا

اجودھیا کی بابری مسجد کا تالا کھول دیا گیا، ہندوؤں نے خوشی میں چراغاں کیا اور مسلمانوں نے اپنے غم و غصہ کے اظہار میں گھروں پر سیاہ جھنڈے لہرائے اور بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھیں۔

ملک اور خصوصاً اتر پردیش میں اس سے ہندو مسلمانوں میں جو کشیدگی پیدا ہوگئی ہے، اس سے ان سطروں میں بحث نہیں، اس واقعہ پر یوپی کے مشہور اخبار "پانیر" کی چار اشاعتوں میں ۹ فروری ۱۹۸۶ء میں جو ایک مضمون شائع ہوا ہے اسی پر ایک نظر ڈالنا ہے، اس کی جلی سرخیاں بظاہر صلح کل انداز کی ہیں مگر اس میں جو تاریخی واقعات تاریخوں کے حوالہ سے قلم بند کیے گئے ہیں، اس کے تجزیہ کی ضرورت ہے تاکہ اس سے جو تاریخی غلط فہمیاں پیدا ہورہی ہیں وہ دور ہوجائیں، کالم نگار کا بیان ہے کہ مغل شہنشاہ بابر نے رام جنم بھومی کو ۱۵۲۸ء میں بابری مسجد میں بدل دیا، لیکن ایسا کرنے میں اس کو ہندوؤں کی پانچ شرطیں منظور کرنی پڑیں، جیسا کہ "توجک بابری" کے صفحہ ۵۳۲ پر ہے۔ (پانیر، ۱۱؍فروری، ص ۱)

مغل بادشاہوں کے عہد میں توجک بابری کے نام سے تو کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، اگر اس سے مراد 'تزک بابری' ہے تو اس کتاب کے صفحہ ۵۳۲ کا جو حوالہ دیا گیا ہے وہ معلوم نہیں کون سی تزک بابری کا ہے، یہ ترکی زبان میں قلم بند ہوئی جو کسی بھی ہندوستانی مورخ کے دسترس سے باہر ہے، اس کا ترجمہ فارسی میں اکبر کے عہد میں عبدالرحیم خان خاناں نے کیا، جو اب تک نہیں چھپا ہے، اس کا انگریزی ترجمہ اے۔ ایس۔ بیورج نے کیا جس کا نام اس نے 'دی بابر نامہ ان انگلش' رکھا، اس کا ترجمہ اردو میں بھی تزک بابری اردو معروف بہ بابر نامہ کے نام سے ہوا۔

'کالم نگار' نے اگر تزک بابری کے انگریزی ترجمہ کا حوالہ دیا ہے تو میرے سامنے اس کی پہلی اور دوسری جلدیں ہیں جو ۱۹۲۲ء میں چھپیں اور یہی علمی حلقہ میں پڑھی جاتی ہیں، اس کے ۵۳۲

صفحہ پر ایسی باتیں نہیں لکھی گئی ہیں جو کالم نگار نے لکھی ہیں، انگریزی ترجمہ کرتے وقت اس میں ترکی نسخہ کے صفحات بھی درج کردیے گئے ہیں جو ۳۸۲ پر ختم ہوجاتے ہیں۔ اردو ترجمہ ۳۶۴ صفحات پر مشتمل ہے، یہ تو نہیں معلوم کہ اس کا ہندی میں ترجمہ ہوا ہے کہ نہیں، کالم نگار کو وضاحت کرنی چاہیے تھی کہ آخر کس تزک بابری کا وہ حوالہ دے رہے ہیں، ہم ہندوستان کے مورخین اور محققین کی طرف سے پورے وثوق کے ساتھ کہنے کا پورا حق رکھتے ہیں کہ انہوں نے تزک بابری کے ص ۵۳۲ کے حوالہ سے جو کچھ لکھا ہے وہ صحیح نہیں ہے اور اگر صحیح ہے تو وہ بتائیں کہ کون سی تزک بابری کا یہ حوالہ ہے؟

کالم نگار نے اپنے ناظرین کو یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ رام جنم بھومی مندر کو منہدم کرکے بابر نے مسجد کیسے بنائی؟ ان کا بیان ہے کہ بابر نے رانگا سانگا سے پہلی جنگ آگرہ کے پاس فتح پور سیکری میں کی، اس وقت اودے پور کی سلطنت اجودھیا تک پھیلی ہوئی تھی، اس پہلی جنگ میں وہ شکست کھا گیا تو بھاگ کر اجودھیا چلا آیا، یہاں آکر وہ دو مسلم صوفی بزرگوں جلال شاہ اور خواجہ کجل عباس قلندری موسیٰ عاشکان (عاشقان) سے ملا، اول الذکر بزرگ نے اس کی کامیابی کے لیے دعائیں کیں جس کے بعد بابر نے فتح پور سیکری کی دوسری لڑائی جیت لی، وہ اجودھیا آیا، جلال شاہ کی دعاؤں کا صلہ دے کر اپنی ممنونیت کا اظہار کرنا چاہا تو جلال شاہ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ رام جنم بھومی گرا کر اس کی جگہ مسجد بنائی جائے، بابر نے ان کی خواہش پوری کی۔

کالم نگار نے اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ خواجہ کجل عباس (قزلباش) اور جلال شاہ دونوں مہاتما شیام نند جی کے چیلے تھے، اس وقت رام جنم بھومی کا نظم و نسق ان ہی کے سپرد تھا، یہ دونوں اپنے گرو کے آشیر بادوں کے ساتھ مسلمان ہوگئے تھے اور وہ مسلمانوں میں بہت مقبول ہوئے، جلال شاہ نے بابر سے کہا کہ رام جنم بھومی مندر ایک پوترا اور اوتاری جگہ ہے، اس کی جگہ پر ایک چھوٹا سا شہر آباد کر کے مسلمانوں کے لیے ایک 'خرد مکہ' بنایا جائے، بابر نے اپنے فوجی سردار میر بانکی (؟) کو حکم دیا کہ اس کی جگہ مسجد بنائی جائے، میر بانکی (؟) نے حکم کی تعمیل شروع کی، مگر مسجد کے لیے دن میں جو دیوار اٹھائی جاتی وہ رات میں گرجاتی، میر بانکی (؟) نے بابر کو اجودھیا آنے کی دعوت دی، تاریخ میں ہے کہ بابر نے یہاں آکر سادھوؤں اور مہاتماؤں کی پانچ باتیں منظور کرلیں جیسا کہ توجک بابری (تزک بابری) میں لکھا ہے:

جو باتیں بابر نے منظور کیں وہ یہ تھیں: ۱۔ مسجد کا نام سیتا باک ہوگا ۲۔ اس میں مینار نہیں ہوگا ۳۔ مسجد یعنی رام جنم بھومی کے پاس ہندوؤں کے لیے پری کرما بھی بنایا جائے ۴۔ اس کا بڑا پھاٹک صندل کا ہو ۵۔ ہندوؤں اور مہاتماؤں کو اس کے اندر پوجا کی آزادی ہو اور مسلمان اس میں صرف جمعہ کی نماز پڑھیں۔ کالم نگار یہ بھی لکھتا ہے کہ رام جنم بھومی کی خصوصی محراب پر فارسی کے کتبے ہیں اور کچھ منا (؟) زبان میں بھی ہیں، ان دونوں سے ظاہر ہے کہ یہ سیتا باک ہے، اس کا شمالی حصہ پھر سے بنایا گیا اور اب تک سیتا باک کے نام سے مشہور ہے۔

کالم نگار کے بیان کے مطابق یہ ساری باتیں تزک بابری میں درج ہیں، وہ تزک بابری کے ان صفحات کی نشاندہی کریں جہاں سے یہ ساری تفصیلات لی گئی ہیں ورنہ ہندوستان کے سارے مورخوں کو یہ کہنے میں تامل نہیں ہوگا کہ یہ ساری باتیں من گھڑت ہیں جن کا تعلق نہ تزک بابری اور نہ کسی مستند تاریخ سے ہے، یہ کہنا صحیح نہیں کہ بابر اور رانا سانگا کی لڑائیاں فتح پور سیکری میں ہوئیں، یہ بھی درست نہیں کہ یہاں دو لڑائیاں لڑی گئیں، صرف ایک لڑائی کنواہہ کے میدان میں ہوئی جس میں بابر کامیاب رہا اور اس بات میں افسانویت ہے کہ بابر پہلی جنگ میں ہارا تو اجودھیا آیا اور پھر یہاں کے بزرگوں کی دعائیں لے کر گیا تو کامیاب رہا اور پھر واپس آیا تو مسجد بنائی اور پھر ہندوؤں سے سمجھوتہ کیا، تزک بابری میں بابر نے اپنی زندگی کے تمام جزوی واقعات لکھے ہیں اتنے اہم واقعہ اور سمجھوتہ کو کیسے نظر انداز کرسکتا تھا، وہ اودھ ضرور آیا مگر وہ پورب کے افغان سرکشوں کو دبانے کے لیے یہاں پہنچا، وہ اس سلسلہ میں چین، تیمور سلطان، شیخ بایزید تروی بیگ، فوج بیگ، بابا جہرہ، باقی شقاول، لکھنؤ، گومتی، گھاگھرا اور سرود وغیرہ کا تو ذکر کرتا ہے مگر رام جنم بھومی، جلال شاہ اور خواجہ کجل شاہ کے نام تک نہیں لیتا ۔ (ترجمہ تزک بابری، اردو، ص ۳۰-۳۲۹، بابر نامہ از اے۔ ایس بیورج، ص ۷۰۲-۷۰۱، ۱۹۲۲ء (ایڈیشن) بابر یہاں مسلمانوں ہی سے لڑنے آیا تھا جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ علاقے ان کے زیر نگیں تھے، پھر معلوم نہیں کالم نگار نے یہ کیسے دعویٰ کیا ہے کہ اجودھیا تک رانا سانگا کی حکومت تھی۔

ابوالفضل کی اکبرنامہ، ملا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ، خافی خان کی منتخب اللباب، سجان رائے کی خلاصۃ التواریخ یا مغلوں کے دور کی کسی تاریخ میں رام جنم بھومی کے انہدام کا ذکر نہیں

ہے، الیٹ اینڈ ڈاوسن کی ہسٹری آف انڈیا، جلد ۴ میں تزک بابری کے کچھ اقتباسات ہیں، یہ دونوں مورخین مسلمانوں کی مندر شکنی کے واقعات کی تلاش میں رہتے ہیں، انہوں نے بھی تزک بابری کے اقتباسات میں رام جنم بھومی کے انہدام کا تذکرہ نہیں کیا ہے، ولیم ارسکن اور راش بروک ولیم نے بابر پر دو کتابیں لکھی ہیں جو یونیورسٹیوں کے نصاب میں ہیں، ان میں بھی اس انہدام کا ذکر نہیں۔

اے۔ایس بیورج نے تزک بابری کا جو ترجمہ انگریزی میں کیا اس میں اس نے بڑی محنت سے حواشی، ضمیمہ جات اور تعلیقات لکھے ہیں جن میں رام جنم بھومی مندر کے انہدام کا ذکر مطلق نہیں ہے اور نہ جلال شاہ، خواجہ کجل شاہ اور ہندوؤں سے بابر کے سمجھوتے کا ذکر ہے، البتہ اس کی دوسری جلد میں 'اجودھیا (اودھ) میں بابری مسجد کے کتبات' کے عنوان سے ایک ضمیمہ ہے، اس میں پہلے تو یہ تین اشعار نقل کیے گئے ہیں:

بفرمود شاہ بابر کہ عدلش بنایست تا کاخِ گردوں ملاقی
بنا کرد ایں مہبطِ قدسیاں را امیر سعادت نشاں میر باقی
بود خیر باقی چو سالِ بنایش عیاں شد کہ گفتم بود خیر باقی
(۹۳۵ھ)

اس کا مطلب یہ ہے کہ شاہ بابر کے حکم سے جس کی عدل پروری کاخِ گردوں سے ملتی ہے، اس کی بنا پڑی، امیر سعادت نشان میر باقی نے اس کو بنوایا جو ابِ فرشتوں کے اترنے کی جگہ ہے، خدا کرے یہ کارِ خیر باقی رہے، اسی لیے اس کی تعمیر کا سال "بود خیر باقی" (۹۳۵ھ) ہے۔

دوسرے کتبہ میں یہ تین اشعار ہیں:

بنامِ آں کہ دانا ہست اکبر کہ خالق جملہ عالم لامکانی
درودِ مصطفیٰ بعد از ستائش کہ سرور انبیائی دو جہانی
فسانہ در جہاں بابر قلندر کہ شد در دور گیتی کامرانی

ان اشعار میں پہلے اللہ تعالیٰ کو دانا، اکبر، جملہ عالم کا خالق اور لامکان کہا گیا ہے، پھر اس حمد کے بعد محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر درود بھیجا گیا ہے اور آپؐ کو دونوں جہان کی انبیائی کا سردار کہا گیا ہے، پھر آخری شعر میں کہا گیا ہے کہ بابر قلندر کا افسانہ دنیا میں پھیلا ہوا ہے، اس لیے کہ وہ اس دنیا میں

کامران رہے۔

اے۔ایس بیورج نے ان اشعار کی لفظی خوبیوں پر پورا تبصرہ کیا ہے مگر کہیں یہ نہیں لکھا ہے کہ یہ مسجد رام جنم بھومی کی جگہ پر بنائی گئی ہے اور نہ پانیر کے کالم نگار کے بیان کے مطابق ان کتبوں میں کہیں 'سیتا پاک' لکھا ہوا ہے۔

پانیر کے کالم نگار نے لکھا ہے کہ بابر کی مسجد ۱۵۲۸ء میں رام جنم بھومی مندر کو منہدم کرا کے بنائی گئی، ڈاکٹر راجندر پرساد سابق صدر جمہوریہ نے اپنی مشہور کتاب انڈیا ڈی وائڈڈ میں بابر کا وہ وصیت نامہ نقل کیا ہے جو اس نے اسی سال ہمایوں کے لیے لکھ کر چھوڑ رکھا تھا اور وہ یہ ہے:

> "اے فرزند! ہندوستان کی سلطنت مختلف مذاہب سے بھری ہوئی ہے، خدا کا شکر ہے کہ اس نے تم کو اس کی بادشاہت عطا کی، تم پر لازم ہے کہ اپنے لوحِ دل سے تمام مذہبی تعصّبات کو مٹا دو اور ہر مذہب کے طریقے کے مطابق انصاف کرو، تم خاص کر گائے کی قربانی کو چھوڑ دو، اس سے تم ہندوستان کے لوگوں کے دلوں کی تسخیر کر سکو گے، پھر اس ملک کی رعایا شاہی احسانات سے دبی رہے گی، جو قوم حکومت کے قوانین کی اطاعت کرتی ہے اس کے مندروں اور عبادت گاہوں کو منہدم نہ کرو، عدل و انصاف اس طرح کرو کہ بادشاہ رعایا اور رعایا بادشاہ سے خوش رہے، اسلام کی ترویج ظلم کی تلوار سے زیادہ احسانات کی تلوار سے ہو سکتی ہے، شیعوں اور سنیوں کے اختلاف کو نظر انداز کرتے رہو، ورنہ اسلام میں ان سے کمزوری پیدا ہوتی رہے گی، مختلف عقائد رکھنے والی رعایا کو اس طرح ان عناصر اربعہ کے مطابق ملاؤ، جس طرح کہ انسانی جسم ملا رہتا ہے تا کہ سلطنت کا ڈھانچہ اختلافات سے پاک رہے۔" (یکم جمادی الاولیٰ ۹۳۵ھ، انڈیا ڈی وائڈڈ، ص ۳۹، تیسرا ایڈیشن)

یہ تحریر اسی سال کی ہے جس میں 'پانیر کے کالم نگار' کے بیان کے مطابق رام جنم بھومی مندر کا انہدام ہوا، بابر کی اس رواداری اور فراخ دلی کے بعد کیسے یہ یقین کیا جا سکتا ہے کہ اس نے ایک مندر کو منہدم کرنے کے بعد ایک مسجد بنوا دی، پروفیسر شری رام شرما کی کتاب 'مغل امپائر ان انڈیا' کی جلد اول کے ص ۵۴ و ۵۵ پر بھی بابر کا یہ وصیت نامہ درج ہے، اسی لیے پروفیسر صاحب نے یہ بھی لکھا

ہے کہ ہم کو کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی ہے کہ بابر نے کسی مندر کو منہدم کیا، یا کسی ہندو کی ایذا رسانی محض اس لیے کی کہ وہ ہندو ہے۔(ایضاً ص ۵۵، ۱۹۴۵ء، ایڈیشن)

پانیر کے کالم نگار نے 'دیوان اکبری' کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اکبر نے بیربل اور ٹوڈرمل کو بھیج کر ہندوؤں کے سادھوؤں اور مہا تماؤں سے یہ سمجھوتہ کیا کہ وہ مسجد کے بائیں جانب ایک چبوترہ بنالیں جو رام مندر کہلائے گا، یہ ہندوؤں کے پوجا اور درشن کے لیے ہوگا، اکبر کو ایسا اس لیے کرنا پڑا کہ ہندوؤں نے کم سے کم بیس مرتبہ اس پر حملے کیے تھے، جیسا کہ دیوان اکبری سے ظاہر ہے، اکبر کے زمانہ میں دیوان اکبری کے نام سے کوئی تاریخ نہیں لکھی گئی، اگر اس سے آئین اکبری مراد ہے تو ہم پھر ہندوستان کے مورخوں کی طرف سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ آئین اکبری کے کسی صفحہ پر ایسی باتیں نہیں لکھی گئی ہیں، اس میں اودھ یعنی اجودھیا کے ذکر میں جہاں اور باتیں ہیں اس کے مذہبی تقدس کا ذکر صرف اتنا ہے کہ ہندوستان کی بڑی اور قدیم تیرتھ گاہ ہے، سواد شہر میں زمین کھودنے سے سونا نکلتا ہے، یہ شہر رام چندر کا مسکن تھا، رام چندر تریتا دور کے ظاہری و باطنی ہر دو عالم کے مشہور معنوی اور صوری فرماں روا گزرے ہیں۔(آئین اکبری، نول کشور پریس ایڈیشن، جلد دوم، ص ۷۸)

پانیر کے کالم نگار نے یہ بھی لکھا ہے کہ اورنگ زیب نے رام مندر کو ساتویں رمضان کو بالکل منہدم کر دیا، اس کے لیے عالمگیر نامہ، ص ۶۳۰ کا حوالہ دیا ہے، میرے سامنے عالمگیر نامہ ہے جو بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے شائع ہوئی ہے، یقین کامل کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کے صفحہ ۶۳۰ پر ایسی کوئی تحریر نہیں لکھی ہوئی ہے اور نہ اس کے کسی اور صفحہ پر اس چبوترہ کے انہدام کا ذکر ہے۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ بابری مسجد کی صرف اتنی حقیقت ہے کہ بابر کے ایک امیر میر باقی نے (جس کو کالم نگار نے میر بانکی لکھا ہے) اجودھیا میں مسلمانوں کے لیے ایک مسجد بنوادی تھی جس کا تعلق رام جنم بھومی کے انہدام سے کچھ بھی نہیں، اس مسجد پر قبضہ کرنے میں سیاسی استحصال کا رنگ پیدا ہو گیا ہے مگر اس رنگ کو پیدا کرنے میں غلط قسم کی تحقیقات اور تعبیرات سے ہندوستان کے علم، تحقیق اور تاریخ کے معیار کو بدنام نہ کیا جائے۔(معارف فروری ۱۹۸۶ء)

بابری مسجد ـــــ تالا کھلنے کے بعد

اجودھیا کی بابری مسجد کا تالا جب سے کھولا گیا ہے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جا بجا ایسی

خونریز کشیدگی پیدا ہوگئی ہے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد قومی یکجہتی اور متحدہ قومیت کا جو سبق پڑھایا گیا تھا وہ بالکل بھلا دیا گیا ہے۔

مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اگر ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کا کوئی استاد یہ ثابت کردے کہ بابری مسجد رام جنم بھومی مندر کو توڑ کر بنائی گئی تو ہم مسلمانوں سے اپیل کریں گے کہ وہ اجودھیا جاکر اس کو اپنے ہاتھوں سے منہدم کردیں کیونکہ کسی غاصبانہ قبضہ والی زمین پر مسجد بنانا اور وہاں نماز پڑھنا مسلمانوں کے لیے مذہباً ناجائز ہے، بنوامیہ کے زمانہ میں ولید بن عبدالملک نے دمشق میں ایک شاندار مسجد بنانے کا ارادہ ظاہر کیا، اس کے لیے زمین کی کمی پڑی تو اس نے پڑوس کے ایک گرجے کی زمین عیسائیوں سے مانگی، انہوں نے یہ کہہ کر زمین دینے سے انکار کیا کہ خوشی سے تو دے نہیں سکتے، زبردستی سے لی گئی تو لینے والے کو کوڑھ ہوجائے گا، ولید کو غصہ آگیا اور یہ کہہ کر زمین لے لی کہ دیکھیں کیسے کوڑھ ہوتا ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا زمانہ آیا تو عیسائیوں نے ان سے شکایت کی، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلفائے راشدین کے اسوۂ حسنہ پر چلتے تھے، انہوں نے حکم دیا کہ مسجد کا وہ حصہ جو گرجے کی زمین پر تعمیر ہوا ہے فوراً منہدم کرادیا جائے اور سرکاری خرچ سے گرجے کی تعمیر ہو۔

(خطبات شبلی، ص ۷۵۔ ۷۴)

اگر ہندو مورخین مستند اور معاصر تاریخوں سے یہ ثابت کردیں کہ یہ مسجد رام جنم بھومی مندر کی جگہ پر بنائی گئی ہے تو مسلمان وہی مثال پیش کرنے کے لیے تیار ہیں جو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے پیش کی تھی، مگر مسلمان غلط قسم کی تاریخی تحقیقات، دوراز کار قیاسات، گمراہ کن معلومات، حکومت کے بے جا فیصلے، اعصابی جنگ، اخبارات کے پروپیگنڈے سے مطمئن، مرعوب اور مغلوب نہیں ہوسکتے، غور کرنے کی ضرورت ہے کہ بابری مسجد کو بنے ہوئے چار سو تراسی برس گزر گئے، اس جگہ پر اس کے قائم رہنے کی وجہ سے کیا ہندو مذہب کے فروغ میں رکاوٹ پیدا ہوتی رہی یا ۱۹۴۹ء میں جب اس میں تالا لگادیا گیا تھا تو اس وقت سے اب تک اس تالا بندی کی وجہ سے ملک کی قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی میں ترقی نہ ہوسکی؟ کیا اس کا تالا کھولنے سے ملکی مفاد اور قومی بہاؤ میں رخنہ نہیں پڑا؟

یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ اور گنجلک نہیں تھا جتنا اب اس کو بنادیا گیا ہے، خود وطن دوست ہندو اس پر

سوچنے پر مجبور ہوگئے ہیں کہ جو کچھ ہورہا ہے کہاں تک صحیح ہے، دہلی کے ڈاکٹر آر۔ ایل شکلا نے اپنے ایک مضمون میں ایسی بات کا انکشاف کیا ہے جس سے راماین اور رام دونوں کی حیثیت مشکوک اور مشتبہ ہوجاتی ہے، وہ لکھتے ہیں: ’’راماین میں شروع میں صرف چھ ہزار اشلوک تھے، پھر بارہ ہزار اور آخر میں چوبیس ہزار ہوگئے، یہ آج تک پتہ نہیں چلایا جاسکا ہے کہ کن کن لوگوں کی طرف سے یہ اضافے ہوتے گئے، پھر اشلوک کے ان اضافوں سے تاریخ مرتب کرنا ممکن نہیں، رام چندر جی کا دور مہابھارت سے بہت پہلے اور حضرت عیسیٰؑ سے ڈھائی ہزار سال پہلے بتایا جاتا ہے۔ مہابھارت کی لڑائی حضرت عیسیٰؑ سے ایک ہزار سال پہلے ہوئی، پھر راماین میں جن جگہوں کا ذکر ہے وہاں انسانی آبادی کا نشان ملنا چاہیے، اس کی تلاش میں اتر پردیش میں تین جگہوں پر کھدائی ہوئی، فیض آباد ضلع میں اجودھیا، پھر الہ آباد سے ۳۵ کلومیٹر اتر کی طرف شرنگویر پور اور پھر الہ آباد شہر میں بھاردواج آشرم میں ہوئی، آج سے تقریباً پچیس سال قبل وہاں جو کھدائی ہوئی اس سے وہاں انسانی آبادی کے نشان حضرت عیسیٰؑ سے چھ سو سال سے اوپر کے زمانہ کے نہیں ملے، پھر دس سال پہلے وہاں جو کھدائی ہوئی تو حضرت عیسیٰؑ سے سات سو سال پہلے کے کچھ نشانات ملے، اب اگر یہ مان لیا جائے کہ یہی اجودھیا رام کا شہر تھا اور یہیں ان کی جنم بھومی ہے تو رام کا ڈھائی ہزار سال پہلے کا زمانہ اجودھیا کے پتہ چلائے ہوئے آثار سے میل نہیں کھاتا۔

ڈاکٹر شکلا لکھتے ہیں کہ بودھ کے زمانہ میں اجودھیا میں جو حکومت قائم ہوئی اس کے نشانات کا تو پتہ چلتا ہے مگر اس سے پہلے کی حکومت اور تہذیب کے آثار کا بالکل پتہ نہیں ہے، اس لیے جو لوگ اجودھیا میں کسی جگہ کو رام جنم بھومی مانتے ہیں ان کی تائید نہ تو تاریخ اور نہ آثار قدیمہ سے ہوتی ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ راماین کے اجودھیا اور موجودہ اجودھیا میں بڑا فرق ہے، راماین میں ہے کہ کوسل کا دارالسلطنت ایودھیا سرجو ندی کے کنارے پر ضرور تھا مگر ندی سے کافی دور ساڑھے تیرہ میل پر تھا مگر آج کا ایودھیا ندی سے بالکل قریب ہے، راماین میں یہ بھی ہے کہ سرجو ندی مغرب کی جانب بہتی ہے اور گنگا سے کچھ دور ہے مگر آج کل یہ ندی پورب کی جانب بہتی ہے اور یہ راپتی میں نہ کہ گنگا میں جاکر ملتی ہے، ڈاکٹر شکلا نے یہ بھی پورے وثوق کے ساتھ لکھا ہے کہ راون اور رام کی لڑائی کا ثبوت بھی کتبے اور آثار قدیمہ سے نہیں ملتا، وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ راماین میں ذکر ہے کہ

شرنگویر پور میں گنگا پار کر کے رام بھاردواج آشرم گئے مگر ان دونوں جگہوں کی کھدائی ہوگئی ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ سے سات سو سال پہلے کی انسانی آبادی کا پتہ نہیں چلتا ہے۔

رام چندر جی کی شخصیت اور اہمیت راماین ہی سے متعین ہوتی ہے، اس سے پہلے ان کا ذکر کہیں اور نہیں آتا، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ راماین کب اور کیسے لکھی گئی؟ آج سے انچاس برس پہلے اسی رسالہ معارف میں اس پر بحث چھڑی تھی، راماین کا تجزیہ کرتے ہوئے راج مندری (دکن) کے مسٹر ملادی وین کٹارتنام سابق وائس چانسلر گورنمنٹ ٹریننگ کالج راج مندری نے ایک کتاب ''رام مصر کا فرعون'' کے نام سے لکھی ہے، اس میں انہوں نے ایسی باتوں کا انکشاف کیا ہے کہ جن کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، ان کا خیال ہے کہ راماین ایک مصری فرعون رامیسز ثانی کے قصہ سے ماخوذ ہے، خود رام کا نام ہندی الاصل نہیں بلکہ سامی الاصل ہے، سیریا کے ایک بادشاہ کا یہی نام تھا، راماین کا دوسرا زبردست کردار سیتا جی ہیں، راماین ہی کا بیان ہے کہ یہ نام اس لیے پسند کیا گیا تھا کہ جنک نے ہل چلاتے وقت ان کو پایا تھا، بہ الفاظ دیگر وہ کسی عورت کے بطن سے پیدا نہ ہوئی تھیں بلکہ دھرتی ماتا کی اولاد تھیں، لیکن سیتا ایک بہت ہی قدیم مصری نام ہے، وہاں اب بھی دولت مند خواتین کے نام کے ساتھ عزت اور ادب کے لحاظ سے اس کو لگا دیا جاتا ہے، قاہرہ میں آج بھی ایک مسجد سیتا زینب کہلاتی ہے، دین کٹارتنام نے اسی طرح راماین کے اور ناموں کی تطبیق مصری ناموں سے کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم آثار میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی جس سے ثابت کیا جائے کہ رام چندر جی نے کسی خطہ پر حکومت کی، یہ ایک مصری کہانی ہے جس کو ہندوؤں کے مزاج کے مطابق ایک مقدس رنگ دے دیا گیا ہے، یہ خیال کہاں تک صحیح ہے اس سے ہم کو بحث نہیں، مگر ملادی دین کٹارتنام نے اس کی تصنیف کا جو زمانہ متعین کیا ہے اس سے ضرور دلچسپی ہے۔

دین کٹارتنام کا دعویٰ ہے کہ راماین میں بودھ مت کے حوالے اکثر جگہ موجود ہیں، مثلاً جب رام اور لکشمن وشوامتر رشی کے ساتھ راکششوں کو قتل کرنے جا رہے تھے اور متھلا پہنچے تو گوتم کے سب سے بڑے بیٹے ستانند سے ملاقات ہوئی، اس کے معنی یہ ہوئے کہ رام چندر جی گوتم بدھ کے بعد ہوئے کیا یہ صحیح ہے؟ یا راماین کی یہ روایت صحیح نہیں ہے؟ اگر اس میں گوتم بدھ کے لڑکے کا ذکر ہے تو یہ تصنیف چھٹی صدی عیسوی کی قرار دی جاسکتی ہے اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ رام چندر جی حضرت عیسیٰؑ سے

ڈھائی ہزار سال پہلے پیدا ہوئے تو پھر رامائن ان کے تین ہزار سال کے بعد لکھی گئی، جو کتاب کسی معاصر ماخذ یا مستند اثری اور کتبی شہادتوں کے بغیر قلم بند ہوتی ہے اس میں سنی سنائی ہوئی روایتوں کا سہارا زیادہ ہوتا ہے جس میں مورخوں کے نزدیک تاریخیت نہیں ہوتی۔

دین کٹارتنام لکھتے ہیں کہ خود رامائن میں ہے کہ نرد پہلا شخص ہے جس نے بالمیک کو یہ افسانہ سنایا، اس میں اس نے کیسی رنگ آمیزی کی، اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بالمیک ہندو نہ تھا، کوئی بدیسی نووارد تھا، رامائن میں یہ بھی ہے کہ نرد برہما کا بیٹا تھا جس کو رام کا قصہ سنانے کے لیے برہما نے بالمیک کے پاس آسمان سے بھیجا، جس کے بعد وہ پھر آسمان کی طرف چلا گیا مگر رامائن میں ایک جگہ یہ بھی ہے کہ چترکوٹ میں بالمیک اور رام چندر کی ملاقات ہوئی، رام چندر جی نے اپنا جو قصہ سنایا، اسی کو بالمیک نے قلم بند کر دیا، وین کٹارتنام لکھتے ہیں کہ اس تضاد کا اندازہ خود مورخین کر سکتے ہیں، وین کٹارتنام جو چاہیں لکھ دیں مگر ہندو رامائن کو ایک آسمانی صحیفہ سمجھتے ہیں تو ہم کو ان کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہوئے اس پر زیادہ بحث کرنے کا حق نہیں۔

رامائن میں جو عجیب و غریب واقعات لکھے گئے ہیں، دین کٹارتنام نے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے، وہ لکھتے ہیں: ''بال کھنڈ میں سیتا اور رام کی شادی کے وقت جو نسب نامہ دیا گیا ہے وہ یہ کہ وشنو سے برہما جی پیدا ہوئے، برہما کے لڑکے اکش وشنو تھے، اکش وشنو کے بیٹے دسرتھ تھے جو رام چندر جی کے باپ تھے، دسرتھ نے ساٹھ ہزار سال تک حکومت کی اور رام چندر گیارہ ہزار برس تک تخت نشین رہے، راون کے دس سر تھے، رام کا حریف و مقابل راون تھا جو رامائن کے تمام افراد میں سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے کیونکہ وہ ایک برہمن اور ویدوں کا مفسر بھی بتایا جاتا ہے، راون کا ماخذ سنسکرت کا لفظ ''راو'' بتایا گیا ہے جس کے معنی ہیں چلانا یا پکارنا، اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ راون اور شیو میں جنگ ہوئی، راون نے اس پہاڑ کو جس پر شیو جی بیٹھے ہوئے تھے اکھاڑ کر آسمان کی طرف پھینک دیا، شیو جی نے غصہ میں پاؤں کے انگوٹھے سے پہاڑ کو دبایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ پھر زمین پر آ گرا اور راون کا ہاتھ اس کے نیچے دب گیا اور وہ چلانے لگا، اور آخر شیو جی نے ترس کھا کر راون کا ہاتھ نکال دیا، اس وقت سے راون شیو جی کا معتقد ہو گیا اور جب ہی سے راون کہلایا، ''دس کنتھ'' اور ''دس گریو'' اس کا لقب ہے، کیونکہ رامائن کے مطابق وہ دس سروں والا انسان تھا

اور جب رام چندر جی سے جنگ ہو رہی تھی تو اس کا ایک سر کٹنے کے بعد اس کی جگہ نیا سر پیدا ہو رہا تھا، یہاں تک کہ رام چندر جی کی تلوار نے ایک سو ایک سر کاٹ ڈالے، اسی لڑائی کے ذکر میں ہے کہ بندروں نے رام چندر جی کی حمایت کی اور وہ ہمالیہ سے پتھر لاتے تھے اور آسمان تک لے جاتے تھے اور سمندر کو ایک جست میں پھاند جاتے تھے، ایسے تمام واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے دین کٹارتنام لکھتے ہیں کہ یہ خلاف عقل بیانات شاعرانہ تخیل کے لیے تو جائز سمجھے جاسکتے ہیں لیکن تاریخ کیا افسانہ کے معیار سے بھی گر جاتے ہیں، پھر اپنی طرف سے یہ کہنا کہ جب ہندو ان باتوں کو سچ سمجھ کر ان پر مذہبی اعتقاد رکھتے ہیں تو ہمارے لیے اس پر جرح وقدح کی گنجائش نہیں، البتہ اس کی طرف خیال ضرور جاتا ہے کہ اگر رامائن کے مطابق راجہ دسرتھ اور رام چندر جی کی حکومت اکہتر ہزار سال رہی تو پھر عام روایت جو یہ ہے کہ ان کا زمانہ حضرت عیسیٰؑ سے پچیس ہزار سال پہلے تھا تو دونوں کی حکومت کو سامنے رکھتے ہوئے ان کا عہد حضرت عیسیٰؑ سے چھیانوے ہزار سال پہلے رکھنا ہوگا۔

دین کٹارتنام یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے آثار الصنادید بھی کوئی چیز ایسی نہیں پیش کر سکتے جس کو رام چندر جی کی یادگار کہا جاسکے، چترکوٹ، رام ٹیک، پنچ وتی، غرض تمام ایسے مقامات پر جن کو رام کے گزرگاہ ہونے یا قیام کا شرف حاصل ہوا ہے، سوائے ان مندروں کے جو عقیدت مندوں نے بعد میں تعمیر کر دیے ہیں بلکہ اکثر مقامات کا وقوع بھی مشتبہ ہے کیونکہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی صوبہ ایسا ہو جہاں کے دو چار مقامات پر رام کا گزرنا مروی نہ ہو، گوداوری کے قریب بہت دور مشرق کی طرف ہٹا ہوا ایک اور مقام ''پرنا سالہ'' نامی بھی رام کی قیام گاہ بتائی جاتی ہے، پرنا سالہ اور پنچ وتی یہ دونوں مقام وہ ہیں جہاں سے کہا جاتا ہے کہ راون سیتا کو لے گیا، یہ دعویٰ ان تمام مقامات کی فرضی حیثیت پر روشنی ڈالتا ہے جن کو رام کے سفر وحضر سے منسوب کیا جاتا ہے۔

دین کٹارتنام یہ بھی لکھتے ہیں کہ دسرتھ کی ایک بڑی سلطنت کوسل نامی دریائے سرجو کے کنارے واقع تھی، اس کا دارالسلطنت اجودھیا تھا، جس کو خود منو نے آباد کیا تھا، اس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں اور ایک ناقابل عبور خندق اس کی حفاظت کے لیے تھی، یہاں ایسے ایسے آلاتِ حرب موجود تھے جو ایک دم سو سو آدمیوں کو ہلاک کر سکتے تھے، کئی محل، بہت سی منزلیں اور عمارتیں اس کی رونق تھیں، اجودھیا کا یہ شہر دنیا میں جواب نہ رکھتا تھا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دین

کٹارتنام لکھتے ہیں کہ شہر اجودھیا کی عظمت وخوبصورتی اور استحکام کا جو ذکر ہے اس کے لیے گواہی دینے والی ایک اینٹ بھی موجود نہیں، اجودھیا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، ممکن ہے یہاں کچھ بدیسیوں نے آکر نوآبادی قائم کرلی ہو اور اس سے رام کی روایت ملک میں پھیل گئی۔

راماین پر اس قسم کی تنقیدیں ہندوؤں کو ضرور ناگوار گزریں گی، مگر یہ ہندوؤں کی ہی لکھی ہوئی ہیں، اس لیے وہ غور وفکر کی دعوت ضرور دیتی ہیں اور اگر راماین میں جو کچھ لکھا ہوا ہے اس کو وہ اپنے سینے سے لگائے رکھنا ہی پسند کرتے ہیں تو اس میں کسی قسم کی مداخلت کی ضرورت بھی نہیں، وہ راماین کو ایک مقدس کتاب اور اجودھیا کو ایک پوتر استھان ضرور سمجھیں، مگر خدارا اجودھیا کی کسی تاریخی چیز اور خصوصاً بابری مسجد کو غلط قسم کے تاریخی حوالے دے کر اس طرح متنازعہ فیہ نہ بنادیں جس سے ملکی مفاد اور جذباتی ہم آہنگی خطرہ میں پڑ جائے اور ملک میں ہر طرف نفرت کی آگ بھڑکتی ہوئی دکھائی دے۔

(معارف مارچ ۱۹۸۶ء)

بابری مسجد کا قضیہ

اجودھیا کی بابری مسجد کا قضیہ جاری ہے، فیض آباد کی ایک زیریں عدالت کے فیصلے سے ہندوؤں کا اس پر قبضہ ہوگیا ہے، مسلمانوں نے اس کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی ہے۔

اگرچہ یہ مسجد برادران وطن کے قبضہ میں آگئی اور انہوں نے اس کو شہید کر کے مندر بنادیا تو ان کو محبان وطن کی حیثیت سے بڑے ٹھنڈے دل سے سوچنا ہوگا کہ اس کے بعد انہوں نے کیا پایا اور کیا کھویا، کیا اس سے ہندو مذہب کا از سر نو احیا ہو جائے گا؟ کیا ہمارے برادران وطن کے سر تمام دنیا میں اونچے ہو جائیں گے؟ کیا اجودھیا رام چندر جی کی جنم بھومی کی حیثیت سے ایک بار پھر اپنی پرانی عظمت کے ساتھ لوگوں کی نظروں کے سامنے آجائے گا؟ راماین کے بیان کے مطابق اجودھیا چھیانوے ہزار سال سے آباد ہے، اس طویل مدت میں اس کو دنیا کی بہترین تیرتھ گاہ بلکہ سیاحوں، زائروں اور تماشائیوں کے لیے جنت نگاہ اور مینو سواد ہونا چاہیے مگر یہ شہر جس حال میں ہے، وہ دیکھا جاسکتا ہے۔ ہماری حکومت کے بیرونی مہمان اس ملک کے بہت سے قابل دید مقامات کی سیر کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں مگر کوئی بیرونی مہمان اجودھیا دیکھنے کے لیے نہیں بھیجا جاتا، کیا بابری مسجد اس تیرتھ گاہ تک پہنچنے میں رکاوٹ پیدا کرتی رہی، کیا اس کے منہدم ہونے کے بعد اجودھیا کو وہ سب کچھ

حاصل ہوجائے گا جواب تک نہیں ہوسکا ہے۔

اور اگر ایسا نہ ہوسکا تو یہ سوچنے کی بات ہے کہ اس مسجد کے انہدام سے کیا نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے مسلمانوں کی دل آزاری نہ ہوگی، کیا اس سے ہندوستان کی نیک نامی میں اضافہ ہوگا، گذشتہ ۷۳ سال سے قومی یکجہتی، جذباتی ہم آہنگی اور سیکولرزم کی جو تعلیمات دی گئی ہیں کیا وہ برقرار رہ سکیں گی؟ کیا ہندوستان کے مسلمان یہ سوچنے پر مجبور نہ ہوجائیں گے کہ جب ان کی عبادت گاہیں محفوظ نہیں ہیں تو ان کا وجود کیسے محفوظ رہ سکے گا؟ قومی بہاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ ملک کی اکثریت اپنی اقلیتوں کے دلوں کو اپنی رواداری، فراخ دلی، سیرچشمی بلکہ جھک کر تسخیر کرے، نہ کہ اپنے اقتدار اور حکومت کے زعم میں ان کو آزردہ، دلگیر اور غیر مطمئن رکھے، قومی بہاؤ اور حب الوطنی کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر چیز میں یکسانیت پیدا کی جائے، سکھوں نے تہذیبی اور تمدنی حیثیت سے وہ ساری چیزیں اختیار کر لی تھیں جو آج کل کے قومی بہاؤ کے علم بردار چاہتے ہیں مگر وہاں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے سبق سیکھا جاسکتا ہے۔

اور اگر بابری مسجد کا قضیہ صرف اس لیے اٹھایا گیا ہے کہ یہ ظاہر کیا جائے کہ مسلمان اپنے دور حکومت میں صرف مندروں کو منہدم کرتے رہے تو پھر یہ لکھنے میں بالکل تامل نہیں کہ ہندوستانی سیاست دانوں کا نہیں بلکہ مورخوں کا ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو یہ جائزہ لے کہ ہندوستان میں جب سے مسلمان آئے اس وقت سے اب تک مسلمانوں نے کتنے مندر منہدم کیے اور ہندوؤں نے کتنی مسجدیں شہید کیں، دونوں کے اعداد و شمار سے یہ فیصلہ ہوجائے گا کہ کون زیادہ قصوروار ہے؟

اب تو صاف اور غیر متعصب ذہن رکھنے والے ہندو مورخین اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں جو مندر منہدم کیے گئے وہ یا تو سرکشی کے مرکز یا معصیت کے اڈے تھے، ڈاکٹر ایشور ٹوپا نے اپنی کتاب پالی ٹکس ان پری موغل ٹائمس میں لکھا ہے کہ فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں بعض مندر بداخلاقی کے اڈے تھے، ان کے میلوں میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے، عورتیں بھی وہاں آتی تھیں اس لیے مندر عبادت گاہ کے بجائے شیطنت کے مرکز بن گئے تھے۔ فیروز شاہ تغلق نے اسلامی اور اخلاقی جذبے کے ماتحت ان مخرب اخلاق اڈوں کو منہدم کرا دیا، یہ ایک الگ سوال ہے کہ فیروز شاہ کو عوام کی بداخلاقی دور کرنے کا حق تھا یا نہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ فیروز

شاہ نے جو کچھ کیا اس میں مذہبی جنون کو دخل نہ تھا بلکہ عوام کے اخلاق کو سنوارنے کے لیے ایسا، اگر اس میں مندروں کو انہدام کرنے کا جذبہ ہوتا تو ہندوستان کے سارے مندروں کو برباد کرا دیتا۔لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، ذمیوں کے حقوق کی بنا پر تمام مندر محفوظ رہے۔ (ص ۳۴۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں غیر مسلموں نے آپؐ کی مملکت میں اگر آپ کی حکومت تسلیم کر لی تھی تو ان کو آپؐ نے یہ حقوق دیے تھے کہ ان کی جانیں، ان کا مذہب، ان کی زمینیں، ان کے اموال، ان کے حاضر و غائب، ان کے قافلے، ان کے سفرا، ان کی مورتیں، اللہ کی امانت اور اس کے رسولؐ کی ضمانت میں ہیں، ان کی موجودہ حالت میں کوئی تغیر نہ کیا جائے گا اور نہ ان کے حقوق میں سے کسی حق میں دست اندازی کی جائے گی اور نہ ان کی مورتیں بگاڑی جائیں گی، کوئی اسقف اپنی اسقفیت، کوئی راہب اپنی رہبانیت، کلیسا کا کوئی منتظم اپنے عہدہ سے نہ ہٹایا جائے گا، جو بھی کم یا زیادہ ان کے قبضہ میں ہے اسی طرح رہے گا، اس کے زمانۂ جاہلیت کے کسی جرم یا خون کا بدلہ نہ لیا جائے گا، ان سے فوجی خدمت نہ لی جائے گی اور ان پر عشر لگایا جائے گا اور نہ اسلامی فوج ان کی سرزمین کو پامال کرے گی، ان میں جو شخص اپنے کسی حق کا مطالبہ کرے گا اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ (فتوح البلدان، بلاذری، صفحہ ۶۷، مطبوعہ مصر، دین رحمت، مطبوعہ دارالمصنّفین، ۳۸۔۳۴۷) اسی پر صحابہ کرام کا عمل رہا اور اگر تعصب کی عینک اتار کر ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی روایت سندھ میں محمد بن قاسم کی آمد سے بہادر شاہ ظفر تک کے عہد تک قائم رہی، اگر اسلام کی ان تعلیمات کی کہیں اور کسی زمانے میں کسی سے خلاف ورزی ہوئی تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس جرم کا ارتکاب ہوا۔

ہاں اس کی مثالیں ضرور ملیں گی کہ ہندوستان میں کچھ مندر مسلمانوں کے عہد میں منہدم کیے گئے، مگر اس لیے نہیں کہ یہ ہندوؤں کی عبادت گاہیں تھیں بلکہ اس کے اسباب کچھ اور تھے جن کا تجزیہ غیر متعصّبانہ انداز سے کرنے کی ضرورت ہے، اورنگ زیب مندر شکنی کا سب سے بڑا مجرم قرار دیا جاتا ہے، برطانوی حکومت کے اشارہ سے جدوناتھ سرکار نے اورنگ زیب پر جو پانچ جلدیں لکھی ہیں ان میں اس کی مندر شکنی کی تفصیل پورے زور بیان کے ساتھ لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ اس نے اپنی شہزادگی اور بادشاہت کے زمانے میں سارس پور، چنتامن، احمد آباد، اورنگ آباد کے گاؤں ستارا،

سومناتھ، بنارس کے وشواناتھ، متھرا کے کیشو رائے مندر اور اجین کے مندر کو منہدم کرایا، ان کی گنتی کی جائے تو ان کی تعداد سات آٹھ سے زیادہ نہیں ہوتی، ان مندروں کے انہدام کا ذکر جدوناتھ سرکار اس طرح کرتے ہیں جیسے اورنگ زیب پورے ہندوستان کے مندروں کو منہدم کرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا مگر اس نے اپنی راجدھانی آگرہ اور دلی کے کسی مندر کو منہدم نہیں کیا اور حیرت تو یہ پڑھ کر ہوتی ہے کہ پچیس برس تک دکن میں رہا، وہاں اجنتا اور الورہ ہے جو اس کی آخری آرام گاہ سے میل دو میل پر واقع ہیں، ان کو اس نے مسمار نہیں کرایا بلکہ اس کا درباری مورخ یعنی مآثر عالمگیری کا مصنف ان کو نظر فریب سیرگاہیں کہہ کر ان کی تعریف کرتا ہے۔ (مآثر عالمگیری، ص ۳۳۸)

اورنگ زیب نے جن مندروں کو منہدم کیا، اس کے اسباب کے تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے، ڈاکٹر بی-ان پانڈے آج کل اڑیسہ کے گورنر ہیں، ان کی نظر ہندوستان کی تاریخ پر بڑی گہری ہے، اورنگ زیب نے بلا شبہہ وارانسی کے وشواناتھ مندر کو منہدم کرایا، اس انہدام کی نوعیت کی وضاحت جناب بی-ان پانڈے نے ۲۱ر جولائی ۱۹۷۶ء میں راجیہ سبھا کی ایک تقریر میں اس طرح کی کہ اورنگ زیب بنگال جارہا تھا تو وارانسی کے پاس سے بھی گزرا، اس کے جلو میں ہندو راجے بھی تھے، انہوں نے اورنگ زیب سے درخواست کی کہ یہاں ایک روز قیام کیا جائے تاکہ ان کی رانیاں وارانسی جاکر گنگا میں اشنان اور وشواناتھ جی کی پوجا کرسکیں، فوجی کیمپ سے وارانسی پانچ میل دور تھا، اورنگ زیب کے حکم سے فوج متعین کردی گئی، رانیاں پالکیوں میں روانہ ہوئیں، انہوں نے گنگا میں اشنان کیا اور وشواناتھ مندر میں پوجا کے لیے گئیں اور رانیاں واپس آگئیں مگر کچھ کی مہارانی لاپتہ تھی، ہر طرف اس کی تلاش ہوئی، کہیں نہیں ملی، اس گم شدگی پر اورنگ زیب بہت برہم ہوا، اس نے مہارانی کی تلاش میں اپنے اونچے عہدیداروں کو مندر کے اندر بھیجا، انہوں نے دیکھا کہ اس میں گنیش جی کی مورتی دیوار میں نصب ہے لیکن اس میں حرکت ہوتی رہتی ہے، یہ مورتی اپنی جگہ سے ہٹائی گئی تو اس کے نیچے زینے ایک تہ خانہ کے اندر جاتے تھے، لوگوں کے تعجب کی انتہا نہ رہی، جب انہوں نے مہارانی کو اس تہ خانہ میں پایا، اس کی عصمت ریزی ہوچکی تھی اور وہ رو رہی تھی، راجاؤں نے اورنگ زیب سے فریاد کی، بڑا اہم مسئلہ تھا، اورنگ زیب نے حکم دیا کہ یہ پوتر احاطہ ناپاک کردیا گیا ہے، وشواناتھ کی مورتی تو کہیں اور جگہ منتقل کردی جائے لیکن مندر مسمار کردیا جائے اور مہنت کو گرفتار

کر کے سزا دی جائے، ڈاکٹر پتابی سیتا رامیہ نے اپنی مشہور کتاب دی فیدرس اینڈ اسٹونس میں اس واقعہ کو پوری سند کے ساتھ لکھا ہے اور ڈاکٹر پی-ال-گپتا نے بھی جو پٹنہ میوزیم میں کیوریٹر رہ چکے ہیں ،اس واقعہ کو دہرایا ہے۔

راجیہ سبھا کی اسی تقریر میں جناب پی-ان-پانڈے نے یہ بھی کہا کہ ڈاکٹر سرتیج بہادر سپرو کے مشورے سے میں نے مختلف اہم مندروں کے مہنت کو خطوط لکھے کہ اگر اورنگ زیب نے ان مندروں کو کچھ جاگیریں دی ہیں تو اس کے فرامین کی فوٹو کاپیاں میرے پاس بھیج دی جائیں، میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب مہاکلیشور، اجین، بالاجی مندر، چترکوٹ، اومانند گوہاٹی، شروون جے کے جین مندروں اور اسی طرح شمالی ہند کے دوسو مندروں اور گرودواروں کی طرف سے مجھ کو ایسے فرامین کی نقلیں ملیں جو ۱۰۶۹ھ یعنی ۱۶۵۹ء سے لے کر ۱۰۹۱ھ یعنی ۱۶۸۰ء تک جاری کیے گئے تھے، اگر اور تلاش وجستجو کی جائے تو مجھ کو یقین ہے کہ اور بھی بہت سی ایسی مثالیں ملیں گی، پھر اندازہ ہوگا کہ غیر مسلموں کے ساتھ اورنگ زیب کا سلوک کیسا کریمانہ رہا۔

خود ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب انڈیا ڈی وائڈ میں لکھا ہے کہ الٰہ آباد میں اورنگ زیب کے دو ایسے فرامین ہیں جو مشہور مندر مہیشور ناتھ کے پجاریوں کو اس نے عطا کیے، گورکھ پور کے جنن چندر (گیان چندر) نے اپنی فراخ دلی اور محنت سے اورنگ زیب کی تقریباً دو درجن ایسی دستاویزیں جمع کی ہیں جو اس نے ہندوستان کے مختلف مندروں اور پجاریوں کے لیے جاری کیں، ان پر انھوں نے ایک طویل مضمون بھی لکھا جو ۱۹۵۹ء کے پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے جرنل میں شائع ہوا، اس کو راقم نے اپنی کتاب ''مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری''، جلد سوم (صفحہ ۱۸۰-۱۸۴) میں بھی شائع کر دیا ہے مگر ان تمام حقائق کے باوجود انگریزوں نے جو یہ سبق پڑھایا تھا کہ اورنگ زیب کیا بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمان حکمران ہندوکش، ظالم اور ستمگر تھے، اسی کی رٹ اب تک لگائی جارہی ہے، بابری مسجد کا قضیہ اسی ہندوکشی، ظلم اور ستم گری کے خلاف انتہا پسند ہندوؤں کی ایک مہم ہے جس کے لیے تاریخ کے واقعات کو توڑ موڑ کر پیش کرنے میں بڑی مہارت دکھائی جارہی ہے۔

اب یہ مہم چلائی جارہی ہے تو پھر اس کی طرف بھی توجہ مبذول ہونی چاہیے کہ خود ہندوؤں نے کتنی مسجدیں شہید کیں، جہانگیر اور شاہجہاں کے عروج کے زمانے میں گجرات میں ہندوؤں نے

جا بجا مسجدوں کو توڑ کر ان کی جگہوں پر اپنے گھر بنا لیے تھے۔ (بادشاہ نامہ از عبدالحمید لاہوری، جلد دوم، صفحہ ۵۷) علی عادل شاہ نے ۹۷۶ھ میں بیجانگر کے راجہ راج کو نظام شاہ بحری کے خلاف اپنی مدد کے لیے بلایا تو رام راج نے علی عادل شاہ کے قلم رو کی تمام مسجدیں جلا دیں۔ (تاریخ فرشتہ، جلد دوم، ص ۳۶) خود جدوناتھ سرکار نے اعتراف کیا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانے میں ست نامیوں نے نارنول کو لوٹ کر اس کی تمام مسجدیں منہدم کر دیں۔ (ہسٹری آف اورنگ زیب، ج ۲، ص ۳۹۶) اورنگ زیب ہی کے عہد میں کنور بھیم سنگھ نے گجرات میں سو مسجدوں کو جلا دیا۔ (ویردو دینو، ص ۱۷۴، اورنگ زیب از ظہیر الدین فاروقی، ص ۱۳۴) سیوا جی نے افضل خاں کے خلاف مہم میں بھیونڈی اور کلیان کی مسجدوں کو برباد کیا۔ (فاروقی، ص ۱۳۴) اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ اول کی وفات کے بعد جودھپور کے راجہ جسونت سنگھ کے لڑکے اجیت سنگھ نے جودھپور کی مسجدیں شہید کر کے ان کی جگہوں پر مندر بنوائے۔ (منتخب اللباب از خافی خاں، جلد دوم، صفحہ ۲۳۷) سکھوں نے اپنی حکومت کے زمانہ میں جو ہزاروں مسجدیں برباد کیں، اس کی داستان علاحدہ ہے۔ (تاریخ لاہور، از کنہیا لال کپور، ص ۱۵۱ و ۱۳۵)

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں مسجدوں کی جو بے حرمتی کی گئی، اس کی المناکی اب بھی آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے۔ ۱۹۷۶ء میں حکومت ہند نے برنی کمیٹی مقرر کی تھی، اس کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک صرف دہلی کی تقریباً ۱۷۶ مسجدیں ایسی تھیں جن کے تصرف سے مسلمان محروم تھے اور ان پر یا تو حکومت یا ہندوؤں کا قبضہ تھا اور اب تک وہ واگزاشت نہیں ہوسکی ہیں، دہلی مسلمان بادشاہوں کا بھی دار السلطنت رہا لیکن کسی مستند حوالے سے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا ہے کہ یہاں ایک سو چھہتر مندروں کے تصرف سے ہندو محروم کر دیے گئے تھے، ۱۹۷۹ء میں مغربی بنگال اسمبلی میں ایک سوال کے جواب میں بتایا گیا کہ صرف کلکتہ میں ۵۹ مسجدیں ایسی ہیں جن کے قبضے سے مسلمان نہ صرف محروم ہیں بلکہ ان پر ہندوؤں کا تصرف ہے اور بعض مسجدوں کو گوبر سے لیپا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی کسی تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلایا جاسکتا ہے کہ صرف ایک شہر کے ۵۹ مندروں کی ایسی بے حرمتی کی گئی اور اخباروں میں برابر ذکر آرہا ہے کہ دہلی سے پاکستان کی سرحد تک نو ہزار مسجدیں ایسی ہیں جو غیر مسلموں کے تسلط میں ہیں۔

بابری مسجد کی غلط اور گمراہ کن تاریخ پیش کر کے ہندوؤں کے جذبات مشتعل کیے گئے اور کیے جارہے ہیں، موجودہ دور میں مسلمان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ان کی عبادت گاہوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا جارہا ہے، پھر بھی ان سے ملک کے ساتھ وفاداری اور قومی بہاؤ کے ساتھ چلنے کا مطالبہ جاری ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ بابری مسجد کا جو قضیہ کھڑا کردیا گیا ہے اس میں مذہبی تعصب اور انتہا پسند ہندوؤں کی ہٹ کی فتح ہوگی یا حکومت ملک کی خیر خواہی اور دوستی میں صحیح اور دانش مندانہ قدم اٹھا کر اپنے تدبر، دور اندیشی اور انجام بینی کا ثبوت دے گی، نہ صرف حکومت بلکہ پورے ہندوستان کو سوچنا ہے کہ بابری مسجد توڑ کر یہاں کے نو کروڑ مسلمانوں کے دلوں کو توڑا جائے گا یا جوڑا جائے گا۔(معارف اپریل ۱۹۸۶ء)

بابری مسجد کا تنازعہ

اتر پردیش میں بابری مسجد کا تنازعہ جاری ہے، اس کی واگزاشت کے لیے مسلمانوں نے ۳۰/اپریل کو بڑے پیمانے پر اپنے کو گرفتاریوں کے لیے پیش کیا، اس سلسلہ میں بارہ بنکی میں گولیاں بھی چلیں جہاں سرکاری رپورٹ کے مطابق پندرہ آدمی جاں بحق ہوئے جو بڑا ہی دردناک واقعہ ہے۔

یہ راقم پہلے کی طرح پھر لکھتا ہے کہ اگر مستند معاصر ماخذوں سے یہ ثابت کردیا جائے...... کہ بابری مسجد رام جنم بھومی کو منہدم کر کے بنائی گئی تو پھر مسلمانوں کو یہ مسجد خود مسمار کردینا چاہیے مگر کوئی مورخ یہ ثابت نہیں کرسکتا، بعض حلقے میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ بابر کی تزک میں رام جنم بھومی کے انہدام کا ذکر ہے لیکن پورے وثوق کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں ایسا کوئی ذکر نہیں، خیال تھا کہ اس کے انگریزی ترجمہ بابر نامہ میں مسز اے۔ایس بیورج نے بھی اپنے تعلیقات میں اس انہدام کا ذکر نہیں کیا ہے، مگر اس کے مزید مطالعہ سے معلوم ہوا کہ بابر کی تزک میں تو نہیں مگر مسز بیورج نے اپنے حواشی میں نظر سے چوک جانے والے خفی حروف میں اپنی طرف سے دو جگہوں پر اس کا مبہم مغالطہ آمیز اور گمراہ کن ذکر کیا ہے، بابر نامہ کے صفحہ ۶۵۶ کے حواشی کے بیچ میں ہے کہ فیض آباد کے ڈی۔جی۔بنول کا بیان ہے کہ ۱۵۲۸ء میں بابر اجودھیا آیا، ایک ہفتہ یہاں ٹھہرا، اس نے یہاں کے قدیم مندر کو (جو رام کی پیدائش کی جگہ تھی) منہدم کیا اور اس کی جگہ پر ایک مسجد بنوائی، جو اب تک بابری مسجد کے نام سے بتائی جاتی ہے، اس پر دو کتبات ہیں ایک باہر اور ایک منبر پر، دونوں فارسی میں

ہیں اور دونوں میں ۹۳۵ھ درج ہے، یہ تاریخ عمارت کی تکمیل کی ہوسکتی ہے۔

مسز بیورج نے ڈی۔جی۔نیول کا بیان تو نقل کیا ہے مگر ان کی تحقیق اور دانشوری کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کرتیں کہ مسٹر نیول کو کس ماخذ کے ذریعہ سے یہ معلوم ہوا کہ بابر نے قدیم مندر کو توڑ کر اس کی جگہ پر مسجد بنوائی، خصوصاً جب بابر نامہ میں اس کا کہیں ذکر نہیں، نیول کا بیان ہے کہ بابر نے ایک قدیم مندر کو منہدم کیا، ان کو اس کا نام تو معلوم نہ ہوسکا تھا اور کیسے معلوم ہوتا جب وہ کسی حوالہ کے بغیر اپنی طرف سے لکھ رہے تھے، اس لیے بریکٹ میں اپنی طرف سے رام کی پیدائش کی جگہ لکھ دی، بریکٹ میں لکھنے کے معنی یہ ہیں کہ ان کو خود یقین نہ تھا کہ یہ رام کی پیدائش کی جگہ تھی مگر اپنی سامراجی شرانگیزی میں یہ فتنہ برپا کرنے کی کوشش کی۔

مسز بیورج اپنے ضمیمہ ملا (یو) میں بابری مسجد کے کتبات کو تو نقل کرتی ہیں مگر ان اشعار سے یہ ثابت نہیں کر سکیں کہ یہ مسجد رام جنم بھومی کو مسمار کر کے بنائی گئی تو اپنے حواشی کو ایک چور دروازہ بنا کر ان میں یہ لکھ گئیں:

> *"Presumably the the order of the mosque was given during Babur's stay in Aud (Ajodhaya) in 934 A.H. at which time ho would be impressed by the dignity and sanctity of the ancient Hindu sh rine it (at least in part) displaced (?) and like the obedient follower of Muhammad he was in intolerance of Faith would regard the substitution of a temple by mosque as dutiful and worthy. The mosque was refunded in 935 A.H. but no mention of its completion is made in Baburnama. The Diary for 935 A.H. has many minor lacunae, that of the year 934 A.H. has lost much metter breakig off when the account of Aud might be looked."(P.LXXVI)*

اس گنجلک اور پر پیچ عبارت میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ سب قیاسات پر مبنی ہیں، ان میں کوئی تحقیق نہیں، اسی لیے تحریر کو *Presumably* (قیاساً) کے لفظ سے شروع ہوتی ہے جو تحقیق کا لفظ نہیں، بابر کا اجودھیا آنا یقینی نہیں، اس لئے اودھ کے ساتھ بریکٹ میں اجودھیا لکھ دیا گیا ہے، اودھ اب بھی ایک خاص خطہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، صرف اجودھیا کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا، پھر بھی یہ قیاساً لکھ دیا گیا ہے کہ بابر یہاں کے ایک مندر کم از کم اس کے ایک حصہ کے رتبہ اور تقدس سے متاثر ہوا ہوگا پھر صریحاً متعصّبانہ جھوٹ سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو منہدم کر دیا کرتے تھے، بابر آپؐ کا ایک فرمانبردار پیرو بن کر عدم

رواداد ہوگیا، اس نے خیال کیا ہوگا کہ ایک مندر کی جگہ پر ایک مسجد بنا کر اپنے کو ایک فرض شناس اور لائق پیرو ثابت کردے گا، ان قیاس آرائیوں کے بعد مسز بیورج لکھتی ہیں کہ یہ مسجد ۹۳۵ھ میں مکمل ہوئی مگر بابرنامہ میں اس کی تکمیل کا ذکر نہیں، اس کے ذکر نہ ہونے کی تاویل اپنی قیاس آرائیوں سے اس طرح کی ہے کہ ڈائری میں ۹۳۵ھ کے بہت سے جزوی واقعات لکھنے سے رہ گئے ہیں، ۹۳۴ھ کے تو بہت سے ایسے واقعات کھو گئے ہیں جن سے اودھ کے متعلق معلومات حاصل ہو سکتے تھے، ان قیاس آرائیوں کو صداقت تسلیم کرانے کی کوشش تحقیقی دانشوری نہیں کہی جا سکتی ،مگر ایسے بیانات کا ناقدانہ تجزیہ کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

ایسا تجزیہ کرنے میں اڑیسہ کے موجودہ گورنر جناب بی۔ان۔پانڈے کی اس تقریر سے مدد لی جا سکتی ہے جو انہوں نے راجیہ سبھا میں ۲۹ جولائی ۱۹۷۷ء میں کی تھی، انہوں نے اس میں بتایا کہ ہندوستان میں انگریز مورخوں نے جو کتابیں لکھیں ان میں اس پر زیادہ تر زور دیا کہ ہندو مسلمان کس طرح ایک دوسرے کے خلاف تشدد آمیز رویہ اختیار کیے ہوئے تھے، وہ ایک دوسرے کے علاقے کو فتح کرتے اور لوٹ مار کے ذریعہ مذہبی تعصب دکھاتے، ان تاریخوں میں یہ بھی دکھایا گیا کہ مسلمان ہندوؤں کے کلچر اور روایات کو تہس نہس کرنے میں مشغول رہے، ان کے مندروں اور محلوں کا انہدام کیا، ان کی مورتیاں توڑیں اور ان کے سامنے یہ خوفناک شرط پیش کرتے رہے کہ اسلام قبول کرو ورنہ تلوار استعمال کی جائے گی۔

جناب بی۔ان۔پانڈے نے اپنی تقریر میں یہ بھی بتایا کہ برطانوی حکومت کے سرکاری دستاویزات سے یہ معلوم ہوا کہ لارڈ الگن کے زمانے میں سکریٹری آف اسٹیٹ ووڈ نے اس کو ایک خط مورخہ ۳ مارچ ۱۸۶۲ء میں لکھا کہ ہم لوگوں نے ہندوستان میں اب تک اپنا اقتدار اس طرح قائم کر رکھا ہے کہ ہم ہندو مسلمان کو ایک دوسرے کا مخالف بناتے رہے، اس کو جاری رکھنا چاہیے، جہاں تک ممکن ہو اس کی پوری کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ یہاں کے لوگوں میں مشترکہ جذبات پیدا نہ ہونے پائیں، ۹ مئی ۱۸۶۲ء میں اسی ووڈ نے لارڈ الگن کو پھر لکھا کہ اس کو یقین جانیں کہ یہاں کے لوگوں کی ایک دوسرے کی دشمنی ہمارے لیے قابل اعتنا نہ ہوگی، اگر پورا ہندوستان ہمارے خلاف متحد ہو جائے تو ہم وہاں کیسے باقی رہ سکتے ہیں؟

۲۹ مارچ ۱۸۶۶ء میں ایک دوسرے سکریٹری آف اسٹیٹ جارج فرانسس ہملٹن نے لارڈ کرزن کولکھا کہ ہم لوگ ہندوستان کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں، اس طرح کہ یہ دونوں اپنے خیالات میں مختلف ہوں، اس لیے تعلیمی اداروں میں نصاب کی کتابیں ایسی پڑھائیں کہ یہاں کے مختلف فرقوں کے درمیان تفرقہ کی مضبوطی پیدا ہوتی رہے، ۴ جنوری ۱۸۵۶ء میں اسی سکریٹری آف اسٹیٹ نے لارڈ فرن کولکھا کہ ہندوستان کے لوگوں میں مذہبی اختلافات پیدا کرنا ہمارے فائدہ کے لیے ہے، آپ نے ہندوستانی تعلیم اور اس کے نصاب کے بنانے کی جو تحقیقاتی کمیٹی بنائی ہے اس سے ہم اچھے نتائج کے متوقع ہیں۔

برطانوی حکومت کی اسی سیاسی حکمت عملی کی روشنی میں جی۔ڈی۔نیول اور مسز اے۔ایس بیورج کی مذکورہ بالا تحریروں کا تجزیہ کرنا چاہیے، ان دونوں ہی پر کیا منحصر ہے، ہندوستان کے آثار قدیمہ کے انگریز ماہرین، پھر امپیریل اور ڈسٹرکٹ گزیٹیر کے مولفین کو جب اور جہاں موقع ملا، انہوں نے واقعات کو توڑ مروڑ کر کے اور اپنی دانشورانہ قیاس آرائیوں اور دور از کار تاویلات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں نے ہندوؤں پر بڑے مظالم کیے، جن کو برابر خوف ناک ذلتیں برداشت کرنی پڑی، ان دونوں فرقوں میں کسی قسم کی مشترکہ قدریں نہیں ہیں۔

بابری مسجد کا تنازعہ بھی برطانوی حکومت کی سامراجیت کا شاخسانہ ہے، مسز بیورج نے بظاہر بہت ہی دانشورانہ انداز میں یہ لکھا ہے کہ بابر نے ایک مندر کی جگہ ایک مسجد بنا کر اپنے رسولؐ کی اطاعت گزاری اور اپنی فرض شناسی کا ثبوت دیا، اگر اس کی یہی اطاعت گزاری اور فرض شناسی تھی تو اجودھیا کے سارے مندروں کو منہدم کرا سکتا تھا اور پھر جب اس نے اپنی راجدھانی آگرہ میں قائم کی تو وہاں کے بھی کسی مندر کو باقی نہ رہنے دیتا، اس کے برخلاف مسز بیورج نے بابر کی جس تزک کا ترجمہ بابر نامہ کے نام سے کیا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ جب وہ ہندوستان کے کسی اچھے مندر کو دیکھتا تو خوش ہو کر اس کی تعریف کرتا، مثلاً جب وہ گوالیار کے قلعہ میں پہنچا تو وہاں کے عالیشان بت خانہ کا تذکرہ اس طرح کرتا ہے کہ یہاں کے تالاب کے مغرب میں ایک عالی شان بت خانہ ہے، سلطان شمس الدین ایلتتمش نے اس بت خانہ کے پہلو میں ایک مسجد بنائی ہے، یہ بت خانہ اتنا بلند ہے کہ بلندی میں اس سے اونچی کوئی عمارت نہیں ہے، دھول پور کے پہاڑ پر سے گوالیار کا قلعہ اور بت خانہ خوب

نظر آتا ہے، کہتے ہیں کہ اس بت خانہ کا سارا پتھر وہاں کے تالاب کو کھود کر حاصل کیا ہے۔ (ص ۶۱۰)

اگر بابر کے لیے مندروں کو مسمار کرنا مذہبی فریضہ تھا تو گوالیار کے اس عالی شان بت خانہ کی تعریف کرنے کے بجائے اس کو منہدم کر دیتا، اس نے گوالیار کی بعض ننگی مورتیوں کا بھی ذکر کیا ہے لیکن ان کو بھی مسمار کرنا پسند نہیں کیا، (ص ۱۲-۶۱۱) گوالیار کے بت خانے کے پہلو میں سلطان شمس الدین ایلتتمش کی بنائی ہوئی ایک مسجد سے ظاہر ہے کہ ایلتتمش نے بھی اس بت خانہ کو منہدم کرنا پسند نہیں کیا، اسی طرح بابر کے ایک امیر نے اجودھیا میں کسی مندر ہی کے پاس ایک مسجد بنادی تو اس میں کون سی بات تعجب انگیز ہو سکتی ہے، اگر اس کے جائے وقوع کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ اس کے آس پاس مسلمان آباد ہو چکے تھے کیونکہ اسی کے متصل حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مشہور خلیفہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کا آبائی مکان تھا، جس سے ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کا محلہ بن چکا تھا، اگر یہاں ایک مسجد مسلمانوں کے لیے بنادی گئی تو کون سے جرم کا ارتکاب ہوا؟

بابر ایک بیرونی فاتح ضرور تھا مگر اس کے کارناموں کا مطالعہ جس حیثیت سے بھی کیا جائے گا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کی شخصیت بہت ہی دلآویز اور دلکش تھی، خود مسز بیورج نے ولیم ارسکن کا ایک لمبا اقتباس دے کر اس بات کی تائید کی ہے کہ ایشیا کا کوئی فرمانروا اس کا مدمقابل نہیں ہو سکتا ہے (بابر نامہ، ص ۷۱۶) پھر اس پر رام جنم بھومی کے انہدام کا من گھڑت الزام رکھ کر اس کو عدم رواداری یعنی ظالم اور مذہبی مجنوں قرار دینا کہاں تک صحیح ہے، ہندو مورخین بھی بابر کی شخصیت کی دلآویزی سے متاثر ہیں، مغلوں کے آخری دور کے مورخ سجان رائے نے اپنی خلاصۃ التواریخ میں اس کے بارہ میں لکھا ہے کہ ع دردادو عدل مبالغہ فرمودی

موجودہ دور کے مورخوں میں جناب رام پرشاد کھوسلا جب پٹنہ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر تھے تو انہوں نے ۱۹۳۲ء میں مغل کنگ شپ اینڈ یوبلیٹی لکھی، اس میں بابر کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بابر کی تزک میں ہندوؤں کے کسی مندر کے انہدام کا ذکر نہیں اور نہ اس کا ثبوت ہے کہ اس نے کفار کا قتل عام ان کے مذہب کی وجہ سے کیا، وہ نمایاں طور پر مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے بری تھا۔ (ص ۲۰۷) ڈاکٹر راجندر پرشاد نے بابر کی مذہبی رواداری کا ذکر جس طرح کیا ہے اس کا حوالہ ہم فروری کے معارف کے شذرات میں دے چکے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو بھی بابر کی دلکش شخصیت سے متاثر تھے، وہ اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں لکھتے ہیں کہ وہ نشأۃ الثانیہ کے دور میں نمونہ کا رہنما تھا، بہادر تھا، مہم جو تھا، آرٹ، لٹریچر اور اچھی زندگی کا شائق تھا، الٰہ آباد یونیورسٹی کے ڈاکٹر رام پرشاد ترپاٹھی اپنے زمانے کے مشہور مورخ گزرے ہیں، انھوں نے اپنی تصنیف رائز اینڈ فال آف دی مغل امپائر میں لکھا ہے کہ بابر میں مذہبی جنون نہ تھا، اس کا رویہ ہندو افغانی امرا اور رعایا کے ساتھ مہذبانہ، شریفانہ اور دوستانہ رہا۔

پھر وہ ایک لمبے تبصرے میں رقم طراز ہیں کہ مغل سلطنت کی شان و شوکت صرف اس کی فوجی قوت میں نہ تھی بلکہ اس کی شان غیر مسلم رعایا اور خصوصاً راجپوتوں کے ساتھ اس کی مذہبی رواداری میں تھی، پھر اس زمانہ میں کلچر کو جو فروغ ہوا وہ بھی ایک شاندار کارنامہ ہے، اکبر کو اس مرتبہ سے محروم نہیں کیا جاسکتا لیکن اس پالیسی کا بیج اس کے ممتاز امرا بابر ہی کی حکومت میں ڈال دیا گیا تھا، ایک ایسی سلطنت قائم ہوئی جس کی سیاست میں مذہبی اور طبقاتی اختلاف کا کوئی دخل نہیں رہا، تخت و تاج کی حیثیت ریاست میں خاطر خواہ طریقہ پر رکھی گئی، راجپوتوں کے مسائل اور شادی بیاہ کے رشتے سے حل کیے گئے، دربار کے تہذیبی پہلوؤں کو زیادہ اہم قرار دیا گیا، لیکن ان تمام باتوں کی ابتدا بابر ہی کے زمانے میں ہوگئی تھی جس نے ایک نئی سلطنت قائم کرنے کا راستہ ہی ہموار نہیں کیا بلکہ کس طرح اس پر حکومت کی جانی چاہیے، اس کی پالیسی بنانے کا بھی اشارہ کردیا، اس نے ہندوستان میں ایک ایسا خاندان اور ایک ایسی روایت قائم کی جس کی مثال دوسرے ملکوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

ہندوستان کے ایسے بڑے محسن اور ایسی دلکش شخصیت کو بابری مسجد کے جھگڑے میں الجھا کر ملک کی شاندار روایت کو مجروح کرنا ہے اور اس کی ذات سے من گھڑت واقعات منسوب کر کے نہ صرف ہندوستان کے علم اور دانشوری کو بدنام کرنا ہے بلکہ ملک کے سیکولرزم، قومی یکجہتی اور وطن دوستی کے ساتھ دشمنی کا ثبوت دینا ہے۔ (معارف مئی ۱۹۸۶ء)

مطلقہ عورت کے نان ونفقہ کا بل

مسلمان مطلقہ عورت کے نان ونفقہ کا بل ہماری حکومت نے اپنی پارلیمنٹ سے منظور کرالیا تھوڑے سے ترقی پسند بلکہ جدیدیت پسند مسلمانوں کے سوا عام مسلمان اس بل سے مطمئن اور خوش ہیں۔

اس بل کی خاص خاص باتیں یہ ہیں: شادی اور خاندان کے معاملات اسلامی تصور پر مبنی ہوں گے۔شادی کے بعد لڑکی بیوی کی حیثیت سے اپنے شوہر کے گھر والدین سے رشتہ توڑ کر منتقل نہیں ہوگی ، بلکہ اس کے بعد بھی وہ اپنے والدین کے گھر کی ایک فرد سمجھی جائے گی اور اس کا رشتہ بدستور قائم رہے گا، وہ اگر بیوہ ہوجائے یا اسے طلاق دے دی جائے تو اس کی مدد اور اس کے بچوں کی کفالت کی ذمہ داری اس کے والدین پر ہوگی ، طلاق کی صورت میں زمانۂ عدت تک نان نفقہ کی ذمہ داری شوہر پر ہوگی کیونکہ جب تک حمل کے متعلق اطمینان نہ ہو وہ دوسری شادی کے لیے آزاد نہیں، اس کے بعد وہ تنہا یا اپنے بچوں کے ساتھ اس کا حق رکھتی ہے کہ اس کے قریبی رشتہ دار اس کی اور اس کے بچوں کی کفالت کریں، جیسا کہ کفالت اور وراثت کا شرعی قانون ہے، عدت کے بعد طلاق دینے والا مرد اس کے لیے ایک اجنبی شخص ہوگا ، وہ اس کے نان نفقہ کا ذمہ دار نہ ہوگا ، عدالت اس کو حکم دے سکتی ہے کہ وہ فوری طور پر مہر کو ادا کرے، اگر یہ پوری باقی ہو یا اس کا کچھ حصہ باقی رہ گیا ہو، عدالت طلاق دینے والے مرد کو یہ بھی حکم دے سکتی ہے کہ وہ مطلقہ کے شیر خوار بچے کی نگہداشت کے لیے ضروری اخراجات کی ادائیگی کرے۔

عدالت یہ بھی ہدایت کر سکتی ہے کہ مطلقہ کا کل سامان اس کا سابق شوہر اس کو واپس کر دے اس میں جہیز اور اس کو دیے ہوئے تحائف بھی شامل ہیں، اگر مطلقہ کے حقیقی رشتہ دار زمانۂ عدت کے بعد اس کی کفالت نہیں کر سکیں تو عدالت وقف بورڈ کو ہدایت کر سکتی ہے کہ وہ اپنے فنڈ سے اس کا انتظام کرے، اس طرح کا ہر معاملہ ایک مہینے کے اندر طے ہوجایا کرے، عدت کے زمانہ میں نان نفقہ کے لیے کوئی مخصوص رقم مقرر نہ کی جائے گی بلکہ طلاق دینے والے شوہر کی سماجی اور مالی حیثیت اور مطلقہ کے طرز رہائش کے مطابق ہوگی ، نان نفقہ کی یہ اسکیم مطلقہ عورت کی دوسری شادی کی ہمت افزائی کے لیے ہے تا کہ وہ ایک نئی اور خوشگوار زندگی بسر کرے۔

یہ بل ہر لحاظ سے مناسب ہے، مگر کچھ لوگوں کی یہ فطرت ثانیہ بن گئی ہے کہ کوئی قانون خواہ کتنے ہی عمدہ اور اچھی نیت پر مبنی ہو وہ اس میں کچھ نہ کچھ نقائص نکالنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ اس کو توڑنے کے لیے چور دروازے کی تلاش میں رہتے ہیں، اس میں وکالت کی قانونی جادوگری، سیاست کی بازی گری اور صحافت کی قلمی سحر پردازی بھی معاون ہوجاتی ہیں، ان ضرر رسانیوں سے قطع نظر اس

بل کی منظوری کا روشن پہلو یہ ہے کہ ہماری حکومت نے اس کو تسلیم کرلیا ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ عدالت کا فیصلہ کچھ بھی ہو، سیاسی رہنماؤں کی ہنگامہ آرائی کیوں نہ ہو، اخباروں میں چاہے جتنے بھی مخالفانہ مضامین لکھے جائیں، اس کے تدبر، دانش مندی اور انجام بینی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے پرسنل لا میں مداخلت نہ کرکے ان کو خوش اور مطمئن رکھے۔

مذکورہ بل مسلمانوں کے سوادِ اعظم کے لیے ہے مگر کچھ مسلمان ایسے ہیں جو اپنے کو مسلمان کہنے کے باوجود دراصل مسلمان نہیں ہیں، ان کے لیے بل میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ وہ چاہیں تو اپنی بیوی کو طلاق دے کر عدت کے بعد بھی اس کو نان نفقہ دے سکتے ہیں مگر یہ اسلامی قانون کے ماتحت نہ ہوگا، اس لیے اس کا طلاق ایسے ہی مسلمانوں پر ہوگا جو گویا اسلامی قانون سے اپنے کو بری رکھنا چاہتے ہیں۔

اچھی حکومت کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے مختلف فرقوں کے دلوں کی تسخیر کے لیے سچی خیر سگالی، خیر خواہی اور رواداری کا ثبوت دیتی رہے، اگر جذباتی ہم آہنگی، قومی یکجہتی، باہمی بھائی چارگی سے ملک کی فلاح و بہبود ہوتی ہے تو یہ سوچنا ضروری ہے کہ کس قانون سے اس میں رکاوٹ ہوگی اور کس ضابطہ سے اس کی نشوونما میں مدد مل سکتی ہے، کوئی سیاسی طرز فکر اور سیاسی فلسفہ خواہ کتنا ہی بلند اور اعلیٰ ہو لیکن اس سے منزل مقصود تک پہنچنے میں نوک سوزن کی چبھن اور نیش خار کی خلش محسوس ہو تو اس کو اختیار کرنے میں احتیاط اور مآل اندیشی کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہندوستانی کلچر کے مسئلہ میں گزشتہ ۳۷ برسوں سے ہم کو یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ یہ ایک کنول کے پھول کے مانند ہے جس کی پنکھڑیاں الگ الگ ضرور ہیں مگر وہ پھول ایک ہی ہے، ہماری کثرت میں وحدت ہے اور وحدت کثرت میں ہے، اس کی تلقین میں طرح طرح کے دلائل کا سہارا لے کر ہم کو خوش اور مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مگر ہندوستان کے مختلف فرقوں کے پرسنل لا کو کنول کے پھول کی الگ الگ پنکھڑیاں قرار نہیں دیا جاتا، اس کی کثرت میں وحدت اور وحدت میں کثرت نہیں دکھائی جاتی، اس تفریق اور اختلاف کی دوری میں نزدیکی، اجنبیت میں یگانگت اور تفرقہ میں موانست پیدا کرنے کی تلقین نہیں کی جاتی۔

اگر پرسنل لا میں یکسانیت اس لیے ضروری ہے کہ اس سے ملک میں یکجہتی پیدا ہوگی تو پھر ہمارے ملک میں کھانے پینے، رہنے سہنے، بولنے چالنے، سیاسی نظر و فکر کی ترویج کرنے، پارلیمنٹ

اور ودھان سبھا کی جگہوں کے انتخاب میں لڑنے اور لڑانے میں جو قدم قدم پر اختلافات پائے جاتے ہیں، ان کو بھی دور کر کے ایک کرنا ہوگا، ملک کی اسی یکسانیت کی خاطر یہ قانون بھی بنانا ہوگا کہ کشمیر سے راس کماری تک اور ملک کے جنوب، شمال، مغرب اور مشرق میں لوگ ایک ہی قسم کی غذائیں کھائیں، ایک ہی طرح کا لباس پہنیں، ایک اور صرف ایک ہی زبان بولیں، سیاست میں ایک ہی طرز فکر ہو، انتخاب لڑنے میں ایک ہی پارٹی ہو، شاید یہ کہا جائے کہ یہ ممکن نہیں، اس لیے کہ اس سے انسان کے بنیادی حقوق کی پامالی ہوگی، دنیا کے کسی حصہ میں اس پر عمل نہیں ہوسکا کیونکہ تنوع پسندی انسان کی سرشت میں داخل ہے اور دنیا کی بہار بھی اس کی یک رنگی میں نہیں بلکہ اس کی رنگارنگی میں ہے، اور شاید یہ دلیل بھی دی جائے کہ یہ دنیا ایک چمنستان ہے، اس کی دلآویزی اور رعنائی اس کے رنگ برنگ پھولوں سے ہے، اگر اس میں ایک ہی قسم کے پھول دکھائی دیں تو شوق حسن اور ذوق جمال کی تسکین نہ ہو اور شاید یہ بھی کہا جائے کہ قدرت کو بھی مناظر فطرت میں یکسانیت پسند نہیں۔

اگر یہ سب کچھ کہنا صحیح ہے تو پھر ایسی باتیں ملک کے مختلف لوگوں کے پرسنل لا کی رنگارنگی کے سلسلہ میں بھی کہی جاسکتی ہیں، پھر اس کی یکسانیت کے لیے قانون کی موشگافی، سیاست کی چرب زبانی اور صحافت نگاری کی زور آزمائی کیوں دکھائی جائے، اس پردۂ زرنگاری کے پیچھے جو کچھ ہے اس کو دیکھنے میں حساس اور بیدار ذہن کی آنکھوں پر پٹی نہیں باندھی جاسکتی۔ (معارف جون ۱۹۸۶ء)

بابری مسجد کا قضیہ

جب سے بابری مسجد کا قضیہ اٹھ کھڑا ہوا ہے، اس وقت سے راقم کو اس کی جستجو ہے کہ بابر پر رام جنم بھومی کے مسمار کرنے کا جو الزام عائد کیا گیا ہے، اس کا قدیم ترین ثبوت کہاں مل سکے گا، مغلوں کے دور کی کسی تاریخ میں تو اس کا ذکر کہیں نہیں ملا۔

البتہ برطانوی عہد میں ۱۸۸۱ء میں جو امپیریل گزیٹیر مرتب ہوا اس میں ڈبلیو۔ڈبلیو ہنٹر نے اجودھیا کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے اس میں ہے کہ اجودھیا سے دلچسپی اس کی قدیم تاریخ کی وجہ سے ہے، اس کا پرانا شہر بالکل غائب ہو چکا تھا۔ یہ کھنڈروں کا ڈھیر تھا یا جنگلوں میں گم تھا، لیکن قدیم زمانہ میں یہ ہندوستان کے عظیم ترین اور شاندار ترین شہروں میں تھا، کہا جاتا ہے کہ اس کا رقبہ چھیانوے میل تک پھیلا ہوا تھا، کوشل کی حکومت کا یہ دارالسلطنت تھا، اس میں موجودہ دور کا اودھ بھی

شامل تھا، یہاں سورج بنسی خاندان کے راجہ دسرتھ کا دربار تھا۔ راماین کے ابتدائی ابواب کے مطالعہ سے اس شہر کی شوکت، یہاں کے فرماں روا کی شان اور یہاں کے لوگوں کی نیکی، دولت اور اطاعت گزاری کا اندازہ ہوتا ہے، رام چندر دسرتھ کے بیٹے تھے، وہ راماین کے ہیرو ہیں، سورج بنسی خاندان کے آخری فرماں روا کے مرنے کے بعد یہاں بودھوں کا تسلط قائم ہوگیا تو اجودھیا پر زوال آ گیا لیکن جب برہمنیت کا ازسرنو عروج ہوا تو بیان کیا جاتا ہے کہ راجہ بکرماجیت نے ۵۷ قبل مسیح میں اس شہر کی کھوج لگائی، اس کے مختلف مندروں اور ان جگہوں کی نشاندہی کی جو رام سے منسوب تھیں، ان میں سب سے اہم مقام راج کوٹ تھا، جو راجہ کا قلعہ اور محل تھا پھر ناگیشور مندر کا بھی پتہ چلایا گیا جو مہادیو کے نام پر تھا، منی پربت کی پہاڑی بھی تلاش کی گئی، اسی طرح اور مندروں کا پتہ لگایا گیا۔

ڈبلیو۔ڈبلیو ہنٹر آگے چل کر رقم طراز ہے کہ کوشل اس لیے بھی مشہور تھا کہ یہ بودھ مت اور جین مت کے پیروؤں کا ابتدائی مسکن تھا اور ان کا دعویٰ تھا کہ یہیں ان کے بانی کی پیدائش ہوئی، ساتویں صدی میں چینی سیاح یہاں آیا تو اس نے اجودھیا میں بودھوں کے بیس ہزار مندر اور تین ہزار بھکشو دیکھے، ان ہی میں برہمنوں کی بڑی آبادی بھی تھی، اب بھی یہاں جینیوں کے کئی مندر ہیں جو ڈیڑھ سو برس کے اندر بنے ہیں، خیال کیا جاتا ہے کہ ان کے پانچ مذہبی پیشواؤں کا یہ مولد بھی تھا۔

اسی کے بعد ڈبلیو۔ڈبلیو ہنٹر کا بیان ہے کہ جب مسلمانوں نے اس کو فتح کیا تو ان کی یادگاروں میں تین مسجدوں کے کھنڈر ہیں جو شہنشاہ بابر اور اورنگ زیب نے ہندوؤں کے مندروں کو توڑ کر ان کے ملبے سے بنوائیں۔ یہ تین مشہور مندر یہ تھے: ۱۔جنم استھان، جہاں رام چندر پیدا ہوئے تھے ۲۔سورگ دوار مندر، جہاں رام چندر جلائے گئے تھے ۳۔تیرتا کا ٹھاکر جو اس لیے مشہور تھا کہ یہاں رام چندر نے بھینٹ چڑھائی تھی............اس شہر میں اس وقت تریسٹھ وشنو اور تینتیس شیو کے مندر ہیں، چھتیس مسلمانوں کی مسجدیں ہیں۔

یہ تو ابھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ بابر پر جو الزام رکھا گیا ہے اس کے لیے یہی قدیم ترین تحریری ثبوت ہے، ممکن ہے کہ ایسی تحریر اس سے پہلے کی بھی ہو مگر وہ کسی نہ کسی انگریز ہی کی ہوگی۔ ۱۸۸۱ء کے بعد فیض آباد کے جتنے گزیٹیر تیار ہوئے، ان میں یہی ساری باتیں دہرائی گئیں، ہنٹر نے اپنی سامراجیت پسندی میں مذکورۂ بالا تحریر میں جو زہر پھیلایا ہے اس کا اندازہ اس کو بہت ہی

غور سے مطالعہ کرنے کے بعد ہی ہوسکے گا، اس نے اس میں ہندوؤں، بودھوں، جینیوں اور مسلمانوں سب پر ضرب لگائی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ کوشل میں گوتم بدھ اور مہابیر پیدا ہوئے؟ پھر ہندوؤں کے مذہبی تخیل کی تحقیر یہ لکھ کر کی گئی ہے کہ وہ اجودھیا کو ایک مقدس شہر سمجھتے ہیں مگر یہ مقدس شہر جنگلوں میں گم ہو کر کھنڈر ہو چکا تھا۔ رام چندر کے کئی ہزار برس کے بعد اس کو پھر سے آباد کیا گیا، ان کی پیدائش، جلانے اور قربانی کی جگہوں کو خیالی طور سے متعین کیا گیا، ان ہی خیالی جگہوں کو ہندو مقدس سمجھتے ہیں، اس تحریر میں یہ بھی ہے کہ یہاں پہلے بودھوں کی بیس عبادت گاہیں تھیں جن مین تین ہزار بھکشو رہتے تھے، اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب ۱۸۸۱ء میں یہ لکھی گئی تو وہاں نہ بودھوں کی عبادت گاہیں رہ گئی تھیں اور نہ بھکشو دکھائی دیتے تھے، اس طرح یہ الزام ہندوؤں پر عائد ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اجودھیا سے ان کو ختم کیا۔

پھر ہندوؤں کو مسلمانوں سے یہ لکھ کر برگشتہ کیا گیا ہے کہ بابر اور اورنگ زیب دونوں نے ان کے مندروں کو مسمار کر کے ان کے ملبے سے مسجدیں بنوائیں، ایسے اہم بیان کے لیے کسی مستند ماخذ کا حوالہ دینا ضروری تھا مگر جب شرانگیزی مقصود ہو تو مستند حوالہ کے بجائے قیاس آرائی زیادہ کارگر ہوتی ہے، پھر اوپر کی تحریر میں بابری مسجد کو کھنڈر ہی بتایا گیا ہے، یہ کوئی کیسے یقین کر سکتا ہے جب یہ مسجد اپنی پرانی شان کے ساتھ کھڑی ہے اور اسی کے لیے سارا قضیہ جاری ہے، پھر اس میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ یہ مسجد مندر کی جگہ یا اس کے قریب بنائی گئی، جب یہ یقین نہ تھا کہ مسجد مندر کی اصل جگہ پر بنائی گئی تو یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی کہ اس کی جگہ کے قریب بنائی گئی، اس طرح کی تحریروں ہی سے فتنہ پیدا ہوتا ہے۔

خیریت یہ ہے کہ اب تک ہندوؤں کی طرف سے یہ دعویٰ نہیں کیا جا رہا ہے کہ اجودھیا میں جنم بھومی مندر کے علاوہ سوارگ دوار مندر اور تیرتا کا ٹھاکر کی جگہیں ان کو دلائی جائیں، جہاں ہنٹر کے بیان کے مطابق دو مسجدیں اور بنائی گئی تھیں، ہندوؤں نے ان دونوں جگہوں کی واپسی کا مطالبہ اب تک نہیں کیا ہے تو اس کے کیا یہ معنی نہیں کہ انگریزوں نے سنی سنائی روایتوں یا اپنی طرف سے من گھڑت باتیں لکھ کر ہندوؤں کے جذبات کو مشتعل کرنے کی کوشش کی اور اس میں کامیابی حاصل کی۔

۲۱۔۱۵ر جون کے السٹرٹیڈ ویکلی میں ایک مضمون نگار چیدانند داس گپتا نے لکھا ہے کہ

بنیاد پرست ہندو یہ کہتے ہیں کہ ہم رام اور سیتا کو آئیڈیل نمونے تسلیم کرنے پر اکتفا نہیں کرتے، ہمارے مہنتوں نے ان کی جو پیدائش کی تاریخ اور ان کی پیدائش کی جو جگہ بتائی ہے ان ہی کو تاریخی حیثیت سے ہم کو تسلیم کرنا ہے اور اسی کے سہارے دوسرے فرقہ سے جنگ کر کے ان سے بازی جیت سکتے ہیں، یہ تسلیم کہ رام کی پیدائش کی جگہ کا ثبوت سائنٹفک طریقہ سے نہیں ملتا ہے لیکن ہم کو اس کی پروا نہیں، بابری مسجد اور جنم بھومی کے جھگڑے سے جو جذبات ابھرے ہیں ان کا تقاضا یہ ہے کہ تاریخ کی ساری کتابیں جلا دی جائیں، برہمن اس کی تاریخ پھر سے لکھیں گے، اپنی اس رزمیہ کو پھر سے سنائیں گے، پھر سے اس کی تعبیر کریں گے اور اس میں طرح طرح کے اضافے بھی کریں گے، وہ اپنے پُرانوں کو بھی پھر سے قلم بند کریں گے اور اس کی پروا نہ کریں گے کہ تاریخی حیثیت سے ان کا کیا مقام ہے۔

اس ہٹ کے بعد پھر سارے معاملات کا تاریخی تجزیہ کرنے کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔

(معارف جولائی ۱۹۸۶ء)

دینی تعلیمی کونسل

دینی تعلیمی کونسل یوپی کے مسلمانوں کی ایک ایسی کارآمد اور مفید تنظیم ہے جس کی نوعیت اور افادیت کی مثال اس ملک کی دوسری ریاستوں میں نہیں ملے گی۔

۱۹۴۷ء کے انقلاب میں اس ملک کی جو تقسیم ہوئی اس سے اس کے اکثریتی فرقہ میں مسلمانوں کے خلاف ایسی آزردگی، کبیدگی، بیزاری بلکہ نفرت اور حقارت پیدا ہوئی کہ مسلمانوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ اب وہ یہاں آئندہ اپنے مذہبی، ملی، تہذیبی اور لسانی تشخص سے بیگانہ ہو کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گے، ان کی موثر قیادت جاتی رہی، ان کی ہر قسم کی تنظیمیں بھی لاچار اور بے بس ہو گئیں، سیاسی ذوق رکھنے والے کچھ مسلمانوں نے کسی نہ کسی سیاسی پارٹی میں شرکت کر کے اپنے سیاسی ذوق کی تشنگی کو ضرور پورا کیا اور اپنے کچھ ذاتی فوائد بھی حاصل کر لیے، ان میں سے کچھ مرکز اور ریاست کی قانون ساز مجلسوں کے ارکین بھی منتخب ہوئے، ان کے متعلق عام مسلمانوں کو یہ احساس رہا کہ وہ ان سیاسی تنظیموں کے ضمیمہ بنے ہوئے ہیں، ان کی ذات سے مسلمانوں کو کوئی اجتماعی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، وہ مسلمانوں سے زیادہ اپنی پارٹیوں کے وفادار ہیں۔

مسلمانوں کی اس مایوسی کے عالم میں کچھ کارگزار اور مخلص مسلمان آگے بڑھے اور یہ صدا بلند کی کہ اگر ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی حمیت اور ایمانی حرارت باقی رہی تو ان کے تشخص اور وجود کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا، ایسی صدا بلند کرنے والوں میں یوپی کے ایک دور دراز ضلع یعنی بستی کے جناب قاضی عدیل عباسی تھے جنہوں نے پوری زندگی کانگریس کی ہم نوائی کے ساتھ بسر کی، آزادی کے بعد جب اور کانگریسی مسلمان اپنی نیشنلزم اور آزادی کی لڑائی میں اپنی نبرد آزمائی کا صلہ اور انعام پانے لگ گئے تو قاضی صاحب مرحوم نے دینی تعلیمی کونسل قائم کرکے مسلمان بچوں کے لیے ایسے ابتدائی مدرسے قائم کرنے کا پروگرام بنایا جن میں پرائمری تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کا بہتر سے بہتر انتظام ہو، ان کی نیت خالص تھی، ان کے اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ان کے یمین ویسار میں جناب ظفر احمد صدیقی وکیل اور مولوی محمود الحسن جیسے مخلص کارکن ساتھ ہوگئے اور جب ان کو مولانا ابوالحسن علی ندوی کا تعاون حاصل ہوا تو پھر اس انجمن کے ماتحت ایسے مدرسوں کا ایک جال پورے صوبہ میں بچھ گیا جس کی کارکردگی کو دیکھنے کے لیے دوسرے صوبہ کے لوگ آنے لگے، اس طرح یہ انجمن یوپی کے مسلمانوں کے لیے ایک قابل فخر تنظیم بن گئی۔

اور جب یہ تنظیم اپنے پورے عروج پر تھی تو مصلحت خداوندی سے قاضی عدیل عباسی جنت کو سدھارے، اس خلا کو جناب ظفر احمد صاحب صدیقی اور مولوی محمود الحسن صاحب، مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کی سرپرستی میں پورا کرتے رہے، لیکن پہلے مولوی ظفر احمد صدیقی اور پھر مولوی محمود الحسن اللہ کو پیارے ہوئے تو اس تنظیم پر بڑا سخت وقت آیا لیکن بڑی خوشی کی بات ہے کہ مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب کی نگرانی میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب نے اس تنظیم کو اپنی پوری قوت عمل اور سرگرمی سے برقرار رکھنے اور چلانے کی ذمہ داری لے لی۔

آج جب کہ سائنس، ٹکنولوجی، صنعت، حرفت اور تجارت کا فروغ ہورہا ہے تو دنیا کی اس ترقی میں بلاشبہ مسلمانوں کو پیچھے نہیں رہنا چاہیے لیکن زندگی کے ان شعبوں میں وہ اپنی مذہبی حمیت، ایمانی حرارت اور ملی غیرت کے بغیر کامیاب ہوکر صرف نام کے مسلمان رہے تو وہ مسلمانوں کے معاشرہ کے لیے صرف کینسر بن کر رہ جائیں گے، پھر بابری مسجد کی بازیابی کی جدوجہد ہو یا پرسنل لا اور اسلامی شریعت کے تحفظ کا سوال ہو یا مشترکہ سول کوڈ کی مخالفت کا جوش وخروش ہو یا مسلمانوں کے

تشخص کے برقرار رکھنے کی مہم ہو، وہ کسی محاذ پر بھی اپنی جرأت مندی، نبرد آزمائی اور پامردی کا ثبوت نہیں دے سکتے، ان کے مستقبل کو روشن بنانے کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنے بچوں کے دینی شعور اور مذہبی تصور کو برقرار رکھنے کے لیے فکر مند رہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم میں دین کا گہرا نقش ان کے دل و دماغ پر قائم کیا جائے، دینی تعلیمی کونسل اسی مقصد کی تکمیل کے لیے جا بجا مکاتب قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہے، ان مکاتب کو ابتدائی تعلیم کی محض درسگاہ نہ سمجھنا چاہیے بلکہ یہ وہ تعلیم گاہ ہے جہاں سے ایمان کا یورنیم حاصل کر کے مذہبی غیرت کی ایٹمی توانائی تیار کی جاسکتی ہے۔

اس زاویہ نگاہ سے ان درس گاہوں کو ہر طرف پھیلانے اور فروغ دینے کی ضرورت ہے، اگر مسلمانوں نے اپنی روایتی غفلت شعاری سے ان کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی تو پھر ان کے مذہبی تشخص کو برقرار رکھنے کا نعرہ محض شورش بے مدعا ہی سمجھا جائے گا اور پھر ان کو یہ کہنے کا حق بھی نہ ہوگا کہ یہ ملک اکّال الامم ہے۔ (معارف جنوری ۱۹۸۷ء)

مولانا عبدالسلام قدوائیؒ

ندوۃ العلماء کا جشن تعلیمی

اگست کے معارف میں ندوہ کے جشن تعلیمی کی خبر دی جا چکی ہے۔ ۱۳۱۰ھ/ ۱۸۹۲ء میں چند بوریہ نشینوں نے ملت کی زبوں حالی پر غور کیا۔ انھوں نے ماضی کے تجربوں اور اس وقت کے حالات کی روشنی میں زوال وانحطاط کے اسباب کا سراغ لگایا اور ایک ایسا لائحہ عمل پیش کیا جس پر عمل کر کے ملت کی افسردگی دور ہو، اس کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑنے لگے۔ اس کے اندر نشاط پیدا ہو، اس کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوں اور وہ نئے جوش و ولولہ کے ساتھ کارگاہ حیات میں قدم رکھے اور ایک بار پھر اپنی لیاقت وصلاحیت کا نقش جریدۂ عالم پر ثبت کر دے۔

اس لائحہ عمل کو مرتب کرنے والوں کے نزدیک ملت کی تباہی و بربادی کا سب سے بڑا سبب باہمی اختلافات تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ تمام مسائل و معاملات میں ساری قوم کا متفق ہونا ممکن نہیں ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مذہبی، سیاسی، معاشی اور تہذیبی امور میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے اور ہوتا رہے گا لیکن وہ چاہتے تھے کہ اس اختلاف رائے کو عداوت اور جنگ وجدل کی شکل میں تبدیل نہ کیا جائے، بلکہ صبر وتحمل سے دوسرے کی بات سنی جائے۔ اس کے جذبات کا احترام کیا جائے اور باہم رواداری سے کام لیا جائے، اس طرح افراد اور جماعتوں کا اختلاف دشمنی کا رنگ نہ اختیار کر سکے گا اور مختلف فرقوں اور گروہوں کی رنگارنگی میں ملت کی یک رنگی باقی رہے گی اور اختلاف کے باوجود قوم کی وحدت و یگانگت کا سررشتہ گم نہ ہونے پائے گا۔

ملت کی پستی اور زبوں حالی کا دوسرا سبب ان بزرگوں کی نظر میں نصاب تعلیم تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی تعلیم جدید وقدیم دو خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ جدید تعلیم گاہیں، مذہبی تعلیم وتربیت سے خالی تھیں اور مذہبی درس گاہیں عصری علوم وفنون سے تہی دامن تھیں۔ ندوہ کے بانیوں کی آرزو تھی کہ اس دوعملی کا خاتمہ ہو، قدیم وجدید کے درمیان ربط کی تدبیر کی جائے اور دین ودنیا کی باہم آمیزی سے وہ

اکسیر تیار کی جائے جس سے ملت کے اندر زندگی کی روح پیدا ہو اور اسلام کے نام لیواؤں میں ایسی صلاحیت پیدا ہو کہ وہ اس ظلمت کدہ عالم کو پھر مطلع انوار بنادیں۔

اس منصوبہ کو پیش کیے ہوئے پچاسی سال گذر گئے ہیں، ضرورت ہے کہ اس اجلاس میں اس طویل جدو جہد کا جائزہ لیا جائے اور معلوم کیا جائے کہ ان مقاصد میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے۔ ماضی کے تجربوں کی روشنی میں حال پر نظر ڈالی جائے، لغزشوں اور کوتاہیوں کی نشان دہی کی جائے اور ان کے اسباب و علل پر غور کر کے نئے عزم و حوصلہ کے ساتھ مستقبل کا نقشہ بنایا جائے، زمانہ بہت آگے بڑھ چکا ہے اور حالات نے بالکل نیا رنگ اختیار کیا ہے، اس وقت جن مسائل سے ہم دوچار ہیں۔ ان کو حل کرنے کے لیے علم و بصیرت اور حکمت و معرفت کے ساتھ ہمت و جرأت بھی درکار ہے۔

اس اجلاس میں شرکت کے لیے علماء و مشائخ، زعماء و ارباب سیاست اور ماہرین تعلیم و تربیت سبھی طبقوں کے سربرآوردہ اصحاب کو دعوت دی گئی ہے۔ اس میں ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک کے نمایندے بھی شریک ہو رہے ہیں۔ شیخ الازہر نے اس جلسہ کی صدارت منظور کر لی ہے اور مصر، شام، سعودی عرب، کویت، تونس، الجزائر اور خلیج فارس کی ریاستوں کے نمایندے شرکت کے لیے آرہے ہیں۔ دوسرے ملکوں سے بھی خط و کتابت ہو رہی ہے، امید ہے کہ انشاءاللہ یہ اجلاس اپنی نوعیت میں منفرد ہوگا اور اس کے انعقاد سے ملک و ملت کو بہت فائدہ پہنچے گا۔ (معارف، اکتوبر ۱۹۷۵ء)

ندوۃ العلماء کا تعلیمی جشن

ندوہ کے ہشتاد و پنج سالہ تعلیمی جشن کا ذکر ان اوراق میں آچکا ہے، ۳۱/ اکتوبر کو شیخ الازہر ڈاکٹر عبدالحلیم محمود کی صدارت میں اس جشن کا آغاز ہوا اور ۳/ نومبر تک اس کا سلسلہ جاری رہا، ان چار دنوں میں مختلف دینی، علمی اور ثقافتی مسائل پر بحث ہوئی۔ اس بین الاقوامی اجتماع میں ایشیا اور افریقہ کے متعدد ملکوں کے اہل علم و نظر اور صاحب رسوخ و اثر اصحاب نے شرکت کی اور انھوں نے ہندوستانی علماء اور زعماء، ماہرین تعلیم و تربیت اور مصلحین تہذیب و معاشرت کے ساتھ بہت سے تعلیمی و تہذیبی مسائل پر غور و خوض کیا، تقریریں ہوئیں، مقالات پڑھے گئے اور تجویزیں پیش کی گئیں، اس تبادلۂ خیال سے بحث و نظر کے بہت سے نئے گوشے سامنے آئے، ذہن و دماغ میں نئے خیالات ابھرے، فکر و عمل کے نئے میدان سمجھ میں آئے اور اشتراک و تعاون کی نئی صورتیں نظر آئیں۔

اس اجتماع میں جو فکر انگیز خیالات ظاہر کیے گئے۔ ان میں شاید سرفہرست وہ تجویز ہے جس میں مشورہ دیا گیا ہے کہ تعلیم کی دوئی دور کی جائے اور ثنویت کے بجائے اس میں وحدت پیدا کی جائے آج صدیوں سے ہماری تعلیم دین و دنیا کے دو خانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور دینی و دنیاوی درس گاہیں علاحدہ علاحدہ قائم ہیں۔ اس دوعملی نے قوم کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے اور ذہن و دماغ کے دو ایسے سانچے بن گئے ہیں، جن کے ربط و اتصال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہر ایک کے غور و فکر کا رنگ جدا اور عمل کا ڈھنگ الگ ہے۔ دیندار دنیا کے معاملات سے نا آشنا اور زمانہ کے تقاضوں سے بے خبر ہیں اور دنیا دار دینی تعلیمات سے ناواقف اور روحانی ضرورتوں سے لاعلم ہیں۔ اس ناواقفیت اور لاعلمی نے ہماری زندگی کی اخلاقی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے اور اس نا آشنائی و بے خبری نے رہنمائی و رہبری کی صلاحیت باقی نہیں رکھی۔ دیندار مجبور اور دنیا دار بے نور ہو گئے۔ اس مجبوری و بے نوری نے ملت پر راہ عمل گم کر دی ہے اور اب صورت حال یہ ہے کہ ع

ہاتھ بے زور ہیں الحاد کے دل خوگر ہیں

اسلام دین و دنیا کی تفریق سے نا آشنا ہے۔ وہ محض حمد و ثنا کے ترانوں پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ احکام و فرامین کا نفاذ بھی کرتا ہے۔ وہ بندگی کی تعلیم بھی دیتا ہے اور بندہ نوازی کی بھی، وہ جسم کی تازگی کے ساتھ روح کی بالیدگی کا بھی طالب ہے۔ وہ دنیا کو ترک کرنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ اسے مطیۃ الآخرہ (آخرت کی سواری) بنانے کا مشورہ دیتا ہے۔ اسی بنا پر شروع میں نصاب و نظام تعلیم میں دین کے ساتھ دنیا کے تقاضوں کا بھی لحاظ رکھا گیا تھا، لیکن بعد میں یہ جامعیت باقی نہیں رہی اور دینی و دنیاوی تعلیم کے حلقے الگ الگ ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا پر دین کی سیادت قائم نہ رہی اور دنیاوی معاملات مذہب کی گرفت سے آزاد ہو گئے۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک طرف دنیا کا انتظام کرنے والوں کو شریعت کا دائرہ تنگ نظر آنے لگا اور وہ محسوس کرنے لگے کہ مذہب زندگی کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لیے اسے صرف عبادت گاہوں تک محدود رہنا چاہیے اور دوسری طرف اہل مذہب ارباب دنیا کو الحاد سے ہمکنار سمجھنے لگے۔

ندوۃ العلماء نے اس صورت حال کو محسوس کیا اور دین و دنیا کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو ازسرنو استوار کرنے کی کوشش کی، لیکن حالات کی ناسازگاری نے اس کوشش کو پورے طور پر کامیاب

نہ ہونے دیا،مگراس اجلاس کے بعدایسی امید ہو چلی ہے کہ بانیان ندوہ کی یہ آرزو پوری ہو،اس سلسلہ میں نصاب تعلیم پرازسرنونظرڈالنا پڑے گی اور دینی ودنیوی علوم کواس طرح سمونا پڑے گا کہ دونوں میں ہم آہنگی پیدا ہوجائے،اس کے ساتھ اونچی سطح پراسلامی علوم کے مطالعہ وتحقیق کا ایسا انتظام کیا جائے۔اس کے بعد تفسیر وحدیث اور فقہ وکلام میں ایسے صاحب نظر علماء پیدا ہوسکیں،جو زمانہ کے تقاضوں سے باخبراوراسلامی ماخذوں سے پورے طور پرواقف ہوں اوران کے اندراسلامی اصول کو حالات پر منطبق کرنے کی صلاحیت ہو تا کہ وہ ابنائے عصر سے ان کی زبان میں بات کرسکیں اور ارباب کارکوشریعت کی وسعت وجامعیت کا یقین دلاسکیں۔

مولانا محمد میاں سے قارئین معارف بخوبی واقف ہیں۔ان کی علمی وعملی خدمات محتاج تعارف نہیں۔وہ درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق کے قائل تھے۔انہوں نے علمی شغف اور قومی خدمت کواپنی زندگی میں سمورکھا تھا۔مطالعہ وتحقیق اورتصنیف وتالیف کے لیے سکون قلب اور فراخ خاطر ضروری سمجھا جاتا ہے لیکن محمد میاں نے سیاست کے پرشور ہنگاموں اور قید و بند کی پریشانیوں میں یہ منزل طے کی ہے۔انہوں نے نہ کبھی داروسن کا خوف کیا نہ آبلہ پائی کا گلہ،وہ مطالعہ میں مصروف ہوتے یادرس وتدریس میں منہمک یا خاندانی مشاغل میں مشغول،جیسے ہی جنگ آزادی کا بگل بجتا میدان میں نکل آتے اوراس راہ کی ہر پریشانی خندہ پیشانی سے برداشت کرتے،وہ زندگی بھراس روش پر چلتے رہے،سیاست کے ساتھ تقوی پرعمل بہت مشکل ہے،مگرانہوں نے سیاسی زندگی کو پاکیزگی سے کبھی جدانہیں ہونے دیا۔ان کی خدمت بےلوث اوران کی سیرت بےداغ تھی، جماعتی زندگی میں کشمکش عام ہے۔ہرشخص سیادت کا طالب ہوتا ہے لیکن ان کا دامن اس عیب سے پاک تھا۔انہوں نے اپنے مفاد پر جماعت کے مفاد کو ہمیشہ مقدم رکھااوراس راہ ایثار میں ہر پریشانی کوخندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے رہے۔افسوس ہے کہ علم وعمل اورایثار وخدمت کا یہ مجسمہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے سرفراز فرمائے اور دوسروں کوان کی پاکیزہ اور پرخلوص زندگی کونمونہ عمل بنانے کی توفیق عطافرمائے۔(معارف،نومبر ۱۹۷۵ء)

اردو تعلیم کے لیے حکومت کے اقدامات

پچیس تیس برس پہلے اردو کے خلاف جوفضا پیدا ہوگئی تھی وہ ابھی ذہن سے فراموش نہ ہوئی

ہوگی، اس وقت حالات ایسے تھے کہ عام طور سے یہ یقین کیا جانے لگا تھا کہ بس اس کا آخری وقت آگیا ہے اور اب ہندوستان میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس وقت تقسیم ملک کے اثر سے فضا بیحد مسموم تھی، فرقہ وارانہ فسادات نے تلخیوں اور بدگمانیوں میں بہت اضافہ کر دیا تھا، حالانکہ اردو کو تقسیم سے کوئی سروکار نہ تھا، وہ نہ اسلام کی زبان تھی نہ مسلمانوں کی، اسلام کا صحیفۂ ربانی عربی میں نازل ہوا تھا اور مسلمان دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف زبانیں بول رہے تھے، خود ہندوستان میں بنگالی مسلمان بنگلہ، پنجابی مسلمان پنجابی، گجراتی مسلمان گجراتی، مہاراشٹر کے مسلمان مرہٹی، ٹامل ناڈ کے مسلمان ٹامل، کرناٹک کے مسلمان کنٹری، آندھرا کے مسلمان تلگو، کیرالا کے مسلمان ملیالم، آسام کے مسلمان آسامی اور کشمیر کے مسلمان کشمیری زبان بول رہے ہیں لیکن فرنگی ساحروں نے دلوں کو ایسا مسحور اور فرقہ وارانہ ہنگاموں نے دماغوں کو اس قدر مفلوج کر دیا تھا کہ اتنی واضح حقیقت بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دیا جا رہا تھا، حالانکہ اردو کی ساخت اور اس کی تاریخ پکار پکار کر یہ کہہ رہی تھی کہ یہ کسی ایک فرقہ کی نہیں، بلکہ تمام ہندوستانیوں کی ایک مشترک زبان ہے، جس کی تشکیل و تعمیر اور ترویج و اشاعت میں ملک کے سبھی علاقوں کے باشندے اور سبھی مذاہب کے پیرو شریک رہے ہیں اور اب بھی اس سے وابستہ اور اس کی توسیع و ترقی کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں۔

جن لوگوں نے ۱۹۴۷ء اور اس کے آس پاس کا زمانہ دیکھا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ اس وقت تعصب اور فرقہ پرستی کا کیا حال تھا، ہر طرف اتحاد و اتفاق کے بجائے انتشار و افتراق اور میل و محبت کے بجائے مخالفت و عداوت کا بازار گرم تھا۔ اس وقت عقل کے بجائے لوگ جذبات کے دھارے میں بہے چلے جا رہے تھے، جنون و مدہوشی کا عجیب عالم تھا، کھلے ہوئے حقائق نظر نہیں آتے تھے اور دل اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا تھے، ایسی فضا میں اردو جو قوموں کے اتحاد کی علامت اور میل ملاپ کی نشانی تھی تفریق کا باعث سمجھی گئی اور چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں کہ اسے ختم کر دو، ورنہ ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، ہندوستانی روایات مٹ جائیں گی اور ہندی تہذیب و تمدن کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اس مخالفانہ فضا میں کسے یارائے سخن تھا، بپھرے ہوئے مخالفوں کا رام کرنا تو بڑی بات تھی، ان سے گفتگو کی جرأت بھی کسی کو نہ ہوتی تھی، اپنی عزت و آبرو اور جان و مال کو کون خطرہ میں

ڈالتا، اردو کے بلند بانگ حامیوں نے کنارہ کشی اور گوشہ نشینی ہی میں عافیت سمجھی، یہ وقت بہت نازک تھا اور ایسا نظر آرہا تھا کہ اس ملک سے اب اردو کا چل چلاؤ ہے لیکن مایوسی کے اس عالم میں کچھ لوگوں نے ہمت کی اور صحرا میں صدا لگانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے، بظاہر حالات بیحد ناسازگار تھے مگر ان جیالوں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور نہ دیکھنے والوں کو دکھانے اور نہ سمجھنے والوں کو سمجھانے کی جد و جہد میں لگ گئے۔ آخر ان کی سعی پیہم کامیاب ہوئی، حقیقت کے رخ سے پردے ہٹنے لگے، رفتہ رفتہ صورت حال سامنے آئی، اردو نے پھر دلوں میں گھر کرنا شروع کیا اور اس کی اہمیت وافادیت عوام اور حکومت سب ہی کی سمجھ میں آگئی اور سرکاری اور عوامی دونوں سطحوں پر اس کی ترویج و ترقی کی فکر ہونے لگی۔

مرکزی حکومت نے اردو کی ترقی واشاعت کے لیے اردو بورڈ قائم کیا اور اس کے لیے ایک خطیر رقم منظور کی۔ اردو یونیورسٹی کے قیام کی تجویز بھی پیش کی گئی۔ ریاستوں نے بھی اردو کی طرف توجہ کی اور اسکولوں اور کالجوں میں اردو کی تعلیم کے مواقع پیدا کیے گئے۔ ہزاروں کی تعداد میں اردو اساتذہ کا تقرر کیا گیا، دفتروں اور عدالتوں میں اردو کے داخلہ کی راہیں نکالی گئیں، سرکاری ملازمین کو اردو سیکھنے کی ترغیب دی جانے لگی، ان کے لیے اردو کے امتحانات رائج کیے گئے اور اردو دانی ان کی صلاحیت کار میں اضافہ کا باعث قرار پائی، اردو کی ترقی کے لیے اردو اکاڈیمیاں قائم کی گئیں، اردو اخبارات ورسائل جو مدت سے کس مپرسی میں مبتلا تھے۔ ان کی جانب بھی توجہ شروع ہوئی۔ چنانچہ گذشتہ سال لکھنؤ میں مدیران رسائل واخبارات کا کل ہند اجتماع ہوا، اور ابھی حال میں کلکتہ میں ان کی دوسری کانفرنس ہوئی، حکومت نے ان اجتماعات کی حوصلہ افزائی کی اور ارباب حکومت نے اپنی تائید واعانت سے ان کی قوت عمل اور نشاط کار میں اضافہ کیا۔

حکومت کی طرف سے تائید واعانت کا یہ رویہ فال نیک ہے، امید ہے کہ اس توجہ میں مزید اضافہ ہوگا اور اس کی سرپرستی سے اردو کی نشوونما میں بہت مدد ملے گی لیکن محض حکومت پر تکیہ کر لینا کافی نہیں ہے۔ اردو والوں کو خود بھی ہاتھ پیر ہلاتے رہنا چاہیے۔ انہیں لوگوں کے دلوں میں یہ خیال جما دینا چاہیے کہ اردو کی ترویج وترقی کے لیے جد و جہد ان کا فرض ہے۔ ان کے بجٹ میں دوسری مدوں کے ساتھ اردو کی بھی ایک مد ہونا چاہیے، آج حالت یہ ہے کہ فضول مراسم، لاحاصل تفریحات

اور بے جا تعیّشات پر وہ دھڑلے سے خرچ کرتے ہیں، مگر اردو کے کسی رسالہ اور کتاب کا خریدنا پہاڑ سمجھتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو کے اخبارات ورسائل سسک رہے ہیں، کتب خانے کس مپرسی میں مبتلا ہیں اور دارالاشاعت دم توڑ رہے ہیں۔ یہ صورت حال باعث افسوس ہے، دوسروں کی شکایت کا موقع ہوتا ہے تو ہم بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے ہیں لیکن اپنے گریبان میں منھ ڈال کر بھی دیکھنا چاہیے کہ اردو کے ساتھ خود ہمارا رویہ کیا ہے۔ (معارف، دسمبر ۱۹۷۵ء)

دارالمصنّفین کے ۶۴ سال

دارالمصنّفین کے قیام کو ۶۴ سال گذر چکے ہیں، دو نسلیں اس کی خدمت کر کے رخصت ہو چکی ہیں اور تیسری پابہ رکاب ہے۔ مولانا شبلیؒ نے اس کا جو لائحہ عمل مرتب کیا تھا، وہ سرمایہ اور وسائل کی قلت کے باوجود بڑی حد تک پورا ہو چکا ہے اور اب دائرہ کار کو مزید وسعت دینے کا ارادہ ہے۔ عہد رسالت سے دولت عثمانیہ تک تاریخ اسلام کی چھ جلدیں شائع کی جا چکی ہیں۔ اس سلسلہ کو عصر حاضر تک پہنچانے کے لیے مزید دو جلدوں کی ضرورت ہے۔ تاریخ ہند کے مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن دو تین جلدوں میں ایک ایسی کتاب کی اشاعت بھی ضروری ہے، جو صحت و جامعیت اور بے تعصبی و فراخ دلی میں ممتاز ہو۔ عربی ادب کی جامع تاریخ کی تیاری بھی شروع سے ہمارے منصوبہ میں داخل اور پروگرام میں شامل ہے۔ احباب کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی مطبوعات کے انگریزی، ہندی اور عربی ترجمے بھی شائع کریں اور عصری مسائل پر محققانہ کتابیں تیار کریں لیکن اس کے لیے ہمیں اپنے اسٹاف میں بہت اضافہ کرنا پڑے گا اور پریس کے انتظامات بھی وسیع کرنے ہوں گے۔ اگر دارالمصنّفین کے ہمدرد ہمارے ساتھ تعاون کریں اور ہماری مطبوعات اور معارف کی توسیع اشاعت کے لیے تھوڑی سی کوشش کر دیں تو یہ کار عظیم آسانی سے انجام پا سکتا ہے۔ (معارف، فروری ۱۹۷۸ء)

مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ

اردو کی حیثیت

تقسیم کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ جنون اور لسانی تعصب کی جو آگ بھڑک اٹھی تھی اس کی لپیٹ میں اردو زبان بھی آ گئی تھی مگر اب اس کی شدت میں کمی ہوگئی ہے اور اردو کے بارے میں صورت حال بدل رہی ہے، ہندی والوں کے دل میں بھی اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہونے لگا ہے، مدھیہ پردیش میں حال ہی میں ہندی کے ادیبوں اور دانشوروں نے اردو کی حمایت میں بیان دیا ہے اور لکھنؤ میں جن وادی لیکھک سنگھ کی اتر پردیش شاخ کے ایک اجلاس میں جو ۲۷ فروری کو گنگا پرشاد میموریل ہال میں ہوا، اردو کو یوپی کی دوسری سرکاری زبان بنانے کی قرارداد منظور کی گئی، اس اجلاس میں اردو کے ادیب و شاعر بھی موجود تھے مگر ہندی کے ادیبوں کی اکثریت تھی، ان کی جانب سے یہ مطالبہ ایک اچھی علامت اور اردو کے لیے فال نیک ہے، ایسی فضا میں گزشتہ ماہ انجمن ترقی اردو (ہند) کی کانفرنس کا یہ فیصلہ کہ ہندی والوں سے اور زیادہ قربت حاصل کی جائے، بہت مناسب اور دانش مندانہ ہے، اس پر عمل کرنے کی صورت پر بھی غور کرنا چاہیے۔

آزادی سے پہلے یہ جھگڑا تھا کہ ملک کی زبان کیا ہو؟ اس کے نتیجہ میں اردو اور ہندی میں کشمکش پیدا ہوگئی تھی، مگر آزادی کے بعد معمولی اور نام ہی کی اکثریت سے سہی، جب ہندی کو ملک کی سرکاری زبان تسلیم کرلیا گیا تو مولانا ابوالکلام آزاد کے بقول "اردو کی حیثیت میں ایک بنیادی انقلاب ہوگیا اور اردو کی بات رقیب کی حیثیت سے ختم ہوگئی، اب ہر ہندوستانی کا جو آئین کا وفادار ہے فرض ہے کہ اسے مانے............اب یہ سوال اٹھتا ہی نہیں کہ پورے ملک کی زبان کون سی ہوگی، ہندی کو جو جگہ ملنا تھی وہ اسے مل گئی، اب ہر ہندوستانی کا فرض ہے کہ اس کے آگے سر جھکائے لیکن اس کے ساتھ اردو کی جو جگہ ہے وہ اسے ملنی چاہیے"، لیکن ملک کو آزاد ہوئے چالیس برس گزر گئے مگر افسوس ہے کہ اردو کو اس کا جائز حق اور اصلی جگہ نہیں مل سکی۔

ہندوستان کے ان علاقوں میں جہاں اردو بولنے والوں کی قابل لحاظ آبادی ہے، اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے منوانے کی کوشش ایک عرصہ سے جاری ہے لیکن بہار کے سوا اور دوسری ریاستیں اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر اب تک یہ کام نہیں کر سکی ہیں، ان کو جتنا جلد احساس ہوجائے اچھا ہے کہ سیاسی مصلحت کی وجہ سے حق و انصاف کی آواز کو دبانا جمہوریت کا گلا گھونٹنا ہے، انجمن ترقی اردو ہند کی کانفرنس نے پھر ایک بار اپنے مطالبہ کو دہرایا ہے، دیکھنا ہے آنے والے انتخابات کے پیش نظر سیاسی پارٹیاں اپنے منشور میں اس مطالبہ کو کس حد تک جگہ دیتی ہیں۔

نظام تعلیم میں سہ لسانی فارمولے میں اردو کو جگہ دینے کا سوال بھی ہے جواب تک طرح طرح کے حیلوں کا شکار ہوتا رہا ہے، خصوصاً اتر پردیش میں اس کے لیے متعدد بار سعی و کوشش کی گئی مگر رائیگاں گئی، اس سے حکومت کی بد نیتی اور اردو کو نظرانداز کرنے کی پالیسی کا اندازہ ہوتا ہے، تازہ اطلاع کے مطابق پھر اردو کو سہ لسانی فارمولے میں شامل نہ کر کے اتر پردیش کی حکومت نے اردو والوں کے کرب و بے چینی میں اضافہ کر دیا ہے، جمہوریت میں ووٹوں کی بڑی طاقت ہوتی ہے، عجب نہیں کہ وقت آنے پر اردو والے اس طاقت سے کام لے کر مقصد برآری کر لیں۔

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری کی جانب سے ۲۲ تا ۲۶ مارچ کو پٹنہ میں ایک سمینار ہوا، اس کا خاص موضوع تو ''ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ سے متعلق عربی و فارسی مخطوطات'' تھا لیکن اس کے کئی جلسوں میں درسی کتابوں کے مواد کا بھی جائزہ لیا گیا اور اسلام خصوصاً مسلم سلاطین ہند کے بارہ میں دلآزار اور گمراہ کن اسباق کی نشاندہی کی گئی، سمینار میں اکثر ریاستوں کے نمائندے شریک تھے اور انہوں نے اپنی ریاست کے اسکولوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں پر مضامین پڑھے جن پر مفید بحثیں ہوئیں اور آخر میں تجویزیں بھی منظور کی گئیں، جلگاؤں کے نمائندے پروفیسر اکبر رحمانی مدیر رسالہ آموزگار کو اس مسئلہ سے خاص دلچسپی تھی اور وہ راقم کا خیال دریافت کرنے کے لیے میری رہائش گاہ پر آئے اور اسے ٹیپ بھی کیا۔ (معارف اپریل ۱۹۸۸ء)

انجمن ترقی اردو

انجمن ترقی اردو (ہند) کی صدارت کے لیے جناب سید حامد سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کا انتخاب بہت مناسب اور انجمن اور اردو دانوں کے لیے فال نیک ہے، ہم سید صاحب کو مبارک باد

پیش کرتے ہوئے انجمن کے ارکان کی جوہر شناسی اور حسن انتخاب کی بھی داد دیتے ہیں۔

سید حامد صاحب متحرک، فعّال اور کارگزار ہونے کے علاوہ باوقار، پُرکشش اور مقناطیسی شخصیت کے مالک ہیں، ان کی سرگرمی، اخلاص اور قوت عمل سے توقع ہے کہ انجمن کو طاقت و توانائی ملے گی اور سید صاحب کی مسیحائی اس تنظیم میں زندگی کی روح پھونک دے گی، انہوں نے مارچ میں ہونے والی انجمن کی سہ روزہ کل ہند کانفرنس میں اس کا نیا نقطۂ نظر اور نیا لائحۂ عمل پیش کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب انجمن تحریک کا روپ اختیار کرنے والی ہے، اس کے جمود و تعطل کے ختم ہونے کے دن آ گئے ہیں اور آزاد ہندوستان میں اردو کا جائز اور جمہوری حق مل کر رہے گا۔

سید حامد صاحب نے اردو کے تین محاذ بتائے ہیں: حکومت، ابنائے وطن اور خود اردو والے، اور تینوں محاذوں پر مداومت، استقامت، استمرار اور تنظیم کے ساتھ کام کرنے کے انجمن کے پروگرام اور منصوبے کا اعلان کیا ہے، ان کا یہ تجزیہ درست ہے کہ اردو کے سربراہوں نے صرف پہلے محاذ پر کام کیا ہے لیکن تیسرے اور اہم محاذ یعنی اردو کی ترویج و اشاعت اور اسے گھر گھر پہنچانے سے غافل رہے ہیں، حالانکہ پہلے دونوں محاذ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہیں لیکن تیسرا محاذ ہمارے ہاتھ میں ہے۔

یہ بہت افسوسناک ہے کہ کتنے اردو والے اردو سے فائدہ اٹھانے کے باوجود اس کی تعلیم و ترویج سے بے پروا ہیں، اس کے لیے جانفشانی کرنے اور قربانی دینے سے گھبراتے ہیں، ان کے بچے اردو سے ناواقف ہیں، ان کے گھروں سے اردو کا رواج ختم ہوتا جارہا ہے، یہاں تک کہ دکانوں کے سائن بورڈ سے بھی اردو غائب ہے، ایسی حالت میں ان کو دوسروں سے شکایت کرنے کا کیا حق ہے؟

پہلے محاذ پر انجمن نے یہ پیش رفت کی ہے کہ اس کا ایک وفد ۸ جون کو انسانی وسائل کی ترقی کے وزیر جناب نرسمہا راؤ سے ملا اور ان کی خدمت میں میمورنڈم پیش کیا کہ اردو کو سہ لسانی فارمولے میں ایک جدید ہندوستانی زبان کی حیثیت سے شامل کیا جائے، ہندی ریاستوں میں اردو طلبہ کی پہلی زبان اردو اور ہندی طلبہ کو دوسری زبان کے بارے میں اختیار ہو کہ اردو سمیت کوئی بھی جدید ہندوستانی زبان لے سکیں اور جن طلبہ کا ذریعہ تعلیم اردو ہو ان کے داخلہ کا امتحان چھٹے درجے میں اردو میں لیا جائے۔

وفد نے گجرال کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد کا مطالبہ کیا اور وزیر موصوف کو کانگریس کا

انتخابی منشور یاد دلا کر اردو کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان بنائے جانے پر زور دیا، اردو کے مشہور شاعر و ادیب اور انجمن کے سابق صدر پنڈت آنند نرائن ملا نے کہا کہ ہندوستان میں اردو کا حق اس وقت تک نہیں مل سکتا جب تک اتر پردیش میں اردو کو قانونی حیثیت نہ دی جائے، وفد نے انہیں اردو کے تعلق سے حکومت ہند کی پالیسی اور طریقہ کار کے بارے میں اردو عوام کی بددلی اور بے اطمینانی سے بھی آگاہ کیا اور سہ لسانی فارمولے کی خلاف ورزی میں اتر پردیش کی تنگ نظری اور تعصب کا حوالہ بھی دیا۔

اس ریاست میں چالیس برس سے اردو والوں کی یہی آواز گونج رہی ہے مگر حکومت جس انداز سے مطالبات ماننے کی عادی ہوگئی ہے، ابھی تک اس انداز میں مطالبے پیش نہیں کیے جاسکے ہیں، یہ بدقسمتی ہے کہ ایسے نازک وقت میں بھی جب کہ اردو کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں، اردو والے ایک دوسرے پر الزامات عائد کرنے میں لگے ہوئے ہیں، ان کی اس کشمکش سے اردو کا مسئلہ پس پشت ہوگیا ہے، سید حامد صاحب نے اردو کی ساری تنظیموں سے اردو کے تحفظ و ترقی کے مرکزی ادارہ انجمن ترقی اردو کے ساتھ اشتراک عمل کی درخواست کی ہے تاکہ اس کے ذریعہ ان سب کی مجموعی طاقت اپنا اظہار کرسکے اور اپنی بات منوا سکے، خدا کرے ان کی یہ آواز صدا بصحرا نہ ہو۔

۱۹؍جون کو کل ہند اردو رابطہ کمیٹی کے زیر اہتمام ایک اردو کانفرنس لکھنؤ میں ہوئی، اس کا افتتاح حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے کیا اور اس کو سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں اور ممتاز قومی و ملی کارکنوں نے خطاب کیا، کانفرنس نے اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے، ابتدائی و ثانوی سطح پر اردو تعلیم کے انتظام، تمام سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اردو کے استعمال اور سہ لسانی فارمولے پر دیانت داری سے عمل درآمد کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے اس پر زور دیا کہ اگر ۳۱؍دسمبر تک اردو کے سلسلہ میں کیے گئے انتخابی وعدے پورے نہ کیے گئے تو اردو دوست راست اقدام کرنے پر مجبور ہوجائیں گے۔

برسر اقتدار پارٹی اپنے انتخابی منشور کی رو سے اردو کو ریاست کی دوسری سرکاری زبان بنانے کی پابند ہے، اس لیے وہی محبان اردو کے اس سخت اقدام کی ذمہ دار ہے، اب بھی وقت ہے کہ حکومت ان کے صبر کا امتحان لیے بغیر اپنا وعدہ پورا کردے، اتر پردیش کے موجودہ وزیر اعلیٰ شری

نارائن دت تیواری کی شرافت، معقولیت اور سوجھ بوجھ کا ان کے سیاسی مخالفین کو بھی اعتراف ہے، ان سے امید ہے کہ وہ حکومت کی سرد مہری کی پالیسی تبدیل کر کے اردو داں طبقہ کا دل جیتنے کی کوشش کریں گے، رابطہ کمیٹی کے سربراہ ان سے رابطہ قائم کریں، یہ سطریں لکھی جا چکی تھیں کہ کل ہند رابطہ کمیٹی کے صدر رام لعل صاحب کا ایک خط اخبار میں نظر سے گزرا جو اسی مسئلہ کے بارہ میں وزیر اعلیٰ کو لکھا گیا ہے۔ (معارف جولائی ۱۹۸۸ء)

امارت شرعیہ

پورے ملک میں بہار واڑیسہ کو "امارت شرعیہ" قائم کرنے کا فخر و امتیاز حاصل ہے، اس کے زیر انتظام عرصہ سے قضا کا نظام کافی خوش اسلوبی سے چل رہا ہے، اس کی بدولت شرعی قوانین کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں اور مسلمانوں کو اکثر اپنے مقدمات کے لیے سرکاری عدالتوں سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی، معلوم ہوا ہے کہ بہار کی سرکاری عدالتیں بھی دارالقضا کے فتوے اور فیصلے کا احترام کرتی ہیں اور ان کو باوزن مانتی ہیں، انصاف کو صحیح اور جلد ہونا چاہیے، مگر سرکاری عدالتوں میں مقدمات کے فیصلے اتنی تاخیر سے ہوتے ہیں کہ کبھی کبھی تو انصاف چاہنے والے کی زندگی ہی کا خاتمہ ہو چکا ہوتا ہے، روپئے پیسے کا ضیاع، زحمت اور پریشانی الگ ہوتی ہے، لیکن دارالقضا سے مقدمات کا تصفیہ جلد ہو جاتا ہے اور لوگوں کو زحمت اور پریشانی بھی نہیں اٹھانی پڑتی، کچھ ماہ پہلے امارت کے سجاد اسپتال کا افتتاح کرتے ہوئے بہار کے وزیر اعلیٰ مسٹر بھگوت جھا آزاد نے کہا تھا:

"ہمیں تعجب ہے کہ پھلواری شریف کے دارالقضا نے سترہ ہزار سے زائد فتوے اور فیصلے کیے ہیں اور ہماری ٹریجڈی ہے کہ لوور کوٹ، ڈسٹرکٹ کورٹ، ہائی کورٹ، سپریم کورٹ کے فیصلے تک انصاف پانے والا جاتے جاتے مرجاتا ہے، بڑا طویل مرحلہ ہے یہ"۔

اس معاملہ میں ہر جگہ کے مسلمانوں کو بہار کی تقلید کرنی چاہیے کیونکہ انصاف کے قیام، حقوق کی حفاظت اور شریعت کے نفاذ کے لیے قضا کے شرعی نظام کا قیام ناگزیر ہے، یہ وقت کی ایک بڑی اہم ضرورت اور مسلمانوں کا شرعی و اجتماعی فریضہ ہے، دینی جماعتوں اور ملی اداروں کو بھی اپنی توجہ اس کی جانب مبذول کرنی اور اس کے لیے منظم جدوجہد کرنی چاہیے، اگر قضا کا نظام ملک کے طول و عرض میں وسیع پیمانے پر قائم ہو جائے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی اسلامی زندگی اور

طرز معاشرت کو جو خطرات لاحق ہیں اس سے بڑی حد تک ان کا خاتمہ ہو جائے اور مسلم پرسنل لا کے تحفظ کا سامان بھی ہو جائے، نظام قضا کے قیام میں گوناگوں دنیاوی فائدے بھی ہیں، ان کے پیش نظر سارے ملک میں دارالقضا قائم کرنا اور اسلامی عدالتوں کا جال بچھانا دینی و ملی فرض ہے، اللہ کے نازل کیے ہوئے قانون کو نافذ و جاری کرنے ہی سے دنیا میں عدل و قسط کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں اور مسلمانوں کی اسلامی زندگی اسلامی بنیادوں پر منظم و مستحکم ہو سکتی ہے، لکھنؤ میں اس اہم کام کا آغاز ہوا ہے جس کو موثر اور منظم کرنے کے لیے بڑی جدوجہد اور سخت جانفشانی کرنی ہوگی۔

(معارف اگست ۱۹۸۸ء)

اردو کے لیے ایک سے زائد رسم الخط

آج کل جناب سید ہاشم علی وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا وہ کلیدی خطبہ اردو والوں کے غم و غصہ اور تشویش و اضطراب کا باعث بنا ہوا ہے جو خدا بخش لائبریری پٹنہ کی تیسری اردو ریسرچ کانگریس میں دیا گیا اور جس میں اردو کے تحفظ کے لیے اس کے ایک سے زائد رسم الخط کی ضرورت بتائی گئی، دراصل یہ تجویز اردو کی موت کا پیش خیمہ ہے، صدیوں کے چلن سے زبان اور رسم خط میں جسم و جان کا سا رشتہ استوار ہو جاتا ہے، کسی زبان سے اس کے رسم خط کا رشتہ توڑ دینے کے بعد اس کا ادب تب و تاب اور تازگی و توانائی سے محروم ہو جاتا ہے اور خود وہ زبان بھی باقی نہیں رہتی، پنڈت جواہر لال نہرو نے بجا فرمایا ہے کہ "شاندار ماضی رکھنے والی کسی بھی زبان کے رسم خط کو بدلنے سے صفحۂ قرطاس پر نئی صورتیں نمودار ہونے لگیں گی جو نئے خیالات اور نئی آوازوں کی حامل ہوں گی، قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار کھڑی ہو جائے گی، قدیم ادب اور قدیم زبان دونوں کی موت واقع ہو جائے گی، ہندوستان میں ایسی تبدیلی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا، اس قسم کی تبدیلی ظالمانہ غارت گری ہوگی جس سے عام تعلیم کی ترقی کو سخت دھکا لگے گا"۔

(معارف فروری ۱۹۸۹ء)

مسلمانوں کے مسائل

ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی مظلومی، بربادی اور اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی اور ناانصافی کی بڑی شکایت ہے، وہ ۴۷ء کے بعد سے اسی کا دکھڑا رو رہے ہیں لیکن اس کا جو نتیجہ ہے

وہ ظاہر ہے

عرفی اگر بگریہ میسر شود وصال صدسال می تواں بہ تمنا گریستن

بلاشبہ مسلمانوں کے ساتھ بڑی زیادتیاں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں، اس کا اعتراف خود انصاف پسند غیر مسلم رہنماؤں کو بھی ہے اور وہ اس کے خلاف آواز بھی بلند کر رہے ہیں، مگر ان کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی، مریض و ناتواں شخص میں مدافعت کی قوت نہیں ہوتی اور موسم کی بے اعتدالی اور ہوا کے معمولی جھونکے سے بھی اس کا مرض بڑھنے لگتا ہے اور وہ مزید عوارض میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن تندرست و توانا شخص کی قوت مدافعت قوی ہوتی ہے اور وہ سرد و گرم کو آسانی سے جھیل سکتا ہے، موسم کی خرابی اور معمولی جھٹکے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، ۴۷ء کے بعد مسلمانوں پر اتنی مشکلیں پڑیں کہ ان کی قوتِ مدافعت جاتی رہی اور اب معمولی جھٹکا بھی ان کی ناتوانی اور کمزوری کو بڑھا دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے جرم ضعیفی کی مزید سزا بھگت رہے ہیں۔

مسلمانوں کی مشکلات اور پریشانیوں کا حل حبل اللہ کو مضبوطی سے پکڑنے اور اپنے کو طاقتور اور توانا بنانے میں ہے مگر جب دیوار کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہوں تو اسے اوپر کی لیپا پوتی سے باقی نہیں رکھا جا سکتا، مسلمان قوت و استحکام کے بغیر بیرونی حملوں سے کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں، ان کی بڑی خامی یہ ہے کہ ان کی نظر اپنی ان اصلی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر نہیں پڑ رہی ہے جو انہیں گھن کی طرح کھائے جا رہی ہیں اور جس نے انہیں بالکل بے دم کر دیا ہے، اس کی وجہ سے وہ انہیں دور کرنے اور اپنی بنیادوں کو مستحکم کرنے سے غافل ہو گئے ہیں اور محض دیوار کی لیپا پوتی میں لگے ہوئے ہیں اور ان کے سروں پر ادبار کی ایسی گھٹا چھا گئی ہے جو کسی طرح ٹلنے کا نام نہیں لیتی۔

مسلمانوں کی قوت و توانائی کا اصل دار و مدار ایمان و عقیدہ کی استقامت، خیالات و نظریات کی پختگی، افکار و اعمال کی پاکیزگی اور وقت و حالات کے لحاظ سے درست فیصلہ اور مناسب راہ عمل کے تعین پر ہے، وہ اپنے مذہب و مسلک، اپنی بنیادی خصوصیات اور امتیازی روایات کو کھو کر اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتے، ان کے ملک کا آئین جمہوری اور سیکولر ہے، اور وہ اس بارے میں قطعاً کوئی مزاحمت نہیں کرتا، دوسرے مذاہب کے لوگ بھی ایسے مسلمان کو بری نگاہ سے دیکھنے کے بجائے عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں، برائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب خود غرض اور

مفاد پسند لوگ مذہب سے انحراف کرکے اس میں وہ باتیں شامل کر لیتے ہیں جن کو مذہب سے تو کوئی تعلق نہیں ہوتا مگر ان کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ جنون بھڑک اٹھتا ہے اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت و بدگمانی پیدا ہوتی ہے، دراصل جو مسلمان اپنے مذہب کا وفادار نہیں وہ ملک و وطن کا بھی وفادار نہیں ہوسکتا، ترقی پسندی اور سیکولر نوازی کا مظاہرہ کرنے والے نہ اپنے دین کے خیر خواہ ہیں اور نہ ملک کے دوست۔

مسلمان دوسروں کے مقابلہ میں ہر شعبۂ زندگی میں نہایت پیچھے ہو گئے ہیں، اقتصادی اور تعلیمی حیثیت سے وہ اتنے پیچھے ہیں کہ ان سے کوئی عظیم اور برتر ذہنی و دماغی کارنامہ انجام دینے کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی، تعلیم کے میدان میں وہ دن بدن پیچھے ہوتے جارہے ہیں، حالانکہ کسی قوم کی عظمت و ترقی کا اصل ذریعہ تعلیم ہی ہے، اسی سانچہ میں وہ افراد ڈھل کر تیار ہوتے ہیں جن کی قوم کو ضرورت ہوتی ہے، اس پسماندگی کو دور کرنے کے لیے بڑی ریاضت و محنت، شدید مشقت و جانفشانی اور غیر معمولی مجاہدہ و جفاکشی کی ضرورت ہے جس کے مسلمان خوگر نہیں رہے بلکہ سستی، کاہلی، تن آسانی اور آرام طلبی کے عادی ہو گئے ہیں، وہ وقت کی قدر و قیمت بھی محسوس نہیں کرتے، ان کا سارا وقت فضول کاموں، لایعنی مشغلوں اور یاوہ گوئی میں گزرتا ہے، باتیں بنانے سے ان کو خاص دلچسپی ہے، سعی مسلسل اور عمل پیہم کو جہاد زندگانی کی شمشیر بنانے کے فن سے وہ ناواقف ہو گئے ہیں۔

مسلمانوں کو اپنے مسائل و مشکلات کے حل کے لیے بے عملی، جمود اور تعطل کی زندگی کو خیرباد کہنا ہوگا اور اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو یکسوئی، انہماک، مستعدی، دیانت داری اور ایمانداری سے انجام دینا ہوگا، اس فاصلہ کو ختم اور دیوار کو ڈھانا ہوگا جو ان کے اور برادرانِ وطن کے درمیان حائل ہوگئی ہے، خدمت اور فیض رسانی سے اس غلط فہمی اور بدگمانی کو دور کرنا ہوگا جو ابنائے وطن کے دلوں میں ان کی جانب سے پیدا ہوگئی ہے، بُعد و بیگانگی اور نفرت و اجنبیت کو قرب و یگانگت اور محبت و انسیت میں تبدیل کرنا ہوگا، فضول خرچی، اسراف، تکلف اور نمائش پسندی کے بجائے اصلیت، سادگی اور حقیقت پسندی کو اختیار کرنا ہوگا، ذاتی مفاد پر ملی مفاد کو مقدم کرنا ہوگا، اجتماعی اور قومی زندگی کی تعمیر و تشکیل کے لیے طویل المیعاد منصوبے اور پروگرام بنانے ہوں گے، جن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بڑے صبر و استقلال سے کام لینا اور اپنا خواب و خور حرام کرنا پڑے گا، یہ سارے

کام بڑے صبر آزما، وقت طلب اور دیر پا ہیں مگر ان کے بغیر نہ مسلمان اپنی ملت کی مفید خدمت کر سکتے ہیں اور نہ ملک میں اپنی اچھی اور بہتر جگہ بنا سکتے ہیں، گردشِ ایام اور حکومت کی بے رخی کا شکوہ وگلہ کرنے، جذبات کی رو میں بہنے اور عمل سے فارغ ہو کر تقدیر کا بہانہ بنانے سے نہ ان کے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور نہ ملت کے مقدر کا ستارہ چمک سکتا ہے۔(معارف مئی ۱۹۸۹ء)

یو پی اور بہار میں دوسری سرکاری زبانیں

اتر پردیش کی کابینہ نے اتفاق رائے سے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کی جو تجویز منظور کی تھی اب ریاستی اسمبلی وکونسل نے بھی اس کی توثیق کر دی ہے، بھارتیہ جنتا پارٹی کی مخالفت، شوروغل، ہنگامہ آرائی اور تشدد کے باوجود یہ بل منظور ہو گیا جس میں اتر پردیش راج بھاشا ایکٹ مجریہ ۱۹۵۱ء میں دفعہ ۲ کے تحت مندرجہ ذیل دفعہ بڑھا دی جائے گی: ”اردو زبان بولنے والوں کے مفاد میں دوسری راج بھاشا کی شکل میں اردو کا استعمال ایسے مقاصد کے لیے کیا جائے گا جن کو ریاستی حکومت بذریعہ نوٹی فکیشن مقرر کرے“ اس طرح حکومت اب اس کی مجاز ہو گئی کہ وہ وقتاً فوقتاً جن مقاصد کے لیے ضروری سمجھے اور جہاں ضروری سمجھے اردو کو دوسری سرکاری زبان کے طور پر استعمال کرنے کے لیے نوٹی فکیشن جاری کرے۔

بل میں بہار میں راج بھاشا ایکٹ میں ترمیم کا حوالہ دے کر کہا گیا ہے کہ وہاں کی ریاستی حکومت نے ہندی کے ساتھ اردو کو دوسری سرکاری زبان کی شکل میں ان مقاصد کے لیے استعمال کیے جانے کی ہدایت کی ہے: ۱۔اردو میں عرضیوں اور درخواستوں کو لینا اور ان کا اردو میں جواب دینا ۲۔اردو میں دستاویزوں کا رجسٹریشن ۳۔اہم سرکاری قوانین وضوابط اور نوٹی فکیشن کا اردو میں اجرا ۴۔عوامی اہمیت کے سرکاری احکام اور سرکلر کا بھی اردو میں ہونا ۵۔اہم سرکاری اشتہارات کا اردو میں شائع ہونا ۶۔ضلع گزٹ کا اردو میں شائع ہونا ۷۔اہم سائن بورڈوں کا اردو میں لگایا جانا، کہا گیا ہے کہ یہ انتظام بہار میں خوش اسلوبی سے چل رہا ہے اور عوام میں مقبول ہے، اس لیے بہار کے طرز پر یہ طے کیا گیا ہے کہ اس ریاست میں بھی اسی نوعیت کا انتظام کیا جائے، اسی مقصد سے یہ ترمیمی بل پیش کیا جا رہا ہے۔

اردو نہ صرف بہار اور اتر پردیش بلکہ پورے ملک کی ایک بڑی آبادی کی مادری زبان ہے،

اس کے جائز جمہوری اور آئینی مطالبہ کو کوئی سیکولر اور انصاف پسند حکومت بہت دنوں تک نظر انداز نہیں کر سکتی تھی، کانگریس ۸۰ء و ۸۴ء کے انتخابی مشور کی رو سے اردو کو اتر پردیش کی دوسری سرکاری زبان بنانے کی پابند تھی، یہ بل منظور کر کے اس نے برسوں پہلے کیے جانے والے اپنے وعدے کو پورا کیا ہے، اردو کا یہ اور دوسرے حقوق بہت پہلے مل جانا چاہیے تھا مگر فرقہ پرست اور تنگ نظر سیاست دانوں نے ہمیشہ اردو کے مسئلہ کو فرقہ وارانہ اور سیاسی رنگ دینے کی کوشش کی ہے، اس لیے اتر پردیش میں اردو کے متعلق اعلان ہوتے ہی شر پسند عناصر اور ہندی کے پرجوش حامیوں پر اس کی مخالفت کا جنون سوار ہو گیا اور بدایوں میں قتل و خوں ریزی، وحشت اور درندگی اور لوٹ و غارت شروع ہو گئی، جس میں حکومت کی غفلت سے بڑا جانی و مالی نقصان ہوا، اردو والے بھی مشتعل ہو گئے، ان کو ضبط و تحمل سے کام لے کر شر پسندوں کے عزائم کو ناکام بنا دینا چاہیے تھا۔

اتر پردیش حکومت کے اس فیصلہ پر مختلف قسم کا ردعمل ظاہر کیا جا رہا ہے، ایک طرف تو لوگ جوشِ مسرت سے جھوم رہے ہیں اور دوسری طرف اسے انتخابی حکمت عملی سمجھ کر بے نتیجہ اقدام قرار دیا جا رہا ہے، وزیر اعلیٰ نے کہا ہے کہ "اردو کی تعلیم پرائمری سطح پر نہ تو لازمی کی جا رہی ہے اور نہ ملازمتوں کے ضمن میں اس کی کوئی قید لگائی جا رہی ہے"، اس کے بعد حکومت کے فیصلہ کو انقلاب انگیز اقدام سمجھ کر زیادہ خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے، اردو کو اتر پردیش میں پہلے ہی سے یہ سہولتیں حاصل تھیں جن کو انتظامیہ مسلسل نظر انداز کرتی رہی ہے اور اب بھی اس کی جانب سے رکاوٹیں پیدا کی جائیں گی لیکن حکومت اردو کو دوسری سرکاری زبان مان لینے کے بعد اس کی پابند ہو گئی ہے کہ وہ مذکورہ بالا مقاصد کے لیے اردو کے استعمال کی سہولتیں فراہم کرے اور اسے انتظامیہ کے رحم و کرم پر نہ چھوڑے، حکومت کو اپنے فیصلہ پر واقعی عمل کر کے ایک نئے باب اور نئے دور کا آغاز کرنا چاہیے۔

اردو کے بعض حلقوں کا یہ مطالبہ بجا ہے کہ "سہ لسانی فارمولے میں شامل کر کے آٹھویں درجہ تک اردو کی لازمی تعلیم کا بندوبست ریاست کے ہر اسکول میں کیا جانا چاہیے" اردو والوں کو اردو سے بے بہرہ کر دینے کے لیے ۴۲ سال سے اسے دودھ کی مکھی کی طرح اسکولوں سے جو نکال باہر کیا گیا تھا، اب اس پالیسی کو چھوڑ کر اسکولوں کا دروازہ اردو کے لیے کھول دینا چاہیے، اس کے بغیر اردو والے مطمئن نہیں ہو سکتے، بل میں اس کا ذکر نہ ہونے کے باوجود مایوس ہونے کی ضرورت نہیں

ہے، حکومت کے موجودہ فیصلہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیے اور اردو کے فروغ وترقی کے لیے سرگرم جدوجہد رکھنی چاہیے، حکومت کا یہ اعلان اردو کے تحفظ وبقا کی ضمانت نہیں ہے کہ اس پر اطمینان کرلیا جائے۔ (معارف اکتوبر ۱۹۸۹ء)

فسادات

ہندوستان کی نئی حکومت کو پچھلی حکومت سے جو مسائل ورثے میں ملے ہیں ان میں بعض اتنے نازک، پیچیدہ اور الجھے ہوئے ہیں کہ ان کو جلدی اور آسانی سے حل کرنا ممکن نہیں، تاہم وزیر اعظم مسٹر وشوناتھ پرتاپ سنگھ کے رویے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کا حل تلاش کرنے میں واقعی مخلص اور سنجیدہ ہیں، انہوں نے اپنے پہلے نشریے میں ان اولین اہمیت کے حامل مسائل کا تذکرہ خاص طور سے کیا تھا اور ان پر پوری توجہ دینے کے لیے اپنے مکمل عزم وارادہ کا اظہار بھی کیا تھا، مگر پنجاب کے سوا ابھی تک کوئی اور مسئلہ ان کی حکومت کا مرکز توجہ نہیں بن سکا ہے، یہ الگ بات ہے کہ اب بھی نہ وہاں تشدد اور دہشت گردی میں کمی آئی ہے اور نہ خون خرابہ بند ہوا ہے۔

نئی حکومت کو ترکہ میں فرقہ وارانہ فسادات کا مسئلہ بھی ملا ہے، حال میں وزیر اعظم نے بھاگل پور کا دورہ کیا ہے جہاں ع ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو۔ اور حکومت کی مشینری اور انتظامیہ نے ایسی قیامت ڈھائی ہے کہ ع آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں۔ دراصل ہر جگہ کے فساد میں امن وامان کے ذمہ دار ہی قتل وغارت گری میں ملوث ہوتے ہیں، بہار کے ریاستی وزیر محنت محمد حسین آزاد نے کہا ہے "بہار میں جس جگہ بھی فساد ہوئے وہاں بہار پولیس کا رول بہت ہی گھناؤنا اور خراب رہا، بھاگل پور کا فساد بہت ہی منصوبہ بند طریقے سے اور سازش کے تحت کرایا گیا ہے، اس میں کچھ کانگریسی لیڈر بھی شامل ہیں، بہار کی افسر شاہی خصوصی طور پر بھاگل پور انتظامیہ ایماندار اور غیر جانب دار ہوتا تو فساد پر پوری طرح قابو پالیا جاتا، مرکزی ریلوے وزیر جارج فرنانڈیز نے کہا ہے کہ بھاگل پور کا حالیہ فساد اس دور کا بدترین فساد تھا اور ہندوستان کے سیاسی اور سماجی ڈھانچہ پر ایک دھبہ ہے، قابل افسوس بات یہ نہیں ہے کہ اس فساد کے دوران ضلع انتظامیہ لڑکھڑا گئی تھی اور ایڈمنسٹریشن نام کی کوئی چیز باقی نہیں تھی، بلکہ سب سے زیادہ بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ انتظامیہ فرقہ وارانہ بنیاد پر فسادات سے نپٹنے کی کوشش کر رہی تھی"۔

وزیر اعظم نے خود اپنی آنکھوں سے تباہی و بربادی کے مناظر دیکھے ہیں، ان پر کوئی بات مخفی نہ ہوگی، انہوں نے ازراہِ ہمدردی ریلیف کے لیے ایک کروڑ روپیہ دینے کا اعلان کیا ہے، بہار کی نئی کانگریسی حکومت کے اقدامات کی بھی ستائش کی جارہی ہے لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ فساد کا سلسلہ کب بند ہوگا، کیا مسلمانوں کے سروں سے یوں ہی جوئے خون گزرتی اور برق خارزار کی شعلہ افگنی برابر جاری رہے گی، وزیر اعظم نے اپنے پہلے نشریے میں ذرائع ابلاغ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی آزادی و خود مختاری کا جو اعلان کیا تھا اس کا عام خیر مقدم ہوا ہے لیکن مسلمانوں کو آزادی سے متمتع ہونے اور امن و عافیت سے رہنے کا موقع کب نصیب ہوگا، شخصی حکومتوں میں بھی اس ظلم واستبداد کی مثال کم ملے گی جو آزاد ہندوستان کی جمہوری اور سیکولر حکومت کے زمانے میں مسلمانوں پر ہوا ہے، ان کے اور مسائل کا کیا ذکر جب کہ ان کا وجود خطرے میں ہے اور ان پر عرصۂ حیات تنگ ہے۔

کانگریس کے دستور میں اقلیتوں کے تحفظ کی پوری ضمانت موجود ہے لیکن ایک عرصہ سے وہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو گاندھیائی اصولوں کو خیر باد کہہ کر صرف اقلیتوں کا استحصال کرتے رہے ہیں، زبانی ہمدردی کے سوا ان کو مسلمانوں کے مسائل ومشکلات کو سمجھنے اور ان سے دلچسپی لینے کا کبھی خیال بھی نہیں ہوا، نئی حکومت کو پچھلی حکومت کی غلطیوں سے سبق لینا چاہیے اور مسلمانوں کے معاملہ میں عدل وانصاف اور جمہوریت وسیکولرزم کے تقاضوں کو پورا کرنا اور یہ حقیقت پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ع صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک۔ یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ مرکزی وزیر داخلہ مفتی محمد سعید کا یہ بیان نظر سے گزرا کہ ''اگر کسی ضلع میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے اور فسادات پر قابو پانے میں انتظامیہ نے ذرا بھی غفلت کی تو ضلع افسروں کو براہِ راست ذمہ دار گردانا جائے گا'' یہ بیان بڑا خوش آئند ہے بشرطیکہ واقعی اس پر عمل ہو، پچھلی حکومت بھی اس طرح کے بیانات دے کر خاموش ہوجاتی تھی، گذشتہ بیالیس برسوں سے مسلمان اتنے فریب کھاتے رہے ہیں کہ انہیں اب موجِ آب پر بھی سراب کا دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ (معارف جنوری ۱۹۹۰ء)

دینی تعلیم اوراس کی صورت حال

دینی تعلیم مسلمانوں کے لیے ہر زمانہ اور ہر دور میں ضروری رہی ہے، لیکن اس زمانہ میں اس کی جانب سے کسی قسم کی کوتاہی اور معمولی غفلت بھی ان کے لیے روا نہیں ہے کیونکہ اس کے بغیر

نہ ان کا عقیدہ وایمان سلامت رہ سکتا ہے اور نہ ان کی قومی وملی خصوصیات باقی رہ سکتی ہیں، مسلمانوں کی تہذیب وتمدن ان کے پرسنل لا اور گزشتہ روایات کا تحفظ بھی اسی پر موقوف ہے، ان کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ وہ اپنے دین ومذہب سے وابستہ رہ کر ہی دنیا وآخرت دونوں میں کامیابی وکامرانی سے ہم کنار ہو سکتے ہیں اور یہ بدیہی حقیقت ہے کہ دین ومذہب سے مسلمانوں کی وابستگی اور تعلق اور نئی نسلوں کو ایمان اور اسلامی عقائد پر قائم رکھنے کے لیے دینی تعلیمی اداروں اور مذہبی درسگاہوں کا وجود نہایت ضروری ہے۔

گو آزادی کے بعد سے مسلمان بڑے نازک اور پُر آشوب دور سے گزر رہے ہیں لیکن وہ مدرسوں اور مذہبی تعلیم گاہوں سے بالکل بے پروا نہیں رہے، انہوں نے اپنے قدیم اداروں اور دینی درسگاہوں کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ نئے دینی مدرسے بھی قائم کیے، ان کی دلچسپی اور دینی شغف سے اب چھوٹے چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی بڑے بڑے دینی تعلیمی ادارے قائم ہوتے جا رہے ہیں، جن کو اور قدیم مدارس کو بھی مسلمانوں کی حرارت ایمانی مزید وسعت، ترقی واستحکام عطا کر رہی ہے، یہ بات جہاں خوشی ومسرت کی ہے وہیں یہ صورت حال تکلیف دہ اور دکھ کی بھی ہے کہ مدارس سے مسلمانوں کو جو فیض پہنچنا چاہیے تھا وہ نہیں پہنچ رہا ہے، کیونکہ اب ان کی حیثیت اسلام کے مضبوط قلعوں اور مستحکم کارخانوں کی نہیں رہ گئی ہے، جن سے کبھی دین وایمان کے محافظ اور قوم وملت کے پاسبان پیدا ہوتے تھے اور ایسے افراد ڈھل کر نکلتے تھے جو محبت، معرفت اور یقین سے سرشار ہو کر اسلام کی عظمت وصداقت کا جیتا جاگتا نمونہ ہوتے تھے اور جن کا وجود نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کے لیے باعث خیر وبرکت ہوتا تھا۔

عموماً اس دردناک صورت حال کا ذمہ دار محض طلبہ واساتذہ کو قرار دیا جاتا ہے لیکن کیا اس کے ذمہ دار خود وہ مسلمان نہیں جو مدارس کو صرف چندہ دے دینا کافی سمجھتے ہیں، اس کے بعد نہ ارباب مدارس سے کسی قسم کے احتساب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور نہ تعلیم وتربیت کے مسائل پر کبھی سنجیدگی اور دردمندی سے غور وخوض کرتے ہیں ، رہے منتظمین تو انہوں نے طلبہ و اساتذہ کو جو مسلمانوں کا سب سے قیمتی اور قابل قدر گروہ تھا اس قدر ناکارہ بنا دیا ہے کہ نہ اس کے پاس عزت نفس اور خودداری نام کی کوئی چیز رہ گئی ہے اور نہ جرأت ایمانی اور حق گوئی سے اس کو کوئی واسطہ رہ گیا ہے،

مدارس کے کار پردازوں کی خودغرضی و مفاد پسندی سے ان کے حصے بخرے ہوتے جارہے ہیں اور باہم ہر طرح کا جدال جاری ہے۔

یہ باتیں تلخ ضرور ہیں مگر خلاف واقعہ نہیں ہیں، تاہم ان سے قطع نظر مدارس کا سب سے بڑا مسئلہ اس کے نصاب و نظام تعلیم کا ہے، جس کو روح عصر کے مطابق بنائے بغیر ان سے کسی مفید اور بہتر نتیجہ کی توقع نہیں کی جاسکتی، علمائے کرام اگر گوشوں اور زاویوں سے نکل کر اپنا اصلی فرض ادا کرنا چاہتے ہیں اور قوم وملک کی قیادت و رہبری کی زمام کار اپنے ہاتھوں میں لے کر انہیں تباہی و بربادی سے بچانا چاہتے ہیں تو انہیں موجودہ حالات و مسائل سے باخبر اور نئی ضرورتوں اور مطالبوں سے واقف ہونا ہوگا اور اسلام کے پیغام و دعوت کو عصری تقاضوں کے مطابق پیش کرنے کے لیے نئی زبان، نئے اسلوب اور نئے انداز کو اختیار کرنا ہوگا، اس کے لیے عربی مدارس کے نصاب میں نئے علوم و مضامین کا اضافہ اور درس و تدریس کا پرانا اور غیر مفید طریقہ چھوڑنا ناگزیر ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے محبوب موضوعات میں ایک موضوع ''عربی دینی مدارس کے نصاب و نظام تعلیم میں اصلاح'' بھی تھا، جس پر اپنی وزارت تعلیم کے ابتدائی دور میں لکھنؤ کانفرنس میں مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے انہوں نے اپنے خیالات تفصیل سے پیش کیے تھے، خوشی کی بات ہے کہ اب اس ضرورت کا احساس عام طور پر ہورہا ہے، مالیگاؤں کے بعد خدا بخش لائبریری پٹنہ کی طرف سے رانچی میں اس پر ۷، ۸، ۹ مئی کو ایک سیمینار ہوا جس کا دعوت نامہ اس خاکسار کو بھی ملا تھا، موضوع سے دلچسپی اور اس کی اہمیت نیز لائبریری کے ڈائریکٹر اور اپنے کرم فرما ڈاکٹر عابد رضا بیدار کے متعدد خطوط اور تار کی بنا پر اس میں شرکت کا قطعی ارادہ بھی تھا لیکن عین موقع پر بعض موانع کی وجہ سے اس میں شرکت نہیں ہوسکی جس کا افسوس ہے، خدا کرے یہ سیمینار کامیاب اور نتیجہ خیز رہا ہو۔

اس سے زیادہ اہم اور قابل توجہ مسئلہ مسلمان بچوں کی ابتدائی بنیادی تعلیم کا ہے، اگر مسلمانوں نے اس کی نزاکت و اہمیت کو نہیں سمجھا اور اپنے بچوں کو سرکاری پرائمری اسکولوں میں داخل کردیا تو اس سے بڑا کوئی دینی و ایمانی خسارہ نہ ہوگا، آئندہ نسلوں کو دین و مذہب سے جوڑے رہنے اور ایمانیات و عقائد پر قائم و باقی رکھنے کے لیے مسلمانوں کی ہر بستی اور گاؤں میں آزاد مذہبی مکاتب اور ابتدائی تعلیم کے مدارس کا قیام ضروری ہے، دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش بہت طویل عرصہ سے اس

کے لیے سرگرم جدوجہد کررہی ہے، یہ کونسل ہر مکتب فکر کے افراد پر مشتمل ہے اور اس کی شاخیں دوسرے صوبوں میں بھی قائم ہوگئی ہیں، مگر وقت اور حالات کا اقتضا یہ ہے کہ اس تنظیم کو مزید موثر، توانا اور فعال بنایا جائے اور اس میں کسی قسم کی کاہلی اور بے پروائی نہ کی جائے۔(معارف مئی ۱۹۹۰ء)

جدید تعلیم

مذہبی و دینی تعلیم سے مسلمانوں کی بے پروائی اور موجودہ حالات میں اس کے نصاب و نظام کے بے فیض اور غیر اطمینان بخش ہونے کا ذکر ان صفحات میں کئی بار ہو چکا ہے، جدید عصری تعلیم سے مسلمانوں کی غفلت اور عدم دلچسپی بھی کم افسوس ناک نہیں ہے، جب سرکاری و نیم سرکاری اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ان کی تعداد بہت کم ہوگئی ہے تو سرکاری ملازمتوں میں ان کا تناسب کیسے زیادہ اور اطمینان بخش ہوسکتا ہے؟ دراصل تعلیمی پس ماندگی مسلمانوں کی قومی و ملی زندگی کے لیے نہایت ضرر رساں اور تباہ کن ہے، اس کی وجہ سے وہ اپنے سماج اور اپنے ملک میں بالکل بے وزن اور کم حیثیت ہوگئے ہیں، وہ نہ ترقی کے موجودہ مواقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور نہ ملک کی تعمیر و تشکیل کی مشترکہ جدوجہد میں ان کا کوئی قابل ذکر حصہ ہوسکتا ہے، ملک کی پس ماندہ قوموں اور پیچھے رہ جانے والے طبقوں نے اپنی تعلیمی پس ماندگی دور کرکے ملک و سماج میں اپنی بہتر اور مستحکم جگہ بنالی ہے، مگر مسلمانوں کا وقار اور اعتبار برابر گھٹتا ہی جارہا ہے۔

یاران تیز گام نے محمل کو جالیا   اور ہم محو نالہ جرس کارواں رہے

انگریزوں کے دور میں مسلمان جدید تعلیم کے معاملہ میں حیص بیص میں پڑے ہوئے تھے اور اب قومی حکومت کے زمانے میں بھی وہ لیت و لعل اور توقف و تذبذب کی پالیسی پر گامزن ہیں اور ملک کے نئے حالات اور نئے تقاضوں سے اپنے کو ہم آہنگ نہ کرکے مسلسل نقصان اور خسارہ اٹھا رہے ہیں، وہ یہ بھول گئے ہیں کہ علم و حکمت ان کی متاع گم شدہ ہے، یہ جہاں اور جس سے بھی ملے انہیں حاصل کرنے میں نہ سستی اور کاہلی کو راہ دینا چاہیے اور نہ خوف و جھجک محسوس کرنا چاہیے، علوم و فنون کو شجرۂ ممنوعہ سمجھ کر ان سے کنارہ کش اور بیزار رہنا مسلمانوں کا شیوہ نہیں، دوسروں کے علوم میں مکمل دستگاہ و مہارت پیدا کرکے ان سے گوئے سبقت لے جانا اور غیر اسلامی علوم و فنون پر بھی اپنی گہری چھاپ ڈال کر انہیں اسلامی علوم و فنون میں تبدیل کرلینا مسلمانوں کا طرۂ امتیاز رہ چکا ہے،

ہندوستان سے مخصوص سمجھے جانے والے علوم ہندسہ، ریاضی، نجوم اور طب وادویہ وغیرہ پر عباسیوں کے دور ہی میں اسلامی چھاپ پڑ چکی تھی اور ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں سنسکرت، برج بھاشا اور ملک کی دوسری زبانوں میں مسلمانوں نے کمال بھی پیدا کیا اور ان زبانوں میں اپنے گوناگوں علمی نقوش بھی یادگار چھوڑے۔

سرسید احمد خاں مرحوم کا یہ بڑا احسان ہے کہ جب اپنے سماج اور اپنے ملک میں مسلمان جدید تعلیم سے بیزار ہوکر اپنی ہمت اور وزن کھوتے جارہے تھے، تو انہوں نے مدرسۃ العلوم کی داغ بیل ڈالی جس نے ان کی بے مایگی اور تعلیمی افلاس و پس ماندگی کو دور کرکے ان کی ساکھ کو گرنے سے بچالیا اور ہمسایہ قوموں اور ہم چشموں میں ان کا وقار و اعتبار باقی رکھا، یہی مدرسہ ترقی کرکے اب عظیم الشان یونیورسٹی میں تبدیل ہوگیا ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے، اگر یہ یونیورسٹی نہ ہوتی تو اس ملک میں مسلمانوں کا جو حال ہوتا، اس کا تصور کرنا بھی مشکل ہے، اس کا تحفظ مسلمانوں کا قومی و ملی فریضہ ہے۔

مسلمانوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسی یونیورسٹیاں قائم کرنے پر اپنی توجہ مبذول نہیں کی، جنوبی اور مغربی ہند میں ان کے اسکولوں اور کالجوں کی حالت بہتر ہے، مگر وہاں بھی ان کی کوئی یونیورسٹی نہیں ہے، شمالی اور مشرقی ہندوستان میں ان کے اسکولوں اور کالجوں کی تعداد ہی کتنی ہے اور جو ہیں ان کا تعلیمی معیار برابر گر رہا ہے، وہ ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا ہیں جو خود اپنے منتظمین ہی کے ہاتھوں حالت نزع میں جا پہنچے ہیں، مسلمانوں اور ان کے قائدین کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ وقتی اور ہنگامی تحریکوں اور جذباتی نعروں سے نہ مسلمانوں کی روح مضمحل میں جان آسکتی ہے اور نہ اس ملک میں ان کا وزن و وقار قائم رہ سکتا ہے، بلکہ انہیں اپنی تعلیمی کم مایگی اور معاشی پس ماندگی دور کرکے اپنے اندر سیاسی شعور اور بیداری پیدا کرنی چاہیے جس کے لیے جدید تعلیم کے قدیم مراکز میں نئی روح پھونکنا اور اپنے زیر انتظام عصری علوم کی نئی درسگاہیں قائم کرنا ہوگا، یہ ایک ہی شہر اور قصبہ میں نئے نئے بے مقصد عربی مدرسے قائم کرنے سے زیادہ ضروری ہے، جن کی کثرت سے امت کے اختلاف کی خلیج مزید وسیع ہورہی ہے۔ (معارف جون ۱۹۹۰ء)

فرقہ وارانہ حکومت

فرقہ وارانہ فسادات ہندوستان کی گھٹی میں داخل ہوگئے ہیں، شر پسندوں اور فرقہ پرستوں سے قطع نظر خود سیاست داں بھی ان کو ہوا دیتے ہیں، کانگریس کے دور حکومت میں جو خوں چکاں فسادات ہوئے اور ان میں مسلمانوں پر جس قدر شدید مظالم ڈھائے گئے وہ حد و شمار سے باہر ہیں، جنتا دل کی حکومت کو بھی ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا مگر یہ دور بھی فسادات سے خالی نہیں، دراصل حکومت کی انتظامی مشینری کے ارکان خصوصاً پی۔اے۔سی اور پولیس کا ذہن نہایت مسموم ہے اور وہ امن و امان قائم کرنے کے بجائے یک طرفہ جارحانہ کارروائی کر کے ایک خاص فرقہ کے لوگوں کو زد و کوب کرتے ہیں، ان کا مال و اسباب لوٹتے ہیں اور ان کی املاک کو نقصان پہنچاتے ہیں، تعصب و تنگ نظری کے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں اتر پردیش کے وزیر اعلی مسٹر ملایم سنگھ یادو کا وجود غنیمت ہے، ان کی مستعدی اولاً تو فساد ہی نہیں ہونے دیتی اور جو ہوتے ہیں، ان پر بروقت کارروائی کر کے قابو پالیا جاتا ہے، ضلع اعظم گڑھ کے موضع لہرا میں ہونے والے فساد کے سلسلہ میں انہوں نے پھر اس کی پرزور یقین دہانی کرائی ہے کہ "ان کی حکومت اپنی اس پالیسی پر سختی سے قائم ہے، کہ کسی جگہ بھی فساد ہو تو ضلع انتظامیہ کو جواب دہ قرار دیا جائے" چنانچہ فساد میں ملوث بعض افسروں کو معطل کر کے انہوں نے عملاً یہ کر بھی دکھایا، ان کا یہ رویہ اور اقدام قابل ستایش بھی ہے اور لائق تقلید بھی۔

ممکن ہے کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ منافرت اور شیخ و برہمن کی کشمکش کے کچھ اسباب و وجوہ ہوں لیکن شیعہ سنی فساد اور گرفتاران بوبکرؓ و علیؓ کی باہمی آویزش اور پاکستان میں سندھیوں اور مہاجروں یا دوسروں کے درمیان ہونے والے ہولناک واقعات اور خوں ریز فسادات کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے ؟ کراچی اور حیدرآباد (سندھ) میں رنگ و نسل کی بنیاد پر جارحیت، کشت و خون اور برادر کشی کا سیلاب امنڈ آیا ہے اور خود مسلمانوں ہی کا ایک گروہ ان کے دوسرے گروہ کے خون کا پیاسا ہوگیا ہے، پاکستان کے اندرونی معاملات سے ایک ہندوستانی کو سروکار نہیں ہونا چاہیے لیکن اس شقاوت و سنگ دلی، ظلم و بے رحمی اور سفاکی و درندگی پر دنیا کے ہر مسلمان کی گردن شرم سے جھک گئی ہے جو مذہب سارے انسانوں کے لیے سراپا رحمت تھا اسی کے ماننے والے باہم اس قدر کشت و خوں ریزی پر اتر آئے ہیں کہ انہیں اپنے مقدس رسولؐ کا یہ فرمان بھی یاد نہیں رہا کہ لاترجعوا بعدی کفارا یضرب

بعضکم رقاب بعض (میرے بعد کافر نہ جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو)۔

کیا ان خوں ریز فسادات اور مسلمانوں کے ایک طبقہ کے دوسرے طبقہ پر اس قدر منظم قاتلانہ حملے کے بعد پاکستانی حکومت اور عوام کو اس کا حق ہے کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے چیخ وپکار مچائیں، ہندوستانی مسلمانوں کے مصائب پر پاکستان کے واویلا کرنے سے ان کا بھلا ہونا تو درکنار الٹے انہیں نقصان ہی پہنچتا ہے لیکن پاکستان کے خودغرض اربابِ اقتدار کو اس کی پرواہی کہاں؟

دارالمصنّفین کی آمدنی کا اصل دار و مدار اس کی کتابوں کی تجارت پر ہے، لیکن یہ بات نہایت تشویش انگیز ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے بعض خودغرض اور بددیانت ناشرین اس کی کتابوں کو اجازت کے بغیر ہی چھاپ کر اسے مالی بحران میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں، یہ شرعاً واخلاقاً کسی حیثیت سے بھی مناسب اور درست نہیں ہے، اگر یہ لوگ اپنی ناروا حرکتوں سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی، ہم کو افسوس ہے کہ دارالمصنّفین کی متعدد کتابیں عرصہ سے ختم ہوگئی ہیں اور انتہائی کوشش کے باوجود ابھی تک ان کو شائع نہیں کیا جاسکا ہے، تاہم اس کی فکر برابر کی جارہی ہے اور الحمدللہ اس کا آغاز بھی ہوگیا ہے، حال ہی میں گل رعنا کا عکسی ایڈیشن شائع ہوا ہے، اب الفاروق اور دوسری کتابوں کے عکسی ایڈیشن کی اشاعت پیش نظر ہے، نئی کتابوں میں شذرات سلیمانی حصہ اول چھپ گئی ہے، اس کے دوسرے حصوں کی کتابت بھی مکمل ہوگئی ہے، تذکرۃ المحدثین حصہ سوم کی طباعت ہورہی ہے، تذکرہ فقہائے اسلام حصہ اول کی کتابت ہوچکی ہے اور مولانا سید سلیمان ندوی کے نام مشاہیر کے خطوط کے زیادہ حصہ کی کتابت ہوچکی ہے۔ (معارف جولائی ۱۹۹۰ء)

بابری مسجد کی جگہ رام مندر بنانے کی مہم

گزشتہ کئی مہینوں سے بابری مسجد کو مندر بنانے کی جو مہم پورے زور وشور سے جاری ہے، پتہ نہیں اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کی وجہ سے پوری دنیا میں ہندوستان کی رسوائی ہورہی ہے اور اس کی رواداری، امن پسندی اور تمام مذاہب کے ساتھ عدم امتیاز کے بارے میں شک وشبہہ ظاہر کیا جارہا ہے، خود ملک میں ہر طرف افراتفری مچی ہوئی ہے، کوئی شعبۂ زندگی بھی لاقانونیت اور انتشار سے خالی نہیں، ہر جگہ خوف ودہشت کا ماحول ہے، پرامن شہریوں کی جان پر بن آئی ہے، مسلمانوں کے لیے اپنے گھروں سے نکلنا اور ناگزیر سفر کرنا بھی مشکل ہوگیا ہے، اترپردیش میں جو آگ لگی ہوئی ہے اس

کے شعلے رہ رہ کر بھڑکتے اور پورے پورے خاندانوں کو بھسم کر دیتے ہیں، معصوم بچوں کو چلتی ٹرینوں سے باہر پھینک دینا اور گاڑیوں کو روک کر بے گناہوں کا قتل عام کرنا فرقہ پسندوں کا معمول ہوتا جارہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ ان میں کوئی مروت و شرافت رہ گئی ہے اور نہ تہذیب و شائستگی جو ہندوستان کا طرۂ امتیاز تھا۔

ہندوستان جنت نشان کہلاتا تھا، یہاں انسان تو درکنار جانوروں کو مارنا اور انہیں ایذا دینا گناہ سمجھا جاتا تھا، لوگ نفرت و عداوت، ظلم و تشدد اور وحشت و بربریت سے ناآشنا اور ہمدردی، رحم دلی، صلح و آشتی اور الفت و محبت کے دلدادہ تھے، عفو و درگذر سے کام لینا اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دینا ان کی خصوصیت تھی، بدھ جی سے لے کر گاندھی جی تک کے تمام رشیوں منیوں کی تعلیم و تلقین یہی تھی اور گاندھی جی نے تو ہندو مسلم اتحاد اور ملک کو خون خرابہ سے بچانے کے لیے اپنی جان ہی دے دی تھی لیکن اب قومی ایکتا اور ہندو مسلم اتحاد خواب و خیال ہو گیا ہے اور ظلم و تشدد اور وحشت و بربریت اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، کسی کی جان و مال عزت و آبرو اور عورتوں کی عصمتیں محفوظ نہیں ہیں، دوسروں کی دلآزاری اور ان کی عبادت گاہوں کو ڈھا دینے میں خوشی محسوس کی جارہی ہے اور کبھی اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ ان مجنونانہ حرکتوں سے آزاد ہندوستان کی تصویر کتنی بدنما ہوتی جارہی ہے۔

یہ بجا ہے کہ ایودھیا کے واقعات کی مذمت بھی ہو رہی ہے، ان سے اکثریت کے انصاف پسند معقول اور سنجیدہ لوگوں کے سر شرم سے جھک گئے ہیں اور وہ اس کھلی جارحیت اور انتہا پسندانہ رویہ کی مخالفت کر رہے ہیں، حکومت نے بھی آئین و قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے کر خود ہر کارروائی کرنے والوں کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے کے باوجود ان کے معاملہ میں اپنی ذمہ داری نباہنے کی کوشش کی، اس نے متعدد بار اس پر زور دیا کہ باہمی گفت و شنید سے معاملہ طے نہ ہو تو عدالت کا فیصلہ تسلیم کیا جائے اور امن و امان کو باقی رکھا جائے لیکن فرقہ پرستی کا امنڈتا ہوا سیلاب بابری مسجد سے ٹکرا کر رہا اور نفرت و تشدد کی آگ بھڑکانے والوں نے اسے نقصان پہنچا کر اور اس کے تقدس کو پامال کر کے ہی دم لیا، اس غیر آئینی اور سراسر جارحانہ اقدام کے خلاف حکومت کو حرکت میں آنا پڑا جس کے نتیجے میں چند افراد ہلاک ہو گئے۔

یہ امر افسوس ناک ضرور ہے لیکن حکومت کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ ہی نہیں رہ گیا تھا، جب اس کی ہر فہمایش رد کردی گئی تو تشدد اور بغاوت پر آمادہ لوگوں کے خلاف وہ اس کے سوا اور کون سا قدم اٹھاتی، جو لوگ قانون کی بالادستی کو ختم کرکے اور ملک کو برباد کرکے اپنی قیادت چمکانے کے سوا کسی اور بات پر راضی نہیں تھے، کیا وہ کسی نرمی اور رعایت کے مستحق تھے، مگر اس کے باوجود انہیں بے قصور کہا جارہا ہے اور ایودھیا کے واقعات کی عدالتی تحقیقات اور ''شہیدوں'' کو معاوضہ دیے جانے کے لیے اصرار کیا جارہا ہے، یہ مطالبہ فرقہ پسندوں کی جانب سے ہوتا تو تعجب نہ ہوتا لیکن ان کے سُر میں سُر ملانے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہوگئے ہیں جن کو اپنی انصاف و معقولیت پسندی پر ناز ہے کیا بابری مسجد کو ڈھا کر چین ملتا؟

ملک میں آئے دن فسادات ہوتے ہیں جن میں بے شمار بے گناہ مارے جاتے ہیں، مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی، خود بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے تنازع کے نتیجہ میں گھر کے گھر اور بستی کی بستی کا صفایا ہوگیا، بارہ بنکی میں معمولی احتجاج کرنے پر لوگ گولیوں کا نشانہ بنادیے گئے، مگر نہ ان کے معاوضہ کی بات ہوئی اور نہ عدالتی تحقیقات کے مطالبہ نے زور پکڑا، اگر ایودھیا میں ظلم و زیادتی کا راستہ اختیار کرنے والے تحسین و آفریں اور انعام و اکرام کے مستحق ہیں تو پنجاب اور کشمیر کے دہشت گردوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک اس وقت بہت نازک اور بحرانی دور سے گذر رہا ہے، فرقہ پرست اور رجعت پسند عناصر نے مذہب کے نام پر سیاست کا کاروبار شروع کرکے ملک کو بہت پیچھے کردیا ہے، اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ملک کی وحدت و سالمیت باقی نہیں رہ جائے گی اور اس کی دیرینہ نیک نامی اور ہزاروں برس پرانی روایات خاک میں مل جائیں گی، اس وقت محب وطن دانشوروں اور اخلاق و اقدار کے پاسبانوں کو آگے بڑھنا چاہیے اور ملک کے وسیع تر مفاد میں فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے اور نفرت و تشدد کے بھڑکتے شعلوں کو بجھانے کے لیے کمربستہ ہوجانا چاہیے، یہ صرف ایک مسجد اور مسلمانوں کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ملک و قوم کی بربادی کا پیش خیمہ ہے، ایسے اہم اور نازک معاملہ میں خاموشی و بے پروائی جرم ہے، جس کی تلافی ممکن نہ ہوگی، ارباب سیاست سے سیدھے سادے لوگ گھبرا اٹھے ہیں، ان کے خطرناک کھیل سے نیک طینت اور دوراندیش دانشور ہی ملک کو

بچا سکتے ہیں۔

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

(معارف جنوری ۱۹۹۱ء)

دارالمصنّفین میں ہندی کا شعبہ قائم کرنے کی تجویز

اردو کا رواج روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے، اس لیے بعض خیر خواہوں کا مشورہ ہے کہ دارالمصنّفین میں ہندی میں تصنیف کا شعبہ قائم کیا جانا چاہیے، دمام سے ایک صاحب نے اس کے لیے دس ہزار روپیے کی پیشکش کی ہے جس کا سلسلہ آیندہ بھی جاری رکھنے کا وعدہ کیا ہے، لیکن دارالمصنّفین کے محدود وسائل کی بنا پر یہ تجویز ناقابل عمل ہے اور اس سے اس کے مقصد کے فوت ہوجانے کا اندیشہ بھی ہے، یہ ایک خالص علمی و تحقیقی ادارہ ہے جس کا مقصد اردو زبان کی خدمت اور اس میں محققانہ کتابوں کی اشاعت ہے، ہندی میں تصنیف و ترجمہ اور کتابوں کی اشاعت کا کام مسلمانوں کے دعوتی و تبلیغی اداروں کو کرنا چاہیے، جو اسی مقصد کے لیے قائم کیے گئے ہیں، ہندی کے فروغ کے لیے ملک میں متعدد ادارے موجود ہیں جن کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے اور جن کے پاس وسائل کی بھی کمی نہیں ہے، وہ فراخ دلی سے کام لے کر اردو کی کچھ خدمت اپنے ذمہ لے سکتے ہیں، یا کم از کم اردو کتابوں کو ہندی میں منتقل کر سکتے ہیں، اس موقع پر ہم کو بے اختیار ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد یاد آ گئی، جو اردو سے کنارہ کش ہو کر اب خالص ہندی اکیڈمی ہوگئی ہے اور ۱۹۸۲ء کے بعد سے اس کا کوئی جلسہ نہیں ہوا ہے۔

ہندی سے مسلمانوں کو کبھی بیر نہیں رہا، مسلم حکمرانوں کے دور میں ہندی اور برج بھاشا کے متعدد مسلمان فضلاء اور اہل کمال پیدا ہوئے، اس زمانہ میں بھی ہندی سے ان کی دلچسپی کم نہیں ہوئی ہے لیکن اب ملک کی نئی نسلیں اور خود مسلمان بھی اردو سے ناواقف ہوتے جا رہے ہیں، جس کی وجہ سے اردو کے ادارے موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوگئے ہیں، حالاں کہ اردو اس ملک کی مشترک تہذیب اور اس کے فخر و عظمت کی نشانی ہے، اس کی خدمت خود ملک کی خدمت ہے، اس کے بغیر ملک کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہے گا، ہندی کے تسلط کی وجہ سے اردو ہی سے دستبردار ہونا اپنی تہذیب اور اپنے ملک کی عظمت سے دستبردار ہونا ہے، کیا ہندی کے فروغ کے لیے اردو کشی ضروری ہے اور کیا

اس کو ہندی کی دیوی پر قربان کر دینا مناسب ہے؟ جو ادارے مخالف ہوا میں اردو کا چراغ جلائے ہوئے ہیں وہ حوصلہ افزائی اور قدردانی کے لایق ہیں، ان کو پھونکوں سے بجھانے کی کوشش نہ کی جائے۔

حکومت یوپی کی اردو دشمنی

ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست اتر پردیش میں اس وقت اردو دشمنی شباب کو پہنچ گئی ہے، کانگریسی حکومتیں اس کے گن گا گا کر اس کے گلے پر چھری چلاتی رہی ہیں، ملائم سنگھ کی حکومت نے اجودھیا کے تنازعہ میں ایسا الجھایا کہ اردو والے اس کا نام لینا بھول گئے، بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت نے ساری کسر پوری کر کے اسے جانکنی تک پہنچا دیا ہے، پتہ چلا ہے کہ محکمۂ اطلاعات کا اردو ماہنامہ نیا دور کسی طرح اس کے وار سے بچ گیا لیکن اتر پردیش اردو اکادمی کی جان پر بن آئی ہے، اس کی تمام سرگرمیاں موقوف ہوگئی ہیں، اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کے وظائف اور کتابت اسکولوں کے بقایا کی ادائیگی رکی ہوئی ہے، اردو مصنّفین کی کتابوں پر جو انعام دیے جاتے تھے ان کو تعطل میں ڈال دیا گیا ہے، اکاڈمی کی مجالس کی نئی تشکیل کی گئی ہے لیکن اردو والوں کو اس سے دور رکھا گیا ہے

ع بسوخت عقل زحیرت ایں چہ بوالعجبی است

(معارف نومبر ۱۹۹۱ء)

ہندوستانی مسلمانوں پر ملک کے باشندوں تک رسول عربیؐ کا پیغام پہنچانے کی ذمہ داری

اسلام ایک عالم گیر اور دائمی مذہب ہے اور قرآن مجید تمام انسانوں کے لیے خدا کا آخری پیغام ہے، اس کا حامل رحمۃ اللعالمین تھا، آپؐ خدا کی رحمت اور پیام کو عام کرنے کے لیے دنیا میں تشریف لائے تھے، آپؐ کی رسالت ہر قوم و ملک، ہر خطہ و علاقہ اور ہر طبقہ و جماعت کے لیے تھی، آپؐ کی بعثت کالے گورے، آبی و خاکی سب کے لیے ہوئی تھی، اس لیے آپؐ زندگی بھر اپنے مشن کی تکمیل میں لگے رہے، اور آپؐ نے خدا کے پیغام و ہدایت کو پہنچانے میں کوئی کور کسر باقی نہیں رکھی اور اپنے بعد ایک ایسی امت چھوڑی جو ہمیشہ آپؐ کے مشن کو جاری رکھے اور دنیا کا کوئی گوشہ اور کونا بھی ایسا نہ رہ جائے جہاں آپؐ کے پیغام کا غلغلہ نہ مچ جائے۔

آج جو لوگ نبی امیؐ پر ایمان لانے اور اس کے امتی ہونے کے مدعی ہیں، کیا وہ آپؐ کے

پیغام وہدایت کو عام کرنے اور نوع انسانی کے ہر طبقہ وگروہ تک آپؐ کی دعوت کو پہنچانے کا کام انجام دے رہے ہیں، یا عقیدت ومحبت کے صرف رسمی طریقوں کے اظہار اور نعرۂ رسالت بلند کر لینے ہی کو آپؐ کی بارگاہ میں نذرانہ خیال کرتے ہیں، اور میلاد النبیؐ کے جلسوں میں لچھے دار تقریریں کر دینے اور آپؐ کے فضائل ومناقب بیان کرنے ہی کو کافی سمجھتے ہیں، یہ مقام عبرت ہے کہ جن لوگوں کو آپؐ کا پیغام دشت وجبل ہر جگہ پہنچانا تھا ان میں باہم جنگ وجدال اس لیے جاری ہے کہ آپؐ کی رسمی وظاہری عقیدت کا نمونہ پیش کرنے اور آپؐ کی تعلیم وہدایت سے دنیا کو واقف کرانے سے کوئی سروکار نہیں رہ گیا ہے، اس سے بھی بڑھ کر افسوس ناک امر یہ ہے کہ رسولؐ کی محبت وعقیدت کا دم بھرنے والے اسی کے نام پر مسلمانوں میں افتراق وانتشار پیدا کر کے شیرازۂ ملت کو تار تار کر رہے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی غیر مسلموں کو رسول عربیؐ کا پیغام پہنچانے کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، انہوں نے سینکڑوں برس تک ہندوستان پر حکمرانی کی، یہاں تاج محل اور اس جیسی متعدد حسین اور پرشکوہ عمارتیں بنوائیں اس کو علمی، تعلیمی، تہذیبی، تمدنی زرعی، اقتصادی اور سماجی حیثیت سے ترقی دے کر اسے جنت نشان بنا دیا، ان کے قدم پڑتے ہی یہ سرزمین گل وگلزار ہوگئی اور انہوں نے اس کے چپے چپے پر اپنی یادگاریں چھوڑیں لیکن وہ یہاں کے باشندوں کو پیغامِ محمدیؐ اور اسلامی تعلیم سے واقف کرانے کے کام سے غافل رہے اور اپنے اخلاق وکردار کا کوئی تاج محل نہیں تعمیر کر سکے جو ان کی تاریخ کا ایک بڑا المیہ ہے اور اب جب کہ حکومت واقتدار ان کے ہاتھوں سے چھن گیا ہے، تب بھی وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشن کی تکمیل سے بے پروا ہیں۔

مسلمان زیادہ تو اپنی سہولت پسندی اور کسی حد تک واقعی مجبوری کی بنا پر اردو سے ناواقف ہو کر خود اسلامی تعلیم وہدایت سے بے بہرہ ہوتے جا رہے ہیں، جب کہ غیر مسلموں کو بھی اسلام کی عالم گیر ہدایت اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دائمی پیغام سے آشنا کرنا ان کا مذہبی فریضہ تھا، جس کو وہ ادا نہیں کر سکے، اس لیے نئے حالات کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ اسلامی علوم وفنون اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات وہدایات کو ہندی زبان میں منتقل کرنے کا کام تیزی سے کیا جائے کیوں کہ آپؐ کی دعوت وپیغام کو غیر مسلموں تک پہنچانے پر مسلمان من جانب اللہ مامور ہیں لیکن اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اردو سے دامن کش ہو جائیں اور ان کے جو ادارے اس کی ترقی وترویج کے لیے قائم

کیے گئے ہیں وہ اپنا کاروبار بند کردیں البتہ ایسے اداروں کا قیام ناگزیر ہے، جو ہندی میں تصنیف و تالیف کا کام یکسوئی سے انجام دیں، یا پھر اصلاحی و دینی جماعتوں کو اپنے دائرہ میں یہ کام بھی شامل کرلینا چاہیے۔ (معارف دسمبر ۱۹۹۱ء)

ملک کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ

آزادی سے پہلے سمجھا جاتا تھا کہ قومی حکومت کے قیام کے بعد ملک کے دوسرے فرقوں اور گروہوں کی طرح مسلمانوں کو بھی ترقی کے یکساں مواقع ملیں گے اور وہ ملک کے دوسرے لوگوں کے دوش بدوش قومی زندگی کے ہر ہر شعبہ میں برابر کے شریک و دخیل ہوں گے اور آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہوکر بے خوف وخطر زندگی بسر کریں، ان کا دین وعقیدہ اور قومی و مذہبی تشخص باقی رہے گا، ان کی عبادت گاہیں اور ان کے پرسنل لا محفوظ رہیں گے، لیکن نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی یہ توقعات بر نہ آئیں اور مسلمان ہر لحاظ سے کمتر اور پس ماندہ بلکہ دوسرے درجہ کے شہری ہوگئے، گویا ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ نہ ان کی جان و مال، عزت و آبرو اور دین و ایمان سلامت ہے اور نہ ان کی عبادت گاہیں اور پرسنل لا محفوظ ہیں بلکہ ان سب کے لیے روز بروز مزید خطرات بڑھتے جارہے ہیں اور مسلمانوں کی پریشانی اور بے بسی میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ مسلسل جو ظلم، زیادتی اور ناانصافی ہورہی ہے وہ کسی بھی جمہوری اور سیکولر حکومت کے لیے نہایت شرم ناک اور اس کے دامن پر ایک بہت بدنما داغ ہے، چنانچہ اب اس پہلو سے دنیا میں ہندوستان کی رسوائی اور بدنامی بھی ہورہی ہے، جس کا اعتراف بعض قومی اور سیاسی رہنما بھی کرنے لگے ہیں لیکن اس کو نظر انداز کرکے اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس ظلم وزیادتی میں جہاں دوسروں کا ہاتھ ہے وہاں مسلمان بھی اس کے ذمہ دار ہیں جو خود اپنے اوپر ظلم وزیادتی کررہے ہیں اور قانون قدرت یہ ہے کہ جو قوم اپنے اوپر خود ظلم و جور کرتی ہے اس کی تمام آسائشیں اور راحتیں اس سے چھین لی جاتی ہیں اور کوئی اس کو تباہی و بربادی سے بچا نہیں سکتا، خدائے ذوالجلال کا زبردست اور طاقتور ہاتھ اسے پاش پاش کرڈالتا ہے اور وہ داستانِ پارینہ بن کررہ جاتی ہے: وَظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ (سبا:۱۹)

اور باتوں سے قطع نظر اس موقع پر ہم مسلمانوں کی صرف ایک محرومی و بدنصیبی اور اپنے اوپر

ظلم وزیادت کی مثال دینا چاہتے ہیں، ہماری مراد تعلیم سے ہے جس کے اعتبار سے وہ نہایت پسماندہ ہوتی ہیں، ان کے بڑے طبقہ کو اپنی قوم تو درکنار خود اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے، جس کے نتیجہ میں وہ قومی حیثیت سے ذلت وخواری اور پستی و ناکامی کی آخری حد پر پہنچ گئے ہیں اور ادنیٰ و معمولی درجہ کے شہری ہوگئے ہیں، تعلیم سے غفلت و بے پروائی نے یہ برا دن بھی دکھایا کہ ملک کی مشترکہ اور قومی زندگی میں مسلمانوں کا عمل دخل بالکل ختم ہوگیا ہے اور اسی باعث سرکاری ملازمتوں میں ان کا تناسب افسوس ناک اور عبرتناک حد تک گھٹ گیا ہے، کیا اس کے بعد بھی قوم وملت کی ہمہ جہت کامیابی اور سربلندی کا کوئی تصور کیا جاسکتا ہے اور کیا علم و بصیرت کے بجائے جہالت و بے بصیرتی کو اپنے معاشرہ میں فروغ دے کر مسلمان اپنے اوپر ظلم نہیں کر رہے ہیں؟

اس عام بے حسی اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد کی حیرت انگیز کمی سے کچھ دردمند اور حسّاس لوگ بہت فکرمند ہوئے اور تڑپ اٹھے، ان کی کوششوں کے نتیجہ میں تعلیمی حیثیت سے پس ماندہ اقلیتوں کے لیے حکومت بڑے حیص بیص کے بعد کوچنگ سنٹر یا تربیتی مراکز کھولنے پر آمادہ ہوئی اور منسٹری آف ویلفیر نے بعض انجمنوں کو اس کے لیے مالی امداد بھی دی، لیکن جب اس کے نتائج اطمینان بخش نہیں نکلے تو ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے جدید وسائل و ذرائع سے آراستہ ایک اقامتی کوچنگ سنٹر تعلیم آباد (سنگم وہار) دہلی میں کھولا جس میں ضروری سہولتوں کے علاوہ رہایش و تربیت کا معقول انتظام بھی ہے۔ جناب سید حامد سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، ہمدرد نگر نئی دہلی کے قلم سے ہمدرد کوچنگ اینڈ ٹریننگ سینٹر کی ضروری تفصیل اخباروں میں شائع ہوچکی ہے، خوش قسمتی سے یہ دور اندیشانہ اقدام حکیم عبدالحمید صاحب بالقابہ صدر ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کی سرپرستی میں شروع کیا گیا ہے، جن کی مسیحائی انشاء اللہ قوم میں زندگی کی نئی روح پھونک دے گی، البتہ ذہین طلبہ کی طرف سے اس کا عملی خیر مقدم ہونا چاہئے اور انہیں اس سنہرے موقع سے پورا فائدہ اٹھانا چاہئے۔

(معارف مارچ ۱۹۹۲ء)

مسلمان آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد

آزادی سے پہلے اور اس کے بعد کے ہندوستان میں بڑا فرق ہوگیا ہے، اگر یہ فرق خوش آیند ہوتا تو اس کا خیر مقدم کیا جاتا اور ان لوگوں کی ستایش کی جاتی جو اس عرصہ میں ملک کے سیاہ وسفید

کے مالک رہے ہیں اور فخر سے کہا جاتا کہ انہوں نے اپنے تدبر، خوش انتظامی، لیاقت، محنت اور خون پسینہ سے درخشاں ہندوستان کی تعمیر کی ہے، لیکن آزاد ہندوستان کی خوبی و خوش نمائی کے پہلو بہت کم ہیں اور اس کے حال زار اور بدنمائی کے رخ گونا گوں ہیں، اس کی داستان کبھی فرصت سے سنی اور سنائی جائے گی، اس وقت تو صرف مسلمانوں کے تعلق سے بعض باتیں عرض کرنی ہیں، کیوں کہ ہندوستان کے نئے نقشے میں انہی کی تصویر سب سے زیادہ دھندلی اور اس قدر بدلی ہوئی ہے کہ

ع ہمیں سے آج اپنی شکل پہچانی نہیں جاتی

مسلمانوں کی نئی نسل پرانی نسل سے بہت کچھ مختلف ہوگئی ہے، مزاج و عادت، طور طریق، وضع قطع، لباس پوشاک، فکر و عمل اور نظریہ و خیال میں اس قدر مغایرت ہے کہ یہ دو خاندانوں یا دو علاقوں اور دو قوموں کے افراد معلوم ہوتے ہیں، یہی نہیں نئی نسل کو اپنے دین و مذہب، عقائد و اعمال، اپنی تاریخ و تہذیب اور تمدن و کلچر سے کوئی واسطہ اور لگاؤ نہیں رہ گیا ہے، وہ اپنی روایات، قومی و ملی تشخصات، اپنی تعلیم و تہذیب اور زبان و ثقافت سے بیگانہ ہوچکی ہے، اس پر اپنی قوم و ملت سے زیادہ دوسروں کے مذہب و ملت کا اثر چھاتا جارہا ہے، اس کا لہجہ، ٹون اور طرز گفتگو اتنا بدل گیا ہے کہ الناس علی دین ملوکھم کا مقولہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔

دینی و اخلاقی زبوں حالی اور تہذیبی و معاشرتی بحران ہی کی طرح مسلمانوں کی معاشی بدحالی اور تعلیمی پس ماندگی بھی بڑھتی جارہی ہے اور عملاً وہ ادنیٰ درجہ کے شہری ہوگئے ہیں، ملک میں نہ ان کی کوئی قدر و قیمت ہے اور نہ وزن و اہمیت، فسادات میں جان و مال کا ضیاع اور عزت و آبرو کا لوٹا جانا ان کا مقدر بن گیا ہے، وہ راتوں کی سیاہی کا کیا گلہ کریں جب دن ہی کالے ہوگئے ہیں، ارباب سیاست انہیں کھلونے دے کر بہلانا اور الیکشن کے موقع پر ان کی زبانی ہمدردی کی دو چار دلفریب باتیں کہہ کر ان کا حساب چکانا چاہتے ہیں، ظلمت ایام کی اس سازش میں جہاں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت، سیاسی تنگ نظری اور اکثریت کا تعصب اور جارحانہ رویہ شامل ہے، وہاں خود مسلمانوں کی بھی اپنی تعمیر و ترقی کے مسائل سے عدم دلچسپی، ان کے مذہبی و گروہی اختلافات، تعلیم سے محرومی، اس کی جانب سے سراسر بے توجہی اور ان کے سیاسی شعور و بصیرت کے فقدان کو بھی بڑا دخل ہے۔

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ایک طرف تو مسلمان اپنے دین و مذہب، اپنی تاریخ و تہذیب

اور اپنی روایات اور اصل خصوصیات کو ترک کرتے جارہے ہیں اور دوسری طرف ملک میں وہ نہایت بے اثر اور غیر اہم ہوگئے ہیں، اور یہ ایسا المیہ ہے جس پر واقعی ایمانی و اسلامی حرارت رکھنے والے اور ملی و قومی غیرت و حمیت میں سرشار، دردمند مسلمانوں کے دل جل کر کباب ہورہے ہیں، اور ان کی آنکھوں سے خون کے آنسو رواں ہیں، وہ حیران ہیں کہ جس قوم کا ماضی اتنا شاندار رہا ہو جس کے ہاتھوں میں قوموں کی باگ ڈور تھی، جس نے اپنے علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا سکہ دنیا پر بٹھادیا تھا اور جس نے یورپ کو بھی علم و ہنر کی روشنی عطا کی تھی اور جس کے زریں کارناموں کی بدولت ہندوستان جنت نشان بن گیا تھا، آج وہ کیوں اس قدر بے حس و حرکت اور دوسروں کا لقمہ تر بن گئی ہے ؎

وہ زمانہ کیا ہوا جب مری آہ میں اثر تھا　　یہی چشم خوں فشاں تھی، یہی دل، یہی جگر تھا

باوجودیکہ مسلمان ملک کی بالادست قوم کے رنگ و روپ کو اختیار کرتے جارہے ہیں اور اکثریت کی چھاپ روز بروز ان پر گہری ہورہی ہے اور وہ اس کی خوشنودی کے لیے اپنی خودی و خودداری ترک کرتے جارہے ہیں، پھر بھی وہ معتوب ہیں اور ساقی کی نگاہیں ان کی طرف سے پھری ہوئی ہیں اور ان کے حصہ میں دردتہِ جام بھی نہیں ہے، آئے دن انہیں غداری اور قوم و وطن فروشی کے طعنے سننا پڑتے ہیں، کبھی ملک میں یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی دھمکی انہیں دی جاتی ہے اور کبھی ان سے اپنے پرسنل لا کو تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے، کبھی مسجدوں کو اکثریت کے حوالے کرکے ان کو مندروں میں بدل دینے پر زور دیا جاتا ہے، کبھی قومی دھارے میں ضم ہوجانے اور اپنا بھارتیہ کرن کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے، کبھی عرب و ایران اور مکہ و مدینہ کی طرف نظر اٹھانے کے بجائے کاشی و متھرا کے گن گانے کی فرمایش کی جاتی ہے اور کبھی محمد عربی فداہ ابی و امی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طوقِ غلامی نکال کر اکثریت کے پوروجوں کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈال لینے اور قرآن مجید کے بجائے وید اور گیتا سے رہنمائی حاصل کرنے کا اپدیش دیا جاتا ہے۔ آخر

ع　اس غم کی تلافی کیا ہوگی، اس درد کا درماں کیا ہوگا

یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں کی نئی نسل ذہنی و فکری ارتداد کے دہانے پر پہنچ گئی ہے اور وہ اپنی حالت تبدیل کرنے اور غفلت و مدہوشی ترک کرنے کے لیے تیار نہیں دکھائی دیتی، لیکن اب بھی اس قوم میں خال خال وہ افراد نظر آتے ہیں جو اشکِ سحر گاہی سے وضو اور دعائے نیم شبی کو اپنا شعار بنائے

ہوئے ہیں، اسی سے امید ہے کہ ہند میں سرمایۂ ملت محفوظ رہے گا، لیکن اس کے لیے قوم کو بیدار کرنے کی مہم چلانا ہوگی اور فکر و تدبیر اور تگ و دو کو بڑھانا ہوگا ع

نوا را تیز تر می زن چوں ذوقِ نغمہ کم یابی

(معارف مئی ۱۹۹۲ء)

بابری مسجد اور رام مندر

آزادی کے بعد ہی سے بابری مسجد پر غاصبانہ قبضہ کے لیے وقفہ وقفہ سے اجودھیا میں ناٹک ہو رہا ہے، ناٹک کرنے والے اپنا کرتب اس طرح دکھانا چاہتے ہیں کہ چت بھی اپنی پٹ بھی اپنی، اس کے لیے کبھی وہ واقعات وحقائق کو توڑ مروڑ کر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہیں، کبھی متضاد اور الٹے سیدھے بیانات دیتے ہیں اور سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرتے ہیں، جس کے جو جی میں آتا ہے وہی راگ الاپتا ہے، چاہے اس میں کوئی معقولیت اور حقیقت پسندی ہو یا نہ ہو، غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں، اس سے مطلب نہیں کہ ان کا کوئی اور چھور بھی ہے یا نہیں، ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ کٹ حجتی، دھاندلی، دھوکہ فریب، مکر، چالبازی اور زور زبردستی سے خانۂ خدا کو صنم خانہ اور حرم کو دیر بنا دیں، لیکن یہ اداکاری اور کرتب بازی انہی کی رسوائی اور بدنامی کا سامان نہیں ہے بلکہ ملک و وطن کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ بھی ہے۔

اجودھیا میں ہونے والے ناٹک کا پہلا پارٹ ۲۲/ ۲۳ دسمبر ۱۹۴۹ء کی درمیانی رات میں ہوا، جب دیوار پھاند کر چوری سے مسجد کے اندر مورتی رکھ دی گئی اور کہا گیا کہ زمین پھاڑ کر رام للا نکل پڑے۔ اس کے بعد مسجد میں تالا پڑ گیا اور مسلمانوں کا داخلہ اس میں بند کر دیا گیا، دوسرا پارٹ ۱۹۸۶ء میں ہوا جس کے بعد مسجد کا تالا کھلوا کر اسے پوجا پاٹ کے لیے ہندوؤں کے حوالہ کر دیا گیا۔ ۹/ نومبر ۱۹۸۹ء کو ہونے والے تیسرے پارٹ میں بابری مسجد کی زمین گنج شہیداں پر شیلا نیاس کرایا گیا، ملک بھر میں رتھ یاترا بھی اسی ناٹک کا ایک خاص پارٹ ہے، اس سال ہونے والے ناٹک میں پہلے اجودھیا کی زمین اکوائر کر کے چار مندروں کو زمین دوز کیا گیا اور آخری مرحلہ میں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فیصلے کے علی الرغم ۹ سے ۲۶/ جولائی تک شیلا نیاس کی متنازع زمین پر پختہ چبوترہ تعمیر کر دیا گیا، ریاستی حکومت تو شروع ہی سے مندر کی تعمیر میں حائل رکاوٹیں دور کر رہی ہے، مگر مرکزی

حکومت بھی عدالتی آرڈر کو نافذ کرنے کی جرأت و ہمت نہیں کرسکی، اگر یہی لیل ونہار رہے تو ناٹک کے دوایک اور پارٹ کے بعد یہ قصہ ہی ختم ہوجائے گا اور بابری مسجد رام جنم بھومی میں تبدیل ہوجائے گی۔

اس ناٹک کے جو اداکار سامنے ہیں وہ تو سب کو دکھائی دیتے ہیں لیکن پردے کے پیچھے ہیں اور اپنے چہرے پر جمہوریت اور سیکولرازم کا نقاب ڈال کر رات دن حق وانصاف کی دہائی دیتے ہیں، عدالت کے وقار واحترام اور دستور وآئین کی برتری اور بالادستی کا دم بھرتے ہیں اور برابر اس کی سوگند کھاتے ہیں کہ بابری مسجد کو کوئی نقصان نہیں پہنچنے دیں گے۔ ممکن ہے ان کو پہچاننے میں عام لوگوں کو دشواری ہو، لیکن اہل نظر انہیں بھی خوب جان پہچان گئے ہیں، کہا جاتا ہے کہ اجودھیا ایک انتہائی اور سنگین مسئلہ ہوگیا ہے، لیکن اسے اس حد تک پہنچانے کی ذمہ داری کس کی ہے، کس نے فرقہ پرستوں کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی کہ وہ قانون کو پامال کریں اور عدالت کی توہین کریں، وزیر اعظم کی عاجزانہ درخواست اسی وقت انہوں نے منظور کی جب چبوترہ کی تعمیر مکمل ہوگئی۔ ابھی وزیر اعظم کے تدبر اور فتح عظیم کی داد ہی دی جارہی تھی کہ باہمی گفت وشنید کے بارے میں ان کا اور سادھو سنتوں کا اختلاف شروع ہوگیا، پھر بھی یہ خوش فہمی ہے کہ تین چار ماہ میں یہ پیچیدہ مسئلہ حل ہوجائے گا۔ ؎

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

رام اور مندر کے نام پر تشدد، خوں ریزی اور ظلم وناانصافی کا جو طوفان اٹھا ہے، وہ پورے ملک کو غارت اور تباہ کرکے چھوڑے گا، اس وقت ملک اخلاقی، تہذیبی اور معاشی بحران میں مبتلا ہے لیکن دیش بھگتوں کو مسجد مندر کے جھگڑے سے فرصت نہیں، وہ سنگین خطروں اور نازک مسائل سے گھرا ہوا ہے، لیکن مذہبی جنون کے جوش میں ان پر توجہ دینے کا موقع کس کو ہے، مسلمان اجودھیا کی فتنہ سازی سے بڑی حد تک الگ تھلگ ہوگئے ہیں اور انہوں نے خانۂ خدا کا معاملہ اسی کے حوالہ کردیا ہے کہ وہ چاہے گا تو مسجد محفوظ رہے گی، اس دفعہ اتنے سخت مرحلے میں بھی وہ صبر وضبط کا پیکر بنے رہے اور ان کے لیڈروں نے بھی کسی قسم کی نفرت، اشتعال اور طیش کی بات نہیں کہی، دراصل انہوں نے پچھلے واقعات سے یہ سبق سیکھا ہے کہ اگر ان کی رگِ حمیت ذرا بھی پھڑکی تو انہیں اس کا سخت خمیازہ بھگتنا پڑے گا، مگر اس احتیاط کے باوجود مالے گاؤں، کیرالا اور بعض دوسرے مقامات میں ان کی جان ومال کا اتلاف ہوکر رہا، یہ اس ملک کی جمہوریت کا کرشمہ ہے کہ آئین، دستور اور

عدالت کو چیلنج کرنے والے اور مذہبی منافرت پھیلانے والے تو دندناتے پھر رہے ہیں لیکن دوسری طرف ان کی چنگیزیت اور ظلم آرائی کے خلاف لب کشائی بھی جرم بن جاتی ہے۔

ع بات پر واں زبان کٹتی ہے

عدالتِ عالیہ کے حکم کے باوجود دھوم دھام سے کارسیوا ہوتی رہی اور ریاستی اور مرکزی حکومتیں عدالتی فیصلے کو نافذ کرنے میں بےبس اور مجبور بنی رہیں۔ قانون اور دستور کے باغی اب بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نہ عدالت کا فیصلہ مانیں گے نہ مسجد سے مورتی ہٹائیں گے بلکہ مسجد ہی پر مندر تعمیر کریں گے، یہ سب مسلمانوں کے لیے مایوس کن اور جمہوریت پر اعتماد متزلزل کر دینے والی باتیں ضرور ہیں، لیکن دوسری جانب ان کے لیے یہ امید افزا اور خوش آیند پہلو بھی ہے کہ ملک کی تمام انصاف اور ترقی پسند جماعتیں بابری مسجد کے تحفظ کی بات شد و مد سے کرنے لگی ہیں، دراصل اب یہ تنہا مسلمانوں کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ ملک کے آئین و دستور، جمہوری قدروں اور ملک کی سالمیت کے تحفظ کا مسئلہ ہو گیا ہے، بابری مسجد کے بقا پر سیکولرازم اور جمہوریت کے بقا کے انحصار ہو گیا ہے، خود کانگریس کا رویہ اب تک جو بھی رہا ہو، لیکن اس کے لیے سیکولر نقطۂ نظر سے انحراف کرنا مشکل ہو رہا ہے، اس میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ووٹ کی سیاست سے بالاتر ہو کر مسائل پر غور کرتا ہے، رام اور لچھمن کی اس دھرتی اتر پردیش میں ایسے ویر اور جیالے موجود ہیں جو بابری مسجد کی حفاظت کے لیے تن تنہا سینہ تان کر کھڑے ہو گئے تھے، اس طرح سیاسی پارٹیوں میں صرف بی۔ جے۔ پی ہی رہ گئی ہے، گو اس کے لیے بھی مسجد کو نگل جانا مشکل ہو رہا ہے، مگر مرکزی حکومت پر قبضہ کے لیے وہ اکیلے ہی یہ مسئلہ زندہ رکھنا چاہتی ہے۔ ع خلقے بمنت یک طرف آں شوخ تنہا یک طرف

(معارف اگست ۱۹۹۲ء)

تاریخ مسخ کرنے کی کوشش

انگریزوں کے دور میں سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ملک کی تاریخ مسخ کی جاتی رہی ہے جس کا سلسلہ قومی حکومت کے قیام کے بعد بھی جاری ہے، ہندوستان کو انگریزوں کی سیاسی غلامی سے نجات تو مل گئی ہے لیکن ان کی ذہنی غلامی سے نہ ابھی تک چھٹکارا ملا ہے اور نہ ان کا پڑھایا ہوا نفرت و اختلاف کا سبق دل و دماغ سے محو ہوا ہے، یہ ملک کی بدقسمتی بھی ہے اور ووٹروں کی ناعاقبت اندیشی بھی،

سیکولر جماعتوں کی اقتدار کے لیے رسہ کشی اور کانگریس کی اکثریت کی تنگ نظری کا نتیجہ بھی ہے کہ اس وقت کئی ریاستوں میں ان لوگوں کی حکومت قائم ہوگئی ہے جو ملک کو پراچین کال میں لے جانا چاہتے ہیں، انہیں نہ ملک کی تعمیر و ترقی سے دلچسپی ہے نہ اس کی وحدت و سالمیت برقرار رکھنے کی پروا ہے اور نہ عوام کے دکھ درد، بڑھتی ہوئی گرانی اور ملک میں ہر چہار سو پھیلی ہوئی بدعنوانی سے کوئی پریشانی ہے، ان کا مقصد ملک کی رنگا رنگ، گنگا جمنی تہذیب کو مٹانا، اس کا سیکولر کردار ختم کرنا اور یہاں ایک خاص مذہب اور مخصوص قسم کی آئیڈیالوجی کا بول بالا کرنا ہے۔

چند ماہ پہلے مسلم حکمرانوں کے تعلق سے راجستھان کے امتحانی سوالات کا ذکر آیا تھا، اب ملک کی سب سے بڑی ریاست فرقہ پرستوں کا نشانہ بنی ہوئی ہے، بابری مسجد پر غاصبانہ قبضہ کی مہم عرصہ سے جاری ہے، مگر موجودہ ریاستی حکومت اس کو ہتھیانے کے لیے نت نئے ہتھکنڈے اختیار کر رہی ہے، اس سلسلہ میں عدالت، آئین اور ملک کے دستور کی کھلم کھلا توہین کرنے کے بعد بھی یہ اپنے کو سب سے بڑا محب وطن اور ملک کا وفادار کہہ رہی ہے، تاریخ کو مسخ کرنے کا مذموم عمل بھی اس نے شروع کر دیا ہے، اور بابر جیسے وطن دوست اور ہندوستان کو گل و گلزار بنانے والے بادشاہ کو فرقہ پرست، حملہ آور اور لٹیرا قرار دیا جا رہا ہے، اور یہ کہا جا رہا ہے کہ میر عبدالباقی نے مندر توڑ کر بابری مسجد بنائی تھی، جو افسانوں کو حقائق میں بدلنے اور جھوٹی سچی باتوں کو تاریخ کا جز بنانے کی مکروہ اور گھناؤنی سازش ہے، دارالمصنّفین نے ظہیر الدین بابر اور بابری مسجد پر مستند اور محققانہ کتابیں شائع کی ہیں جن کو پڑھنے کے بعد کسی انصاف پسند شخص کو ہندوستان سے بابر کی محبت و شیفتگی میں نہ شک و شبہہ ہو سکتا ہے اور نہ اس کا وہم و گمان کہ مندر توڑ کر مسجد بنائی گئی ہے۔

تعصب اور فرقہ واریت کو فروغ دینے اور طلبہ کے خام اور کچے ذہنوں کو زہر آلود کرنے کے لیے اتر پردیش حکومت تاریخ کی درسی کتابوں میں ردوبدل کر رہی ہے، ویدا اور رگ وید کی تصریح کے خلاف آریہ کو ہندوستان کا اصلی باشندہ بتایا جا رہا ہے، وادیٔ سندھ کی تہذیب کو ہڑپا تہذیب کا نام دیا جا رہا ہے، گیان بھارتی کتاب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا سبق خارج کرنے دسویں درجہ تک سنسکرت کو لازمی اور ویدک گرنتھ کو داخل نصاب کرنے کا حکم بھی جاری کیا گیا ہے، یہ خبر بھی آئی ہے کہ اب کسی نئے اقلیتی ادارے کو منظوری نہیں دی جائے گی، جو اقلیتوں کا قانونی اور دستوری حق ہے،

وزیر تعلیم مسٹر راج ناتھ سنگھ نے تاریخ کی از سر نو تدوین کا مقصد ''ہندوستانی کلچر'' کو فروغ دینا بتایا ہے، حالاں کہ اس سے یہ ریاست دوسری ریاستوں کے تعلیمی دھارے سے الگ ہو جائے گی ، ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی درہم برہم ہو جائے گی اور جنوبی ہند میں اس کے شدید رد عمل کا اندیشہ بھی ہے۔ خود اتر پردیش کے سیکولر اور انصاف پسند لوگ ریاستی حکومت کی اس کاروائی کی شدید مذمت کر رہے ہیں۔ (معارف مئی ۱۹۹۲ء)

بابری مسجد کی شہادت

۶/ دسمبر کو گاندھی جی کے سیکولر ہندوستان میں رام چندر جی کے بھگتوں نے بابری مسجد کو شہید کر ڈالا، ابھی وہ اپنی فتح کا جشن بھی منا سکے تھے کہ پورے ملک میں تشدد کی آگ بھڑک اٹھی، ان سطروں کی تحریر کے وقت گیارہ سو سے زیادہ آدمی مارے جا چکے ہیں، بابری مسجد کو شہید کرنے والے داد کے مستحق اس وقت ہوتے جب وہ اپنے مدمقابل کی عبادت گاہ کو مسمار کر کے اپنی مردانگی اور بہادری کا جوہر دکھاتے، انہوں نے اپنا کارنامہ دکھانے کے لیے اس قوم کی عبادت گاہ کا انتخاب کیا جو مجبور اور بے بس ہے، جس کے ساتھ دوہرا معیار اختیار کیا جاتا ہے، اور جس کو لوٹنے مارنے میں محافظین بھی شریک رہتے ہیں، کیا ایسے مجبور و بے بس لوگوں کی عبادت گاہ کو ڈھا دینا بہادری ہے، اور کیا رواداری اور عدم تشدد پر عقیدہ رکھنے والوں کے کارنامے ایسے ہی ہوتے ہیں،

ع تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

بابری مسجد کو شہید کرنے والے جس طرح کے لوگ ہیں اور جن طبقوں سے ان کا تعلق ہے ان سے حکومت، طاقت اور دولت کے بل پر ہر قسم کا کام لیا جا سکتا ہے، کیا اگر حکومت نہ چاہتی تو مسجد شہید کی جا سکتی تھی؟ صوبائی حکومت تو یہ کارنامہ انجام دینے میں پوری طرح شریک رہی ہے، بھارتیہ جنتا پارٹی کو اس پر کوئی پچھتاوا بھی نہیں ہے اور یہ پچھتاوا کیوں ہو، وہ پچھلے چند برسوں سے تمام قومی مسائل کو نظر انداز کر کے صرف اسی ایک مہم کو سر انجام دینے میں مصروف تھی، مرکزی حکومت کو بھی کیسے بری الذمہ سمجھا جا سکتا ہے؟ ۱۹۴۹ء ہی سے مسجد کو مندر بنانے والے اقدامات ہو رہے تھے، اس دفعہ بھی جب مسجد شہید ہو گئی اور کارسیوک ''باعزت'' واپس چلے گئے، تب اسے مسجد بچانے یا شاید اس کی تربت پر فاتحہ پڑھنے کا خیال آیا۔

مری میت پہ اب آیا ہے ظالم بال بکھرائے
کہو یہ شکل جیتے جی دکھا دیتا تو کیا ہوتا

اب بھی وہ مسجد کی ازسرنو تعمیر کی بات کہہ رہی ہے جس پر کیسے یقین آئے، مسجد میں تو بتوں کی پوجا ہو رہی ہے، آخر مسلمانوں کو کب تک فریب دیا جائے گا۔

مسلمان مسجد کی شہادت پر تڑپ رہے ہیں، لیکن اپنا درد کس سے کہیں؟ ملک میں ہر طرف تشدد پسندوں کا بول بالا ہے، جو آئین و قانون کی بات بھی سننے کے لیے تیار نہیں ہیں، تاہم ان صبر آزما حالات اور اذیت رساں واقعات کے باوجود انہیں صبر وضبط سے کام لینا اور ملک میں امن و امان قائم رکھنا ہے، ان کے لیے زمین کا چپہ چپہ مسجد ہے، ارشاد نبویؐ ہے، **جعلت لی الارض مسجدا وطھورا**، شر پسندوں کے غلبہ کے باوجود حق و صداقت اور عدل و انصاف کی بات کرنے والے بھی ملک میں موجود ہیں اور وہ ان واقعات کی شدید مذمت کر رہے ہیں، ان کے نزدیک بابری مسجد نہیں شہید ہوئی ہے بلکہ ہندوستانی جمہوریت اور سیکولرزم کی بنیادیں ڈھہ گئی ہیں اور پوری دنیا میں ملک رسوا اور بدنام ہو رہا ہے، اس وقت جمہوریت پسندوں کی یہ آواز گو نحیف اور غیر موثر ہوگئی ہے لیکن ایک دن یہی پورے ملک میں گونج کر رہے گی۔

چاہے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے یہ واقعہ کتنا ہی غمناک کیوں نہ ہو لیکن اس میں ان کے لیے درس و پیام بھی ہے، ان کا عقیدہ ہے کہ دنیا کی باگ ڈور خدا کے ہاتھ میں ہے یہاں بخت و اتفاق کے بجائے ہر واقعہ اللہ کے حکم سے پیش آتا ہے جو حق و عدل پر مبنی ہوتا ہے، جب مسلمانوں کے اندر وہ خرابیاں پیدا ہوگئیں جو کسی قوم کو خدا کے تازیانہ کا مستحق بناتی ہیں تو وہ اس سے اس لیے نہیں بچ سکتے کہ ان کے عقائد و رسوم دوسروں سے اچھے ہیں، کیوں کہ اجتماعی زندگی کو بنانے میں صرف یہی کافی نہیں ہے بلکہ اصل چیز اجتماعی و انفرادی کردار ہے، اگر یہ نہ ہو تو محض عقائد و رسوم کام نہیں دیتے۔ اس واقعہ نے مسلمانوں کو اپنے حالات و معاملات کی اصلاح اور انہیں ازسرنو منظم ہوجانے کا موقع بخشا ہے۔ کاش وہ اس تخریب سے اپنی تعمیر کا راستہ ہموار کر لیتے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

مسلمان مذہب کے معاملہ میں بڑے حساس ہیں، اس لیے ہندوستانی مسلمان اپنی مسجد سے دستبردار نہیں ہوسکتے، لیکن اس کے ردعمل میں کسی مندر کو توڑنے کا خیال بھی انہیں نہیں ہونا چاہئے۔ بابری مسجد کے انہدام کے ذمہ دار پاکستان اور بنگلہ دیش کے ہندو نہیں ہیں، اس کے لیے ان کو تشدد کا نشانہ بنانا اور ان کے مندر ڈھانا شرمناک اور اسلامی تعلیم کے منافی ہے، اس طرح کا اقدام ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد کے خلاف بھی ہے۔

صرف بابری مسجد کا سوال نہیں ہے بلکہ اس وقت ملک نہایت نازک اور کٹھن دور سے گزر رہا ہے۔ تشدد، شرپسندی اور فرقہ پرستی کی آندھی سیکولرزم، جمہوریت، امن وامان اور آئین وقانون سب کو خس وخاشاک کی طرح اڑا لے جانا چاہتی ہے، اس طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے کانگریس اور سیکولر جماعتوں کو انسانیت اور ملک کے مفاد میں متحد ہوجانا چاہئے۔ گاؤں گاؤں اور محلہ محلہ میں جا کر نفرت واشتعال کو ختم کرکے اخوت اور بھائی چارگی کی فضا پیدا کرنی چاہئے۔ ووٹ کی سیاست چھوڑ کر جمہوریت اور آئین کی بالادستی قائم رکھنے کے لیے جدو جہد کرنی چاہئے۔ اگر شرپسندی، فرقہ واریت اور تشدد کا جنون کم نہ ہوا تو ملک تباہ ہونے سے بچ نہیں سکتا، جس کی ذمہ داری فرقہ پرستوں سے زیادہ قوم پرستوں، وطن دوستوں اور سیکولر پسندوں پر ہوگی جو اپنے گھروں میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔ (معارف دسمبر ۱۹۹۲ء)

بابری مسجد کا سانحہ

ہندوستان کے مسلمان تیسرے درجہ کے شہری اور تعلیمی ومعاشی اعتبار سے ہی پسماندہ نہیں ہیں بلکہ وہ ہر میدان میں مجبور اور بے بس ہوگئے ہیں۔ ملک میں ان سے زیادہ بے وزن اور بے قیمت کوئی طبقہ نہیں ہے۔ زبانی تو ان سے ہمدردی، رواداری اور برابری کا دعویٰ کیا جاتا ہے، لیکن عملاً ان کی جان، مال، عزت اور آبرو سے مسلسل کھلواڑ ہورہا ہے۔ ان کے ساتھ دوہرا برتاؤ کیا جارہا ہے۔ ان کا امتیاز وتشخص ختم کرنے کے لیے اردو زبان کو مٹادیا گیا اور ان کے اداروں کا اقلیتی کردار مسخ کردیا گیا۔ ملک کے چپہ چپہ سے ان کی عظمت کی نشانیاں اور پُرفخر مذہبی، تہذیبی اور تعمیری یادگاروں کو معدوم کیا جارہا ہے اور اب فرقہ پرستوں سے سازباز کرکے عظیم الشان بابری مسجد اور اس کی لپیٹ میں درجنوں مسجدوں کو زمیں بوس کردیا گیا ہے۔

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تونے اے باد صبا　　یادگارِ رونق محفل تھی پروانے کی خاک

اس پر بھی صبر نہیں ہوا تو مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا جارہا ہے۔

بابری مسجد کی شہادت حکومت کی سراسر نااہلی اور وزارت داخلہ کی عمداً چشم پوشی اور مسلمانوں کے معاملات میں دوہرا معیار اختیار کرنے کا نتیجہ ہے جس سے ہندوستانی جمہوریت اور سیکولرازم کی جڑیں کھوکھلی ہوگئی ہیں اور سارے عالم میں حکومت کی جگ ہنسائی ہورہی ہے ؎

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا　　کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

مگر حکومت کے ذمہ دار نہایت بے شرمی سے اپنی بے گناہی کا اعلان کیے جارہے ہیں۔ان کے خیال میں اس وقت اتر پردیش میں بی جے پی حکومت تھی لیکن مسجد کی جگہ پر مندر کی داغ بیل کب ڈالی گئی اور اتر پردیش ہی نہیں پورے ملک میں جو خون ناحق بہہ رہا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ بی جے پی حکومتوں کو برخواست کرنے والے بمبئی اور احمد آباد میں جنگل کے راج،غنڈوں کی حکومت اور پولیس کی درندگی کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔رام لعل نابھوی کہتے ہیں ''ملک میں غدر مچا ہوا ہے،گھر سے باہر نکلنا محال ہورہا ہے''اور جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں ''یہ زمانہ ہم لوگوں کے اپنے اپنے گوشۂ تنہائی ہی میں رہنے کا ہے۔یہاں کے حالات بھی تو خراب ہی ہیں بلکہ خراب سے خراب تر ہوتے جارہے ہیں...... خدا جانے اس ملک کا کیا انجام ہوگا'' مگر اس کے باوجود ملک میں استحکام کے لیے حکومت کا باقی رہنا ضروری ہے۔

انگریزوں کے زمانے میں کانپور کی مسجد کا معمولی اور جزوی حصہ شہید ہوگیا تھا تو پورے ملک میں کہرام مچ گیا تھا۔آج بھی علامہ شبلی کی نظمیں ع ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں اور ؎

شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں　　کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہے

فضا میں گونج رہی ہیں لیکن قومی حکومت کے دور میں بابری مسجد کو ہضم کرلیا گیا اور مسلمان مجسم صبر و ضبط بنے رہے۔کہیں کہیں کارسیوکوں اور شرپسندوں کی اشتعال انگیزی سے بعض نوجوانوں نے جوش وحمیت دکھائی تو وہی حکومت جو بابری مسجد کو ڈائنا مائٹ سے اڑا دینے پر بھی چپ چاپ رہی تھی، سارے مسلمانوں کو گولیوں کا نشانہ بنانے کے لیے مستعد ہوگئی۔درندگی پر آمادہ پولیس اور پی اے سی اپنا فرض منصبی ادا کرنے کے لیے گھروں میں گھس کر ان کو لوٹنے اور مارنے لگی۔آتش زنی کرکے ان

کو اوران کی املاک کو برباد کرنے اور عورتوں کی عصمت دری کرنے لگی۔ بی جے پی کی حکومت بھی ہوتی تو کیا اس سے زیادہ ظلم ڈھاتی ع بلا سے قزاق آکے لوٹے، یہ پاسبانوں کی لوٹ جائے۔

اگر حکومت واقعی نیک نیت ہوتی تو وہ مسجد کی ازسرنو تعمیر کے لیے مخلصانہ قدم اٹھاتی اور تشدد پسندوں کے دباؤ میں نہ آتی، لیکن وہ تو قوت اور تشدد ہی کے سامنے سرنگوں ہونا جانتی ہے۔ مسلمانوں کا مطالبہ کتنا ہی جائز اور حق پر مبنی کیوں نہ ہو، وہ کمزور ہیں۔ اس لیے ان کی بات ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان کی طفل تسلی کے لیے وہائٹ پیپر کی اشاعت اور سی بی آئی سے تحقیقات کرانے کا شوشہ چھوڑ دینا کافی ہے۔ آر۔ ایس۔ ایس، ہندو پریشد اور بجرنگ دل پر دکھانے کے لیے پابندی عائد کی گئی تو جماعت اسلامی ہند کو بھی اسی زمرہ میں شامل کرلیا گیا جس کا فرقہ واریت سے دور و قریب کا بھی واسطہ نہیں، اس نے ہمیشہ ملک و قوم کے مفاد کو پیش نظر رکھا ہے اور مسلمان اور ہندوؤں کو بھائی بھائی بن کر رہنے اور خدا سے ڈرنے کی تلقین کی ہے۔ آج تک کسی شر و فساد میں وہ ملوث نہیں رہی ہے اور بلا امتیاز مذہب و ملت ہر مظلوم کی مدد و حمایت کرتی رہی ہے اور دوسری طرف بی جے پی اور شیوسینا کو ملک کا امن و امان درہم برہم کرنے کے لیے کھلی چھٹی ملی ہوئی ہے۔ جب کہ ہر شخص جانتا ہے کہ ان ہی کی بدولت پانی سر سے اونچا ہوا اور ملک کو یہ سیاہ دن دیکھنا پڑا۔

جس حکومت کے یہ کارنامے ہوں اس سے یہ توقع رکھنا کہ وہ بابری مسجد کو دوبارہ بنوا دے گی ع

ایں خیال است و محال است و جنوں

وہ تو مسجد کی جگہ مندر بنوا کر رام للا کا درشن کرا رہی ہے اور پجاریوں کو سرد و گرم موسم سے بچانے کے لیے مزید تعمیرات کرا رہی ہے۔ وعدے سے کیا ہوا، وعدہ تو مسجد پر کوئی آنچ نہ آنے دینے اور انتخابی منشور میں سو دنوں میں مہنگائی پر قابو پانے کا بھی کیا تھا۔ جب وعدوں سے ہی کام چل جائے تو انہیں وفا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جس حکومت کا معیار سراسر دُہرا اور جارحانہ ہو اور جو عدل و انصاف کے تقاضوں کو نہ پورا کرے اس سے مسجد کی بھیک مانگنا ننگ ہے۔ مانگنا ہے تو خدا سے مانگیے اور اسی پر بھروسہ کیجیے۔ وہ اندھا بہرا نہیں ہے کہ اپنے گھر سے غافل ہو جائے اور اسے تباہ کرنے والوں کے کرتوت نہ دیکھے۔ وہ ظلم و ناانصافی کو برداشت نہیں کرتا۔ حق کبھی کبھی اوجھل ہو جاتا ہے لیکن

مٹتا نہیں۔مٹنا اور برباد ہونا تو باطل کا حصہ ہے۔ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جن مسلمانوں نے جذبات سے مغلوب ہوکر مندر توڑے، ان کا فعل غیر اسلامی اور قابل مذمت ہے۔ہم کو خوشی ہے کہ بعض مسلم ملکوں نے مسمار شدہ مندروں کو دوبارہ بنوانے کا فیصلہ کیا ہے۔ہندوستان کی حکومت مسجد کو اپنا داخلی معاملہ کہہ کر دنیا کی زبان بند نہیں کرسکتی۔ اس نے خود دوسرے ملکوں میں مندر توڑے جانے پر احتجاج کیا ہے۔ملائم سنگھ یادو نے صحیح کہا کہ میں نے بابری مسجد کا تحفظ کرکے بہت سارے مندروں کو بچا لیا تھا۔اگر موجودہ حکمرانوں نے بھی عاقبت بینی سے کام لیا ہوتا تو ردعمل کا یہ سلسلہ شروع نہ ہوتا۔ردعمل بجائے خود غلط ہے لیکن اس کا موقع بابری مسجد اور اجودھیا کی دوسری مسجدوں کو نہ بچا کر خود ہماری حکومت نے دیا۔

(معارف جنوری ۱۹۹۳ء)

بابری مسجد کی شہادت اور فسادات

مسلمانوں کی مسجد تو شہید ہوئی ہی تھی جس کے صدمے سے وہ تڑپ رہے ہیں لیکن اب خود ان کی بھی خیر کہاں ہے۔یہ ہندوتوا نہیں وحشت اور درندگی کا طوفان ہے اور رام کے بھیس میں راونوں کا لشکر مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے امنڈ پڑا ہے۔حکومت ہی کہاں ہے۔اور اگر ہے تو اس نے وحشیوں اور درندوں کو صلائے عام دی ہے کہ مسلمانوں کا خون خرابہ کریں۔انہیں اور ان کی املاک کو پھونک دیں اور ان کی عورتوں کی اجتماعی عصمت دری کریں۔جنگل کے اس راج میں شرپسندوں اور غنڈوں کو من مانی کرنے اور مسلمانوں کو "سبق" دینے کی پوری آزادی ملی ہوئی ہے۔

حکومت کے اشارے یا اس کی کمزوری سے شیطانی رقص کرنے والوں کو مسلمانوں کو یہ بتا دینا چاہیے کہ اس درندگی سے نہ ان کو معدوم کیا جاسکتا ہے اور نہ نورِ خدا کو ظلم و تشدد کی آندھی سے بجھایا جاسکتا ہے۔

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم　　سو بار کرچکا ہے تو امتحاں ہمارا

زور زبردستی اور ظلم و دھاندلی سے مسجد بھلے ہی ڈھا دی گئی اور مسلمانوں کی مجبوری اور بے بسی کا فائدہ اٹھا کر وہاں مندر بھی بنایا جاسکتا ہے۔لیکن وہ اپنی مسجد کے مطالبے سے کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہوسکتے۔آج حکومت کو اور ہندوستان کے لوگوں کو حق و انصاف کا پاس ولحاظ نہیں ہے اور

مسلمان بھی مجبور ہیں۔ لیکن آئندہ ان کی جگہ لینے والے اس طرح مجبور نہیں ہوں گے اور وہ وہیں مسجد بنائیں گے جہاں تھی۔ حکومت واقتدار کے بل پر حق کو دبایا جا سکتا ہے، مٹایا نہیں جا سکتا۔

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

حکومت کا معیار اکھرا ہوتا اور وہ نیک نیت اور انصاف پسند ہوتی تو مسلمانوں کو ناکردہ گناہوں کی سزا کیوں ملتی اور ان کے ساتھ جارحیت اور تشدد کا مظاہرہ کرنے والوں کو کھلی چھوٹ کس طرح ملتی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی تضاد بیانی، جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے کی بڑی ماہر ہے۔ پہلے ان کے چوٹی کے لیڈروں نے مسجد ڈھائے جانے کو غلط اقدام کہا۔ اسی بنا پر یوپی کے وزیر اعلیٰ اور مسٹر اڈوانی اپنے عہدوں سے مستعفی ہو گئے تھے، مگر اب حکومت کی ڈھیل سے یہی لوگ اجودھیا کے واقعہ پر فخر کرنے اور ۶؍دسمبر کو قومی انقلاب کا دن کہنے لگے ہیں اور وزیر اعلیٰ صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ ”اس واقعہ پر نہ انہیں ملال ہے اور نہ پچھتاوا“ ؎ چہ دلاور است دزدے کہ بہ کف چراغ دارد۔ یہی وزیر اعلیٰ عدالت میں کچھ اور بیان دیتے ہیں۔ کسی اور کا کیا شکوہ، خود وزیر اعظم صاحب شروع میں بہ تکرار اپنے کو بے خطا کہنے کے علاوہ مسجد کی ازسرِنو تعمیر کی بات بھی کرتے تھے مگر اب یہ سب بھول کر ان کو صرف اپنے اقتدر کے تحفظ کا ایک نکاتی پروگرام ہی یاد رہ گیا ہے اور فرمانے لگے ہیں کہ ”مندر مسجد کا معاملہ چار سال کے لیے ملتوی کر دیا جائے“ ملک کی عجیب بدقسمتی ہے کہ کیسے کیسے لوگ اس پر مسلط ہو گئے ہیں اور کس کس طرح کے لوگ اس پر مسلط ہونے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ وہ زبان حال سے ضرور کہتا ہوگا ؎ ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے۔

مسلمان اچھی طرح سمجھ لیں کہ نہ انہیں کوئی سبق دے سکتا ہے اور نہ مزہ چکھا سکتا ہے۔ سبق دینے اور مزہ چکھانے والے خود اپنے کرتوتوں کی سزا پا کر رہیں گے کیوں کہ اس دنیا کی باگ ڈور اس خدا کے ہاتھ میں ہے جو ظلم و ناانصافی کو پسند نہیں کرتا۔ اس لیے جور و تشدد پر آمادہ افراد ہوں یا جماعتیں اور حکومتیں، ان کی بدمستی کا دور ختم ہوگا اور وہ قدرت کی گرفت سے باہر نہیں جا سکتے۔ لیکن یہ اس کی غیر مبدل سنت ہے کہ ؎ اعمال بگڑتے ہیں تو آتی ہے تباہی۔ مسلمان خود اپنے موجودہ حالات کے ذمہ دار ہیں۔ اگر وہ اپنے اعمال و کردار درست کر لیں تو خدا کی نصرت کے سزاوار ہو سکتے ہیں۔ ایک شریف ہندو شاعر جگن ناتھ آزاد نے انہیں یہ ولولہ بخش پیام دیا ہے :

قرآن کی تعلیم سے پھر درس بقا لے پھر روح میں پیغام محمدؐ کو بسالے
گزرے ہوئے عظمت کے زمانے کو بلالے روٹھی ہوئی ایمان کی دولت کو منالے
ایمان کی دولت کو گنوائے ہوئے انساں
بھارت کے مسلماں

اللہ کے قہر وغضب کی پروا کیے بغیر جو لوگ قوت کے گھمنڈ اور حکومت کے نشے میں اس کے مقدس گھر کو برباد کرنے کے لیے چڑھ دوڑے۔ان کے لیے اس گھر کے اصل محافظ کی تلوار ضرور بے نیام ہوگی ۔اصحاب فیل نے بیت اللہ کی تخریب کی سازش کی تھی اور ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کر کے خانۂ کعبہ کو منہدم کرنے کا ارادہ کیا تھا تو اللہ نے اسے اور اس کے لشکر کو تباہ کیا اور حرم کے ساتھ گستاخی کی سزادی ۔یہود ونصاریٰ نے ایک دوسرے کے معابد تباہ کیے اور بیت المقدس میں ذکرو عبادت سے روکنے کے لیے خوں ریز لڑائیاں کیں تو انہیں یہ وعید سنائی گئی کہ ''اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مساجد میں اس کا ذکر کیے جانے سے منع کرے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو، مساجد کی حرمت کا اقتضا یہ ہے کہ لوگ ان میں ڈرتے ہوئے داخل ہوں اور ان کے تقدس کو پامال نہ کریں ورنہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے''۔اسلام نے تو حالت جنگ میں بھی غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو ڈھانے یا ان کی توہین کرنے سے روکا ہے۔ایسی صورت میں راون کا کردار ادا کرنے والے رام بھگت اپنے کو رسوائی سے کیسے بچا سکتے ہیں،ان کی رسوائی کا ڈنکا تو ساری دنیا میں بج رہا ہے۔دوسری طرف سچے مسلمانوں کے لیے اللہ کے دریائے رحمت کے جوش و طغیانی میں کمی نہیں آئی ہے ؎

هنوز آں ابر رحمت درفشان ست خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

اس طرح کے حالات ومسائل سے نہ زندہ قوموں کا شیرازۂ ہستی درہم برہم ہوتا ہے اور نہ ان کا نظام حیات بے کیف اور مضمحل ہوتا ہے۔وہ ناکامی کی ٹھوکریں کھا کر بھی سرشار آرزو رہتی ہیں۔ راہ طلب کی دشواریاں ان کا عزم وحوصلہ بڑھاتی ہیں ۔مشکلات اور صعوبتیں ان کے گام شوق کو تیز کردیتی ہیں۔ان کے جوش عمل کو پُرخطر راہوں کی تلاش رہتی ہے اور طوفان برق و باد میں ان کے بال و پر کی نشوونما ہوتی ہے۔سرفروشی، جاں بازی اور قربانی ان کا وطیرۂ حیات بن جاتا ہے جس کے

بعد شکست وہزیمت بھی فتح وظفر میں تبدیل ہوجاتی ہے

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

(معارف فروری ۱۹۹۲ء)

بابری مسجد سانحہ اور مسلمان

گزشتہ تین مہینوں سے ان صفحات میں ہم مسلسل بابری مسجد کی شہادت اور اس کے بعد رونما ہونے والی وحشت ودرندگی پر اشکباری کررہے ہیں؟ کیا کریں آنسوؤں کا طوفان رکتا ہی نہیں۔ ایک بابری مسجد ہی کا غم ہوتا تو شاید وقت اسے مندمل کردیتا لیکن اس کے ڈھائے جانے کے بعد سے مصائب وآلام کا سیلاب امنڈ پڑا ہے، مسلمانوں کی جان مال، عزت آبرو، تشخص، امتیاز، قومیت، مذہب، عقیدہ، ایمان اور تہذیب وتمدن کی کوئی چیز بھی سلامت نہیں ہے، مساجد، معابد، مآثر اور مقابر سب ہی زمیں بوس ہورہے ہیں۔ ایک زخم بھرتا نہیں کہ دوسرا اس سے کاری زخم لگادیا جاتا ہے۔ ایسے میں بابری مسجد کا غم کیسے فراموش ہوسکتا ہے

فلم تنسنی اوفی المصیبات بعدہ ولکن نکأ القرح بالقرح اوجع

(ترجمہ): اوفیٰ کے مرنے کے بعد کے مصائب اس کے غم کو بھولنے نہیں دیتے کیونکہ زخم پر زخم کی رگڑ بڑی تکلیف دہ ہے۔

ایک غم ہوتو اس کا مداوا ڈھونڈا جائے اور ایک درد ہوتو اس کا درماں تلاش کیا جائے لیکن یہاں تو ع تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم۔

حالات کی اس شدت وپیچیدگی میں بظاہر مسلمانوں کی کامیابی وکامرانی کے راستے مسدود نظر آتے ہیں لیکن فلسفہ تاریخی کا یہ ایک راز ہے کہ صبر وابتلا کے کٹھن دور کے بہت بعد سہولت اور آسانی کا دور آتا ہے اور تاریک ومہیب رات کے بعد سپیدۂ صبح نمودار ہوتا ہے۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ قوموں کی تعمیر وترقی اور کامیابی وکامرانی کے امکانات بظاہر معدوم ہوگئے ہیں لیکن اسی نازک گھڑی میں ان کے عزم وحوصلہ، ہمت وبہادری اور محنت وجفاکشی نے تخریب کو تعمیر سے اور ناکامی کو کامرانی سے بدل دیا ہے۔ مسلمان بھی ایسے ہی نازک موڑ پر آگئے ہیں جہاں اگر وہ سنبھل گئے تو تخریب کے پردے سے تعمیر کا راستہ نکل آئے گا اور دشواریوں اور مشکلات کے طوفان میں بھی وہ ساحل مراد سے

ہم کنار ہو جائیں گے۔ زندہ اور بہادر قوموں کا عزم سفر سنگلاخ زمینوں کو بھی عبور کر لیتا ہے اور چٹانوں کو پاش پاش کر دیتا ہے لیکن اگر اب بھی وہ ٹھوکریں کھاتے اور مایوسی و بددلی کا شکار رہے تو ان کی تعمیر و ترقی کی راہ باز نہیں ہو سکے گی اور ناکامی و نامرادی ہی ان کا مقدر بن جائے گی۔ کوئی معجزہ اور کرامت بھی انہیں قوت و توانائی نہیں بخش سکے گی۔

اس موقع پر ہم بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایک واقعہ کا حوالہ دینا چاہتے ہیں جس کا ذکر تورات و صحیفۂ سموئیل اور قرآن مجید (سورہ بقرہ) دونوں میں ہے۔ حضرت سموئیلؑ کے ظہور کے ابتدائی دور میں بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود نہایت ذلیل و خوار ہو گئے تھے۔ شرک و بدعت کے اثر و نفوذ کی وجہ سے ان کی دینی و اخلاقی حالت بہت خراب ہو گئی تھی اور اجتماعی تنظیم نہ ہونے کی بنا پر ان کی سیاسی حالت بھی ابتر تھی۔ ان کے انتشار اور پراگندگی نے ان کے دشمنوں کو اس قدر ڈھیٹ بنا دیا تھا کہ وہ بلا خوف و خطر ہر چہار جانب سے ان پر یورش کر رہے تھے اور ان پر ایسا خوف و ہراس اور دہشت و مرعوبیت طاری تھی کہ دشمنوں کے مقابلے کی کوئی ہمت اور سکت ان میں باقی نہیں رہ گئی تھی۔ فلسطینی ان کے شہروں سے انہیں نکال رہے تھے اور ان کا قتل عام کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ خدا کا مقدس صندوق بھی ان سے چھین لے گئے۔

صندوق کا چھن جانا بنی اسرائیل کی عزت و حشمت چھن جانے اور ان کی اخلاقی و ایمانی موت کے مرادف تھا۔ قرآن مجید نے بھی ان کی اس بزدلی کی زندگی کو موت ہی سے تعبیر کیا ہے کیونکہ یہ ان کی ذلت و نکبت، مجبوری و بے بسی اور پسپائی و پامالی کی آخری حد تھی۔ صندوق کی حیثیت یہود کے یہاں قبلہ کی تھی جس کو وہ اپنے خیمۂ عبادت میں ایک مخصوص جگہ بڑے اہتمام کے ساتھ پردوں کے بیچ میں رکھتے اور دعا و عبادت میں اسی کی طرف متوجہ ہوتے۔ ان کے ربیؔ و کاہن غیبی رہنمائی کے لیے اسی کو مرجع بناتے، مشکل حالات، قومی مصائب اور میدان کارزار میں یہی تابوت بنی اسرائیل کا عزم و حوصلہ قائم رکھنے میں معاون ہوتا۔ اس میں تورات اور صحرائی زندگی کے دور کی بعض یادگاروں کے علاوہ حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ اور ان کے خاندان کے کچھ تبرکات محفوظ تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں ان کے خداوند کی جانب سے وہ سامانِ تسکین و اطمینان تھا جو پُر خطر حالات اور جنگ کے مصائب میں ان کے لیے موجب قرار و حوصلہ تھا۔

بیس برس تک بنی اسرائیل پر ذلت و نامرادی کی یہ کیفیت طاری رہی۔ اس کے بعد حضرت سموئیلؑ کی پیغمبرانہ دعوت سے ان میں بیداری پیدا ہوئی۔ ان ہی کی اصلاحی وتجدیدی کوششوں سے وہ شرک وبدعت سے باز آئے۔ گناہوں اور معصیتوں سے تائب ہوئے اور اپنے افتراق وانتشار کو دور کر کے دوبارہ منظم ومتحد ہوئے۔ غرض جب انہوں نے اپنے حالات ومعاملات درست کر لیے تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان پر اپنا فضل کیا اور انہیں از سر نو زندگی بخشی۔ چنانچہ ان میں فلسطینیوں سے مقابلہ کی ہمت وقوت پیدا ہوئی جس کے بعد انہوں نے ان سے اپنے چھینے ہوئے شہر واپس کرا لیے اور اپنی عزت وحشمت بھی دوبارہ حاصل کر لی یعنی خدا کا صندوق کروبیوں کی رہنمائی اور فرشتوں کی مدد سے ان کو دوبارہ مل گیا۔ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایسا ہی معاملہ ہوتا ہے، اگر کوئی قوم اپنے لیے ذلت ونامرادی کو پسند کرتی ہے تو خدا بھی اسے ذلت ونامرادی کے حوالہ کر دیتا ہے اور اگر کوئی قوم عروج وسربلندی کی طالب ہوتی ہے اور اس طلب کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو عزت وسربلندی بخشتا ہے۔

تاریخ بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بڑا اسبق آموز ہے۔ مسجد کا چھن جانا مسلمانوں کی عزت و حشمت کا خاک میں مل جانا ہے جس کے بعد سے وہ مسلسل سنگین حالتوں سے دوچار ہیں لیکن زندگی و موت کے اس دوراہے پر وہ کدھر جائیں، اس کا فیصلہ ان ہی کو کرنا ہے۔ اگر موت سے ڈر کر انہوں نے خوف اور بزدلی کی زندگی اختیار کی تو انہیں موت سے کوئی چیز بچا نہیں سکے گی اور اگر وہ موت سے نڈر اور بے پروا ہو کر ایمان واسلام کی زندگی اختیار کرنے کا عزم مصمم کر لیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کو باعظمت زندگی اور آخرت میں حیات جاوداں سے سرفراز فرمائے گا۔ (معارف مارچ ۱۹۹۳ء)

بابری مسجد سانحہ سے سبق

اس سال دسمبر کا مہینہ مسلمانوں کے لیے ماہ محرم بن کر آیا ہے۔ گزشتہ چھ برس کو ان کی مجبوری وبیکسی کا فائدہ اٹھا کر حکومت واقتدار کے نشہ میں دھت لوگوں نے ان کی قدیم تاریخی بابری مسجد کو شہید کر دیا تھا اور جب اس پر بھی انہیں تسکین نہیں ہوئی تو انہوں نے مسلمانوں کے لہو سے اپنی تشنگی بجھانے کے لیے ان کا قتل عام شروع کر دیا۔ امن وآشتی اور اہنسا کی یہ سرزمین ابھی تک مسلمانوں کے خون ناحق کے چھینٹوں سے رنگین ہے۔ ظالموں اور سفاکوں نے بابری مسجد کو شہید

کر کے ملک کی شہرت وعزت میں بٹہ لگایا اور اپنی وحشت و درندگی سے ساری دنیا میں ہندوستان کو ذلیل ورسوا کیا، جس پر وہ بے شرمی اور ڈھٹائی سے فخر و گھمنڈ کر رہے ہیں اور اپنی بہیمانہ حرکت کو بہادری سمجھ رہے ہیں۔ ایک طرف پوری دنیا میں اس بزدلانہ اور گھناؤنے کام کی مذمت ہو رہی ہے، دوسری طرف آئین وقانون سے اپنے کو بالاتر سمجھنے اور جمہوریت وسیکولرزم کے پرخچے اڑانے والا یہ چھوٹا سا گروہ اسے اپنا شاندار کارنامہ سمجھ کر اترا رہا ہے ع

خلقے بمنت یک طرف آں شوخ تنہا یک طرف

گریہ وزاری کی ایک حد ہوتی ہے۔ نوحہ و ماتم زندہ اور بیدار قوموں کا شیوہ نہیں ہے بلکہ حوادث اور ٹھوکریں ان کے لیے تازیانہ عبرت ہوتی ہیں ؂

لذت شناسِ غم کو ہے اظہارِ غم حرام　　روتا ہوں اور دامنِ مژگاں بھی تر نہیں

بابری مسجد کا سانحہ چاہے کتنا ہی دردناک کیوں نہ ہو لیکن یہ غیر محدود نالہ وشیون اور کسی نئے محرم کی دعوت نہیں ہے بلکہ اس میں مسلمانوں کے لیے یہ درس وپیام مضمر ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں اور خرابیوں کی اصلاح کریں۔ اپنے حالات ومعاملات کو درست کریں، اپنی دینی واخلاقی زندگی کو سنواریں، اپنا انتشار اور پراگندگی کو دور کریں اور وہ رویہ اختیار کریں جو خدا کو پسند ہوتا کہ وہ اس کی رحمت ونصرت کے سزاوار ہوں۔ ان کا عقیدہ وایمان تو یہ ہے کہ یہ پوری کائنات خدا کے حکم اور اس کی قدرت سے قائم ہے۔ اس کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ نہ عدل وقسط کے نظام کی پامالی و بربادی کو گوارا کر سکتا ہے اور نہ نظام عدل وقسط کے دشمنوں کو برپا ہونے دے سکتا ہے۔

حالات کو سنگین بنانے اور بابری مسجد کے مسئلے کو الجھانے کی ذمہ داری خود مسلمانوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ انھوں نے اس کے نام پر اپنی قیادت کی دوکان چمکائی اور ہندوتو کا احیا کیا جس کے نتیجہ میں بابری مسجد شہید کر دی گئی اور وہ کچھ نہ کر سکے۔ اب اگر مسلمانوں کے شور وشغب سے ٹھنڈی فضا گرم اور مسموم ہوئی اور ان کے لیڈروں کی بے سود تقریروں اور اشتعال انگیز نعروں سے ان میں خواہ مخواہ کا جوش واشتعال پیدا ہوا تو ان کے مخالفوں کو پھر کھُل کھیلنے کا موقع ملے گا اور وہ تشدد، فرقہ پرستی اور نفرت وعناد کا وہ طوفان برپا کریں گے جو مسلمانوں کی مزید تباہی وبربادی کا موجب ہوگا۔ یہ وقت بڑے صبر وضبط اور آزمائش کا ہے۔ اس میں پوری ہوش مندی اور بیدار مغزی سے کام لینے کی

ضرورت ہے، جو لوگ مسجد کا تحفظ نہیں کر سکے، انہیں اس کی شہادت کی یادگار اور برسی منانے کا کیا حق ہے؟ آخر ان کی بے تدبیری سے سادہ لوح مسلمانوں کا خون خرابہ کب تک ہوگا۔

اللہ تعالیٰ خیر مطلق ہے۔ وہ شر اور فساد فی الارض کو پسند نہیں کرتا۔ اس نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، اس لیے اسے ایک خاص اور محدود دائرے میں آزادی و اختیار بھی بخشا ہے لیکن جب انسان خدا کی دی ہوئی اس نعمت کا غلط استعمال کرتا ہے تو دنیا شر و فساد سے معمور ہو جاتی ہے۔ اتر پردیش میں کچھ لوگوں کو حکومت کیا ملی کہ انہوں نے ملک کو تہ و بالا کر دیا، جمہوریت اور سیکولرزم کی بنیادیں ہلا دیں۔ اللہ کے بندوں پر مظالم ڈھائے۔ مساجد و معابد مسمار کیے۔ نصاب تعلیم تبدیل کیا، تاریخ بدل دی۔ ملک کے دستور و آئین کا مذاق اڑایا۔ قانون کی بالاتری ختم کر دی۔ عدالتوں کی توہین کی اور ۶ /دسمبر ۱۹۹۲ء کو اجودھیا میں بڑے پیمانے پر ہندوتو شکتی کا مظاہرہ کر کے بابری مسجد کی جگہ مندر بنانے کی تمام رکاوٹیں دور کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن اللہ کی مشیت و مرضی کے سامنے ان کی کچھ نہ چلی اور بابری مسجد ڈھانے والوں کو عبرتناک سزا مل کر رہی۔ ۶ /دسمبر کے پہلے ہی اتر پردیش اور بعض دوسری ریاستوں کو ان کے پنجۂ استبداد سے چھٹکارا مل گیا۔ قرآن مجید میں ہے کہ ”اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض سے دفع نہ کرے تو صومعے، گرجے، عبادت خانے اور وہ مسجدیں جن میں اللہ کا بکثرت ذکر ہوتا ہے، ڈھادی جائیں“۔ (حج: ۴۰)

اتر پردیش کے نئے وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو کی سیکولر پسندی اور مظلوم اور کمزور طبقوں سے ہمدردی اور دلچسپی کی شہرت ہے۔ انہیں موقع ملا تو وہ ایک صاف ستھری حکومت قائم کر کے اپنی نیک نامی میں اضافہ کریں گے۔ اب بابری مسجد کا مسئلہ مرکزی حکومت کے دائرہ اختیار میں چلا گیا ہے جس کی گومگو پالیسی نے اسے اور خود کانگریس کی تصویر کو بگاڑا ہے۔ اس نے مسجد کے ڈھائے جانے کے بعد اس کی اور اس سے ملحق آراضی کو بحق سرکار ضبط کر کے مسجد و مندر بنانے کے لیے مذہبی لوگوں کے دو ٹرسٹ بنانے کا اعلان کیا ہے اور مسجد و مندر کی جگہوں کے تعین کے لیے سپریم کورٹ کی رائے طلب کی ہے لیکن اس طرح نہ یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور نہ فریقین اس پر راضی ہو سکتے ہیں۔ اب مسلمانوں کو سیکولر جماعتوں کی تائید و حمایت سے مرکزی حکومت کو آمادہ کرنا چاہیے کہ وہ سپریم کورٹ سے اپنا ریفرنس زیر دفعہ ۱۴۳ واپس لے کر دستور کی دفعہ ۱۳۸ کے تحت یہ مقدمہ سپریم کورٹ

کو فیصلے کے لیے بھیج دے اور عدالت کا جو بھی فیصلہ ہو اس کی پابندی کی جائے۔ آئینی و قانونی جدو جہد کے بجائے پرانے زخموں کو کریدنا مسئلے کو مزید خراب کرنا ہے۔ (معارف دسمبر ۱۹۹۳ء)

مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حل کے لیے حکمتِ عملی

مسلمان اپنے مسائل کے لیے حکمت، تدبر اور دور اندیشی کے بجائے ان طریقوں کو اختیار کیے ہوئے ہیں جن سے ان کے مسائل اور زیادہ الجھتے اور پیچیدہ ہوتے جارہے ہیں۔ شور، ہنگامہ اور احتجاج کو انھوں نے اپنی طبیعت ثانیہ بنالیا ہے۔ اس سے اس ملک میں ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ ہمیشہ سے کمزوروں اور مجبوروں کو تختۂ مشق بنانا اور ان پر ظلم و تشدد روا رکھنا زبردست اور جفا شعار لوگوں کا شیوہ رہا ہے، اس کے ازالے کے لیے گلہ، شکوہ اور جزع و فزع کبھی سود مند نہیں رہا ہے۔ ظلم و تشدد کا سد باب اسی وقت ہوتا ہے جب مظلوموں اور زیردستوں میں قوت و طاقت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنی کمزوری اور کمی کی تلافی کرکے اپنے حالات کی اصلاح کرلیتے ہیں لیکن مسلمانوں نے نصف صدی کا طویل عرصہ بے عملی، تعطل، نالہ و شیون اور واویلا میں گزارا ہے، یہ بڑا المیہ ہے کہ دنیا کو آزادی، مساوات اور انصاف عطا کرنے والے آج ذلت، محکومی، ناانصافی اور تفریق و امتیاز کا شکار ہیں جو ساری دنیا کے لیے چراغ راہ تھے وہ تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور انھیں راستہ نہیں مل رہا ہے۔ لوگوں کے مصائب و آلام کو دور کرکے انھیں سہولت و آسانی فراہم کرنے والے خود ایسے دلدل میں جا پھنسے ہیں جن سے نکلنے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔

شکست خوردہ قوموں کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ اپنی ہزیمت اور تباہی کا ذمہ دار دوسروں کو سمجھتی ہیں اور خود اپنی غفلت و کوتاہی سے چشم پوشی کرلیتی ہیں، مسلمانوں کا حال بھی یہی ہے کہ وہ اپنی موجودہ زبوں حالی اور بربادی کا ذمہ دار دوسروں کو سمجھتے ہیں اس لیے ان کے خلاف غصہ اور نفرت میں مبتلا رہتے ہیں اور انھیں اپنی غلطی اور بے تدبیری کا احساس نہیں ہوتا۔ اپنے باہمی اختلافات کو رفع کرنے کے بجائے ایک دوسرے کی کردار کشی ان کا وطیرہ بن گئی ہے جس سے ان کے اختلاف و نزاع کی خلیج مزید بڑھتی جارہی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک ہی یونیورسٹی ہے جو ان کا سب سے بڑا قومی سرمایہ ہے لیکن گزشتہ کئی برس سے اس کے حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں، ان کو

درست کرنے کے بجائے ہر فریق دوسرے کی ہوا خیزی، اسے نیچا دکھانے اور اس پر جا و بیجا الزام عائد کرنے میں لگا ہوا ہے اور خود اپنے طرز عمل کا محاسبہ کرنے کے لیے کوئی بھی آمادہ نہیں ہے اس وقت جو طفلانہ حرکتیں ہو رہی ہیں، ان سے یونیورسٹی کا رہا سہا وقار بھی ختم ہو جائے گا، اگر واقعی تڑپ، بے چینی اور اخلاص ہے تو سب کو مل جل کر اس پر ہمدردی اور دلسوزی سے غور کرنا چاہیے۔

(معارف جولائی ۱۹۹۴ء)

اردو کے تئیں اردو والوں کی ذمہ داری

اب اتر پردیش میں اردو کا مسئلہ جس موڑ پر آ گیا ہے، اس میں اردو والوں کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ عرصۂ دراز سے اردو کے لیے جو مطالبات کیے جا رہے تھے اور جن کو اب تک کی تمام ریاستی حکومتیں سراسر نظر انداز کرتی رہی ہیں، موجودہ ریاستی حکومت نے اردو کے جائز اور جمہوری حقوق دینے کے لیے جو جرأت مندانہ فیصلے کیے ہیں، اس کے بعد بھی اگر اتر پردیش میں اردو کا رواج نہیں ہوتا تو اس کے اصل ذمہ دار خود اردو کے حامی اور بہی خواہ ہی ہوں گے، جن کا مزاج صرف باتیں بنانے اور کام نہ کرنے کا بن گیا ہے۔ وہ اردو کے لیے چیخ و پکار تو بہت مچاتے رہے ہیں لیکن اس کے استحصال میں وہ بھی برابر کے شریک رہے ہیں، اب انہیں اپنی روش بدل کر اپنی جد و جہد تیز کرنی اور اردو کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینی ہوگی۔ اگر اردو والوں نے یہ سنہرا موقع بھی اپنی غفلت و بے پروائی سے ضائع کر دیا تو یہ ان کی نہایت بدبختی اور ایسا قومی جرم ہوگا جس کے لیے اردو کی آئندہ نسلیں انہیں معاف نہیں کریں گی۔ اردو والوں کو اب کچھ کر دکھانا ہوگا ؎

جہاں میں عمل کی عملداریاں ہیں سخن پروری کا زمانہ نہیں ہے

(معارف جولائی ۱۹۹۴ء)

امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ

انگریزوں کے زمانے ہی میں بہار و اڑیسہ میں امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آ گیا تھا اور اس کے دار القضا سے شرعی قوانین کے مطابق مسلمانوں کے مقدمات طے ہوتے تھے۔ اب بھی امارتِ شرعیہ کا یہ نظام قائم ہے اور اس سے مسلمانوں کو بڑی راحت و سہولت ہے کیونکہ سرکاری عدالتوں میں انصاف بکتا ہے اور معمولی مقدمات کے تصفیہ ہونے تک عدالت سے رجوع کرنے والا مر چکا ہوتا

ہے اور اس طویل عرصہ میں وقت اور روپئے کے ضیاع کے علاوہ ذہنی اذیت اور نا قابل بیان پریشانیاں پیش آتی ہیں۔ابھی تک امارت شرعیہ کے دارالقضا کے خلاف کوئی آواز سننے میں نہیں آئی تھی اور نہ اسے کوئی متوازی نظام کہا گیا تھا بلکہ چھ برس پہلے امارت کے زیر انتظام قائم ہونے والے ''سجاد اسپتال'' کی افتتاحی تقریب میں اس وقت کے وزیر اعلیٰ بہار مسٹر بھگوت جھا آزاد نے کہا ''ہمیں تعجب ہے کہ پھلواری شریف کے دارالقضا نے ستر ہزار سے زائد فتوے اور فیصلے کیے ہیں اور ہماری ٹریجڈی ہے کہ لوور کورٹ، ڈسٹرکٹ کورٹ، ہائی کورٹ، سپریم کورٹ کے فیصلے تک انصاف پانے والا جاتے جاتے مرجاتا ہے'' یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بہار کی سرکاری عدالتیں دارالقضا کے فیصلوں کو اہمیت دیتی ہیں اور ان کا احترام کرتی ہیں۔

بہار میں دارالقضا کے کامیاب تجربہ کی بنا پر گزشتہ سال آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے اپنے اجلاس منعقدہ جے پور میں فیصلہ کیا کہ پورے ملک میں مسلمان دارالقضا قائم کریں جس کے خلاف شدید ردعمل ہوا مگر مسلم پرسنل لا کے فیصلہ کے خلاف شوروغوغا برپا کرنے والوں نے گاؤں پنچایت، لوک عدالت اور پنچایتی راج پر کبھی ہنگامہ واحتجاج نہیں کیا اور نہ اسے عدلیہ کے خلاف متوازی نظام کہا جب کہ ان سب کا مقصد ومنشا بھی یہی ہے کہ عام لوگوں کے لیے انصاف سستا اور آسان ہوجائے اور گاؤں والے اپنے جھگڑے کسی پریشانی اور زیر باری کے بغیر خود ہی چکالیں۔اگر پنچایتی راج سے کسی متوازی نظام کے قائم ہونے اور لوگوں کے قومی دھارے سے الگ ہوجانے کا اندیشہ نہیں ہے تو مسلمانوں کے دارالقضا کے قیام سے کون سی قیامت برپا ہوجائے گی۔

(معارف ستمبر ۱۹۹۴ء)

ندوہ کے بے گناہ طلبہ پر پولیس کی زیادتی

تعلیمی ادارے جو افراد سازی کے کارخانے تھے، آج طلبہ کی شورش پسندی اور ہنگامہ آرائی اور اساتذہ کی غیر ذمہ داری اور اپنے فرائض سے عدم دلچسپی کی وجہ سے بدعنوانیوں کا مرکز بن گئے ہیں جس طبقہ پر امن وامان قائم کرنے اور خرابیوں کی اصلاح کی ذمہ داری تھی وہی امن وعدل اور آئین و قانون کا شیرازہ درہم برہم کررہا ہے، سماج دشمن اور جرائم پیشہ لوگ کھلم کھلا ہر قسم کی زیادتی اور سرکشی کے مرتکب ہوتے ہیں اور آئین شکنی کرتے ہیں مگر نہ حکومت کو ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی

ہمت ہوتی ہے اور نہ پولیس ان سے کوئی تعرض کرتی ہے، البتہ بے خطا، کمزور اور مظلوم لوگوں کو پریشان کرنا، ان کے خلاف فرضی اور جھوٹے مقدمے قائم کرنا، انہیں ہر قسم کی اذیت دینا اور زد وکوب کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی ہے۔

ملک کے اس بگڑے اور بدتر ماحول میں صرف مسلمانوں کے دینی عربی مدارس ہی کَاَنَّھَا مَنَارَۃُ مُمْسٰی رَاھِبٍ مُتَبَتِّلٍ کے مصداق ہیں جن سے اس کی شب تاریک میں ضوفشانی ہو رہی ہے۔ یہ سب کے سب سیاسی ہنگاموں، قومی بکھیڑوں، ہر قسم کی شورشوں اور دہشت وتشدد سے الگ رہ کر اپنی دھن میں مست اور اپنے حال میں مگن ہیں۔ ان کا کام پیغام محبت پہنچانا ہے۔ یہ صرف قوم و ملک کی تعمیر وترقی اور خلق خدا کی خدمت ونفع رسانی سے سروکار رکھتے ہیں۔ محبت، اخوت، میل ملاپ، صلح وآشتی اور رواداری کی دعوت دیتے ہیں۔ اپنے اور پرائے کی تمیز کے بغیر سب کی بھلائی اور خیر خواہی چاہتے ہیں۔ حق وصداقت کا بول بالا کرنا چاہتے ہیں۔ ظلم وناانصافی کی مذمت کرتے ہیں، لوگوں کو شر وفساد سے باز رکھتے ہیں اور انہیں عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا ہر دینی مدرسہ اسی اصول پر کاربند ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جھگڑوں، تفرقوں اور نفرتوں سے ملک کمزور ہوگا، اس کی بھلائی، میل ملاپ، دوستی اور بھائی چارگی میں پنہاں ہے۔

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است   با دوستاں تلطف   با دشمناں مدارا

ہندوستان کے دینی مدارس میں ندوۃ العلما لکھنؤ بہت ممتاز ہے۔ اس کے اساتذہ وطلبہ خاموشی اور ذمہ داری سے علم، مذہب، قوم اور وطن کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس کے ناظم اور سربراہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلۂ ہند میں سرمایۂ ملت کے نگہبان اور مسلمانوں کے ہر طبقہ کے معتمد ہیں۔ وہ اپنی حب الوطنی اور قوم ووطن کی بے لوث اور مخلصانہ خدمت کی وجہ سے ہندوؤں کے حلقہ میں بھی مقبول ہیں۔ جس قدر ملک میں ان کی عزت وعظمت کا سکہ بیٹھا ہوا ہے اس سے زیادہ عرب اور اسلامی ملکوں میں ان کا اعزاز واکرام کیا جاتا ہے۔ ان کا آوازۂ شہرت عرب وعجم ہی میں نہیں یورپ، امریکہ اور افریقہ کے ملکوں میں بھی پہنچ گیا ہے، وہ ندوۃ العلما کے علاوہ ہندوستان، اسلامی ملکوں اور یورپ کے متعدد علمی، تعلیمی، تحقیقی اور تصنیفی اداروں کے سربراہ ہیں جن میں دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی بھی ہے۔ ملک کو فتنہ وفساد، جنگ وجدال اور تباہی وبربادی کے دہانے پر دیکھ کر ان کا

دردمند دل تڑپ اٹھا اور وہ انسانیت کا پیغام پہنچانے کے لیے اس کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گئے۔

پورے ہندوستان میں مولانا ابوالحسن علی ندوی ہی کی ذات گرامی ہے جن کو اسلامی ملکوں کے علما و فضلا و اعیان حکومت اور فرمانروا اپنے یہاں مدعو کرتے اور ان سے مہماتِ امور میں رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں اور ان سے ملنے کے لیے لکھنؤ اور رائے بریلی تشریف لاتے ہیں۔ ہندوستان کی مختلف جماعتوں کے سربراہ ان کے پاس آنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ وزرائے اعظم مسز اندرا گاندھی راجیو گاندھی، وی۔ پی سنگھ اور اتر پردیش کے وزرائے اعلیٰ ہیم وتی نندن بہوگنا، نرائن دت تیواری، ملائم سنگھ اور دوسرے متعدد مرکزی و صوبائی وزرا اور کئی ریاستوں کے گورنر ان کے بوریائے فقر پر فروکش ہوتے رہے ہیں اور ہم جیسے مسلمان ان کی مجلسوں میں حاضر ہوکر اپنا ایمان و یقین تازہ کرتے ہیں تعال نومن ساعة۔ اگر ان کی سربراہی میں چلنے والا دنیائے اسلام کا یہ مقبول ادارہ ہی تشدد اور دہشت گردی کا اڈا بن جائے تو کجا ماند مسلمانی؟

گزشتہ ماہ دارالعلوم ندوۃ العلما کے بے گناہ طلبہ پر رات کے سناٹے میں پولیس نے گولیاں چلا کر انہیں زدوکوب کیا، گرفتار کیا اور ندوہ کی عمارت کو نقصان پہنچایا۔ اس سے ہندوستان ہی نہیں دنیا کے مسلمانوں کو شدید صدمہ پہنچا ہے، دراصل حکومت اور اس کی انتظامیہ نے مسلمانوں کی تذلیل و اہانت کا جو ناروا سلسلہ شروع کیا ہے یہ اسی کی ایک کڑی ہے، ابھی تک مسلمان بابری مسجد کی شہادت سے کراہ ہی رہے تھے کہ اس دوسرے سنگین حادثہ نے ان کو پھر نہایت بے قرار و بے چین کردیا، وہ سوچ نہیں سکتے تھے کہ ان کے اتنے باوقار، معتبر، صلح و آشتی، امن و امان اور انسانیت کے داعی و علمبردار ادارہ پر شب خون مارا جاسکتا ہے، اگر حکومت اور انتظامیہ کو مولانا سید ابوالحسن علی کی حب الوطنی پر بھروسہ نہیں اور وہ ان کے ساتھ دوسرے اور تیسرے درجہ کے شہریوں جیسا برتاؤ کرسکتی ہے تو عام مسلمان کس شمار قطار میں ہیں، انہیں بڑی سنجیدگی اور دور اندیشی سے اپنے بارے میں سوچنا اور اپنی اصلاح و تنظیم کا پروگرام بنانا ہوگا۔ حکومت کے لاعلمی کا عذر کردینے اور شرمندگی ظاہر کرنے یا معافی مانگ لینے سے مسلمانوں کی تشفی نہیں ہوسکتی۔ ان کی تسلی تو اس سے ہوگی کہ آئندہ اس طرح کے واقعات کا سدباب کرنے کے لیے ندوہ پر پولیس ایکشن کے ذمہ دار ہر ہر شخص کو عبرت ناک سزا دی جائے۔ (معارف دسمبر ۱۹۹۴ء)

ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل پر
مسلم کانفرنس کا اجلاس

ہندوستان میں مسلمانوں کے حالات روز بروز بدتر ہوتے جارہے ہیں، ان کی معاشی اور تعلیمی پس ماندگی کا چرچا ہر زبان پر ہے، لیکن کیا ان کی دینی و اخلاقی حالت کم ابتر ہے، ایمان میں کمزوری، عقیدے میں خلل اور مذہب سے بعد بڑھتا جارہا ہے، توحید خالص کا تصور کفر وشرک کے دھندلکوں میں گم ہوتا جارہا ہے۔ سماجی اور سیاسی حیثیت سے مسلمان نہایت بے وزن اور بے قیمت ہوگئے ہیں۔ سرکاری ملازمتوں، اعلیٰ عہدوں، ریاستی اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں ان کی نمائندگی بہت کم ہوگئی ہے، سیاسی جماعتیں ان کے ساتھ مسلسل مکاری اور فریب سے کام لیتی رہی ہیں اور ان کی کمزوری و مجبوری کی بنا پر ان کا استحصال کرتی رہی ہیں۔ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی، ان کے معابد اور شعائر دین کی توہین اور خود مسلمانوں کا تمسخر اور مذاق اڑانا ان کا شیوہ بن گیا ہے۔ اس صورت حال کی ذمہ داری سے گو مسلمان بھی بری نہیں ہیں تاہم ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور زیادتی میں حکومت کے رویے کو بڑا دخل ہے۔

مسلمانوں کو اپنی قومی پستی اور ملی زبوں حالی کا احساس ہے لیکن وہ اپنے مسائل کو سلجھانے کے لیے جو کوششیں بھی کرتے ہیں وہ رائیگاں جاتی ہیں، تاہم اسے بخت و اتفاق کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، مسلمانوں نے اپنے حالات و معاملات کی اصلاح کے لیے گوناگوں کوششیں کیں، کانفرنس اور اجتماعات کیے، انجمنیں اور ادارے قائم کیے۔ تحریکیں چلائیں اور جماعتیں بنائیں، تجویزیں منظور کیں اور منصوبے وضع کیے لیکن یہ سب باد حوادث کی نذر ہوگئے، نہ مسلمانوں کی حالت درست ہوئی اور نہ ان کا انتشار اور پراگندگی دور ہوئی، نیت کے فتور، ایثار و اخلاص اور محنت و لگن کی کمی نے انہیں پنپنے اور بڑھنے ہی نہ دیا یا ان کی کج اندیشی، بدتدبیری اور ناعاقبت بینی رکاوٹ بن گئی یا اغیار کی سازشوں نے ان کا گلا گھونٹ دیا، کچھ لوگ تو اپنی سادہ لوحی سے دوسروں کے دھوکے میں آگئے اور کچھ شعوری طور پر ان کے ہتھے لگ گئے، کچھ لوگوں کی خود غرضی، حقیر فائدہ اور سستی شہرت طلبی بھی مانع راہ ہوئی۔ بابری مسجد کی بازیابی کی تحریکیں بھی خود غرضی اور نفع اندوزی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھادی گئیں۔

اسی پس منظر میں ایک نئی آل انڈیا مسلم کانفرنس ۲۸و۲۹ جنوری کو کلکتہ میں بڑے اہتمام سے ہوئی، اس کے کنوینر جناب احمد سعید ملیح آبادی ایڈیٹر آزاد ہند اور مجلس استقبالیہ کے چیرمین جناب کلیم الدین شمس وزیر حکومت مغربی بنگال تھے۔ اس کا افتتاح آل انڈیا فارورڈ بلاک کے جنرل سکریٹری جناب چتو با سوایم۔ پی نے کیا اور پہلے روز کے جلسہ کی صدارت جناب سید مظفر حسین برنی سابق گورنر ہریانہ اور دوسرے روز کی صدارت پروفیسر علی محمد خسرو چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کی، جسٹس سردار علی خاں چیرمین قومی اقلیتی کمیشن مہمانِ خاص تھے، جموں و کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبداللہ، مرکزی وزیر غلام نبی آزاد، نیشنل کانفرنس کے چیرمین پروفیسر سیف الدین سوز، ممبر پارلیمنٹ جناب سید شہاب الدین اور پارلیمنٹ اور ریاستی اسمبلیوں کے متعدد ارکان کے علاوہ کرناٹک اور آندھرا پردیش کے بعض مسلم وزرا بھی کانفرنس میں شریک ہوئے۔

اس دو روزہ کانفرنس میں پانچ اہم تجویزیں منظور کی گئیں، سیاسی قرارداد میں کہا گیا ہے کہ مسلمان فرقہ پرستی کے خلاف سیکولرازم کی فضا بحال کرنے کے لیے آگے بڑھیں اور قومی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں، اقلیتوں کے لیے دستوری ضابطہ اور فلاحی پروگرام شروع کیے جائیں، بابری مسجد کو اصل جگہ تعمیر کیا جائے، ووٹر لسٹ سے خارج مسلمانوں کے نام دوبارہ درج کیے جائیں، فرقہ وارانہ فضا خراب کرنے والوں کے خلاف کارروائی کی جائے، مسلمانوں کی سماجی، معاشی اور تعلیمی ترقی پر توجہ دی جائے اور تعلیمی اداروں اور سرکاری ملازمتوں میں ان کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے ان کو ریزرویشن دیا جائے۔ خاص مغربی بنگال کے مسلمانوں کے لیے بھی سرکاری اور پبلک اداروں میں مناسب نمائندگی اور غریب و متوسط طبقوں کی رہائش کے بندوبست کا مطالبہ کیا گیا، کشمیر میں قتل و تشدد بند کیے جانے کے موثر اقدام پر زور دیا گیا اور اس کی خصوصی پوزیشن بحال کی جانے کی مانگ کی گئی۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ڈاکٹر فاروق عبداللہ کی سربراہی میں مسلم فورم کے قیام کا فیصلہ کیا گیا اور اس کی ایڈھاک کمیٹی کے ۱۳ رارکان کے ناموں کا اعلان بھی ہوا۔

کانفرنس میں مختلف طبقہ و مسلک کے لوگ شریک ہوئے جن کے خیالات یکساں نہیں تھے بلکہ بعض نے اپنی پارٹیوں اور لیڈروں کے گن گائے اور بعض نے خود اپنے کارنامے بھی گنائے تاہم سب نے اپنے اپنے انداز سے مسلمانوں کو پستی سے نکالنے اور عزت و وقار عطا کرنے کی بات

کہی اوران کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا اعتراف کیا اور ملک وملت کے مفاد پر مبنی تجویزوں کو اتفاق رائے سے منظور کیا، دعا ہے کہ جناب کلیم الدین شمس اور جناب احمد سعید ملیح آبادی جیسے دردمند اور فعال لوگوں کی یہ کوشش رائیگاں نہ جائے اور اس کا حشر دوسری کانفرنسوں اور تحریکوں جیسا نہ ہو بلکہ اس سے ملک وملت کی فلاح وبہبود کے ایک نئے دور کا آغاز ہو۔ (معارف فروری ۱۹۹۵ء)

ندوۃ العلما کے مقاصد

۱۶؍جولائی کو دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ جناب مولانا حکیم افہام اللہ صاحب کی صدارت میں ہوا جس میں ملک کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے ارکان نے شرکت فرمائی اور ان سطور کے راقم کو بھی یہ سعادت میسر آئی، اس میں ناظم ندوۃ العلما حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے اپنی رپورٹ میں ندوہ کے انتظامی وتعلیمی امور سے ہٹ کر ان خطروں سے بھی آگاہ فرمایا جو اس وقت دین وملت کو لاحق ہوگئے ہیں اور ان مسائل کی طرف بھی فاضل ارکان کی توجہ منعطف کرائی جو ہندوستان ہی نہیں دنیا کے مسلمانوں اور بالخصوص اسلامی ملکوں کو درپیش ہیں، مولانا کے یہ خیالات نہایت دردمندانہ اور اس قابل ہیں کہ مدارس کے ذمہ داران پر بڑی سنجیدگی سے غور کریں اور اس سلسلہ میں اپنا کلیدی کردار ادا کر کے اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کا سامان کریں۔

انہوں نے مدارس دینیہ اوران کے علما وفضلا کے تاریخی کردار کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا کہ مدارس نے ہمیشہ اپنے زمانے کے چیلنج کا سامنا کیا، وہ دراصل اسلام کے قلعے اور ملت کی نئی نسل کو ذہنی وفکری ارتداد اور تحریف وانحراف سے بچانے کے مرکز تھے، جہاں علم راسخ وایمان راسخ اور دین پر ثبات واستقامت کا جذبہ اوران کی علانیہ دعوت وتبلیغ کا ایسا مزاج بنتا تھا جو فضلائے مدارس کو دین کے کسی نقطہ وشوشہ سے دست بردار نہیں ہونے دیتا تھا۔ مدارس کے اسی شاندار کردار کی وجہ سے برصغیر میں دینی وملی تشخص باقی ہے، عقائد بڑی حد تک محفوظ ہیں، دین کے فرائض وارکان زندہ ہیں، مساجد آباد ہیں، حج وعمرہ اور عربی زبان اور علوم دینیہ کے ذریعہ جزیرۃ العرب اور حجاز مقدس سے ربط وتعلق قائم ہے۔

فضلائے مدارس کی سرگرمیاں ہندوستان ہی تک محدود نہیں تھیں بلکہ عالم اسلام بھی ان کے وسیع دائرے میں شامل تھا۔ تحریک خلافت، ترکوں کی حمایت اور جزیرۃ العرب کے تقدس کی حفاظت

ہی میں پیش پیش نہیں رہے بلکہ ہندوستانی علما نے صلیبی حملوں اور تشکیک و انتشار انگیز لٹریچر کا ایسا مقابلہ کیا جس کی مثال مسلمان اکثریت کے ملکوں میں بھی نہیں ملے گی۔ انھوں نے نہ کبھی بیرونی اسلامی ملکوں سے آنکھیں بند کیں اور نہ وہاں سے اٹھنے والے فتنوں، تشکیکی حملوں، الحاد و لادینیت اور قومیت عربیہ کی خطرناک اور بعید نتائج رکھنے والی مخالف اسلام دعوت کو نظر انداز کیا، اس سلسلے میں بطور واقعہ ندوۃ العلما کے امتیاز و تفوق اور ان بیرونی فتنوں کا نوٹس لینے میں فضلائے ندوہ کی سبقت و تقدم کا ذکر کیا جو مرکز اسلام میں ارتیاب و تزلزل پیدا کرنے والے بلکہ نصرانیت، یہودیت اور لادینیت کے لیے راستہ کھولنے والے تھے۔

مدارس دینیہ کا تاریخی جائزہ لینے کے بعد مولانا نے اس دور کی ریشہ دوانیوں اور ان الحادی و ارتدادی کوششوں کا ذکر کیا جو اسلامی ممالک اور ممالک عربیہ کو اسلامی و دینی حمیت و غیرت سے محروم کرنے کے لیے شروع کی گئی ہیں، اس سلسلے میں اسلام کی بیخ کنی اور اس سے ہمیشہ کے لیے چھٹی پانے کی کوشش میں یہودی دماغ و شطارت اور مسیحی طاقت و اقتدار کے ہم نوا اور دمساز بن جانے کا تذکرہ کیا اور اس کا یہ نتیجہ بتایا کہ ممالک عربیہ میں دین کی حمیت اور اسلام پر افتخار، جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں کمزور و نادار اور صاحب اقتدار طبقہ میں معدوم و مفقود ہو گیا ہے، لادینیت، تشکک اور ارتیاب سے نفرت اور جذبہ جہاد اور شوق شہادت تو در کنار ان چیزوں سے استنکاف ہو گیا ہے اور مغربی تہذیب و اقتدار سے بیزاری اور ان سے آزاد ہونے کی سعی و جہد بھی ختم ہوتی جا رہی ہے، حکومتوں کا رخ آزادی و نامذہبیت کی طرف ہوتا جا رہا ہے، بعض عرب ملکوں میں دین و اہل دین سے کھلی محاذ آرائی ہے، ترقی یافتہ عرب ملکوں میں صاحب اقتدار طبقہ اور جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے حالات سخت، دل خراش اور باعث شرم ہیں اور یہ ناپسندیدہ اثرات خلیج کی ریاستوں، کویت، بحرین وغیرہ اور کسی حد تک (خاکم بدہن) سعودی عرب میں پہنچ رہے ہیں۔

اس کے تدارک کے لیے مولانا نے مدارس عربیہ کے ذمہ داروں کو سنجیدگی سے غور کرنے اور مدارس میں عربی زبان کی تعلیم کے معیار کو بلند کرنے پر زور دیا تا کہ ان کے فضلا اسلامی ممالک میں تقریر و تحریر کے ذریعہ دعوت دین کا کام کر سکیں اور وہاں کے نوجوانوں، دانشوروں اور صاحب اختیار طبقہ کو متاثر کر سکیں، اسی کے ساتھ انھوں نے اپنے ملک میں ہندو احیائیت کی زبردست اور

خطرناک تحریک کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی فضلائے مدارس کو تیار ہونے اور رہنے کی دعوت دی جس کا مقصد اس ملک کو اسپین بنانا ہے تاکہ یہاں صرف ایسے نسلی مسلمان رہ جائیں جن کی تہذیب و معاشرت، عائلی قانون اور اعتقادی سانچہ بدل جائے اور وہ ہندو میتھالوجی کو قبول کرلیں، یہ خطرناک صورت پیدا کرنے کے لیے نصاب تعلیم، ذرائع ابلاغ اور سیاسی اثرات سے کام لیا جارہا ہے، مولانا نے جن خطروں سے آگاہ فرمایا ہے ان سے عام لوگ بھی واقف ہوں گے مگر مدارس کے موجودہ حالات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں، یہاں ان پر تبصرہ کرنے کا موقع نہیں، صرف یہ عرض کرنا ہے کہ وہ حالات کی نزاکت کو محسوس کرکے اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں۔

مولانا علی میاں نے اپنے خطبہ میں یہ بھی واضح کردیا ہے کہ ندوۃ العلما کی غرض و غایت یہی تھی اس لیے موجودہ دور کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی ندوہ کو آگے آنا ہوگا اور مخالفتوں سے بے پروا ہوکر تمام مدارس کی رہنمائی اور قیادت کرنی ہوگی، ندوہ کے ابتدائی دور میں علامہ شبلیؒ اس تحریک کے سب سے زیادہ پرجوش اور سرگرم حامی تھے اور گو اس وقت ان کو ارکان ندوہ کے ایک گروہ کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا مگر ان کی وفات کے بعد ان کی تحریک کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔ ان کا خاص مطمح نظر یہ تھا کہ وہ اپنے سامنے اور اپنے بعد بھی علما کا ایک گروہ ایسا چھوڑ جائیں جو وقت کے چیلنج کا مقابلہ کرے اور نئے زمانے میں اسلام کی ضرورت کو پوری کرتا رہے، اس کے لیے انہوں نے پُرزور مضامین لکھے اور پُرجوش تقریریں کیں جن میں ندوۃ العلما کی ضرورت و اہمیت اور غرض و غایت بیان کرتے ہوئے واضح کیا کہ عربی تعلیم کا پرانا نصاب محتاج اصلاح ہے، ہمارے علما کو نئے زمانے کی نئی ضرورتوں کا احساس ہونا چاہیے تاکہ وہ وقت کے چیلنج کا جواب دے سکیں۔

ندوۃ العلما کی تحریک کے آغاز سے پہلے ہی ان کو اس ضرورت کا احساس اچھی طرح ہوگیا تھا اور جب روم و مصر و شام تشریف لے گئے تو انہیں اس کا احساس اور شدت سے ہوا، چنانچہ اپنے سفرنامہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں ''اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کردیتا تھا وہ اسی قدیم تعلیم کی ابتری تھی، یہ مسئلہ آج کل ہندوستان میں بھی چھڑا ہوا ہے اور تعلیم قدیم کی ابتری پر عموماً رنج و افسوس کیا جاتا ہے لیکن میرا افسوس دوسری قسم کا تھا، ہمارے ملک کے نئے تعلیم یافتہ پرانی تعلیم پر جو رنج اور افسوس کرتے ہیں وہ درحقیقت رنج نہیں بلکہ استہزا اور شماتت ہے،

میں اگرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومیت قائم رہنے کے لیے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے، اس کے ساتھ جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ تعلیم جس طریقہ سے جاری ہے وہ بالکل بے سود و بے معنی ہے تو خواہ مخواہ نہایت رنج ہوتا ہے''۔ اسی لیے ندوۃ العلما کی تحریک ان کے دل کی آواز بن گئی اور وہ اس میں اس قدر جوش و اخلاص سے شریک ہوئے کہ سب پر چھا گئے، آج اگر تعلیم کو سودمند اور بامعنی بنانا ہے تو ایسے باخبر علما ہونے چاہئیں جو نئے فتنوں کا نوٹس لیں اور وقت کے چیلنج کا جواب دیں اور اسلام کی حقانیت و صداقت کو مدلل طور پر ثابت کرسکیں۔ (معارف اگست ۱۹۹۵ء)

اردو کی صورت حال

آزادی کے بعد ہی سے اردو تعصب اور تنگ نظری کا شکار رہی ہے، سب سے زیادہ اردو دشمنی کا مظاہرہ اتر پردیش میں ہوا جو اردو کا سب سے بڑا مرکز تھا، یہاں چاہے کانگریسی حکومتیں برسرِ اقتدار رہی ہوں یا غیر کانگریسی، سب کا رویہ اردو کے بارے میں یکساں معاندانہ اور جارحانہ رہا ہے۔ یہ سب اردو کو مٹانے اور اسے نیست و نابود کردینے کے درپے رہیں، حکومت کے ذمہ دار اردو کا گن گاتے اور اس کی شان میں لچھے دار تقریریں بھی کرتے رہے اور اس کا گلا بھی گھونٹتے رہے، اردو کے انہیں قصیدہ خوانوں نے آج اردو کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں آنجہانی ڈاکٹر سمپورنا نندا سے پہنچانا چاہتے تھے، چنانچہ اردو دشمنی کے اس ماحول میں سب کے علی الرغم اور پچھلے تمام وزرائے اعلیٰ کی روش کے برخلاف اتر پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ بابو ملائم سنگھ یادو نے اردو کو اس کا جائز اور جمہوری حق دینے کا انقلابی اور جرأت مندانہ اقدام کیا جس کی حامی موجودہ وزیر اعلیٰ مس مایاوتی بھی تھیں اور اب بھی ہیں تو اردو پڑھنے والے عنقا ہوگئے ہیں اور اردو والوں کو اردو کے جس اچھے دن کا انتظار تھا، اب گو اس کے آثار پیدا ہوئے ہیں مگر

راز ہے بہت گہرا، بات اک ذرا سی ہے وہ ہیں سامنے پھر بھی چشمِ شوق پیاسی ہے

اردو اساتذہ اور مترجمین کے تقرر میں ہونے والی بدعنوانیوں کے نتیجے میں اہل اور لائق افراد کے بجائے بے صلاحیت اور نااہل لوگوں کا تقرر اردو دوستی میں نہیں ہے، سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم کے معیار کی پستی سے کون واقف نہیں ہے، اس کے مقابلے میں مدارس اور عربی

درسگاہوں کا معیار بہت بلند ہے جس کا اعتراف سب کو ہے، اس لیے ان مدارس اور عربی درسگاہوں میں تعلیم پانے کے بعد جو طلبہ ہائی اسکول اور انٹر کیے بغیر براہ راست بی۔اے اور ایم۔اے اردو میں کرتے ہیں یا ادیب ماہر اور ادیب کامل ہوتے ہیں، اردو میں ان کی استعداد سرکاری درسگاہوں کے انٹر پاس طلبہ سے بدرجہا اچھی اور بہتر ہوتی ہے، ایسی صورت میں انتظامیہ اور عدلیہ کو اردو معلمین و مترجمین کے تقرر میں انٹر کی تعلیم کو معیار بنانا اور اس سے بہتر اور اچھے معیار کو نظر انداز کرنا کسی طرح مناسب نہیں، حکومت کو بھی آفتاب سے زیادہ روشن اس حقیقت کو جاننا اور سمجھنا چاہیے اور اردو اساتذہ و مترجمین کے تقرر میں محض انٹر کی قید ختم کر دینی چاہیے اور ان لوگوں کے تقرر میں لیت و لعل نہیں کرنا چاہیے جو انٹر کے مساوی بلکہ اس سے اونچی ڈگری بھی رکھتے ہیں اور انٹر والوں سے اچھی اور بہتر صلاحیت کے حامل بھی ہیں، اتر پردیش کی حکومت اگر اردو کے مقابلے میں نیک نیت ہے تو اسے انٹر کے مساوی اور اس سے اونچے معیار کی تعلیم پائے ہوئے اردو معلمین و مترجمین کی تنخواہیں روک کر انہیں پریشان کرنے والے سرکاری حکام کی سرزنش سختی سے کرنی چاہیے۔

اردو کا مسئلہ حکومت سے زیادہ خود اردو والوں سے جڑا ہوا ہے، اردو کے تحفظ و بقا کی اصل ذمہ داری ان ہی پر عائد ہوتی ہے جس سے وہ پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہو رہے ہیں، اس میں شبہہ نہیں کہ انہوں نے اردو کا جائز اور جمہوری حق دلانے کے لیے پُرزور مطالبے کیے، بہت سی تحریکیں چلائیں، اس کے مقدمہ کو پوری قوت اور دلائل سے پیش کیا، اردو کے حق میں فضا بنانے کے لیے پُرجوش نعرے لگائے لیکن یہ ساری جدوجہد دفاعی نوعیت کی اور اردو کے مخالفوں کے جواب میں کی گئی کسی نے پیچھے مڑ کر یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اردو کی تعلیم کا رواج کم ہوتا جارہا ہے، اس کا حلقہ سمٹتا جارہا ہے، پرائمری اور سکنڈری اسکولوں اور خود اردو والوں کے گھروں سے اردو غائب ہوتی جارہی ہے، ان کے اپنے بچے ہی مادری زبان میں تعلیم حاصل نہیں کر رہے ہیں، وہ خود تو اردو کی محبت میں دیوانہ رہتے ہیں مگر ان کے بچے اس کی تعلیم سے محروم ہیں، آج جب اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کے لیے اردو ٹیچر اور مترجم مقرر کیے جارہے ہیں تو اردو کے لیے چیخ و پکار کرنے والوں کے بچے انگلش میڈیم، نرسری اور کے جی اسکولوں میں داخلے لے رہے ہیں، آخر پرائمری اسکولوں میں طلبہ ہی نہ ہوں گے تو اردو ٹیچر کس کو پڑھائیں گے، دفتروں اور کچہریوں میں اردو میں درخواستیں نہیں

دی جائیں گی تو مترجم موجود رہ کر کیا کرے گا، پھر ان کو دوسرے کاموں میں لگائے جانے کا شکوہ کیوں؟ جلد ہی وہ وقت آئے گا جب یہ کہہ دیا جائے گا کہ اردو ٹیچروں اور مترجموں کا کام ہی نہیں ہے اس لیے ان کا تقرر غیر ضروری ہے۔

جو لوگ اردو کے اجارہ دار بنے ہوئے ہیں اور جن کے ہاتھوں میں اردو کے سرکاری و نیم سرکاری اداروں کی زمام کار ہے جو سچ مچ اردو ہی کی روٹی توڑ رہے ہیں اور اسی کی بدولت وہ بڑے بڑے عہدوں پر متمکن ہیں اور ہر قسم کے اعزاز و انعام سے نوازے جا رہے ہیں، کیا وہ اپنی تن آسانی اور راحت طلبی کو ترک کرنا اور اپنی روش پر نظر ثانی کرنا پسند کریں گے؟ کیا وہ اپنا ہی بھلا کرتے رہیں گے یا اردو کا بھی کچھ بھلا کریں گے، کیا وہ اردو کا استحصال ہی کرتے رہیں گے یا اس کے فروغ و ترقی کا بھی کچھ سامان کریں گے؟ کیا وہ اپنے اعزاز و انعام ہی سے سروکار رکھیں گے یا اردو کے لیے کوئی ایثار و قربانی بھی کریں گے؟ کیا وہ اردو کے نام پر ملنے والے فتوحات و غنائم سے متمتع ہونے اور اکیڈمیوں کے ذریعہ بندر بانٹ کرنے ہی میں لگے رہیں گے یا اردو کے بنیادی اور اصلی مسائل پر بھی توجہ دیں گے؟ وقت آ گیا ہے کہ وہ اس کی منظم تحریک چلائیں کہ لوگ اپنے بچوں کو اردو پڑھائیں اور ان سے پہلے وہ خود اپنے گھروں میں اردو کو رواج دیں، اپنے بچوں کو انگلش میڈیم میں بھیجنے کے بجائے ان اسکولوں میں بھیجیں جہاں اردو کی تعلیم ہو رہی ہو، دفتروں میں خود بھی اردو میں درخواستیں دیں اور دوسروں سے بھی دلائیں، اردو میں خطوط اور پتے لکھنے کی خود عادت ڈالیں اور دوسروں کو بھی اس کا عادی بنائیں، اس میں جو لوگ مزاحم ہوں ان سے آئینی طور پر برسرِ پیکار ہو جائیں اور یہ یاد رکھیں کہ اگر اردو نہ ہوگی تو ان کی بھی پرسش اور پذیرائی نہ ہوگی۔

ابھی یہ سطریں زیر تحریر ہی تھیں کہ اردو کے ایک کرم فرما کا جو خیر سے ترقی اردو بیورو کے نائب چیرمین بھی ہیں، ایک انٹرویو اخباروں میں نظر سے گزرا کہ ہندوستان میں اردو زوال پذیر نہیں ہوئی ہے، اگر زوال آیا ہے تو خواص کی زبان میں، اگر اردو کو آسان کر دیا جائے تو تیزی سے اس کی ترقی ہوگی، اس کا نسخہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس کے رسم الخط کو آسان بنایا جائے، خیریت یہ ہوئی کہ رسم الخط تبدیل کرنے پر زور نہیں دیا گیا، اسی سلسلے میں اردو کے ہم صوتی حروف حذف کر دینے کے بارے میں بھی ارشاد ہوا ہے، کاش اردو کے ٹھیکیدار اور ذمہ دار ایسے گمراہ کن بیانات دے کر اردو کی شناخت

اس کے تشخص اور اس کی خصوصیات و امتیازات کو ختم کرنے سے باز رہتے۔ (معارف ستمبر ۱۹۹۵ء)

بابری مسجد کی شہادت اور ہمارا ردعمل

مسلمانوں کے لیے دسمبر کا مہینہ غم و الم کا مہینہ بن گیا ہے، ٦ دسمبر کی تاریخ آتی ہے تو ان کا زخم ہرا ہوجاتا ہے اور بابری مسجد کی یاد تازہ ہوجاتی ہے اور وہ اس روز یوم غم مناتے ہیں، اس سال بھی بعض لوگوں نے بابری مسجد کی تیسری برسی منانے اور احتجاج کر کے مروجہ طریقے اختیار کیے، یعنی بازوؤں پر کالی پٹی باندھنے، گھروں پر سیاہ جھنڈے لگانے اور جلسے جلوس کر کے قراردادیں پاس کرنے کا فیصلہ کیا۔ کیرالا کے بعض پُرجوش لوگوں نے اجودھیا کی طرف مارچ کا پروگرام بھی بنایا تا کہ شہید بابری مسجد کی جگہ پر نماز ادا کریں۔ بلاشبہہ بابری مسجد اور اس کی لپیٹ میں اجودھیا کی کئی اور مسجدوں کی شہادت کا واقعہ نہایت غیر معمولی، سخت جاں گسل اور بڑا روح فرسا ہے جس کو بھلایا نہیں جاسکتا، لیکن غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ کیا نوحہ و غم کے اظہار، آہ و فریاد اور نالہ و شیون کرنے سے کوئی بات بن سکتی ہے؟ یا ہنگامہ و احتجاج کے پٹے پٹائے طریقے اختیار کرنے سے بابری مسجد دوبارہ تعمیر ہوسکتی ہے؟ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس طرح کے احتجاج کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ کہیں یہ سب طریقے دوسروں کے تشبّہ کے ضمن میں تو نہیں آتے۔

عموماً ان اوچھے طریقوں کا اعلان جن لوگوں کی جانب سے ہوتا ہے، ان کی سوجھ بوجھ، بصیرت اور معاملہ فہمی بھروسہ کے قابل نہیں ہوتی، یہ لوگ غیر ذمہ دارانہ بیان دے کر خود پیچھے رہ جاتے اور غائب ہوجاتے ہیں مگر ان کے بیان کی ہلچل سے فضا گرم ہوجاتی ہے اور سادہ لوح لوگ مشتعل اور بے قابو ہوجاتے ہیں جس کا انہیں زبردست خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے، اس سے فرقہ پرستوں کی بھی بن آتی ہے جو اس طرح کے مواقع کی تاک میں رہتے ہیں تا کہ ہنگامہ و فساد کر کے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلیں۔ یہ بھی بعید نہیں ہے کہ خود فرقہ پرست اور شر پسند لوگ ہی مسلمانوں کے ہمدرد بن کر ان کے ناعاقبت اندیش اور بے بصیرت لوگوں کو غیر ذمہ دارانہ اور ہلچل مچادینے والے بیان دینے پر آمادہ کرتے ہوں، بات جو بھی ہو مسلمانوں کو ایسے لاطائل، بے سود اور بے نتیجہ اقدامات کر کے اپنی تباہی کا سامان خود نہیں کرنا چاہیے، ان اوچھے طریقوں سے الٹے وہ نقصان اٹھاتے اور مزید پسپا اور کمزور ہوتے ہیں اور دوسرے فائدہ اٹھاتے اور طاقتور ہوتے ہیں، ماتم و شیون اور فریاد و

احتجاج بیدار مغز قوموں کا شیوہ و دستور نہیں، زندہ قومیں گزشتہ واقعات سے سبق حاصل کرتی ہیں، ماضی کی تاریکیوں سے حال و مستقبل کے لیے روشنی حاصل کرتی ہیں، تخریب سے تعمیر کی راہیں نکالتی ہیں، خرابی سے خوبی اور ناکامی سے کامرانی کی منزلیں طے کرتی ہیں اور جوشِ عمل سے سرشار ہو کر یہ کہتی ہیں:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں

بابری مسجد کی شہادت مسلمانوں کو اس امر کی دعوت دیتی ہے کہ وہ سوچیں اور غور کریں کہ کیا اسباب و حالات تھے کہ ان کی پانچ سو برس قدیم مسجد ڈھادی گئی اور وہ اس کا تحفظ تو درکنار، اس کے لیے فریاد و احتجاج کرنے کے قابل بھی نہیں رہے، حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ دوسروں کو الزام دینے کے بجائے وہ اپنے ہی کو مورد الزام قرار دیں اور واقعہ یہ ہے کہ دوسروں کی جارحیت اور ظلم و تعدی سے زیادہ مسلمانوں کی کمزوری اور کوتاہی کی وجہ سے مسجد شہید ہوئی، افسوس اور سخت افسوس ہے کہ اس عظیم الشان حادثہ کے بعد بھی مسلمانوں نے کوئی سبق نہیں لیا، اب بھی ان کی غفلت، سرمستی خود فراموشی اور خدا فراموشی کا وہی حال ہے، وہ نہ اپنے حالات و معاملات کی اصلاح کے لیے فکرمند ہوئے اور نہ انہیں اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی تلافی کا کوئی خیال ہو رہا ہے، بابری مسجد کی بازیابی کے لیے ان کی نگاہیں ملک کی سیاسی جماعتوں کی جانب اٹھتی ہیں لیکن اس خدائے حیی و قیوم کی جانب وہ نگاہ غلط انداز بھی ڈالنا گوارا نہیں کرتے جس کے قبضۂ قدرت میں یہ پوری کائنات ہے اور جس کی مرضی کے بغیر دنیا کا ایک پتہ بھی حرکت نہیں کرتا، اپنی صلاح و فلاح کے منصوبے بنا کر اپنی قوت و طاقت کو بڑھانے کے بجائے اپنے اختلاف و انتشار کو بڑھا کر اپنی ہوا خیزی کر رہے ہیں، کیا عجب بات ہے کہ جو چیز خود ان کے پاس موجود ہے، اس کی طلب دوسروں سے کر رہے ہیں۔

سالہا دل طلبِ جام جم از ما می کرد — آنچہ خود داشت ز بیگانہ تمنا می کرد

(معارف دسمبر ۱۹۹۵ء)

دارالمصنّفین

اشخاص و افراد کی طرح اداروں اور تحریکوں کو بھی اتار چڑھاؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر

ان کی بنیاد اخلاص اور نیک نیتی پر ہو اور ان کے کارکنوں میں حوصلہ اور جوش عمل ہو تو سرد و گرم حالات کا کوئی اثر ان پر نہیں پڑتا بلکہ دشواریاں اور مشکلات ان کی قوت عمل کو بڑھا دیتی ہیں اور طوفان برق و باد میں ان کے دست و بازو اور مضبوط اور توانا ہو جاتے ہیں

بال و پر کو میرے اس طوفان برق و باد میں   لطف جو آتا ہے کیا جانے اسے مرغ سرا

دارالمصنّفین نے اپنی ہشتاد (۸۰) سالہ زندگی میں اسلامی علوم و فنون، اپنے ملک کی تاریخ و ثقافت اور اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں ملک و بیرون ملک کے انصاف پسند اصحاب علم و نظر کو ان کا اعتراف ہے، گو اس طویل مدت میں اسے بھی نشیب و فراز سے گزرنا پڑا لیکن اس کے بانی کے اخلاص و حسن نیت اور کارکنوں کے جذبہ ایثار و قربانی کی وجہ سے لیل و نہار کی گردشیں اور راہ پُرخطر کے جھٹکے اور ٹھوکریں اس کے بڑھتے ہوئے قدم کو نہ روک سکیں۔

تقسیم کے بعد دارالمصنّفین پر بڑا سخت وقت آیا اور اسے شدید دھکہ لگا، مسلم دشمنی اور اردو کشی کے طوفان میں اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا گئے، ادارے اور تحریکیں دم توڑنے لگیں۔ اس کے کچھ ہی برس بعد مولانا سید سلیمان ندوی اور ان کے علمی دست راست مولانا عبدالسلام ندوی کا وقت موعود آ گیا اور مہتمم مولانا مسعود علی ندوی کے اعضا و قویٰ بھی مضمحل ہو گئے، مگر تقسیم کی ہولناکیوں سے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمان برآمد ہوئے اور انہوں نے نہ صرف دارالمصنّفین کی کشتی کو منجدھار سے نکالا بلکہ اس کی ترقی و استحکام کا سامان بھی کیا۔ ان کے آگے پیچھے وفات پا جانے سے دارالمصنّفین پر پھر کوہ غم ٹوٹ پڑا لیکن اس وقت ادارہ کی خوش قسمتی سے ادارہ کی سرپرستی و سربراہی کے لیے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ اور اس کے دیدہ ور اور ذی بصیرت ارکان موجود تھے، انہوں نے دارالمصنّفین کا نیا نظام تشکیل دیا اور جناب سید شہاب الدین دسنوی اس کے معتمد مقرر ہوئے جو متعدد اداروں کو کامیابی سے چلانے کا تجربہ رکھتے تھے اور اس ناتواں کو علمی شعبہ سپرد کیا گیا جس کی کم مائیگی کے باوجود اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تائید، حضرت مولانا کی دعائیں اور موقر ارکان کی ہمت افزائیاں تھیں، حسن اتفاق سے ہم دونوں کی معاونت کے لیے شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کے سابق وائس پرنسپل اور شعبۂ تعلیمات کے صدر جناب عبدالمنان ہلالی میسر آ گئے جو اپنی شرافت، ایمانداری، خوش انتظامی اور جذبۂ خدمت و ایثار کے لیے مشہور ہیں۔

ہر ادارے کے کچھ واقعی ہمدرد اور بہی خواہ ہوتے ہیں جن کو اس کی ترقی و استحکام سے خوشی ہوتی ہے، وہ اپنی کوششوں اور مشوروں سے ادارے کے صلاح و فلاح اور نیک نامی کا سامان کرتے ہیں اور اس کو تخریب، تباہی اور بدنامی سے بچاتے ہیں، اسی طرح بعض لوگوں کو اس کی فلاح و ترقی سے دکھ ہوتا ہے اور وہ مسلسل اس کی تخریب، تباہی اور بدنامی کا سامان کیا کرتے ہیں اور ہمیشہ اس کے نقصان کے درپے رہتے ہیں، دارالمصنّفین کو بھی ابتدا ہی سے دونوں طرح کے لوگوں سے سابقہ رہا، لیکن الحمدللہ پہلے بھی اور اب بھی اس کے قدردانوں اور خیرخواہوں کا حلقہ بہت وسیع رہا ہے اور ان کے مقابلے میں بدخواہوں اور مخالفوں کا طبقہ بہت کم۔ آج کل فانا ایجنسی سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب سرگرم ہو گئے ہیں جو ابھی سبزہ نورس اور علمی و ذہنی حیثیت سے ناپختہ ہیں، انہوں نے بعض اردو اور انگریزی اخباروں میں دارالمصنّفین کے متعلق ایک مضمون لکھ کر اس کے محسنوں، ہمدردوں اور خیرخواہوں میں بداعتمادی اور نفرت پیدا کرنی چاہی ہے، اگر وہ نیک جذبہ اور اخلاص سے کچھ مفید مشورے دیتے تو ہم ان کے شکرگزار ہوتے۔ انہوں نے اپنے خیال کے مطابق دارالمصنّفین کی جو تصویر پیش کی ہے اور اس کے جو صحیح و غلط اسباب و عوامل بتائے ہیں اسی کے ساتھ ان کی ہمدردی یا معروضیت کا تقاضا یہ بھی تھا کہ وہ یہ بتاتے کہ ہندوستان کے بدلے ہوئے حالات میں دارالمصنّفین موانع کے باوجود جو کچھ کر سکتا ہے وہ کر رہا ہے یا نہیں؟ اس کے اور معارف کے معیار و مقدار کی بات ملک و بیرون ملک کے ان اصحاب علم و دانش کے حوالے سے کیجئے جو بالالتزام اس کا ایک ایک لفظ پڑھتے ہیں، ہمارے پاس چوٹی کے اہل قلم کے خطوط موجود ہیں جن کو اس لیے شائع نہیں کیا جاتا کہ اسے خودستائی پر محمول کیا جائے گا، مضمون نگار اگر مسلمانوں کے دوسرے علمی و تعلیمی اداروں کا جائزہ بھی اسی انداز سے لیں گے تو وہ سب ہی کو زوال کا شکار نہ ہوتے ہوئے بھی زوال کا شکار کر دیں گے، ان کی طبیعت میں اگر دردمندی ہے تو وہ خود سوچیں کہ اس طرح کے مضامین لکھ کر وہ مسلمانوں کے اداروں کی کوئی خدمت کریں گے یا انہیں نقصان پہنچائیں گے۔

ہمیں اس وقت اپنے ایک کرم فرما یاد آ گئے جو دارالمصنّفین کی آمدنی کے غم میں دبلے ہو رہے ہیں، ان کے کہنہ مشق صحافی ہونے کا علم تو پہلے سے تھا مگر مفتی و محتسب ہونے کی خبر اب ہوئی ہے، دارالمصنّفین کے معاملے میں انہوں نے افتا و احتساب دونوں کا منصب سنبھال لیا ہے، یہ چاہے

جو بھی ہوں لیکن اصول دعوت کے اس بنیادی نکتہ سے نا آشنا ہیں کہ انذر عشیرتك الاقربین۔ کیا دلی کے جس انسٹی ٹیوٹ یا جس تنظیم و کونسل کے پلیٹ فارم سے وہ اکثر گل افشانی گفتار فرماتے رہتے ہیں ان کی رقوم اور پٹرو ڈالر کے بارے میں بھی کبھی ان کے ذہن و ضمیر سے کوئی صدا اٹھی یا وہ دارالمصنّفین ہی کو مچھر چھاننے کی تلقین فرماتے رہیں گے، تلك اذاً قسمةٌ ضیزیٰ۔ ان سے یہی کہا جا سکتا ہے ؎

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ان کرم فرما کی آواز پر بعض پُر جوش نوجوانوں نے بھی لبیک کہا ہے، جنھیں شکوۂ بے جا کا ڈھنگ بھی نہیں آتا اور جن کی معراج بس عرب ملکوں میں پہنچ جانا ہے، ان کی حقیقت اس سے ظاہر ہے کہ وہ دارالمصنّفین کو ایک کاروباری ادارہ سمجھتے ہیں اور اسی حیثیت سے وہ اس کا مقابلہ دلی کے ناشروں اور پبلشروں سے کرتے ہیں ع

ننگ ہے صید زبوں ہمت عالی کے لیے

اپنے ان کرم فرماؤں سے اعراض بہتر تھا لیکن یہ سطریں طبیعت پر جبر کر کے دارالمصنّفین کے ان خیر خواہوں کے اطمینان و انشراح کے لیے لکھی جا رہی ہیں جن کو اس طرح کے مضامین اور مراسلوں سے خواہ مخواہ تشویش اور غلط فہمی ہو گئی ہے، ان کو صورت حال سے باخبر رکھنے کے لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ گو دارالمصنّفین کا عہد شباب نہیں رہا لیکن معمول کے مطابق اس کا سفر جاری ہے، ہماری مشکلات رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہیں، طباعت کے وہ مسائل بھی حل ہوتے جا رہے ہیں جن کی وجہ سے نئی کتابوں کی اشاعت کا اوسط کم رہا، تاہم جو کتابیں عرصہ سے ختم ہو گئی تھیں ان کے نئے ایڈیشن نکلے ہیں، جن میں سیرۃ النبیؐ حصہ اول کا صحیح ایڈیشن بھی ہے، اب ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ پرانی کتابوں کے نئے ایڈیشن بھی شائع ہوں گے اور انشاء اللہ دو تین نئی کتابیں بھی ہر سال چھپیں گی، وما توفیقی الا باللہ العظیم۔ اصل مسئلہ مناسب افراد کی فراہمی ہے، جو لوگ واقعی کار آمد ہیں وہ اعظم گڑھ جیسی پسماندہ جگہ میں رہ کر یہاں کی مشقتیں نہیں جھیل سکتے، افراد کی تربیت کا کام بھی نہیں ہو رہا ہے کیونکہ طلبہ محنت، مطالعہ، صبر آزما اور پتہ مار کام کرنے کے عادی نہیں رہے، ذہین اور ہونہار طلبہ کے لیے خدا کی زمین نہایت وسیع ہو گئی ہے۔ یہ دارالمصنّفین کے رفقا ہی ہیں جو

مضامین اور کتابیں بھی لکھتے ہیں، کاپیاں اور پروف بھی پڑھتے ہیں اور قدیم مطبوعات کی غلطیوں کی تصحیح بھی کررہے ہیں اور پورے ملک سے آنے والے خطوط و استفسارات کا جواب بھی دیتے ہیں، یہ طنز و تعریض کے بجائے تحسین و آفریں کے مستحق ہیں لیکن ان کے ایثار، قربانی اور قناعت پسندی کا اندازہ بمبئی اور دہلی کی ٹھنڈی فضاؤں میں بیٹھنے والے اور پٹرو ڈالر کے متوالے نہیں کرسکتے ع

کجا دانند حالِ ما سبکسارانِ ساحلہا

(معارف مارچ ۱۹۹۶ء)

اردو رسم الخط

اردو کو اپنا رسم الخط چھوڑ کر دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے کا مشورہ بہت پرانا ہے جو وقفہ وقفہ سے دہرایا جاتا اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اس میں اردو کا سراسر مفاد اور بھلائی ہے، اس کی وجہ سے اردو کی نہایت قدآور شخصیتوں کو بھی مغالطہ ہوجاتا ہے اور ان کی نظروں سے اس ''خیرخواہانہ مشورے'' کی مضرتیں اوجھل ہوجاتی ہیں، اب اس پر بھی اخلاص، ہمدردی اور خیرخواہی کی یہ ملمع کاری کی گئی ہے کہ اردو کے تحفظ و بقا اور اس کی وسعت و ترقی کے لیے اس کی کتابوں، رسالوں اور اخباروں کو اردو کے ساتھ ہی دیوناگری رسم الخط میں شائع کرنا ضروری ہے۔ اس ہمدردانہ مشورہ کا جادو اردو کے ایک بڑے شاعر اور صاحب قلم پر چل گیا ہے اور وہ اردو کو وسیع تر حلقوں تک پہنچانے کے جھانسے میں آگئے ہیں اور اس کے نتائج و عواقب پر غور کیے بغیر اس کی ہم نوائی کرنے لگے ہیں، اس پر اردو والوں نے دارو گیر کی تو وہ پیچ و تاب کھانے لگے اور غلطی تسلیم کرنے کے بجائے اس کی تاویل کرنے لگے اور یہ حقیقت فراموش کر بیٹھے کہ مغلوب و مفتوح زبان کو غالب و فاتح زبان میں ضم کرنے اور اردو کے وجود و تشخص کو ختم کرنے کی یہ بھی ایک حکمت عملی اور گہری سازش ہے، جسم و جان کا رشتہ ختم ہوجانے کے بعد بھی جسم کو باقی اور زندہ سمجھنا خوش فہمی اور سادہ لوحی ہے۔

کسی زبان کے لیے اس کے لیے اس کے رسم الخط کی اہمیت کا اندازہ کرنے کے لیے ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو کی یہ تحریر پیش نظر رکھنی چاہیے۔

''رسم خط کی تبدیلی کی مخالفت محض جذباتی لگاؤ کی وجہ سے نہ ہوگی، شاندار ماضی رکھنے والی کسی بھی زبان کے لیے رسم خط کی تبدیلی بہت بڑی تبدیلی ہوگی کیونکہ رسم خط اس کے ادب کا اہم ترین

اور عزیز ترین جز بن جاتا ہے، رسم خط کو بدل دیجیے تو صفحۂ قرطاس پر نئی صورتیں نمودار ہونے لگیں گی، یہ نئی صورتیں نئے خیالات اور نئی آوازوں کی حامل ہوں گی، قدیم اور جدید ادب کے درمیان ایک ناقابل عبور دیوار کھڑی ہو جائے گی، قدیم ادب اور قدیم زباں دونوں کی موت واقع ہو جائے گی، جس کے پاس محفوظ کرنے کے لیے کوئی قابل قدر ادب نہیں وہاں یہ خطرہ مول لیا جا سکتا ہے، ہندوستان میں ایسی تبدیلی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا کیونکہ ہمارا ادب نہ صرف قابل قدر اور بیش قیمت ہے بلکہ اس کا ہماری تاریخ اور ہمارے خیالات سے گہرا تعلق ہے، عوام کی زندگی سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے، اس قسم کی تبدیلی ظالمانہ غارت گری ہوگی جس سے عام تعلیم کی ترقی کو سخت دھکا لگے گا۔"

اردو کے ایک محب و شیدائی اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق سربراہ ڈاکٹر حکم چند نیر لکھتے ہیں:

"یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صدیوں کی رفاقت اور چلن سے زبان اور رسم خط میں ایک نوع کی گہری اور اٹوٹ ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے، صدیوں تک ادبیات کی تخلیق، ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت سے زبان اور رسم خط میں جسم اور جان کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے...... زبان سے رسم خط کا رشتہ توڑ دیا جائے تو وہ کچھ دنوں تک شاید زندہ رہ جائے لیکن جہاں تک اس کے ادب کا تعلق ہے وہ ضرور مر جائے گا...... اردو رسم خط میں اردو زبان و ادب کی چار سو سالہ ادبی، تاریخی اور سماجی زندگی کی روایات موجود ہیں، ان روایات سے تعلق قطع کر کے اردو زبان اور ادب نہ صرف اپنے کلاسیکی سرمائے سے محروم ہو جائیں گے بلکہ اپنی حیثیت اور حقیقت کھو بیٹھیں گے، ان کی انفرادیت ختم ہو جائے گی اور انہیں زندگی کے لالے پڑ جائیں گے، اردو ادب کے تمام قدیم و جدید ادبی سرمائے کو ناگری رسم خط میں منتقل نہیں کیا جا سکتا اور اگر منتقل کیا جائے گا تو اس انتقال میں نہ جانے کتنے لفظوں، محاوروں، بندشوں، ترکیبوں، اصطلاحوں اور تشبیہوں کا خون ہو جائے گا اور ادب اپنی تمام آب و تاب اور توانائی سے محروم ہو جائے گا، ہماری نئی نسلیں اگر اردو رسم خط سے بے بہرہ ہوں گی تو وہ اردو ادب کی روح تک رسائی حاصل نہ کر سکیں گی"۔

لطف و کرم کی یہ بارش اردو ہی پر کیوں ہو رہی ہے اور تمام ہندوستانی زبانوں میں سے صرف اسی کو دیونا گری رسم خط اپنانے کی دعوت اس قدر اصرار سے پیہم کیوں دی جا رہی ہے، پنجابی،

بنگالی، مراٹھی اور گجراتی وغیرہ ہند آریائی زبانیں اور تامل، تیلگو، کنڑ، ملیالم وغیرہ دراوڑی زبانیں بھی دوسرے خطوں میں لکھی جاتی ہیں، آریائی زبانوں کے خط اور ہندی کے دیوناگری رسم خط شکل، شباہت اور ساخت میں ملتے جلتے ہیں، جب اس قدر قربت و تعلق کے باوجود وہ ناگری رسم خط اپنانے کے لیے تیار نہیں ہیں تو اردو سے کیوں یہ توقع کی جارہی ہے کہ وہ ناگری رسم خط اختیار کرلے گی، اردو کے یہ خیر خواہ یہ شوشہ چھوڑ کر خلط مبحث بھی کرتے ہیں کہ انگریزی، فرنچ اور جرمن وغیرہ رومن رسم خط میں لکھے جانے کے باوجود اگر زندہ ہیں تو اردو دیوناگری رسم خط اپنا کر موت سے کس طرح ہم کنار ہوجائے گی، حالانکہ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن وغیرہ اپنے وجود کے وقت ہی سے رسم خط کو اپنائے ہوئے ہیں، جب ان زبانوں کا اپنا کوئی رسم خط ہی نہ تھا تو ان کو رومن رسم خط اپنانے کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہ تھا، پھر ان ہی یورپی اقوام نے اس رسم خط کو چھوڑنا تو درکنار اس میں کسی قسم کی اصلاح و ترمیم بھی قبول نہیں کی، ایک ترکی کی مثال ضرور ہے جس نے اپنی زبان کے لیے رومن رسم خط اختیار کیا جس کا خمیازہ بھی وہ بھگت رہا ہے۔(معارف جولائی ۱۹۹۶ء)

مسلم یونیورسٹی میں پولیس فائرنگ

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ پولیس فائرنگ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ایک طالب علم ہلاک اور کئی طلبہ شدید زخمی ہوگئے، پورے ملک میں بجا طور پر اس افسوسناک واقعہ کی شدید مذمت ہورہی ہے، لیکن آخر ہلاک ہونے والے طالب علم کے والدین اور اعزہ کے غم کی تلافی کیا ہوگی اور ان کے درد کا درماں کیا ہوگا؟ یہ عجیب بات ہے کہ مسلم یونیورسٹی میں کوئی معمولی واقعہ بھی ہوتا ہے تو شر پسند عناصر اور خود یونیورسٹی کے مفاد پسند لوگ اسے ہوا دے کر نہایت سنگین بنادیتے ہیں، طلبہ بھی ان کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا شکار ہوجاتے ہیں اور اپنی عاقبت بینی کی وجہ سے ہنگامہ آرائی اور تشدد پر آمادہ ہوکر معاملات کو نہایت پیچیدہ اور خراب کردیتے ہیں، دوسری طرف پولیس مسلم یونیورسٹی کے بارے میں اتنی حساس اور فرض شناس ہے کہ اسے طلبہ کو بھون دینے میں کوئی تامل نہیں ہوتا، احتجاج ہنگامے اور تشدد کے واقعات تعلیمی اداروں میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں، لیکن کہیں پولیس کی بے رحمی و بے دردی کا یہ منظر دیکھنے میں نہیں آتا، اگر یونیورسٹی اور ضلع انتظامیہ نے افہام و تفہیم کا یہ رویہ اختیار کیا ہوتا تو ایسا دل دوز اور جگر خراش واقعہ نہ رونما ہوتا، پولیس کا یہ ناروا اقدام قابل مذمت ہی نہیں

قابل مواخذہ بھی ہے۔

موجودہ وائس چانسلر ڈاکٹر محمود الرحمن کے آنے سے پہلے مسلم یونیورسٹی سخت بحران سے دوچار تھی، داخلوں میں کھلے عام بدعنوانیاں ہورہی تھیں، تعلیم کا نظام درہم برہم تھا، طلبہ کے گروپ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے، یونیورسٹی کیمپس میں حرب وضرب کے واقعات اور خون خرابہ ہورہا تھا، مفاد پسند لوگ اس وقت کے نیک طبیعت وائس چانسلر پروفیسر فاروقی کی نرمی و مروت کی وجہ سے بڑے ڈھیٹ ہوگئے تھے، اور خوب فائدے اٹھارہے تھے، ایسے بدتر حالات میں نئے وائس چانسلر کے انتخاب میں کورٹ کے اکثر ممبروں نے اس کو خاص طور پر مدنظر رکھا کہ وہ دیانت دار، قوم وملک کا درد، انتظامی امور کا تجربہ رکھنے والا اور قدرے سخت گیر ہو، ہمارے اندازے میں موجودہ وائس چانسلر نے علمی و تعلیمی ماحول برپا کرنے اور حالات کو معمول پر لانے کے لیے موثر اصلاحی اقدامات کیے، لیکن اصلاحات وتحقیقات کی زد میں آجانے والوں نے اپنے بے نقاب ہوجانے کے اندیشے اور طرح طرح کے مفادات کو پامال ہوتا دیکھ کر بڑی عیاری سے ایسے حالات پیدا کردیئے کہ دوسال بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ یونیورسٹی کو دومرتبہ بند کرنا پڑا اور اب کی یہ نہایت ناخوش گوار حادثہ پیش آیا جو تکلیف دہ ہی نہیں سب کا سرشرم سے جھکا دینے والا ہے۔

برسراقتدار اشخاص سے شکایتیں ہوجانا عام بات ہے، گو اسٹاف کا بڑا طبقہ بے غرض اور اصلاح پسند ہے، لیکن وہ یونیورسٹی میں پیش آنے والے حالات وواقعات سے بڑی حد تک بے تعلق رہتا ہے، علاوہ ازیں وہ بھی وائس چانسلر صاحب کی سخت دار و گیر اور درشتی کی وجہ سے ان کو پسند نہیں کرتا اور جاوبے جاان پر تبصرے بھی کرتا رہتا ہے، جس سے مفسد اور مفاد پسند لوگوں کی ایک طرح سے حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور انہیں کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے، رہے طلبہ تو وہ اپنی عدم پختگی کی بنا پر ہر اس شخص کے ہتھے لگ جاتے ہیں جو بظاہر ہمدرد و خیر خواہ کے روپ میں ان کے سامنے آتا ہے، اس لیے جن لوگوں کو صرف اپنا ہی مفاد عزیز ہوتا ہے اور وہ یونیورسٹی کی فلاح و بہبود سے کوئی سروکار نہیں رکھتے وہ سادہ لوح لوگوں خصوصاً سریع الاشتعال طلبہ کو اپنا آلہ کار بنالیتے ہیں اور انہیں آگے کرکے اور خود پس پردہ رہ کر ایسی سازشیں کرتے ہیں کہ نظام کی ساری چولیں ڈھیلی ہوجاتی ہیں اور ہر طرح کا انتشار وخلفشار رونما ہونے لگتا ہے، معمولی باتوں کو بھی اپنی فتنہ انگیزی سے ایسا اہم اور پیچیدہ مسئلہ

بنا دیتے ہیں جس میں الجھ کر طلبہ صرف ہنگاموں اور شورشوں کے لیے وقف ہوجاتے ہیں اور اس بڑے مقصد کو بھول جاتے ہیں جس کو حاصل کرنے کے لیے یونیورسٹی میں ان کا داخلہ ہوا تھا، اس سے ان کا تعلیمی نقصان تو ہوتا ہی لیکن کبھی کبھی ان کو اس کا ایسا سخت خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے جس کا ایک نمونہ یہ موجودہ دردناک سانحہ ہے۔

وائس چانسلر اور یونیورسٹی انتظامیہ بے قصور اور بری الذمہ نہیں ہے، جب یونیورسٹی کے موجودہ حالات کے پیچھے مفاد پسندوں کی ریشہ دوانیوں اور یونیورسٹی کے مخالفوں اور بدخواہوں کی گہری سازشوں کا پیچ در پیچ سلسلہ ہے جس کی ایک کڑی زہرخورانی کا تازہ واقعہ بھی ہے تو انہیں کیوں نظرانداز کیا جاتا رہا اور ان کا مناسب تدارک کیوں نہیں کیا گیا، اگر بروقت ان معاملات سے نپٹ لیا گیا ہوتا تو ایک طالب علم کی جان نہ جاتی، مسلم یونیورسٹی کورٹ کے ایک ادنی ممبر ہونے کے باوجود ابھی تک راقم کو وائس چانسلر صاحب کا نیاز حاصل نہیں ہوا ہے، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اساتذہ وطلبہ سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے، اس لیے ان کے مسائل ومشکلات سے واقف نہیں ہوتے، ان کے مزاج کی درشتی اور آمرانہ رویے کی شکایت بھی کی جاتی ہے، بلاشبہہ بے لاگ عدل ہی ایک حکمراں کا شیوہ ہونا چاہیے، لیکن اسے رحم دل بھی ہونا چاہیے، یہ بھی انسانی شرافت کا جوہر ہے، قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی بھی کی جائے اور بے ضابطگی اور بے راہ روی پر باز پرس بھی کی جائے لیکن یونیورسٹی کو ایک خاندان کے نظام کی طرح چلایا جائے، اساتذہ کے ساتھ اکرام واعزاز اور طلبہ کے ساتھ رحم وشفقت کا معاملہ کیا جائے، ان کی خوبیوں کی تحسین کی جائے اور خرابیوں پر تنبیہہ کی جائے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مسلم یونیورسٹی فرقہ پرستوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی اور وہ اس کی ہوا خیزی کے برابر درپے رہتے ہیں، جس کے لیے یونیورسٹی کا بدخواہ اور مفاد پسند طبقہ انہیں موقع دے دیتا ہے، اس لیے انتظامیہ، اساتذہ اور طلبہ کو اس پہلو سے چوکنا رہنے کی ضرورت ہے اور موجودہ واقعہ کی غیر جانبدارانہ تحقیق کرا کے جو بھی اس میں ملوث پائے جائیں انہیں رورعایت کے بغیر مناسب سزا دی جانی چاہیے۔ (معارف اکتوبر ۱۹۹۶ء)

دارالمصنّفین کی مطبوعات کے مسروقہ ایڈیشن

ان صفحات میں متعدد بار اس کا تذکرہ آیا ہے کہ بعض خودغرض ناشرین دارالمصنّفین کی

اجازت کے بغیر اس کی مطبوعات چھاپ رہے ہیں، ہم کو زیادہ شکایت پاکستان کے ناشروں سے تھی لیکن ہندوستان اس معاملے میں پیچھے نہیں ہے، چوری ہمیشہ ہوتی تھی لیکن یہ بہت پست اور معمولی لوگ کرتے تھے اور وہ بھی رات کے سناٹے میں یا سنسان جنگلوں اور بیابانوں میں ڈاکو راہ گیروں کو لوٹ لیتے تھے، مگر حکومتیں ان کی روک تھام کی پوری کوششیں کرتی تھیں اور جو لوگ پکڑ میں آتے تھے انہیں سخت سزا ملتی، لیکن اب اونچے طبقوں کے لوگ بھی یہ کام کر رہے ہیں اور شاید ہی کبھی ماخوذ ہوتے ہوں، انہوں نے چوری کے ایسے ایسے طریقے اور صورتیں ایجاد کر لی ہیں جن کی وجہ سے ہر شخص کے لیے یہ آسان ہوگئی ہے اور ہر قدم پر اس کی گنجائش بھی پیدا ہوگئی ہے ؎

شہریست پر زخوباں و ز ہر طرف نگارے یاراں صلائے عام است گرمی کنید کارے

ہم جس طرح کے لوگوں سے دوچار ہیں وہ ناشروں اور تاجران کتب کا گروہ ہے، یہ بڑی ڈھٹائی سے دارالمصنّفین کی کتابیں چھاپ کر اس کے لیے مصیبتیں اور مشکلات پیدا کر رہے ہیں، ان میں دہلی اور دیوبند کے بعض ناشرین بھی ہیں جو تقدس کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں، پتہ نہیں ان کے نزدیک یہ چوری، ڈاکہ زنی اور اکل اموال بالباطل ہے بھی یا نہیں؟ فقہی تاویلوں اور حیلوں سے تو ہر چیز جائز کر لی جاسکتی ہے۔ (معارف ستمبر ۱۹۹۷ء)

بابری مسجد

مسلمانوں کو بابری مسجد کے لیے تڑپتے، بلکتے اور روتے ہوئے ۵ برس گزر گئے لیکن کوئی مقصد برآری نہیں ہوسکی، اس کی بازیابی کے لیے جو تدبیر کی جاتی ہے وہ الٹی ہو جاتی ہے، دوسری جانب بڑا دم خم ہے، تباہ شدہ مسجد کی جگہ پر مندر تعمیر کرنے کی تحریک میں بڑی قوت اور زور پیدا ہوتا جارہا ہے، کارسیوکوں کو اعزاز و انعام دینے کے لیے جمع کیا جارہا ہے، برابر نئی باتیں اور نئے چرچے سنائی دیتے ہیں اور ہر روز نئے نئے منصوبے بنائے جاتے ہیں، صاف دکھائی دیتا ہے کہ مسجد کی بازیابی کی راہ تو دشوار اور بعید تر ہوتی جارہی ہے مگر مندر کی تعمیر کا راستہ سبک اور ہموار ہوتا جارہا ہے، بابری مسجد ڈھانے والے تو روز اول سے علی الاعلان یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمان اب بابری مسجد کا خیال اپنے ذہن و دماغ سے نکال دیں لیکن اب یہی بات ناسازگار حالات دیکھ کر خود بعض سنجیدہ، ذی شعور اور سوجھ بوجھ رکھنے والے مسلمان بھی کہہ رہے ہیں کہ ایک بابری مسجد کے لیے آخر مسلمان کیوں

اپنے کو ہلاک و برباد کر رہے ہیں، اسے بھول جائیں اور اس پر صبر کر لیں تاکہ مزید خون خرابہ نہ ہو، جو چیز نہ ملنے والی ہو اس کے پیچھے پڑ کر ملنے والی چیزوں کو بھی گنوا دینا دانائی نہیں ہے اس لیے مسجد کا خیال چھوڑ دیں، اپنی تعمیر و ترقی کے سامان کریں اور اقتصادی و تعلیمی پس ماندگی دور کرنے میں لگ جائیں۔

موجودہ حالات میں مجبور و بے کس مسلمانوں کے لیے ظلم و تشدد سے ڈھائی جانے والی مسجد کی تعمیر واقعی ناممکن ہوگئی ہے، اگر یہ مسئلہ اتنا ہی آسان ہوتا اور مسلمانوں کے دست و بازو میں قوت ہوتی تو مسجد مسمار ہی کیوں کی جاتی، لیکن ان کی تھوڑی بہت امیدیں ملک کے عدل و انصاف پسند اشخاص، جمہوریت اور سیکولر نواز جماعتوں اور ملک کی عدالتوں سے وابستہ تھیں، انہیں خیال تھا کہ فرقہ وارانہ جنون کی لہریں، شر پسندی اور غنڈہ گردی کی یلغاریں گو بہت تیز و تند ہوگئی ہیں لیکن جمہوریت کے شیدائی اور انصاف پسند ان کے مقابلے میں سینہ سپر ہو کر حق و صداقت کا بول بالا کریں گے اور عدل و انصاف کا خون نہ ہونے دیں گے، خاص طور سے متحدہ محاذ کی حکومت سے انہیں بڑی توقعات وابستہ تھیں مگر کچھ تو اس کی واقعی مجبوریوں اور کچھ مصلحت پسندی اور باہمی کشمکش کی وجہ سے بابری مسجد کا معاملہ جوں کا توں ہی رہا اور اس کے چل چلاؤ کا وقت آ گیا، عدالتوں کی سست رفتاری ہی نہیں بہت سی گفتنی و ناگفتنی باتیں بھی ہیں جنھوں نے اس کے بارے میں خوش فہمی ختم کر دی ہے، مسجد مسمار ہونے کے بعد ہی اس کا معاملہ لبرہن تحقیقاتی کمیشن کو سپرد کیا گیا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اس نے اپنے کام کا آغاز ہی نہیں کیا، دوسری طرف مسجد ڈھا دینے والے اپنے ''کارنامے'' پر فخر کر رہے ہیں، ایسے مایوس کن حالات میں کس کو خیال ہو سکتا ہے کہ وہ دوبارہ بن جائے گی۔

دراصل یہ دو باتیں الگ الگ ہیں اور دونوں کی نوعیتیں بھی جدا جدا ہیں، ایک تو یہ کہ بابری مسجد کی تعمیر نو موجودہ حالات میں مشکل اور دشوار ہے، دوسری بات یہ ہے کہ مسلمان اس کا خیال ہی دل میں نہ لائیں اور اسے بالکل بھول جائیں۔ پہلی بات کے سلسلے میں ان کو اپنی مجبوری اور بے چارگی کا پورا اندازہ ہے، اس لیے اس کے بارے میں وہ آسمان و زمین سر پر نہیں اٹھائے ہوئے ہیں، وہ صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ ہر حال میں اس کے متعلق عدالت کا فیصلہ مانیں گے۔ رہی دوسری بات تو وہ ان کے حلق کے نیچے نہیں اتر رہی ہے، سنگھ پریوار کی نظریں تو کاشی اور متھرا اور نہ جانے کس کس پر گڑی ہوئی ہیں، جیسا کہ آر ایس ایس کے سربراہ نے حال ہی میں اس کا اعلان بھی کیا ہے، اس لیے

ان سے بابری مسجد کو بھلادینے کا مطالبہ سخت ناروا، نہایت بیجا اور بڑا دل شکن ہے اور یہ حقیقت تو روزِ روشن سے بھی زیادہ عیاں ہے کہ مساجد کا تحفظ اور شعائر اللہ کا احترام فرضِ عین ہے، اس میں کوتاہی پر مسلمانوں سے مواخذہ ہوگا، اگر ان کی ذات سے متعلق کوئی مسئلہ ہوتو وہ اسے سو بار معاف کر سکتے ہیں اور ہزار بار بھول سکتے ہیں لیکن معابد کی تخریب اور شعائر الٰہی کی توہین کو بھلانا ان کے بس میں نہیں ہے، یہی اسوۂ نبوی بھی ہے، آپؐ نے اپنے ذاتی مخالفوں اور جان کے دشمنوں کو برابر معاف کیا ہے اور قدرت کے باوجود ان سے کوئی انتقام نہیں لیا ہے لیکن اللہ کے حدود اور شعائر و محارم کے معاملہ میں نہ کوئی رورعایت کی ہے اور نہ کسی کی سفارش پر کان دھرا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مسلمان بہت سی ضروری اور اہم باتوں سے واقعی غافل اور بے پروا ہو گئے ہیں ان میں صحیح دینی شعور نہیں رہ گیا ہے، ایمان و عقیدہ میں پختگی اور درستگی ختم ہوگئی ہے، اعمال و اخلاق میں بڑی کجی اور بے راہ روی آگئی ہے، ان کا اتحاد پارہ پارہ اور اختلاف و انتشار بڑھ گیا ہے، نہ اپنی تعلیمی و اقتصادی پس ماندگی دور کرنے کی فکر ہے اور نہ تعمیر و ترقی کا کوئی لائحہ عمل سامنے ہے، لیکن ان سب کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ بابری مسجد کے لیے دیوانے ہو گئے ہیں بلکہ اس کے سلسلے میں انھوں نے جس صبر و ضبط، ہوش و تمکین اور اعتدال و توازن سے کام لیا ہے اگر وہ بے حسی نہیں ہے تو اس کی ان کو داد ملنی چاہیے۔ جس طرح مسلمانوں کے لیے بابری مسجد کو نسیاً منسیاً نہ کرنا ضروری ہے، اسی طرح اپنے حالات و معاملات کی اصلاح اور اعتقاد و عمل کی درستگی کرنا بھی ضروری ہے، اسی سے وہ نصرت الٰہی کے مستحق ہو سکتے ہیں اور بابری مسجد کی بازیابی کا اصل ہتھیار بھی یہی ہے، وہ ضرور مجبور اور بے بس ہیں لیکن ان کا خداوند مجبور اور بے بس نہیں ہے، اسے حالات کو موافق اور سازگار بنادینے میں کوئی مانع نہیں ہے۔ (معارف دسمبر ۱۹۹۷ء)

اتر پردیش حکومت کی اردو دشمنی

اب اتر پردیش میں اردو کشی کی جو مہم پنڈت گوند ولبھ پنتھ جی اور ان کے جانشین ڈاکٹر سمپورنانند جی نے شروع کی تھی، اس کا اختتام اب بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت کے دور میں ہوا ہے جس نے تمام اسکولوں میں درجہ سوم کے سنسکرت کا کورس درجہ چہارم اور پنجم میں پڑھانے اور سب کے لیے لازماً وندے ماترم پڑھنے کا اعلان کیا ہے تا کہ بزعم خویش وہ اردو کا قصہ ہی ختم کردے اور

مزید ستم یہ کہ وندے ماترم جیسا مشرکانہ گانا پڑھ کر مسلمان اسلام پر قائم نہ رہیں، ایک طرف تو بی جے پی مرکز اور صوبوں میں برسر اقتدار آنے کے لیے اپنی پاکِ داماں کی حکایت بیان کرکے مسلمانوں کو بہلانے پھسلانے میں لگی رہتی ہے، دوسری طرف وہ ان کا وجود ہی ختم کرنے کے لیے ان کا عقیدہ، مذہب، تہذیب وتمدن اور زبان ہر ہر چیز کو مٹا دینے کے بھی درپے ہے، اتر پردیش کی سرکاروں کے اسی مسلم کش اور اردو دشمن رویے کی وجہ سے مسلمانوں کو اپنے نجی اور علاحدہ تعلیمی ادارے قائم کرنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے، لیکن بی جے پی حکومت اس میں بھی رخنہ اندازی کر رہی ہے اور ان اداروں کے پانچویں درجہ پاس طلبہ کو چھٹے درجہ میں داخلہ کی سہولت نہیں دے رہی ہے، نجی اسکول قائم کرنے پر مسلمانوں میں علاحدگی پسندی کا الزام بھی عائد کیا جاتا ہے لیکن اگر وہ یہ ادارے نہ قائم کریں تو کیا مشرک و مرتد ہو جائیں۔(معارف دسمبر ۱۹۹۷ء)

دارالمصنّفین

دارالمصنّفین کے اصلی اور بنیادی کاموں اور علمی وتحقیقی منصوبوں کی تکمیل اور عصری ضرورتوں کے مطابق نئے لٹریچر کی تیاری کے لیے ضروری ہے کہ بعض لائق اور مناسب اشخاص کی خدمات حاصل کی جائیں، نوجوانوں کو تصنیف وتالیف کی عملی مشق کرائی جائے اور ان کی تربیت کی جائے تاکہ چراغ سے چراغ جلتا رہے، لیکن مناسب اور لائق افراد اور ہونہار طلبہ کی سرگرمی عمل کے لیے موجودہ دنیا میں مختلف میدان موجود ہیں، وہ قلیل معاوضے پر دارالمصنّفین کی محنت وریاضت کی زندگی پر کیسے قانع ہو سکتے ہیں، ان سے کمتر استعداد کے لوگ بھی اگر مسلسل محنت وجانفشانی سے اسی کام میں جٹے رہیں تو وہ بھی مفید اور کارآمد ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ان میں صبر، ایثار، قناعت اور قربانی کا جذبہ، علمی خدمت کا ولولہ اور مطالعہ وتحقیق کے صبر آزما کام کا حوصلہ ہو، تاہم ان کے اپنے مسائل وضروریات بھی تو ہیں جن کی تکمیل کا سامان دارالمصنّفین اپنے محدود وسائل وذرائع کی بنا پر نہیں کر پاتا، جو لوگ عرصہ سے دارالمصنّفین کی خدمت کر رہے ہیں ان کی تنخواہیں بہت قلیل ہیں جو آئے دن کی بڑھتی ہوئی گرانی کی وجہ سے ان کی واجبی ضروریات کے لیے بھی کافی نہیں ہوتیں اور دارالمصنّفین ان کی تشفی کا سامان نہیں کر پاتا۔

تقسیم سے قبل بعض مسلم ریاستوں کے عطیات اور کتابوں کی تجارت سے دارالمصنّفین کی

ضروریات پوری ہوجاتی تھیں مگر ریاستوں کے خاتمہ کے بعد اس کا اصل انحصار اپنی کتابوں کی تجارت پر رہ گیا ہے جو موجودہ بڑھتی ہوئی مہنگائی، ملک میں اردو قارئین کی کمی اور سنجیدہ علمی کتابوں سے عدم دلچسپی کی وجہ سے متاثر ہوئی ہے، پاکستان اور دوسرے بیرونی ملکوں میں بھی دارالمصنّفین کی مطبوعات کے قدرداں موجود ہیں مگر مراسلات و مواصلات کی پیچیدگی، محصول ڈاک کی زیادتی اور ڈاک کے نظام کی خرابی کی وجہ سے وہ بھی ہمت ہار رہے ہیں، بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ دارالمصنّفین کی پرانی مطبوعات جس تیزی سے ختم ہوتی جارہی ہیں اتنی تیزی سے ان کی چھپائی کا کام نہیں ہورہا ہے، اسٹاک کی کمی بھی تجارت پر اثرانداز ہورہی ہے، اسی لیے اشاعتی پروگرام میں تیزی لانے کے لیے ہم ان صفحات میں کئی بار علم دوست ارباب خیر سے استدعا کرچکے ہیں لیکن شاید ہماری کج مج بیانی سے بات پوری طرح ان پر واضح نہیں ہوسکی ہے، اسی لیے سیرۃ النبیؐ حصہ اول و دوم، الغزالی اور ہماری بادشاہی ہی کے لیے ہماری اپیل کارگر ہوسکی، ارض القرآن، سفرنامہ روم و مصر و شام اور انقلاب الامم کے مصارف کی ذمہ داری کا وعدہ بعض علم دوست حضرات نے کیا ہے۔

دارالمصنّفین کی کتابوں کی تحقیق و تحشیہ کے بعد از سر نو اشاعت ضروری ہے، اس کام میں معاونت سے اس کی تجارت کو فروغ اور علم و دین کی ترویج بھی ہوگی اور ان شاءاللہ اس کے دوسرے مسائل بھی حل ہوں گے، ارباب خیر کے سامنے دارالمصنّفین کی امداد و اعانت کی دو اور صورتیں پیش کی جاتی ہیں: ایک تو یہ کہ وہ اس کے لائف ممبر بن جائیں جس کی فیس دس ہزار روپئے ہے، دارالمصنّفین ان کی خدمت میں دو ہزار کی مطبوعات جن کو وہ پسند کریں گے فوراً پیش کرے گا اور آئندہ جو نئی کتابیں شائع ہوں گی وہ اور رسالہ معارف مدۃ العمر ان کے نام جاری رہے گا، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ پانچ ہزار روپئے دے کر دارالمصنّفین کا معاون خصوصی بننا منظور کرلیں تو انہیں ایک ہزار کی ان کی پسندیدہ کتابیں اسی وقت پیش کی جائیں گی اور آئندہ معارف ان کی زندگی بھر ان کے نام جاتا رہے گا۔ (معارف اگست ۱۹۹۸ء)

اقلیتوں کے حقوق

اقلیتوں کے مذہبی حقوق کی طرح ہندوستان کا آئین ان کے تعلیمی و ثقافتی حقوق کے تحفظ کا ضامن بھی ہے۔ دستور کی دفعہ ۲۹(۱) میں صراحت ہے کہ بھارت کے علاقے میں یا اس کے کسی

حصے میں رہنے والے شہریوں کے کسی طبقہ کو جس کی اپنی الگ جداگانہ زبان، رسم الخط یا ثقافت ہو، اس کو محفوظ رکھنے کا حق ہوگا''۔ اسی طرح دفعہ ۳۰(۱) میں بھی واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ''تمام اقلیتوں کو خواہ وہ مذہب کی بنا پر ہوں یا زبان کی، اپنی پسند کے اقلیتی ادارے قائم کرنے اوران کا انتظام کرنے کا حق ہوگا''۔ قوانین وضع کرتے وقت (۱-الف کے تحت) ریاستوں کو پابند کیا گیا کہ ''ضمانت دیا گیا حق محدود اور ساکت نہ ہو جائے'' اور دفعہ ۳۰(۲) میں وضاحت ہے کہ ''مملکت تعلیمی اداروں کو امداد عطا کرنے میں کسی تعلیمی ادارے کے خلاف اس بنا پر امتیاز نہ برتے گی کہ وہ کسی اقلیت کے زیر اہتمام ہے، خواہ اقلیت مذہب کی بنا پر ہو یا زبان کی''۔

لیکن آئین میں دیے گئے اقلیتوں کے مذہبی حقوق کی طرح یہ صریح و واضح تعلیمی حقوق بھی ملک کی اکثریت کے لیے ناقابل برداشت ہیں اور وہ ان کے خلاف برابر کوئی شوشہ چھوڑتی رہتی ہیں، شروع ہی سے انتظامیہ کے متعصب اور تنگ نظر افراد محکمۂ تعلیمات کے افسر، یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر اور فرقہ پرست عناصر ان میں بے جا دخل اندازی کرکے اقلیتوں کو تنگ اور ان کے حقوق کو سلب کرنا چاہتے ہیں اور ان کے قائم کردہ اداروں کی ترقی میں رخنہ اندازی اور ان کے اقلیتی کردار کو تبدیل کرنے کے درپے ہوتے ہیں، کبھی یکساں قوانین یا یکساں سول کوڈ کی آڑ میں اور کبھی ملک کی سالمیت اور قومی یکجہتی کے نام پر ان کو ختم کرنا چاہتے ہیں، اقلیتی اداروں میں بھی پسماندہ ذاتوں کے لیے نشستیں محفوظ رکھنے کی پابندی اور ملازمین کی برطرفی کے لیے طرح طرح کی بندشیں لگا کر آئینی تحفظات کو بے جان بنا دینا چاہتے ہیں، ان سازشوں کو ناکام کرنے، اپنے آئینی حقوق کے تحفظ اور اقلیتی کردار کو بچانے کے لیے تمام اقلیتوں کو متحد ہو کر جدو جہد کرنی چاہیے مگر پہلے خود اقلیتی اداروں کے سربراہ ان کو بدعنوانی اور بدانتظامی سے پاک رکھیں، عدل و مساوات کے اصول اور آئین کی مکمل پابندی کریں، ملازمین کو تنگ کرنے اور نکالنے کے من مانے ڈھنگ سے باز رہیں، افسوس ہے کہ تعلیم جیسے مقدس اور برتر شعبے میں بھی غلط کار افسروں نے رشوت اور لین دین کرکے ہر قسم کی بدعنوانی کے لیے راستے کھول دیے ہیں۔

یہ شکایت بہت پرانی ہے کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب ان کی آبادی سے بے حد کم ہے، ہفتہ وار ''توحید میل''، لکھنؤ نے اتر پردیش کے محکمۂ اطلاعات عامہ کی سنہ رواں کی ڈائری

کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "۱۹ر کمشنریاں، ایک بھی کمشنر مسلمان نہیں۔ ۸۳ر اضلاع، ایک بھی حاکم ضلع کے عہدے پر مسلمان فائز نہیں (۱)، ۸۳ کپتانوں میں ۲ مسلمان، ایک ایس ایس پی، دوسرا ایس پی، مگر کہاں بلند مقامات پر...... نینی تال اور اودھم سنگھ نگر میں، صوبے کے مفصلات میں تعینات اطلاعات کے افسر بھی شاید دو ایک ہی نکلیں گے...... گورنمنٹ کے ہیڈ کوارٹر پر تعینات پرسنل سکریٹری، کمشنر اور سکریٹریوں اور محکمہ جاتی سربراہوں کا حال اتنا خراب نہ سہی لیکن اس سے زیادہ کچھ اچھا بھی نہیں، فاضل مدیر جناب سبط محمد نقوی کو ہم سے زیادہ اس کی واقفیت ہوگی کہ "صاف ستھری اور عدل و انصاف پر مبنی حکومت" سے پہلے کی حکومتوں میں بھی صورت حال بہت اطمینان بخش نہیں تھی، اس پر دوسروں کو الزام دینے سے پہلے اپنے قصور کو دیکھنا چاہیے، مسلمانوں کی علم و آگہی سے محرومی اور تعلیمی پس ماندگی نے آزاد ہندوستان کے نقشے میں ان کی تصویر بہت دھندلی اور مدھم بنادی ہے، مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنے والے مسلم امیدواروں کی تعداد اس لیے بہت کم ہوتی ہے کہ ان کے خیال میں ان کے ساتھ ناانصافی اور تعصب سے کام لیا جاتا ہے، اس کا رونا رو کر محنت سے جی چراتے اور اپنی تساہلی اور غفلت کے لیے حکومت کو الزام دیتے ہیں۔ (معارف اپریل ۱۹۹۹ء)

جامعہ ہمدرد

جامعہ ہمدرد حکیم عبدالحمید مرحوم کا بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے جس کے وہ بانی چانسلر تھے۔ ان کا خلا پر ہونا تو بہت مشکل ہے لیکن یہ خبر سن کر خوشی اور اطمینان ہوا کہ اس کے چانسلر اب جناب سید حامد ہوگئے ہیں۔ ظاہر ہے اس منصب کے لیے ان سے بہتر اور موزوں شخص کوئی اور نہیں ہوسکتا، وہ جامعہ کے قیام، اس کی عملی جد و جہد اور ضروری کارروائیوں میں حکیم صاحب کے خاص دست راست تھے، ان کی عملی زندگی کا آغاز پی۔سی۔ایس اور آئی۔اے۔ایس کی حیثیت سے ہوا اور اپنی اہلیت، ایمان داری اور اچھی کارکردگی کی وجہ سے نیک نام رہے، علی گڑھ کے وائس چانسلر ہوئے اور علمی و تعلیمی ماحول پیدا کرنے کے لیے ڈھیلی چولیں کسیں تو بدنام اور مبغوض ہوئے۔ حامد صاحب کو اردو اور فارسی زبان و ادب کا بہت اچھا ذوق ہے، علمی و تعلیمی کاموں سے ہمیشہ دلچسپی رہی، علی گڑھ سے سبک دوشی کے بعد مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی دور کرنا اور علم کو فروغ دینا ان کا وظیفۂ حیات ہے،

(۱) یہ سطریں چھپ رہی تھیں کہ ایک مسلمان اعظم گڑھ کلکٹر ہو کر آئے ہیں۔

تعلیمی کارواں نکالا اور شہروں اور قصبوں کی خاک چھانی، اردو کی بے کسی اور مظلومی دیکھی تو اس تحریک کی قیادت اور رہنمائی کی، علم و تعلیم سے غیر معمولی شغف کی بنا پر حکیم صاحب کی دعوت پر ان کے شریک سفر ہو گئے، سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے دل میں قوم و ملت کا درد اور بے لوث خدمت کا جذبہ ہے جو انہیں کبھی چین سے رہنے نہیں دیتا۔ ع رہرواں را خستگیِ راہ نیست

ان کی سربراہی میں انشاء اللہ ہمدرد یونیورسٹی ترقی کی منزلیں طے کرے گی اور اس کا فیض بھی عام ہوگا۔ (معارف اکتوبر ۱۹۹۹ء)

آزادی کے بعد اردو

آزادی کے بعد اردو پر بڑا سخت وقت آیا، طرح طرح کے اتہام اس پر عائد کیے گئے، اب اگر چہ یہ حالات نہیں رہے اور اس پر عائد کردہ الزامات کی شدت میں بھی کمی آ گئی ہے اور اردو کی سخت جانی نے اس کا گلا گھونٹنے والوں کو مایوس کر دیا ہے کہ وہ ختم نہیں ہو سکتی، شروع میں اتر پردیش میں کانگریسی حکومتوں کی کوشش تو یہی تھی کہ ایسی صورت پیدا کر دیں کہ چالیس برس بعد وہ خود بخود ختم ہو جائے اور نئی نسلیں اس سے ہمیشہ کے لیے بیگانہ ہو جائیں۔ مگر جب اردو یہ سارے ظلم و ستم جھیل لے گئی اور آج وہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ اس کا افق مزید وسیع ہو گیا ہے اور وہ ایشیا اور یورپ کے ملکوں تک پھیلتی جا رہی ہے اور ہر جگہ سے یہی صدا بلند ہو رہی ہے کہ: ع سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔ تو کانگریس والوں کی طرح بی۔ جے۔ پی کے لوگ بھی چاہے اسے کتنا ہی بیر کیوں نہ رکھتے ہوں اس کی شیرینی، لطافت اور ہر دلعزیزی کا گن گا رہے ہیں۔

اب اردو والوں کا اس کا واویلا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ مٹ رہی ہے، اس سے اردو کے شیدائیوں اور کارکنوں کی حوصلہ شکنی اور نئی نسل کی بے رغبتی بڑھتی ہے مگر اردو کے معاملے میں مطمئن اور غافل ہونا کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ اس کے مخالفوں کی ذہنیتیں تبدیل اور حکومتوں کا معاندانہ رویہ بدلا نہیں ہے، اتر پردیش میں اردو کا حال تمام ریاستوں سے بدتر ہے، یہاں اس کو اپنی بقا و تحفظ کے لیے بڑی لڑائی لڑنی پڑے گی، حکومت اردو کے لیے کسی سہولت کا اعلان کرتی ہے تو افسر شاہی اس پر عمل پیرا نہیں ہونے دیتی اور اس کے نفاذ میں طرح طرح کی رخنہ اندازی کرتی ہے اور پھر وہ سہولت ہمیشہ کے لیے سرد خانے میں چلی جاتی ہے، ریاستی اور مرکزی حکومتیں اردو کے معاملے میں

مخلص اور سنجیدہ نہیں ہیں، ان کا ہر اقدام سیاسی ہوتا ہے، اردو کے فروغ اور مفاد سے زیادہ ان کو اپنی پارٹی کا مفاد عزیز ہوتا ہے، وہ اردو کو بھی اپنے کارکنوں اور پارٹی والوں کے فائدے کا ذریعہ بناتی ہیں اس کی ایک مثال مختلف ریاستوں کی اردو اکیڈمیوں کے عہدیداروں اور مختلف کمیٹیوں کے ارکان کی نامزدگی ہے، اتر پردیش میں نرائن دت تیواری کے علاوہ سارے وزرائے اعلیٰ نے اکیڈمی کے ارکان کا انتخاب سیاسی بنیادوں پر کیا ہے، اردو کے مشہور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کا انتخاب بہت مناسب تھا لیکن حکومت اس میں مخلص نہ تھی اس لیے ان کے خط کا جواب بھی نہ دیا اور ان کو مستعفی ہو جانا پڑا۔

اس وقت اردو کی بقا و تحفظ کے ضامن عربی مدارس بھی ہیں جن میں ذریعہ تعلیم اردو زبان ہے، وہ ادارے جو اردو کی کتابوں کی تالیف و تصنیف اور طبع و اشاعت کا کام برابر انجام دے رہے ہیں اور بہت سے فضلا اور دانشور جن کی گھٹی میں اردو کی محبت رچی بسی ہوئی ہے اور وہ برابر علمی تحقیقات اور ادبی خدمات میں مصروف اور اردو کے مسائل سے باخبر ہو کر اسے فروغ دینے کی جدوجہد کرتے رہتے ہیں، ان سب کو اس لیے ناقابل التفات سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں ہوتے، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور مخصوص قسم کے ناقدین و محققین اور ادیبوں و صحافیوں کی نامزدگی پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن اردو زبان پر ان کی اجارہ داری تو نہیں ہے جب کہ عام طور پر ان کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ اردو کی بدولت شہرت و ترقی پانے اور اسی پر ان کی معیشت کا دارومدار ہونے کے باوجود ان کو اس کی خدمت و فروغ سے نہ دلچسپی ہوتی ہے اور نہ وہ اس کے لیے کوئی قربانی دیتے ہیں بلکہ اپنے بچوں کے ''روشن مستقبل'' کے لیے انہیں اردو تعلیم بھی نہیں دلاتے، عربی مدارس میں اردو ذریعہ تعلیم تو ہے مگر مدارس سے وابستہ اکثر لوگوں کی نظر اس کی تاریخ، ادب اور شاعری پر نہیں ہوتی کیونکہ اس کی تعلیم نہیں دی جاتی، جدید علوم و فنون کا کوئی جھونکا بھی مدارس میں نہیں آنے دیا جاتا کہ اس سے ان کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا اور طالب علم سائنس اور ریاضی کی بھول بھلیوں میں پڑ کر دینی علوم میں دستگاہ نہیں پیدا کر سکتا مگر یہ علاحدہ موضوع ہے جس پر سر دست گفتگو مقصود نہیں۔

اردو کے معاملے میں مایوسی اس لیے بھی بیجا ہے کہ ہندوستان میں اردو کی بہ کثرت کتابیں، اخبار اور رسالے شائع ہو رہے ہیں، متعدد ادارے معیاری اور محققانہ کتابیں چھاپ کر اس کی بقا کا

سامان کررہے ہیں۔ دارالمصنّفین کا نام لینا خودستائی ہوگی، مکتبہ جامعہ دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی، ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد، بعض ریاستی اردو اکادمیاں اور مذہبی و دعوتی کتابوں کی اشاعت کے لیے ادارۂ تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ اور مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی بڑے مرکز ہیں، ہم کو اس موقع پر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کا ذکر کرنا ہے جو مشرقی علوم اور اردو فارسی، عربی مطبوعات ومخطوطات کا بڑا مخزن ہے، وہ نایاب، نادر اور بھولی بسری کتابیں شائع کرکے لوگوں کو محوِ حیرت بنائے ہوئے ہے۔ حال ہی میں اس کے موجودہ ڈائریکٹر جناب حبیب الرحمٰن چغانی نے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کے خطبات، خطوط اور تقریروں کے مجموعے شائع کیے جن کی تعداد چھ ہے، ان کے علاوہ قدیم تذکرے وتالیفات اور نئی تصنیفات بھی سات عدد موصول ہوئی ہیں، ہم اس کے لیے چغانی صاحب کو مبارک باد دیتے ہیں۔

(معارف نومبر ۱۹۹۹ء)

مدارس اسلامیہ اور حکومت

بھارتیہ جنتا پارٹی زبانی چاہے جتنا بھی کہے کہ وہ مسلمانوں کی ہمدرد ہے مگر اس کے عمل سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، مسلم دشمنی اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، جب اسے اقتدار نہیں ملا تھا اس وقت کے کرتوت لوگوں کے سامنے ہیں، بابری مسجد کے انہدام کو کون بھول سکتا ہے جس میں اس کے بڑے بڑے لیڈر جو آج اہم وزارتوں پر فائز ہیں، شریک تھے۔ سات برس پہلے اسی دسمبر کے مہینے میں اس نے جو وار کیا اس کے کاری زخم سے خدا جانے مسلمان کب تک چیختے اور کراہتے رہیں گے، اور اب جب کہ وہ مسند اقتدار پر متمکن ہے تو مسلمانوں کے ارتداد کا سامان اور ایسے اسباب مہیا کررہی ہے جن کے بعد بھلے ہی وہ نام کے مسلمان رہ جائیں مگر اسلام وایمان سے ان کا رشتہ منقطع، ان کی اصل شناخت ختم اور دینی وایمانی غیرت وحمیت معدوم ہوجائے گی۔

اس منصوبے کی تکمیل کے لیے اس وقت دینی درس گاہوں اور عربی مدارس کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا ہے جن کو مسلمان اپنا قیمتی اثاثہ اور متاع گراں ارز سمجھتے ہیں، ہندوستان میں اسلام کے تحفظ میں مدارس کے کارنامے گوناگوں اور عظیم الشان ہیں، اس لیے بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیے ان کا وجود ناقابل برداشت ہے، اس کے لیڈران پرسکون و پرامن درسگاہوں کو دہشت گردی اور تشدد کا

مرکز، فتنہ وشورش کی آماجگاہ اور غداروں کی پناہ گاہ خیال کرتے ہیں، بعض ممبروں کے سوالات کے جواب میں راجیہ سبھا میں وزیر داخلہ نے تشویش ظاہر کی ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں ہندو نیپال سرحد پر مدرسوں اور تربیتی اسکولوں کی تعداد بڑھی ہے، ان مدارس اور آئی۔ایس۔آئی میں یقینی طور پر رابطہ ہے۔ آئی۔ایس۔آئی کی سرگرمیاں تو واقعی بڑھی ہیں لیکن اپنی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لیے مدارس کو ان کا ذمہ دار قرار دینا مدارس ہی نہیں تمام مسلمانوں کی توہین اور ان کی وفاداری پر شک وشبہ ظاہر کرنا ہے۔

حکومت جن دینی مدارس سے اتنی خائف ہے اور جنہیں وہ آئی۔ایس۔آئی کی سرگرمیوں کا مرکز سمجھتی ہے، اگر اس کے ذمہ داروں کو موقع ہو تو وہ مدارس کے ماحول، ان کے نصاب تعلیم اور ان میں پڑھائی جانے والی کتابوں کا جائزہ لے اور خود ہی فیصلہ کرے کہ جہاں خدا ترسی، اخلاق اور روحانیت کا درس دیا جاتا ہو وہاں تشدد، دہشت، شر وفساد اور فتنہ وشورش کا شائبہ کیسے ہوسکتا ہے، ان میں نیک، صلح جو، امن پسند، نوع انسانی کے ہمدرد اور ملک وسماج کے لیے کارآمد افراد تیار ہوں گے یا خونخوار، جنگ جوؔ، درندہ صفت، ہنگامہ وفساد برپا کرنے اور قومی املاک کو تباہ و برباد کرنے والے پیدا ہوں گے، جس طرح کی بیہودگیوں کا مظاہرہ آئے دن کالجوں، یونیورسٹیوں اور حکومت کے زیر انتظام چلنے والے مدارس میں ہوتا ہے، اس سے ان عربی مدارس کا دور قریب کا بھی تعلق نہیں، ان کے متعلق وزیر داخلہ کا یہ بیان بالکل غیر ذمہ دارانہ ہے، آج ہر سطح پر ملک میں جو مفاسد اور خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کی اصلاح دینی واخلاقی تعلیم ہی سے پیدا ہوسکتی ہے، یہ مدارس حکومت پر کسی طرح کا بوجھ بنے بغیر اپنے محدود وسائل و ذرائع کے باوجود ملک کے ایک بڑے طبقے کی تعلیمی ضرورت پوری کرتے ہیں، اس کے لیے حکومت کو ان کا ممنون ہونا چاہیے نہ کہ وزیر داخلہ ایسے غیر ذمہ دارانہ بیان دے کر ان میں بے اطمینانی پیدا کریں۔

مرکزی حکومت کی وزارت تعلیم نے اعلان کیا ہے کہ مدارس کو جدید بنانے اور ان کا تعلیمی معیار بلند کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دینا چاہتی ہے، اسے ملک میں رائج تعلیم کے معیار کے مساوی مسلم نوجوانوں کو بھی تعلیم دلانے اور تعلیم سے فراغت کے بعد روٹی روزی کی مشکلات دور کرنے سے دلچسپی ہے، اس کے خیال میں حکومتی عہدوں کے لائق مدارس کے تعلیم یافتہ مسلم نوجوان نہیں ہوتے، ہم کو بھی تسلیم ہے کہ ملک کو سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقیوں سے جوڑنے کی جو کوششیں

جدید تعلیم گاہوں اور حکومت کے زیر انتظام چلنے والے اداروں میں ہورہی ہیں، دینی مدارس میں ان کی طرف سے بے توجہی ہے، اس میں ان کے وسائل و ذرائع کی کمی کا بھی دخل ہے اور بعض بعض مدارس واقعی اپنے جمود کی وجہ سے کسی تبدیلی کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ لیکن بعض بعض اپنی شناخت کو برقرار رکھتے ہوئے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوکر سائنس اور ٹکنالوجی کی برکتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں، حکومت کا جو رویہ مدارس کے ساتھ ہے، اس کے بعد وہ اس سبز باغ اور دام ہم رنگ زمین میں کیسے پھنسیں؟ اتر پردیش حکومت نے بھی پروفیسر یونس نگرامی کی سربراہی میں اسی مقصد سے ایک کمیٹی تشکیل دی ہے، اس کے ارکان میں ندوہ اور دیو بند کے لوگ بھی ہوں گے، یہ خوش آئند بات ہے مگر ابھی اس کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا۔

ایک طرف تو حکومت مدارس کی جدید کاری اور ان کے وابستگان کی روٹی روزی کے لیے اتنی فکر مند ہے لیکن دوسری طرف اس کا یہ فیصلہ بھی ہے کہ جن مدارس کے اساتذہ وملازمین کو وہ تنخواہیں دیتی ہے انہیں پنشن اور دوسری سہولتیں نہیں دے گی، وہ اردو دوستی کا بھی دعویٰ کرتی ہے لیکن سرکاری خرچ میں کٹوتی کا بہانہ بنا کر بی۔جے۔پی کی اتر پردیش حکومت نے پریس، انفارمیشن بیورو کے دفتر میں اردو اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر کا عہدہ ختم کردیا۔ سوال یہ ہے کہ پریس انفارمیشن بیورو میں دوسری زبانوں کے عہدیدار بھی تو ہیں لیکن متعصّبانہ اور سوتیلا برتاؤ اردو ہی کے ساتھ کیوں؟ اتر پردیش اردو اکیڈمی اردو طلبہ وطالبات کو عرصے سے وظائف نہیں دے رہی ہے، کتابت اسکول کے امتحان، اس کے نتائج اور وظائف میں بھی تاخیر کا عمل جاری ہے، سرکاری خرچ میں کٹوتی کرنی ہے تو وزیروں کی تعداد کم کی جاسکتی ہے، ان کے اور ممبروں کے الاؤنس، بھتے اور دوسری سہولتوں میں تخفیف کی جاسکتی ہے، کٹوتی کی ساری زد اردو ہی پر کیوں ہے۔ ع برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

(معارف دسمبر ۱۹۹۹ء)

مسلم یونیورسٹی میں شورش

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پھر شورش و ہیجان برپا ہے اور پہلے ہی کی طرح اس دفعہ بھی اس کا ذمہ دار وائس چانسلر اور یونیورسٹی انتظامیہ کو بتایا جاتا ہے چنانچہ مسلم یونیورسٹی ایکشن کمیٹی نے اپنے ایک ہنگامی اجلاس کی متفقہ قرارداد میں یونیورسٹی کی خراب صورت حال کے لیے وائس چانسلر کو

مورد الزام قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ وہ یونیورسٹی برادری کا مکمل اعتماد کھو چکے ہیں اس لیے خود مستعفی ہوجائیں یا حکومت ان کو واپس بلالے، طلبہ، اساتذہ، یونیورسٹی کے عملے کی بڑی تعداد کو وائس چانسلر کے آمرانہ اور غیر جمہوری رویے کی شکایت ہے، ان کے نزدیک بھی حالات کو خراب کرنے میں وہ ایک اہم عامل ہیں، ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کسی بڑے سرکاری منصب کے متمنی ہیں اور حکومت کو خوش کرنے کے لیے یونیورسٹی کے مفاد پر ضرب لگا رہے ہیں، وائس چانسلر کے بعض بیانات کو جن کی وہ تردید کرتے رہے ہیں طلبہ کے اشتعال اور ردعمل کا باعث بتایا جاتا ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے بحران کو ختم کرنے کے لیے ایکشن کمیٹی اور بعض مسلم تنظیمیں دہلی میں ایک اجلاس کرنے والی ہیں جو ان سطور کی اشاعت تک ہو چکا ہوگا، لیکن کیا ساری خرابیوں کے ذمہ دار صرف وائس چانسلر ہیں اور یونیورسٹی سے متعلقہ دوسرے افراد بالکل بے قصور ہیں، آخر کس کی بیہودگی اور شر پسندی سے یونیورسٹی بند ہوئی، کس کے زدوکوب اور شورش کی وجہ سے یونیورسٹی کا نظام مفلوج ہوا، کس کی من مانی اور سفیہانہ حرکتوں سے تشدد کے اتنے سنگین واقعات رونما ہوئے، کس کی توڑ پھوڑ سے یونیورسٹی کی املاک اور قیمتی اثاثے برباد ہوئے، یہ طلبہ ہی تو تھے جن کے جنون، اشتعال، برہمی اور جارحیت نے ساری آفت ڈھائی، ان کے ان غیر شریفانہ، غیر مہذب اور وحشیانہ افعال پر قوم کے بہی خواہوں اور ملت کے دردمندوں کے سر شرم سے جھک گئے، کیا طلبہ جس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اس میں ان کی ان ناروا حرکتوں کا کوئی جواز ہے؟

اس کا یہ مطلب نہیں کہ وائس چانسلر بے داغ ہیں، ان صفحات میں ان کی آمریت، سخت گیری، بے لچک رویے اور اپنے ماتحتوں کو نظر انداز کرنے کا ذکر آچکا ہے بلکہ دکھانا یہ ہے کہ یونیورسٹی جن عناصر کا مجموعہ ہے ان میں طلبہ کی یہ کارستانیاں ہیں، ان کی ناراضگی اور شکایتیں درست ہوسکتی ہیں مگر ان کا غیر ذمہ دارانہ، جارحانہ اور ناعاقبت اندیشانہ رویہ سخت مذموم ہے، یونیورسٹی کے ایک اور اہم عنصر اسٹاف ایسوسی ایشن کے بارے میں خبر آئی تھی کہ وائس چانسلر اور انتظامیہ سے نجی شکایتوں کی بنا پر اس نے تشدد کو ہوا دی اور طلبہ کو اکسایا، اس لیے صرف وائس چانسلر کو برخاست کرنے کا مطالبہ اور دوسرے عناصر کے جراثیم کو بڑھنے اور پھیلنے دینا کیسے مناسب ہے، یونیورسٹی کا قضیہ بازاروں اور سڑکوں میں لے جانے سے اس کی جگ ہنسائی اور ہوا خیزی ہوگی، اصلاح و مصالحت کا صحیح طریقہ یہ

ہے کہ یونیورسٹی سے متعلقہ لوگوں سے رابطہ قائم کر کے اصل حقائق معلوم کیے جائیں اوران کی روشنی میں گفت وشنید کی جائے ، شور وہنگامہ کے بجائے افہام وتفہیم ہی سے یونیورسٹی کے معاملات درست ہوسکتے ہیں۔(معارف جنوری ۲۰۰۰ء)

ندوۃ العلما میں پولیس کی دست درازی

ہندوستان پہلے جتنا ہی اپنی امن وانصاف پسندی، رواداری وفراخ دلی اور محبت واخوت کے لیے نیک نام تھا، اب اتنا ہی بدنام ہوتا جارہا ہے۔ہم لاکھ اپنی عظمت وبڑائی کے گن گائیں اور ملک کی ترقی اورخوشحالی کے بلند بانگ دعوے کریں لیکن آج ملک جس اخلاقی وروحانی بحران سے دوچار ہے اس سے اس کا وقار مجروح ہورہا ہے، انتشار اور بے اطمینانی کی اس فضا میں شریفوں کے دم گھٹ رہے ہیں، ملک کی جس ترقی اورخوش حالی کا غلغلہ مچا ہوا ہے، اس سے خاص خاص اشخاص اور مخصوص طبقے ہی فیض یاب اور متمتع ہورہے ہیں، عام لوگوں کی یہ حالت ہے ؎

جو گزرتے ہیں داغ پر صدمے　آپ بندہ نواز کیا جانیں

حکومت کی ساری مشنری، تمام محکمے اوردفاتر اپنی بدانتظامی، فرض ناشناسی اورنااہلی کی وجہ سے ملک کی رسوائی اور بدنامی کی علامت بنتے جارہے ہیں اور محکمہ پولیس کی بدعنوانیاں اور بے لگامیاں تو اضعافاً مضاعفہ ہیں، محافظوں اورامن وامان کے ذمہ داروں کے وحشیانہ افعال سے ملک کی ناک کٹتی اورخیر وصلاح پسند لوگوں کی گردنیں شرم سے جھکتی جارہی ہیں۔

مجرموں، خطاکاروں اور قتل وغارت گری کرنے والوں سے چشم پوشی اور مظلوموں، بیکسوں اور بے گناہوں پر قہر سامانی پولیس کا شیوہ ہے، اس طبقہ کی سطح اتنی پست اور نیچی ہوگئی ہے کہ کسی بھلے آدمی کی عزت وآبرو سلامت نہیں، جب چاہا برسرعام اسے ذلیل وخوار کردیا، جب عالم اسلام کی مایہ ناز ہستی مولانا علی میاں کے گھر کی تلاشی اوران کی سربراہی میں چلنے والے بین الاقوامی ادارہ ندوۃ العلماء پر وہ شب خون مارسکتی ہے تو مولوی عتیق الرحمن کی تذلیل وتوہین اورعام مدارس پر دھاوا بولنے میں اسے کیا تکلف ہوسکتا ہے۔اس کی حرص وطمع اتنی بڑھ گئی ہے کہ مظلوم اورستم رسیدہ شخص اگر تنگ دست اورمحتاج ہو تو اس کا کام نہیں ہوسکتا، ان لوگوں میں تعصب اورفرقہ واریت کا زہر اس طرح سرایت کرگیا ہے کہ اقلیتیں برابر ان کی چیرہ دستی کا شکار رہتی ہیں، ان کو فرضی اورجھوٹے اور بے بنیاد

مقدمات میں پھنسا کر سو طرح سے پریشان کیا جاتا ہے، فسادات میں اس کی طرف سے بلوائیوں کو لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی مکمل چھوٹ ملی رہتی ہے اور کرفیو میں خود پولیس اقلیتوں پر مظالم ڈھاتی ان کے مال و اسباب لوٹتی اور ان کی عزت و آبرو سے کھلواڑ کرتی ہے۔ (معارف مئی ۲۰۰۰ء)

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پولیس کی دہشت گردی

۹/ اپریل کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پولیس کی دہشت گردی، اس کی درندگی، خباثت، ظلم و زیادتی اور اقلیت دشمنی کا تازہ شاہکار ہے۔ اسے دو مجرموں کی تلاش تھی جو اطلاعات کے مطابق جامعہ کے طالب علم نہیں تھے، لیکن کہا جاتا ہے کہ ان کو پکڑنے کے لیے پولیس وائس چانسلر کی اجازت کے بغیر کیمپس میں داخل ہوگئی اور جب کچھ طلبہ کی مزاحمت کی وجہ سے اسے کامیابی نہیں ملی تو دوبارہ وہ ہزار بارہ سو کی تعداد میں آکر جامعہ کے طلبہ پر اس طرح حملہ آور ہوئی جیسے کسی دشمن ملک کی فوج پر حملہ کر رہی ہو، طلبہ امتحانات کی تیاری اور لائبریری اور ہاسٹل میں پڑھنے میں مصروف تھے، ان دونوں میں گھس کر طلبہ کو گھسیٹ کر مارا، بعض کے ہاتھ پیر توڑ دیے، بعض کو تیسری منزل سے نیچے گرادیا، متعدد طلبہ بے ہوش ہوگئے، داڑھی والوں کی داڑھیاں نوچیں اور انہیں آئی۔ایس۔آئی کا ایجنٹ کہا، طلبہ کے مال و اسباب بھی لوٹے، توڑ پھوڑ کر کے ان کے اور جامعہ کے املاک کو نقصان پہنچایا، ہاسٹل کے پرووسٹ اور لائبریری کے اسٹاف پر بھی دست ستم دراز کیا، مسجد کی بے حرمتی کی اور امام سمیت نمازیوں کو بھی نہ بخشا، سیکڑوں طلبہ کو گرفتار کیا جن کو حراست میں بھی پولیس کی بربریت کا سامنا کرنا پڑا، پھر جھوٹے اور غلط مقدمات عائد کر کے تہاڑ جیل بھیج دیا، غرض جو ظلم و تشدد غنڈوں، ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ لوگوں پر بھی نہیں کیا جاتا وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسی عظیم الشان قومی تعلیم گاہ کے طلبہ پر کیا گیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاریخ خلافت و ترک موالات کی تحریک اور جہاد آزادی سے جڑی ہوئی ہے، گاندھی جی نے انگریزوں کے خلاف نان کوآپریشن کی جب تحریک چلائی تو آزادی کے متوالے طلبہ و اساتذہ نے سرکاری تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کر کے سودیشی درس گاہوں میں داخلہ لیا، مولانا محمد علی اور دوسرے قومی رہنماؤں کی اپیل پر جن طلبہ نے علی گڑھ کو خیرباد کہا ان کی تعلیم کے لیے وہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کی گئی جو بعد میں دہلی منتقل ہوئی۔ اس قومی درسگاہ کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اپنے بستر علالت سے تشریف لائے تھے اور ان کا درد و اخلاص سے

بھرا خطبہ ان کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھا تھا، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں وغیرہ نے اسے اپنے خون جگر سے سینچ کر پروان چڑھایا مگر آزادی کے بعد یہ قومی درسگاہ فرقہ پرستوں کی نظر میں کھٹک رہی ہے، اس کے طلبہ پر یہ پولیس ایکشن اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کا کوئی قانونی جواز نہ تھا، عجیب بات ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی حب الوطنی پر ان لوگوں کی طرف سے شکوک ظاہر کیے جارہے ہیں جو جامعہ کی تاسیس کے وقت انگریزی سامراج کا دفاع کررہے تھے۔

پولیس کے اس وحشیانہ اقدام سے جامعہ اور اس کے طلبہ سے زیادہ ملک کی رسوائی اور بے عزتی اور حکومت کی بدنامی ہوئی ہے، اس لیے ارباب حکومت اور خاص طور پر مرکزی وزیر داخلہ کو پولیس کے آئے دن کے ان ناروا مظالم کا سدباب کرنا چاہیے، پولیس کی گندہ ذہنیت، اقلیتوں کو ہراساں کرنے اور اس کے تعصب پر مبنی رویے کی اصلاح کرنی چاہیے، دہلی پولیس تو براہِ راست مرکزی وزارت داخلہ ہی کے ماتحت ہے، جامعہ کے تعلق سے اس کا صریح ظلم اور کھلی زیادتی طشت از بام ہوچکی ہے، اب بھی اگر حکومت ان کو سزا اور مظلوموں کی دادرسی نہیں کرتی تو لوگ اس کے متعلق یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ اس کا کردار صاف ستھرا اور اقلیتوں کے معاملے میں منصفانہ نہیں ہے، وہ قومی اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے بجائے ملک کے مختلف فرقوں میں نفرت اور فرقہ پرستی کا زہر گھول رہی جس سے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے، جامعہ کے طلبہ، اسٹاف اور دوسرے مسلم اداروں کو بھی اس طرح کے اشتعال انگیز موقعوں پر ضبط و تحمل کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے، پولیس، حکومت اور وائس چانسلر کے رویے کو نظر انداز کرکے ایسے اقدامات سے باز رہیں جن سے فرقہ پرستوں کو کھل کھیلنے کا موقع ملے، ہوش مندی اور تدبر سے کام لیں تاکہ نہ ان کی قوم و ملت کا نقصان ہو اور نہ ملک و وطن پر کوئی آنچ آئے۔ (معارف مئی ۲۰۰۰ء)

فرقہ پرستانہ جارحیت اور مسلم یونیورسٹی

ہندوؤں کی فرقہ پرست جارحیت اور احیائیت پسند جماعتیں، مسلمانوں کو پریشان، تنگ اور خوف زدہ کرنے کے لیے برابر کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتی اور نئی نئی سازشیں کرتی رہتی ہیں۔ ان کے خیال میں ملک میں رونما ہونے والے اکثر بدنما واقعات کے ذمہ دار مسلمان ہوتے ہیں، آئے دن کے بم دھماکوں میں ان کا ہاتھ رہتا ہے، عیسائیوں پر حملے اور انہیں اور ان کے گرجاؤں کو نذر آتش

کرنے میں ان ہی کا دخل تھا، فرقہ وارانہ فسادات کی ابتدا ان کی جانب سے ہوتی ہے، کیونکہ مسجدوں کے پاس سے گزرنے والے جلوس پر وہی پتھراؤ کرتے ہیں، حد یہ کہ مسلمانوں کا ایک فرد یا ان کا چھوٹا سا گروہ بھی اگر کسی غلطی کا مرتکب ہوتا ہے تو یہ انتہا پسند لوگ اسے سارے مسلمانوں کا جرم سمجھ کر ان کو تشدد اور جارحیت کا نشانہ بنائے بغیر دم نہیں لیتے، ان کے خیال میں اکثر مسلمان ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث اور ملک دشمنوں کا آلۂ کار ہوتے ہیں، پہلے وہ صرف آئی۔ ایس۔ آئی کے ایجنٹ تھے، اب کشمیر کی جنگ جوؤں اور انتہا پسند تنظیموں سے بھی انہوں نے ہاتھ ملا لیا ہے، اس طرح مسلمانوں کے خلاف نفرت اور بدگمانی کا ماحول بنایا جاتا ہے اور ملک کی خاموش اور پُر امن فضا میں حرکت اور لہر پیدا کی جاتی ہے۔

فسطائی جماعتیں بہت منظم طریقے سے مسلسل جھوٹی اور فرضی باتیں اختراع کرتی ہیں جن کو ملمع کاری کے بعد ان کے ہم نوا اخبارات پورے ملک میں مشتہر کر کے مسلمانوں کو مجروح اور ان کی حب الوطنی کو مشکوک بنا دیتے ہیں، واقعات کی تحقیق اور حقائق کا پتہ کون لگاتا ہے، جب تک مسلمانوں کے ذمہ دار افراد اور جماعتیں ان کی تردید کر کے اصل حقیقت اور صحیح صورت حال سامنے لاتے ہیں تب تک یہ بے بنیاد اور جھوٹی خبریں پھیل کر اپنا اثر دکھا چکی ہوتی ہیں اور مسلمان ناکردہ گناہوں کا خمیازہ بھگت رہے ہوتے ہیں، مرکز اور اتر پردیش میں جب سے بی۔ جے۔ پی کی حکومتیں قائم ہوئی ہیں ان لوگوں کو اور کھل کھیلنے کا موقع مل گیا ہے، مسلمان تو ان جھوٹے اور فرضی واقعات کی وجہ سے فوراً گرفتار کر لیے جاتے ہیں، حراست اور جیل میں ان پر ہر قسم کا تشدد روا رکھا جاتا ہے اور انہیں سخت جسمانی اور ذہنی اذیتیں دی جاتی ہیں، زور، زبردستی اور زدوکوب کر کے پولیس جیسا چاہتی ہے ان سے بیان لے کر انہیں فرضی مقدمات میں پھنسا کر تنگ کرتی رہتی ہے، صحیح صورت حال سامنے آجانے کے بعد بھی ان کی جاں بخشی نہیں ہوتی لیکن جھوٹی افواہیں پھیلانے اور پُر امن ماحول کو خراب کرنے والوں سے نہ کوئی تعرض کیا جاتا ہے اور نہ نفرت اور اشتعال پھیلانے والے اخباروں کے خلاف کوئی کارروائی کی جاتی ہے۔

چند ماہ قبل مسلمانوں کے دینی مدارس کو بدنام اور متہم کرنے کے لیے بڑی شد و مد سے مہم چلائی گئی تھی اور اسی دوران بعض وزیروں نے مسلمانوں کو ''دیش دروہی'' کا خطاب مرحمت کیا تھا اور

مدارس کو آئی۔ایس۔آئی کا اڈہ قرار دیا تھا، ملک کی سب سے مایہ ناز ہستی مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے گھر اور ان کے محبوب اور بین الاقوامی ادارہ ندوۃ العلما پر شب خون مارا گیا، پھر متعدد بڑے مدارس کے ساتھ معمولی شکوک کی وجہ سے نہایت اوچھی حرکتیں کی گئیں لیکن نہ کہیں آئی۔ایس۔آئی کا سراغ لگا اور نہ کوئی قابل اعتراض مواد ملا، تب بھی ان بے قصور ذمہ داروں کو مہینوں حراست اور جیل میں رکھا گیا اور سخت سزائیں اور ذہنی اذیتیں دی گئیں تاکہ مسلمانوں اور دینی مدارس میں دہشت اور سراسیمگی پھیلے ملک کی فضا مسموم ہو اور شریف اور امن پسند ہندوؤں میں بھی مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکے، یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ مسلمانوں کے کالجوں اور یونیورسٹیوں پر یورش ہونے لگی، ایک بڑے نیشنل کالج میں جس کو علامہ شبلی جیسے شہرۂ آفاق عالم و مصنف اور محب قوم و وطن بزرگ سے نسبت کا فخر حاصل ہے، اس کی لپیٹ کا نشانہ بنا، شبلی اکیڈمی جیسا بین الاقوامی ادارہ بھی آیا اور شہر کے معزز مسلمان ڈاکٹروں کی دوکانیں توڑی اور جلائی گئیں، ملک کی ممتاز قومی یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں جو ظلم آرائیاں ہوئیں اس کی مثال انگریزوں کے زمانے میں بھی نہیں ملے گی، ابھی تک ان اداروں کے بے گناہ طلبہ و اساتذہ پر جو فرضی مقدمات قائم کیے گئے تھے وہ واپس نہیں لیے گئے۔

یہ سب کچھ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر یلغار کی تقریب و تمہید تھی۔ابھی تک اس کے بارے میں جو حقائق سامنے آئے ہیں وہ حکومت کی بدنیتی اور پولیس کی زیادتی کو عیاں کرنے کے لیے کافی ہیں، پولیس کی نظر میں عبدالمبین مشتبہ تھا، اس کی اور آئی۔بی۔آفیشل کے ساتھ ہتک کرنے والے طلبہ کی گرفتاری بجا تھی، مگر گرفتاری کا جو طریقہ اختیار کیا گیا اور آئی۔بی۔آفیشل جس ڈرامائی انداز میں یونیورسٹی کے ایک ہوسٹل میں داخل ہوا وہ غلط ہی نہیں اشتعال انگیز تھا، ناپختہ ذہن طلبہ کا مشتعل ہونا فطری تھا، وائس چانسلر قابل مبارک باد ہیں کہ طلبہ کو ٹھنڈا کر کے یونیورسٹی کو خلفشار سے بچالیا اور تعلیمی سلسلہ موقوف ہونے نہیں دیا، اس کے باوجود یونیورسٹی کو بند کرنے اور سارے ہوسٹلوں کی عام تلاشی کے لیے اصرار غلط ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ایس۔آئی۔ایم اور حزب المجاہدین سے عبدالمبین کے تعلق کی حقیقت تفتیش کے بعد ہی ظاہر ہوگی، لیکن کیا تنہا ایک شخص کی وجہ سے ساری یونیورسٹی کو آئی۔ایس۔آئی کا اڈہ اور دہشت گردوں کی پناہ گاہ قرار دینا مناسب ہے؟ پھر ایس۔آئی۔ایم سے کسی کا تعلق اس کے ساتھ پولیس کے ظلم و تشدد کے لیے وجہ جواز تو نہیں ہوسکتا، ایک برسوں پرانی تنظیم پر جس کی کسی وطن

دشمن سرگرمی کا علم ابھی تک نہیں اور دوسری مسلم جماعتوں پر پابندی لگانے کا مطالبہ سراسر آمریت اور صریح ظلم ہے، کئی جگہ تبلیغی جماعت جیسی بے ضرر تنظیم کے ساتھ پولیس کی ظالمانہ کارروائیاں ایک جمہوری اور سیکولر ملک کے لیے نہایت شرمناک ہے۔ (معارف اکتوبر ۲۰۰۰ء)

ایس۔آئی۔ایم پر پابندی

اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے بارے میں بی۔جے۔پی ناانصافی، زیادتی اور دوہرے معیار کو اپنا ہوئے ہے، اسٹوڈنٹس اسلامک مومنٹ پر پابندی لگانا اس کا بین ثبوت ہے، ملک کے عام باشندے تو درکنار خود مسلمانوں میں بھی کم ہی لوگوں کو اس تنظیم سے واقفیت تھی، اس کے مقابلے میں وشو ہندو پریشد، بجرنگ دل، آر۔ایس۔ایس، شیوسینا جیسی فسطائی جماعتیں کھلم کھلا تشدد و نفرت پھیلا رہی ہیں، مگر غالباً ان کو اس لیے کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے کہ وہ اتر پردیش کے آنے والے انتخابات میں بی۔جے۔پی کا ہراول دستہ بنیں اور زور زبردستی اور دھاندلی سے اس کی شکست کو جو یقینی سمجھی جارہی ہے فتح میں تبدیل کردیں، لکھنؤ میں سیمی کی گرفتاری پر چار نوجوان پولیس کی گولیوں کا نشانہ بھی ہوگئے جس کے لیے بعض اخباروں، عوام اور سیاسی پارٹیوں نے پولیس پر بے جا طاقت کے استعمال کا الزام بھی لگایا ہے، لیکن وزیر اعظم نے پولیس کی صفائی دیتے ہوئے فرمایا کہ مظاہرین نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پولیس کو زخمی کردیا، سوال یہ ہے کہ مظاہرین تو اکثر قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں، ابھی چند روز پہلے دیگے کی موت پر شیوسینا کے کارکنوں نے آسمان سر پر اٹھالیا تھا، تب پولیس کیوں خاموش تماشائی بنی رہی، دراصل وزیر اعظم ان کی حکومت اور پارٹی کا معیار ہی دہرا ہے، اگر مسلمان مظاہرہ کریں تو وہ لایق گردن زدنی اور اس قابل بھی نہیں ہیں کہ وزیر اعظم ان کی موت پر اظہار افسوس کریں اور ان کے اعزہ کی تسکین اور ہمدردی کا کوئی لفظ کہیں ع

یہ باغباں کا ظرف ہے چمن چمن کی بات ہے

(معارف اکتوبر ۲۰۰۱ء)

ہمدرد اسٹڈی سرکل

حکیم عبدالحمید مرحوم کے ایما سے ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کا ذیلی ادارہ ہمدرد اسٹڈی سرکل اقلیتوں اور دوسرے پس ماندہ طبقات کے امیدواروں کو سول سرویسز میں داخلے کے امتحان کے لیے

تیار کرا کے اپنا شاندار ریکارڈ قائم کر چکی ہے، اقلیتوں کی نمایندگی دفاعی خدمات یا ڈیفنس سرویسز میں بھی بہت کم رہ گئی ہے، اس لیے یونین پبلک سروس کمیشن کے متعلقہ امتحانوں کے لیے بھی مسلمان اور دوسرے پس ماندہ طبقات کے امیدواروں کو تربیت دینے کے لیے سوسائٹی نے اپنے صدر عبدالمعید صاحب سے منظوری لے کر طے کیا کہ ڈیفنس سرویسز کا جو امتحان یونین پبلک سروس کمیشن کی طرف سے مختلف مراکز میں ۷/ اپریل ۲۰۰۲ء کو لیا جائے گا اس کے لیے ۷/ جنوری ۲۰۰۲ء سے ہمدرد کوچنگ سینٹر تعلیم آباد میں تربیت دی جائے گی۔ سروسز کے سلسلے کی مزید معلومات کے لیے ۳/ نومبر ۲۰۰۱ء کا ''امپلائمنٹ نیوز'' یا ''روزگار سماچار'' دیکھیں اور کوچنگ کے بارے میں مزید معلومات ڈائرکٹر ہمدرد کوچنگ سینٹر تعلیم آباد، سنگم وہار دہلی۔ 110062 (ٹیلی فون نمبر 6088848) سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ جناب سید حامد صاحب کو توقع ہے کہ ''فوج، بحریہ اور فضائیہ میں اگر ہم بڑی تعداد میں داخل ہو سکے تو ایک طرف مسلمانوں کی ساکھ میں اضافہ ہوگا۔ دوسری طرف ان کے خلاف عصبیت اور ان سے اہل وطن کی دوری میں کمی آئے گی۔ (معارف دسمبر ۲۰۰۱ء)

گودھرا سانحہ

ملک میں رہ رہ کر بھیانک جنگل راج قائم ہو جاتا ہے اور امن، انصاف اور قانون کی حکومت کا خاتمہ ہو جاتا ہے، تشدد اور فرقہ وارانہ جنون کی لہر اتنے زور شور سے اٹھتی ہے کہ امن و سکون، شرافت و انسانیت اور اخوت و محبت کو خس و خاشاک کی طرح اڑا لے جاتی ہے، حکومت کی مشنری معطل ہو جاتی ہے اور وہ شر و فساد کو روکنے، امن و امان قائم کرنے اور مظلوموں اور آفت زدہ لوگوں کی مدد و حمایت سے جو اس کا فرض ہے ہاتھ کھینچ لیتی ہے اور شر و فساد برپا کرنے والوں کی ساتھی بن جاتی ہے، ہندوستان جب آزاد ہوا تھا تو ملک میں جنگل کا یہی قانون رائج تھا، نفرت و اشتعال کی آگ بھڑکی ہوئی تھی، لوٹ مار، وحشت و درندگی اور قتل و خوں ریزی حد انتہا کو پہنچ گئی تھی، ہندوستان کے محسن اعظم گاندھی جی دنیا بھر میں سچائی اور امن کے دیوتا کی حیثیت سے مشہور تھے، وہ جب اپنے ہم وطنوں کو ہنسا سے روکنے، اخوت اور ہندو مسلم اتحاد کا درس دینے کے لیے سامنے آئے تو کسی نے بات پوچھنا تو درکنار خود ان ہی کی ہتیا کر دی، اس وقت کہا جاتا تھا کہ یہ تقسیم کا ردعمل ہے، جلد ہی وحشت و بربریت کا دور ختم ہو جائے گا، وقت گذرنے کے ساتھ سارے زخم بھر جائیں گے اور سب لوگ ماں

جائے بھائیوں کی طرح مل جل کر رہنے لگیں گے۔

وقت گذرتے دیر نہیں ہوتی، ملک کو آزاد ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذرا مگر اسے جنگل راج سے چھٹکارا نہیں ملا، زخم پر زخم لگتے رہتے ہیں، ایک زخم بھرتا نہیں کہ اس سے کاری دوسرا زخم لگ جاتا ہے، ہر صبح ایک مصیبت کا پیش خیمہ بن کر طلوع ہوتی ہے اور ہر روز شورشِ محشر لیے ہوئے ہوتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ لوگ پرانے زخموں کو بھول جاتے ہیں اور نئی مصیبت ہی پر واویلا کرتے ہیں، ایک حماسی شاعر کہتا ہے:

علی انها تعفو الکلوم وانما نو کل بالا دنی وان جل مامضی

اب تک آزادی کے بعد سے کتنے لرزہ خیز واقعات رونما ہوئے، گو عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے اور رنج کا خوگر ہونے کے بعد رنج مٹ جاتا ہے، بابری مسجد کے انہدام کے بعد ملک نے کتنے روز سیاہ دیکھے، کان پور اور اس کے ضمن میں ہونے والے واقعات تو ابھی بالکل تازہ ہیں مگر ذہنوں سے محو ہو چکے ہیں، ہاں بمبئی کی سفاکی وخوں ریزی اور شیوسینا کی وحشت و درندگی ایسی سخت تھی کہ بھلائے نہیں بھولتی، ابھی لوگ اسے بھولے بھی نہیں تھے، کہ گجرات کے خوں چکاں واقعات سے پورے ملک میں زلزلہ آ گیا ہے، گاندھی جی کی یہ سرزمین پہلے بھی مسلمانوں کے خون سے لالہ زار ہوتی رہی ہے اور خدا جانے کب مسلمانوں کے خون سے اس کی تشنگی بجھے گی، سال بھر پہلے وہاں ہولناک زلزلہ آیا جس کے جھٹکے ساری دنیا نے محسوس کئے اور اپنے کلیجے نکال کر رکھ دیئے اور اب جو بھونچال آیا ہے تو سارا ملک شرم سار ہے اور ساری دنیا میں ہندوستان کی رسوائی ہو رہی ہے۔

یہ ظلم وتشدد اور گجرات میں کئی روز ہونے والی آتش زنی اس لیے ہوئی کہ سابرمتی اکسپریس کی بعض بوگیوں میں شر پسندوں نے آگ لگادی تھی جس سے ایک بوگی اور ۵۷ افراد جل کر خاکستر ہو گئے تھے اور اس سے بھی زیادہ لوگ زخمی ہو گئے تھے، یہ گھناؤنا، بے رحمانہ اور وحشیانہ واقعہ سخت قابلِ مذمت ہے، جو لوگ بھی اس کے مرتکب ہیں، انہیں قرار واقعی سزا ملنی چاہئے، لیکن مجرموں کو عبرت ناک سزا دینا حکومت کا کام ہے جو لوگوں کے جان ومال کی محافظ اور امن وامان قائم کرنے کی اصل ذمہ دار ہے مگر اس کو شر پسندوں اور فساد وبلوہ کا موقع ڈھونڈنے والوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور تقریباً ایک ہفتے تک آگ وخون کی ہولی کھیلنے اور بے قصور شہریوں کی جان، مال، اسباب

اور جائداد لوٹتے اور تباہ کرتے رہے، حکومت نے ان سے مزاحمت کرنے کے بجائے کرفیو لگا کر ان کا کام آسان کر دیا، وہ ہر جگہ دندناتے پھر کر پولیس کی سرپرستی میں آتش زنی اور قتل و غارت گری کرتے اور اقلیتوں کے محلوں کو مرگھٹ بناتے رہے، کرفیو صرف اقلیتوں کے لیے تھا کہ وہ اپنا کوئی بچاؤ نہ کرسکیں اور گھروں میں محصور ہو کر لٹیروں اور بلوائیوں کو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیں اور گھر سے باہر ہونے پر یہ ہتھیار بند لوگ انہیں اپنی گولیوں کا نشانہ بنا دیں، بہار کے سوشلسٹ اور سیوکلر وزیروں کو صرف بہار ہی کا جنگل راج دکھائی دیتا ہے اور بی۔ جے۔ پی کی مرکزی حکومت جمہوریت کا خون کر کے بہار اور اتر پردیش میں صدر راج قائم کر سکتی ہے لیکن گجرات کی نااہل اور نکمی حکومت کو برخواست نہیں کر سکتی ہے، وہ سیمی جیسی بے ضرر تنظیم پر پابندی لگا سکتی ہے مگر وشو ہندو پریشد اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے والی ضرر رساں تنظیم پر کوئی قدغن نہیں لگا سکتی، کیا یہ دہرا معیار نہیں ہے؟۔

گودھرا میں ٹرین کی بوگیاں جلانے والوں کا پتہ اتنی جلدی کیسے چل گیا کہ یہ مسلمان تھے اس لیے احمد آباد اور دوسرے شہروں میں اس کا ردعمل شروع ہو گیا، کیا اس لیے کہ جلائے جانے والے کارسیوک تھے، یا اس لیے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ جہاں ٹرین رکی تھی، وہاں مسلمانوں کی آبادی تھی، کیا ایسے ہی مفروضات اور قیاسات کی بنیاد پر پوری ریاست کو آگ میں جھونک دینا اور مسلمانوں کو کچل ڈالنا کسی ذمہ دار حکومت کے لیے مناسب تھا، قیاس تو یہ کہتا ہے کہ بوگی میں جلنے والے کارسیوک نہیں تھے کیوں کہ ان میں عورتوں اور بچوں کے مقابلے میں مردوں کی تعداد بہت کم تھی، کارسیوک تو پوری گاڑی میں تھے، اگر ان ہی کو جلانا ہوتا تو ایک ہی بوگی کیوں جلائی جاتی اور اگر واقعتاً ان ہی کو جلانے کے لیے یہ حرکت کی گئی تھی تو وہ جس طرح کے لوگ تھے اس کا اندازہ ان کے سیٹوں اور برتھوں پر زبردستی قبضہ کر لینے اور کھانے پینے کی چیزیں بلا قیمت لے لینے سے ہوتا ہے، بھلا ایسے دھینگا مشتی کرنے والے ٹرین میں روکے جانے کے بعد اس بوگی سے بھاگ نہیں گئے ہوں گے، اور ساری بلا بے چارے کمزوروں، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کے سر گئی مگر یہ ساری باتیں اٹکل پچو ہے، بعد میں ہونے والے واقعات کی ساری ذمہ داری گجرات کی حکومت پر ہے، جس کے سربراہ نے فساد کے جواز کے لیے ردعمل کا راستہ ڈھونڈ نکالا اور اپنی نااہلی کو چھپانے کے لیے یہ تاثر دے کر فضا کو اور مسموم کر دیا کہ جلانے والے مسلمان اور جلنے والے کارسیوک تھے، اگر یہ صحیح بھی ہو تو ایک ہفتہ تک ان کی

حکومت مفلوج اور ساری باگ ڈور عملاً فسادیوں اور بلوائیوں کے ہاتھ میں کیوں چلی گئی تھی۔

اصل واقعات وحقایق تو تفتیش کے بعد ہی سامنے آئیں گے جس کی امید نہیں لیکن اگر آ بھی جائیں تو اس جنگل راج میں کیا ہوگا، بمبئی، ملیانہ اور ہاشم پورہ کے مجرموں کا کیا بگڑا؟ سنگھ پریوار کے لوگ جس قسم کا ماحول بنانے میں ایک مدت سے لگے ہوئے ہیں اس میں ملک ترقی نہیں کرسکتا، اسی طرح کے فسادات ہوتے رہیں گے، ملک کے باشندوں میں کشیدگی اور دوری بڑھا کر زمین کو اتنا سنگلاخ بنادیا گیا ہے کہ اب میل ملاپ، الفت ومحبت اور ہمدردی واخوت کے پودے کا برگ وبار لانا ممکن نہیں، اقلیت دشمنی اس کی گھٹی میں داخل ہے، مسلمانوں کو خائف، ہراساں اور دہشت زدہ کرنا اور زبردستی اپنے عقائد وخیالات ان پر مسلط کرنا اور ان کی تہذیب وثقافت کو مٹانا ان کا شیوہ ہے، گو ملک میں ابھی بڑا طبقہ مشترکہ گنگا جمنی تہذیب سے جڑا ہوا ہے، لیکن بی۔ جے۔ پی کے برسر اقتدار آنے سے فسطائیت پسندوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں مگر اسے سمجھنا چاہئے کہ یہ سستے، سطحی اور اوچھے طریقے بہت دنوں تک نہیں چل سکتے، ان سے صرف اس کو عارضی فائدے ہوں گے، حکومتیں حق وعدل، مخلوق کی خدمت اور نفع رسانی سے باقی رہتی ہیں اور ظلم، تشدد، بدعنوانی، ناانصافی اور کرپشن سے ختم ہوجاتی ہے۔ (معارف مارچ ۲۰۰۲ء)

گجرات فسادات

گجرات کے بھیانک فساد کو کون بھول سکتا ہے، چار پانچ مہینے سے وہاں مسلسل قتل وخوں ریزی اور شیطنت وحیوانیت کا ننگا ناچ ہورہا ہے، صرف جان ومال کا اتلاف ہوتا تو یہ کہہ کر دل کو تسلی دی جاسکتی تھی کہ ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے، وہاں جو کچھ ہوا اور ہورہا ہے انسان تو درکنار وحشی اور درندے بھی ایسا نہیں کرتے، گھر کے گھر اور بھرے پرے خاندان پھونک دیے گئے، معصوم بچے اور عورتیں جلادی گئیں، حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کرکے جنین سمیت انہیں ماردیا گیا، عورتوں کو برہنہ کرکے ان کی عزتیں لوٹی گئیں، ان کے قریبی عزیزوں کی موجودگی میں ان کی عصمتیں برباد کی گئیں۔ مسجدیں، درگاہیں، اور بزرگان دین کے مزار مسمار کرکے ان پر مندر، مکان اور سڑکیں بنادی گئیں، یا ہموار اور مسطح کرکے انہیں شاہراہوں اور گزرگاہوں میں تبدیل کردیا گیا، کیا یہ حرکتیں کرنے والے انسان تھے، یا چوپایے بلکہ چوپایوں سے بھی بدتر، اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ

هُمۡ اَضَلُّ سَبِيۡلاً یا پھر وہ شیطانِ لعین جو اپنی اسی طرح کی حرکتوں پر فخر سے کہتا ہے

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو

ایک طرف ان خوں خواروں کی یہ شیطنت، درندگی اور ہوس ناکی دوسری طرف ان کی ایسی عیاری، ہوشیاری اور چالاکی کہ شیطانی وحیوانی حرکتوں اور گھناؤنے جرائم میں ملوث ہونے کے بعد بھی وہ بے دھڑک دندناتے پھر رہے ہیں، بے خطا اور سفید پوش بنے ہوئے ہیں، نہ سماج نے ان پر کوئی نکیر و ملامت کی اور نہ حکومت اور قانون کی گرفت میں وہ آسکے، نہ ایف۔آئی۔آر درج اور نہ چارج شیٹ لگی اور اگر لگی بھی تو وہ کھیل تماشا بن گئی، ان کا کوئی بال بیکا نہ ہوا، اس لیے کہ حکومت خود انہیں بچانے اور ان کے جرموں کی پردہ پوشی میں لگی ہوئی ہے، انہیں ان کی وحشت و درندگی، فرقہ واریت کا زہر پھیلانے اور ملک کے فرقوں کا بٹوارہ کردینے پر انعام اور شاباشی دے رہی ہے، کیوں کہ خود اسے نہ ملک کا مفاد عزیز ہے، نہ دنیا بھر میں اس کی رسوائی اور بدنامی کی پروا، نہ اس سے دلچسپی ہے کہ ملک سے خرابیاں اور بدعنوانیاں دور ہوں بلکہ صرف اپنے اقتدار سے غرض ہے اور وہ بھی جیسے تیسے پورا ہندوستان یہاں تک کہ این۔ڈی۔اے کے اس کے حلیف بھی گجرات کے ہٹلر اعظم کو ہٹانے کے لیے چیختے چلاتے رہے مگر ع خلقے بمنت اک طرف آں شوخ تنہا اک طرف۔ کیا اندھیر ہے کہ کل تک جو لوگ بہار کے جنگل راج کا ڈھنڈھورا پیٹ کر وہاں اور اب کشمیر میں منصفانہ انتخابات کرانے کے لیے صدر راج قائم کرنے کے لیے بے چین ہیں، انہیں گجرات کا جنگل راج سجھائی ہی نہیں دیتا اور نہ وہاں منصفانہ انتخاب کرانے کا احساس ہے بلکہ سیاسی کامیابی کا امکان دیکھ کر قبل از وقت ہی انسانیت کے قاتلوں اور حیوانیت کے سرپرستوں کے زیر نگرانی الکشن کرانے جارہے ہیں،

ع ایں کہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بہ خواب

گجرات کی آگ بھڑکنے سے ایک روز پہلے گودھرا کا بہت قابل مذمت اور شرم ناک واقعہ پیش آیا تھا جس میں ۵۹ افراد مارے گئے تھے، جو حکومت کے بیان کے مطابق ''کارسیوک'' تھے، اس لیے گجرات سے لے کر مرکز تک ہر ایک اور خود نسیان میں اکثر مبتلا ہوجانے والے وزیر اعظم کو بھی نیوٹن کی تھیوری یاد آگئی، جس کو گجرات کے بھیانک المیے کے جواز کا بہانہ بنالیا گیا اور تحقیق و تفتیش کے بغیر ہی گودھرا واقعہ کے لیے مسلمانوں کو موردِ الزام قرار دے کر ان کی اندھا دھند

گرفتاریاں کی گئیں، جو ابھی تک محبوس ہیں، اور اگر ضمانت بھی ہوجائے تو پتہ نہیں کب تک عدالتی کارروائی اور مقدمہ چلتا رہے گا، گودھرا واقعہ میں مسلمانوں کے ملوث ہونے اور حکومت کی نیت کے بارے میں اول روز ہی سے شک وشبہہ ظاہر کیا جارہا تھا، حکومت واقعہ کی تفتیش نہ کرکے اور جلنے والے بوگی کے مسافروں کی تعداد نہ بتاکر اصل حقائق کو چھپانا چاہتی تھی، مگر اب یہ حقیقت سامنے آرہی ہے کہ گودھرا سانحہ اور گجرات المیہ میں ایک ہی ہاتھ تھا اور گودھرا کا ڈرامہ گجرات کی جنوبی کارروائیاں عمل میں لانے ہی کے لیے رچا گیا تھا۔

ہمارا اشارہ فورسینک سائنسی لیباریٹری تحقیقات کی جانب ہے جس کو عملی تجربے سے پتہ چلا کہ ڈبے میں آتش زنی باہر سے نہیں اندر سے ہوئی تھی، باہر سے تو کوئی سیال مادہ اندر پھینکنا ممکن ہی نہیں تھا، حکومت پر اپوزیشن کا الزام ہے کہ گودھرا ٹرین واقعہ کچھ بہانہ بناکر دانستہ اس نے یہ تاثر پیدا کیا کہ اقلیتی فرقہ کے لوگوں نے ٹرین کے ڈبہ میں آگ لگائی جس کے نتیجے میں ریاست کے دوسرے حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات بھڑک اٹھتے تھے، سابق مرکزی وزیر رام ولاس پاسوان نے گودھرا میں جلی ہوئی کوچ نمبر ٦ دیکھنے کے بعد کہا کہ ''یہ کوچ باہر سے ٹھیک ہے، آگ صرف اندر لگی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ آگے پیچھے کسی ڈبے کو خراش تک نہ پہنچی، افسوس کی بات یہ ہے کہ بغیر کسی جانچ کے اس واقعہ کا ذمہ دار اقلیت کے لوگوں کو ٹھہرادیا گیا، کسی اور کو کیا کہا جائے جب خود وزیر اعظم نے گوا میں تحقیق وثبوت کے بغیر یہ غیر ذمہ دارانہ بیان دے کر کہ ''اگر گودھرا والا سانحہ نہ پیش آتا تو گجرات میں فسادات نہ ہوتے''۔ فرقہ پرستوں اور شرپسندوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کے لیے جواز کا راستہ پیدا کیا، ہمیں خوشی ہے کہ فسطائیت اور فرقہ پرستی کے اس زہرناک ماحول میں کمزور اور نحیف ہی سہی حق کی آواز بھی کبھی کبھی سنائی دے دیتی ہے، ری پبلیکن پارٹی آف انڈیا کے رکن مسٹر پرکاش امبیڈکر اسی رپورٹ کے پس منظر میں کہتے ہیں ''حکومت پر لازم ہے کہ وہ عوام کے سامنے اس سلسلے میں وضاحت پیش کرے'' اور مسلم لیگ کے لیڈر جی ایم بنات والا نے کہا ''حکومت کو عوام کے سامنے جواب دہی کرنی پڑے گی کہ کس طرح ایک اقلیتی مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو گھڑے ہوئے معاملہ کا شکار بنایا گیا، اب یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ گودھرا والے واقعہ میں مسلمانوں کا ہاتھ نہیں تھا'' مگر شاعر وزیر اعظم کی شوخ اداؤں سے اقلیتوں کی جو جانیں گئیں ان کا کیا ہوگا؟ (معارف اگست ۲۰۰۲ء)

اردو کی ابتدائی تعلیم

آزاد ہندوستان میں اردو زبان کی ابتدائی تعلیم کا سلسلہ بہ تدریج کم ہوتا جا تا رہا ہے، شمالی ہندوستان میں لوراور پرائمری سطح پر اس کی پڑھائی تقریباً بند ہوگئی ہے، صرف یونیورسٹیوں اور مسلم کالجوں میں دوسرے مضامین کی طرح اردو کے شعبے باقی ہیں، جن میں نظم ونثر کا مقررہ نصاب پڑھایا جاتا ہے لیکن جب جڑ ہی خشک ہوجائے تو شاخوں پر چھڑکاؤ سے درخت سرسبز وشاداب نہیں رہ سکتا، اردو کے اہل قلم نے اپنی سرگرمیاں صرف شعروشاعری، ادب وتنقید نگاری اور افسانہ وناول نویسی تک محدود کرلی ہیں، حکومت نے ان کو بہلانے کے لیے اکثر ریاستوں میں اردو اکیڈمیاں اور دوسری کمیٹیاں قائم کی ہیں جن کے فوائد سے انکار نہیں مگر لوگوں کو انعامات، ممبری، عہدوں کے لیے لڑنے جھگڑنے سے فرصت نہیں اور ملک کے سیاسی بحران، اخلاقی پستی اور حکمرانوں کی ہوس اقتدار اور لوٹ کھسوٹ نے اکیڈمیوں کو موت کے دہانے پر پہنچا دیا ہے اور بعض نے تو دم بھی توڑ دیا ہے، جب طلبہ کے وظائف، کتابت اسکول کے اساتذہ اور اکیڈمی کے مستقل ملازمین کی تنخواہیں نہ ادا کی جارہی ہوں تو کتابوں اور ادیبوں کے انعام اور مسودوں کی طباعت کے لیے مالی امداد وہ کیا دیں گی اور کوئی اچھا علمی و ادبی پروگرام اور سیمینار کیسے کریں گی، ریڈیو اور ٹیلی ویژنوں پر نشر ہونے والے اردو پروگرام بھی ختم ہوتے جاتے رہے ہیں، کئی ریاستوں میں دوسری سرکاری زبان ہونے کے باوجود اردو عضو معطل ہے، اردو ٹیچروں اور مترجموں کا تقرر رک گیا ہے اور جو پہلے سے ہیں ان سے دوسرے کام لیے جارہے ہیں، کانگریس اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا وعدہ کرکے دہلی میں برسراقتدار آئی تھی مگر یہ وعدہ وفا بھی نہیں ہوا اور الکشن کا وقت آگیا۔

بات سے بات نکل آتی ہے، عرض یہ کرنا تھا کہ اردو کی ابتدائی تعلیم اور اردو کا ذریعہ تعلیم اب صرف مکاتب ومدارس میں باقی رہ گیا ہے، لیکن مدارس کا اصل مقصد دینی علوم اور عربی زبان کی تعلیم دینا ہے، ان میں یونیورسٹیوں کا اردو کورس اور کلاسیکل ادبی تنقیدی کتابیں پڑھانے کی گنجایش نہیں تاہم جدید علوم اور سائنس وٹکنالوجی کی تعلیم تو مادری زبان میں دلانا ان کے لیے بھی لابد ہے، مگر عام طور پر اس کی مخالفت کی جارہی ہے، انگریزی ہندی اور کمپیوٹر کی طرح جدید علوم سے بھی ان کا توحش دور ہوکر رہے گا مگر اس وقت جب زمانہ قیامت کی چال چل چکا ہوگا، پہلی مرتبہ اردو میں نئے علوم

پڑھانے کے لیے ریاست حیدرآباد میں جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا تھا، مگر آزاد ہندوستان کی کانگریسی حکومت نے بابری مسجد کی طرح غالباً غلامی کی یادگار سمجھ کر اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

مسلمانوں کا انگریزی اخبار

مسلمانوں کی بدقسمتی سے آج تک ان کا کوئی اپنا انگریزی روزنامہ نہیں نکل سکا، جناب سید حامد جیسے مخلص، فعال اور دردمند شخص تھک ہار کر بیٹھ گئے، ان کی مسیحا نفسی بھی اس مردہ اور بے حس و حرکت قوم میں زندگی کی روح نہ پھونک سکی، قوم وملت کے مشہور کارکن اور جری و بے باک رہنما جناب سید شہاب الدین تقریباً بیس برس سے ''مسلم انڈیا'' نکال رہے تھے، یہ ہندوستانی مسلمانوں ہی نہیں عالم اسلام کے حالات مسایل کا ایک دستاویزی مجلہ اور بے باک ترجمان تھا، شہاب الدین صاحب بڑے باخبر، قومی وملی زندگی کے نشیب وفراز سے واقف مسلم قاید ہیں، مسلمانوں کے ہر مسئلے اور مشکل معاملے میں پیش پیش رہتے اور جرأت مندی سے اظہار خیال کرتے ہیں، ہر طرح کی معلومات اور اعداد وشمار کی روشنی میں درست حقایق اور صحیح تجزیے پیش کرتے ہیں مگر دسمبر کے بعد سے وہ اس مفید رسالے کو بند کرنے کے لیے مجبور ہوگئے، صاحب ثروت مسلمانوں کے ہوتے ہوئے مالی وسائل کی کمی سے ''مسلم انڈیا'' کا بند ہونا نہایت افسوس ناک ہے اور اس سے بڑھ کر افسوس اس کا ہے کہ مسلمانوں کا متمول طبقہ فضول کاموں میں بے دریغ و بے حساب پیسے خرچ کرتا ہے مگر صحیح مصرف، دنیا میں فیض بخش اور آخرت میں نفع دینے والے کاموں میں خرچ کرنے کی توفیق اسے نہیں ہوتی، مسلمانوں کی قومی وملی غیرت کا تقاضا ہے کہ وہ ''مسلم انڈیا'' کے دوبارہ اجرا کا سامان جلد از جلد کریں۔

(معارف فروری ۲۰۰۳ء)

بابری مسجد کا تنازعہ

''لڑاؤ اور حکومت کرو'' انگریزوں کی خاص پالیسی تھی، یہی طریقہ ان کے ہندوستان چھوڑنے اور آزادی ملنے کے بعد قومی حکومتوں نے بھی اختیار کیا، جس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں روز بہ روز تفرقہ واختلاف بڑھتا جارہا ہے، بلکہ آزادی کے بعد حالات زیادہ خراب اور بدتر ہوگئے ہیں، دونوں قوموں کے تصادم اور ٹکراؤ کو ختم کرنے کی کبھی کوئی سنجیدہ کوشش بھی نہیں کی گئی اور اب ملک میں ایسی جارحیت پسند اور بے لگام فسطائی جماعتیں وجود میں آگئی ہیں، جن کا مشغلہ ہی

اختلاف وتفرقہ بڑھانا اور فرقہ وارانہ جنون، شر وفساد اور نفرت وعصبیت کی آگ بھڑکاتا ہے لیکن اس کے باوجود نہ ان پر کوئی قدغن ہے اور نہ بندش۔

اب ایسی ہی جماعتوں کا ملک پر قبضہ وتسلط ہے اور سیکولر کہلانے والی متعدد جماعتیں بھی اپنے مفاد کے لیے اور اقتدار کی لالچ میں ان کا ضمیمہ بن گئی ہیں، اس لیے فرقہ پرست اور رجعت پسند طاقتوں کو من مانی کرنے اور کھل کھیلنے کا زیادہ موقع مل گیا ہے اور انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو شدید نفرت اور دوری پیدا کردی ہے وہ مٹائے نہیں مٹ رہی ہے، ہندوؤں میں ذات پات کا جو نظام صدیوں سے قایم ہے، یہی عناصر اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے اسے بھی ہوا دے رہے ہیں اور مختلف گروہوں کی طبقاتی کشمکش کو بڑھا رہے ہیں، یہ صورت حال ملک وقوم کی آزادی، جمہوریت، وحدت وسالمیت، قومی یک جہتی، فرقہ وارانہ اتحاد، امن وامان اور ترقی وخوش حالی، ہر چیز کے لیے نہایت خطرناک ہے، گزشتہ پانچ چھ برسوں میں فرقہ وارانہ کشمکش، طبقہ واریت اور علاقائیت جس تیزی سے بڑھی ہے، اس کی مثال نہیں مل سکتی۔

اجودھیا کی بابری مسجد کا تنازعہ بھی اسی نوعیت کا ہے، جس کو آزادی کے بعد بہ تدریج اس مرحلے تک پہنچا دیا گیا ہے کہ ملک سے امن وامان مفقود ہو گیا اور یہ ہندو مسلم اختلاف ونفرت سے بھی آگے قتل وخوں ریزی کا باعث بن گیا، ہمارے نزدیک یہ سرے سے نزاعی مسئلہ تھا ہی نہیں، لیکن اگر بالفرض نزاعی تھا بھی تو مسجد کے انہدام کا کیا جواز تھا، اس کی نوبت تو نزاع کے تصفیہ کے بعد آتی، یہ کارنامہ نہیں کھلا ہوا جرم، قانون شکنی اور دہشت گردی تھی، جس میں آج کے وہ کتنے پارسا بھی ملوث تھے جو باہمی مذاکرات پر بڑا زور دے رہے ہیں، اس کا خیال مسجد گراتے وقت کیوں نہیں آیا، کیا اس لیے کہ گھوم گھوم کر ملک میں آگ کے شعلے بھڑکانے کا موقع نہ ملتا یا اس لیے کہ مسجد کا موجود وقایم رہنا گفت وشنید میں حایل بنتا؟ بی۔ جے۔ پی کے سرکردہ لیڈر اپنی برأت اور بے گناہی کے چاہے کتنے ہی ثبوت کیوں نہ پیش کریں مگر یہ بات ساری دنیا کو معلوم ہے اور آفتاب سے زیادہ روشن ہے کہ بابری مسجد کے انہدام کا سب سے بڑا ذمہ دار کون ہے، بدیہیات ویقینیات کے لیے ثبوت کی کیا ضرورت؟ اور ثبوت رہ کر بھی کیا کرے گا جب کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو وہ جس ثبوت کو چاہے دباؤ ڈال کر اپنے موافق بنا لے، اترپردیش کی سابق وزیر اعلیٰ اپنے منصب سے دست بردار ہونے

کے بعد یہی تو فرما رہی ہیں، مگر جس طرح گجرات میں بیسٹ بیکری کے مجرمین بری ہو گئے وہی صورت مسجد کے معاملے میں بھی نظر آ رہی ہے، ستم ظریفی یہ ہے کہ بعض مسلم لیڈر بھی گھبرا کر صرف مثبت یا منفی تصفیہ ہی پر راضی ہو گئے ہیں، ہمارے نزدیک اگر مجرم کو قرار واقعی سزا نہ ملے تو وہ اور ڈھیٹ ہو جاتا ہے اور پھر آیندہ ظلم و جور کا انسداد نہیں ہوتا۔

اب یہ بات اور کھل کر سامنے آتی جا رہی ہے کہ ارباب اقتدار کے نزدیک بابری مسجد کا انہدام نہ کوئی جرم تھا اور نہ قانون شکنی اگر ہو بھی تو انہیں اس کی پروا نہیں، وہ اسے اپنے اثر و رسوخ سے ٹھیک کر لیں گے، اب مسئلہ صرف اس قدر ہے کہ اس کی جگہ پر مندر بن جائے، یہی بات وزیر اعظم اور نائب وزیر اعظم دونوں فرما رہے ہیں، گزشتہ مہینے رام مندر تعمیر کے سب سے بڑے حامی پرم ہنس رام چندر داس کی چتا کے سامنے دونوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مہنت کو بہترین خراج عقیدت یہ ہوگا کہ ان کی خواہش کی تکمیل کے لئے اجودھیا میں رام مندر بنایا جائے، جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں انہیں عقل سلیم سے کام لے کر گھٹیا سیاست سے پرہیز کر کے رام مندر کی تعمیر کی راہ ہموار کرنی چاہیے، اب محنت کے دیرینہ خواب کو شرمندہ تعبیر ہونے سے روکا نہیں جا سکتا، نائب وزیر اعظم نے وزیر اعظم کی تقریر کا ابہام یہ کہہ کر دور کر دیا کہ مندر متنازع زمین ہی پر تعمیر ہوگا، لوک سبھا میں وزیر اعظم پر اعتراض ہوا تو حسب معمول انہوں نے میڈیا کو مورد الزام ٹھہرایا، اس پر کانگریس کے چیف وہپ پریہ رنجن داس منشی نے کہا وزیر اعظم کو بیانات بدلنے کی عادت ہے اور کانگریس کے ترجمان جے پال ریڈی نے کہا واجپئی اجودھیا تنازع پر ۱۲۰ ایسے متنازع بیانات دے چکے ہیں، جن کے بعد انہیں وضاحت کرنا پڑی ہے، خیر ہم تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ نہ بابری مسجد کے انہدام کا شنیع جرم ان کے سامنے کوئی مسئلہ ہے، نہ مسجد کی تعمیر سے ان کو بحث ہے، انہیں صرف متنازع جگہ پر رام مندر کی تعمیر کی فکر ہے، جس کے لیے وہ جا و بے جا بیانات دینے کے عادی ہو گئے ہیں، رہے مذاکرات تو وہ سادہ لوگوں کو جھانسا دینے کی ایک کوشش ہے۔ (معارف ستمبر ۲۰۰۳ء)

اردو کی صورت حال

ہندوستان میں اردو کو صاف صاف مسلمانوں کی مذہبی زبان تو نہیں کہا جا سکتا مگر اب یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہو گئی ہے، اردو اخباروں میں حال ہی میں ماہنامہ آجکل کے

سابق سب ایڈیٹر جناب نندکشور وکرم کا ایک مضمون اسی کے متعلق شایع ہوا ہے اور اس پر بڑا افسوس بھی ظاہر کیا گیا ہے، لکھا ہے کہ آزادی سے پہلے یہ ہر مذہب وملت میں یکساں مقبول تھی اور سبھی اس کو پڑھتے تھے، آزادی میں اس کا شاندار رول تھا اور اس وقت یہ دفتری اور عدالتی زبان تھی، اعداد وشمار پیش کر کے آزادی کے بعد اردو کی یہ ترقی دکھائی ہے کہ اخبار اور رسالے زیادہ نکل رہے ہیں اور پی ایچ ڈی کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھی ہے، لیکن یہ ترقی وترویج اس لیے تشویش ناک ہے کہ اس تعداد میں ہندو بہت کم ہیں اور گو سیکڑوں غیر مسلم شاعر وادیب اب بھی ہیں، مگر وہ سب ساٹھ پینسٹھ برس کے ہیں اور نوجوان نسل میں یہ عنقا ہیں، وہ تسلیم کرتے ہیں کہ زبان پر کسی کی مناپلی نہیں ہوتی، اور ہر زبان میں بولنے والے صرف ایک فرقے اور مذہب کے لوگ نہیں ہوتے، لیکن انہیں شکایت ہے کہ سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں اردو کی تعلیم وترویج کا کام مذہبی اور سیاسی نقطہ نظر سے انجام دیا جارہا ہے، کیوں کہ یہ سرگرمیاں مسلم علاقوں تک محدود ہیں، ہندو علاقے میں ان کا فقدان ہے، ان کے نزدیک یہ بھی افسوس ناک ہے کہ مسلمانوں کی زبان ہونے کی بنا پر اردو کے لیے مراعات طلب کی جاتی ہے، اور سرکار یہی سمجھ کر سیاسی صورت حال اور مسلمانوں کی خوشنودی کی خاطر اسے مراعات دیتی ہے۔

جس صورت حال میں اور جو پالیسی اختیار کر کے اردو ترقی وترویج کی منازل طے کررہی ہے اسے مضمون نگار نے بہت تشویش ناک بتایا ہے، کیوں کہ اس سے اردو اپنے سیکولر کردار سے محروم، اس کی گنگا جمنی خصوصیت ختم اور وہ مسلمانوں کی زبان بن کر رہ جائے گی، اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنے والے گو ہندو بھی ہیں مگر مسلمانوں کے موجودہ رویے نے دیگر فرقوں کو اس زبان سے دور اور بدظن کر دیا ہے، یہاں تک کہ نئی نسل کی اکثریت اسے مسلمانوں کی زبان ہی سمجھتی ہے، اور کچھ تو پاکستان کی بھی۔ اور اس کا ذمہ دار مسلمانوں کا ایک مخصوص طبقہ ہے جو اس زبان کو قومی دھارے سے دور کرتا جارہا ہے، ہندوستان میں اردو کا مستقبل تاریک اس لیے ہے کہ وہ پاکستان کی سرکاری زبان بن گئی ہے اور ہندی نے ہندوستان میں قومی زبان کی مسند سنبھال لی، اس مضمون میں اگر کچھ صحیح ہے تو وہ تہ بہ تہ غلطیوں میں چھپ گیا ہے، عدم گنجایش کی بنا پر چند باتیں ہی عرض کی جاتی ہیں، اردو کی ترقی، ترویج کا ذکر تو بار بار کیا گیا ہے مگر اس کی تعلیم کا ذکر بہت کم ہے، حالانکہ اردو کا اصل مسئلہ اس کی ابتدائی اور بنیادی تعلیم ہی کا ہے، جس کا رواج سرکاری اسکولوں میں آزادی کے بعد بالکل نہیں رہا، اس کے بغیر اخبار ورسالے

پڑھنے اور پی ایچ ڈی کرنے والے کہاں سے آئیں گے، مقالہ نگار نے اس پر کوئی کرب ظاہر نہیں کیا کہ اتر پردیش میں ایک بھی اردو میڈیم اسکول نہیں، مسلمان اگر مکاتب اور مدارس میں اس کا انتظام کرتے ہیں تو وہ اردو سے ہندوؤں کو بدظن اور اردو کو قومی دھارے سے دور کردیتے ہیں۔

اردو کی ترقی وترویج کے جس انداز و پالیسی پر اعتراض کیا گیا ہے اس کا مطلب ہم نے یہی سمجھا ہے کہ وہ مکاتب و مدارس میں کیوں پڑھی اور پڑھائی جارہی ہے، اس سے سیکولر کے بجائے مذہبی لٹریچر وجود میں آئے گا، حالاں کہ آزادی کے پہلے سے یہ ہورہا ہے اور خود ہندو دھرم اور اس کی مقدس کتابوں رامائن اور بھگوت گیتا پر اردو کا ذخیرہ کم نہیں ہے، آزادی کے بعد جب اردو کا دائرہ سمٹ کر مدرسوں تک محدود ہوگیا تو ان کے بس میں جو ہے وہی تو اردو کے لیے کریں گے، اگر ہندوؤں کو ان کے مذہبی لٹریچر کی تالیف سے روکا جاتا تو یہ قابل اعتراض ہوتا، اردو مراکز کے ہندو علاقے میں قایم نہ کئے جانے کی بات صحیح ہوسکتی ہے لیکن انجمن ترقی اردو نے جو صباحی وشبینہ مکاتب کھولے تھے اس کا تجربہ مسلم علاقوں میں بھی ناکام رہا، اعداد وشمار کی فہرست ایک فریب ہے، آزادی سے پہلے اور بعد کی آبادی کو ملحوظ رکھئے اور آزادی کے بعد ہندی میں پی ایچ ڈی کرنے اور اخبار ورسالوں کے اعداد وشمار بھی پیش کیجیے، تبھی صحیح صورت سامنے آئے گی، رہی اردو کی ترقی ومراعات تو بقول آپ کے یہ سیاسی، مسلمانوں کی خوشنودی کی خاطر اور ہمارے خیال میں نمایشی اور دکھاوا ہے، عملاً تو اردو کشی ہورہی ہے، ہندو ادیبوں اور شاعروں کی تعداد کمتر ہوجانے کا ملال مسلمانوں کو آپ سے کم نہیں ہے، لیکن بڑھ کر ہاتھ میں مینا اٹھا لینے سے انہیں کس نے روکا ہے، اردو کے ساٹھ پینسٹھ برس کے غیر مسلم ادیبوں نے اردو سے فائدہ تو بہت اٹھایا لیکن اگر وہ اپنے بچے اور بچیوں کو اردو بھی پڑھاتے تو آج کمی کا گلہ نہ ہوتا، کیا یہ بھی ردعمل کا فلسفہ ہے کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہونے کا خمیازہ بھارت کے اردو والے بھگتیں، نند کشور وکرم صاحب کو بتدریج اردو کے مسلمانوں کی زبان بن جانے کا تو اتنا غم ہے مگر اسے مغلوں، ترکوں اور دہشت گردوں کی زبان کہنے والوں کی مذمت کا کوئی لفظ ان کی زبان پر نہیں آیا، ممکن ہے اس میں بھی وہ مسلمانوں ہی کو مورد الزام سمجھتے ہوں۔ (معارف جنوری ۲۰۰۴ء)

دارالمصنّفین ـ مسائل

دارالمصنّفین، شبلی اکیڈمی ایک علمی وتحقیقی ادارہ ہے جس کا مقصد اردو زبان میں بلند پایہ اور

محققانہ کتابوں کی تصنیف وتالیف وترجمہ ہے، وہ کوئی عام اشاعتی ادارہ نہیں بلکہ ایک تحریک ہے جو قوم کی علمی وفکری اصلاح، افراد کی ذہنی ودماغی تربیت اور مولانا شبلیؒ کے افکار ونظریات کے لئے قایم ہوا تھا، اگر محض تجارت اس کا مقصد ہوتا تو وہ عام مذاق کی سستی اور بازار میں چلنے والی کتابیں شایع کرکے منافع حاصل کرتا اور شہر میں سب سے الگ دکان کھول کر قوم کے لئے نفع بخش لٹریچر نہ مہیا کرتا جس سے اس کے اخراجات بھی پورے نہیں ہوتے، یہ کمی تقسیم سے پہلے حیدرآباد اور بھوپال کی مسلم ریاستوں کے عطیات سے پوری کی جاتی تھی اور قلیل مشاہرے کے باوجود علمی بھکشوؤں کی یہ جماعت اپنے علمی اشغال میں منہمک رہتی تھی، مگر ریاستوں کے انڈین یونین سے الحاق کے بعد ان کے عطیات بند ہوگئے، پنجاب کا جو علاقہ پاکستان میں شامل ہوگیا اور حیدرآباد اور بھوپال وغیرہ دارالمصنّفین کی کتابوں کے خاص مارکیٹ تھے، اس طرح اس کی آمدنی کم اور مشکلات بڑھنے لگیں۔

ملک کے بدلے ہوئے حالات اور زمانے کے نئے تقاضوں اور مطالبوں نے زندگی کے معیار واقدار بدل دیے، بڑھتی ہوئی معاشی ضرورتوں اور اقتصادی الجھنوں نے ذرائع ابلاغ کے نئے طریقے ایجاد کئے، لوگوں کے نقطہ ہائے نظر تبدیل ہوگئے غور وفکر کا نیا انداز پیدا ہوگیا، نظام تعلیم اور طریقہ تعلیم کے نئے پیمانے وضع کئے گئے، علوم وفنون کی دنیا بدل گئی، صارفیت کے بڑھتے ہوئے رجحان، الکٹرانک میڈیا اور اس کی طلسماتی کارکردگی نے سب کو اپنا اسیر اور گرویدہ بنالیا، ان حالات میں دارالمصنّفین کے لئے اپنی نئی جگہ بنانا، نئی راہ عمل متعین کرنا اور اپنے مسائل ومشکلات پر قابو پانا آسان نہیں رہا، ملک میں علم وتعلیم کا سنجیدہ ذوق معدوم ہورہا ہے، کلاسیکل زبانوں پر عبور تو درکنار خود اپنی مادری زبان اردو میں بھی مہارت نہیں رہ گئی اور روز بہ روز اس کا رواج کم ہوتا جارہا ہے، ہندی کے بول بالا اور اس کے اثر سے اردو نے نئی صورت اور نیا قالب اختیار کرلیا ہے، نئی نسل کے جو لوگ اردو پڑھتے پڑھاتے ہیں ان کے لئے بھی دارالمصنّفین کی کتابیں زیادہ پرکشش نہیں رہیں۔

زمانہ جس تیزی سے آگے جارہا ہے اسی تیزی سے سائنس اور ٹکنالوجی میں بھی ترقی ہورہی ہے جس کی وجہ سے ہر شعبۂ زندگی میں انقلاب آتا جارہا ہے، نئی ایجادات نے جو سہولتیں اور آسانیاں پیدا کردی ہیں ان کی وجہ سے مہینوں کا کام دنوں میں اور دنوں کا گھنٹوں اور منٹوں میں ہونے لگا ہے، لوگ ان کے استعمال اور ان سے استفادے کے عادی ہوگئے ہیں، طباعت کی دنیا میں بھی یہ انقلاب

آچکا ہے، جس کے نتیجے میں طباعت آسان اور اس کا معیار بہت بلند ہوگیا ہے، اس معاملے میں علامہ شبلی مرحومؒ کا ذوق بھی بہت بلند تھا، دارالمصنّفین کے ابتدائی دور میں معارف پریس حسن طباعت کے لیے بھی مشہور و ممتاز تھا، مگر حالات کی پیچیدگیوں سے اس کا معیار فروتر ہوتا گیا، موجودہ برتر معیار کا مقابلہ اب اس کی کتابیں نہیں کرسکتیں، وہ ابھی لیتھو اور ونڈا ائیک ہی کے مراحل طے کر رہا تھا کہ آفسیٹ اور کمپیوٹر کا دور آگیا، دارالمصنّفین کی آمدنی کم، اخراجات زیادہ اور گرانی بڑھتی جارہی ہے، اس میں وہ آفسیٹ پریس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، اگر اس کی خاص کرم فرما محترمہ شبانہ اعظمی اس سے ذاتی دلچسپی نہ لیتیں، وہ اس کے لیے بہت فکرمند ہیں، اگر اللہ کی مہربانی سے وہ اس میں کامیاب ہوگئیں تو دارالمصنّفین کی کتابیں بھی اچھی چھپیں گی اور اس کی آمدنی کی ایک صورت بھی پیدا ہوگی۔

دارالمصنّفین کی کتابوں کی چوری اور قزاقی کے خلاف ان صفحات میں مولانا شاہ معین الدین مرحوم برابر لکھتے رہے ہیں اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم نے مہینوں پاکستان میں قیام کرکے وہاں کے اخباروں میں مضامین لکھے اور اہل علم سے اس پر تبادلہ خیال بھی کیا، بالآخر ایک معاہدے کے تحت ۱۲۵ کتابوں کا حق طباعت حکومت پاکستان کو دیا، مگر پھر بھی چوری بند نہیں ہوئی، بلکہ اس وقت تو دونوں ملکوں میں اس میں بڑی شدت آگئی ہے، اس کی وجہ سے دارالمصنّفین کے معزز ارکان نے طے کیا کہ آفسیٹ پریس کے لیے کوشش جاری رکھی جائے گی، مگر یہاں کی خاص خاص اور اہم کتابیں باہر سے آفسیٹ پر طبع کرائی جائیں اور طباعت کے مصارف کے لیے قوم کے ارباب خیر سے اپیل کی جائے، ان کا خیال تھا کہ جب مارکیٹ کے معیار کی کتابیں خود دارالمصنّفین شائع کرے گا تو چوری اور قزاقی بند ہوجائے گی، چنانچہ اللہ کا نام لے کر اس کا آغاز دارالمصنّفین کی سب سے مقدس ومقبول کتاب سیرۃ النبی سے کیا گیا، لیکن صحت کے اہتمام، حوالوں کی تخریج پھر حسن طباعت اور خوبصورت بائنڈنگ کی رعایت کی وجہ سے اس میں بڑی تاخیر ہوگئی مگر اس میں غالباً یہ مصلحت ایزدی کارفرما تھی کہ علامہ شبلیؒ کی جو کتابیں عرصے سے دستیاب نہیں تھیں اور ان کی اشاعت کے لیے برابر تقاضہ ہو رہا تھا ان میں سے اکثر اسی درمیان میں چھپ گئیں، اب صرف موازنہ انیس و دبیر اور مولانا کے فارسی کلام کا مجموعہ چھپنے سے رہ گیا ہے، موازنہ بھی پریس کو دیا جاچکا ہے اور اس کے مصارف دارالمصنّفین کے ایک مخلص قدرداں جناب سید علی اکبر رضوی نے مہیا کردئے ہیں، جس کے لئے

کارکنان دارالمصنّفین ان کے بے حد شکر گذار ہیں، ارباب ذوق کو شعرالعجم کے پانچوں حصے کے نئے اور اچھے اڈیشن کا انتظار مدت سے ہے جس کی تصحیح کا کام شروع ہوگیا ہے، اس کی آفسیٹ طباعت کے مصارف کے لئے مولانا شبلیؒ کے قدردانوں اور ارباب خیر سے درخواست کی جارہی ہے۔

(معارف مئی ۲۰۰۴ء)

آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت

آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے صدر جناب سید شہاب الدین مسلمانوں کے سرکردہ رہنما اور ہوش مند قاید ہیں، وہ مسلمانوں کے حالات اور آزاد ہندوستان میں ان کو درپیش مسائل و مشکلات سے بہت باخبر اور ان کے حل کے لیے فکر مند رہتے ہیں، خود مسلمانوں کی شخصی اور اجتماعی زندگی کی خرابیوں کا علم بھی ان کو ہے اور وہ جانتے ہیں کہ یہ کس طرح دور ہوسکتی ہیں، حال ہی میں انہوں نے اپنے ایک مضمون میں مسلم تنظیموں کے درمیان تقسیم کار اور ہر سطح پر تال میل کو ضروری بتاتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ قابل غور اور لایق توجہ ہیں، فرماتے ہیں کہ مسلم فرقے کے اندر تنظیموں، جماعتوں، انجمنوں، سوسائٹیوں اور ٹرسٹوں کا سیلاب آیا ہوا ہے اور سب ہی کا دعوا ہے کہ ان کی حیثیت کل ہند کی ہے، حالاں کہ ۹۰ سے ۹۵ فی صد وہ اپنے ہی علاقوں تک محدود ہوتی ہیں، زیادہ تر ادارے محض کاغذی ہوتے ہیں، زیادہ تر کا مقصد حکومت سے گرانٹ یا صاحب ثروت سے چندہ وصول کرنا ہے، ایسے اداروں کی شرح موت اور زندگی بہت زیادہ ہے، جن رضا کار تنظیموں نے جڑ پکڑ لی ہے اور برسوں سے قایم ہیں اور سارے ملک میں ان کی شاخیں ہیں، سید صاحب کو دکھ ہے کہ جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کو چھوڑ کر سب ہی جماعتوں کو متوازی جماعت کے قیام کا سامنا کرنا پڑا۔

سید صاحب کا خیال بجا ہے کہ ایک بار شگاف پڑ جانے کے بعد اتحاد مشکل ہوجاتا ہے، حالاں کہ ایسے اختلافات عام طور پر ذاتی انا یا سربراہ کی من مانی کی بنیاد پر ہوتے ہیں، وہ بعض اداروں کی محاذ آرائی کی شدت اور ایک دوسرے پر نازیبا حملے اور خودستائی کے مظاہروں کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اس کی وجہ سے یکساں قسم کا کام کرنے والے اداروں کے دائرے الگ نہیں ہو پاتے، اور نہ ان کے کاموں میں کوئی تنوع آپاتا ہے، اس نامناسب محاذ آرائی کے نقصان، اس کے پس پردہ معمولی مفاد اور حقیر اغراض کی شناعت بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں سیاسی خدمت

کا میدان بہت وسیع ہے اور اس میں ہر ادارے کو اپنے مخصوص دائرہ کار کے اندر کام کرنے اور بہتر مقام حاصل کرنے کا زبردست موقع ہے، وہ سب سے اہم میدان تعلیم کا بتاتے ہیں، جہاں رضا کار انجمنوں کو کام کرنے کا بہت موقع ہے، مختلف تنظیموں کے لئے الگ الگ دوایر میں کام کرنے کی زبردست گنجایش ہے، جیسے مذہبی تعلیم و تبلیغ، سماجی اصلاح، عام اور پیشہ وارانہ تعلیم، میڈیا پر نظر اور قانونی مشاورت، سیاسی رہنمائی کی بھی ضرورت ہے مگر مسلم رضا کار تنظیموں میں تنوع نہیں اور نہ تخصیص کار کا کوئی اصول، نہ افرادی طاقت اور نہ ہی سرمایہ کہ وہ ملت کی مختلف النوع ضرورتوں پر توجہ دے سکیں، نیچے سے اوپر تک ہر میدان سیاسی، معاشی، سماجی، تعلیمی اور اطلاعاتی میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔

آخر میں اس کی سخت ضرورت بتاتے ہیں کہ تمام انجمنیں اور ادارے جو اپنے دائرے میں مختلف قسم کے کام کر رہے ہیں وہ آپس میں مل بیٹھیں، اپنے کاموں میں تال میل پیدا کریں، ایک دوسرے کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں، دو ادارے ایک ہی کام کو نہ دہرائیں اور غلط فہمیوں اور مسابقت کو دور کریں، ایسا کرنا بے حد ضروری ہے تا کہ ملت کو بحیثیت مجموعی فائدہ پہنچیں، ضرورت تقسیم کار، ہر سطح پر تال میل اور تنظیموں کا جال بچھانے کی ہے، کسی وقت سبھی انجمنیں ایک مطالبے پر ایک رائے ہوسکتی ہیں، اس طرح ملت یا عوام کے مطالبے کو زبردست تقویت حاصل ہوجائے اور انہیں عوام کی زبردست حمایت حاصل ہوجائے، مسلم عوام نااتفاقی کا رونا روتے ہیں، مگر مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد کیسے ہوسکتا ہے جب ان کے ذی اثر افراد ہر سطح پر خود ہی بٹے ہوئے ہیں، اگر انجمن اور ادارے ایک نہیں ہوسکتے تو کیا ان کے مقاصد بھی ایک نہیں ہوسکتے۔ (معارف جولائی ۲۰۰۵ء)

مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی منسوخی۔الٰہ آباد ہائی کورٹ کا فیصلہ

یوپی اے حکومت کی عام کارکردگی جیسی بھی ہو مگر اس کے بعض کارنامے اہم ہیں، فروغ انسانی وسائل کی وزارت نے گزشتہ سال یہ تاریخ ساز فیصلہ کیا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو ۳۶ پیشہ ورانہ کورسوں میں مسلم طلبہ کو ۵۰ فی صد داخلے کی پالیسی پر عمل درآمد کی اجازت دے دی تھی جس کو مسلمانوں کے علاوہ سیکولر اور انصاف پسند غیر مسلموں نے بھی سراہا تھا اور جو دستور کے ضابطوں، یونیورسٹی کے مقاصد کے مطابق اور موجودہ حالات کا عین اقتضا تھا، لیکن فرقہ پرستوں کو مسلمانوں کی

تعلیمی واقتصادی ترقی ایک آنکھ نہیں بھاتی، انہوں نے اس کی مخالفت میں آسمان سر پر اٹھالیا اور اس کے خلاف عدالت پہنچ گئے، جس کا فیصلہ ان کی خواہش کے مطابق ہوا، حکومت اور یونیورسٹی نے الہ آباد ہائی کورٹ کے ڈویژن بنچ میں اپیل کی مگر اس نے سنگل بنچ کا فیصلہ برقرار رکھا، قانونی موشگافی سے چاہے دونوں فیصلوں میں کچھ فرق نکل آئے، مگر دونوں کا قدر مشترک ایک ہی ہے بلکہ ڈویژن بنچ نے مزید صراحت کی ہے کہ یونیورسٹی اقلیتی ادارہ نہیں، مسلمانوں کے لیے داخلے میں ۵۰ فی صد ریزرویشن غیر دستوری اور غیر آئینی ہے، اور مسلم یونیورسٹی ایکٹ مجریہ ۱۹۸۱ء بھی غیر قانونی ہے، جس کے تحت یونیورسٹی کو ایک اقلیتی ادارہ قرار دیا گیا تھا، کیوں کہ سپریم کورٹ کے فیصلے کو جو عزیز پاشا کیس میں ۱۹۶۸ء میں ہوا تھا، پارلیمنٹ کالعدم نہیں قرار دے سکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ مدرسۃ العلوم اور ایم اے او کالج سے لے کر ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام تک کے سارے مراحل اگر مدنظر رکھے جائیں تو خود بہ خود یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ یہ ادارہ مسلمانوں نے اپنی جدوجہد اور محنت سے اپنے لیے قایم کیا تھا، اور انہیں کے انتظام وانصرام سے چلتا رہا ہے، اور یہ صورت ۱۹۵۰ء تک برقرار رہی، اس عرصے میں کبھی کسی کو اس کے اقلیتی ادارہ ہونے میں شک وشبہہ نہیں ہوا، مگر اسی سال جب ہندوستان جمہوریہ ہوا تو ۱۹۵۱ء میں مسلم یونیورسٹی ایکٹ میں ترمیم کی گئی اور یونیورسٹی کورٹ میں غیر مسلموں کے لیے بھی دروازہ کھول دیا گیا، یونیورسٹی ایکٹ میں ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۲ء میں بھی تبدیلیاں کی گئیں، اس کے خلاف ۱۹۶۸ء میں عزیز پاشا اور کچھ دیگر نے سپریم کورٹ میں اپیل کی تو فاضل عدالت عظمی نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو اقلیتی ادارہ ماننے سے ہی انکار کردیا جس کے خلاف ملک گیر تحریک چلی، مسز اندرا گاندھی کو مسئلے کی اہمیت و نزاکت اور اقلیتی کردار ختم کردینے کی غلطی کا احساس ہوا تو دوبارہ برسر اقتدار آنے کے بعد انہوں نے ایکٹ میں ترمیم کرکے یونیورسٹی کے اقلیتی اور تاریخی کردار کو بحال کردیا۔

یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد کئی برسوں تک اس کی داخلہ پالیسی میں تبدیلی کے لیے فکر مند رہے، بالآخر ان کی تجویز کو متعدد مرحلوں سے گزرنے کے بعد ۲۶ر فروری ۲۰۰۵ء کو وزارت انسانی وسائل کی منظوری ملی مگر ۴ر اکتوبر ۲۰۰۵ء کو الہ آباد ہائی کورٹ کی ایک رکنی بنچ اور ۵ر جنوری ۲۰۰۶ء کو دو رکنی بنچ نے داخلہ پالیسی کی جڑ ہی پر تیشہ چلادیا، ''معارف'' کی اسی اشاعت میں الہ آباد

ہائی کورٹ کے ایک سینئر اور ممتاز وکیل جناب عبدالقدیر صاحب کی ایک تحریر کی تلخیص شایع کی جارہی ہے جو غور وتوجہ سے پڑھنے کے لایق ہے، اس میں یونیورسٹی کی عہد بہ عہد سرگزشت بیان کی گئی ہے اور اسے اقلیتی ادارہ ثابت کرنے کے لیے اس کے قیام کی غایت اور اس کے لیے مسلمانوں کی قربانیوں اور جاں فشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے عدالت عالیہ (ہائی کورٹ) کے فیصلوں کے نقایص اور خامیاں دکھائی گئی ہیں اور آخر میں یہ بھی بتایا ہے کہ اس کی تلافی کیسے ہوگی اور یونیورسٹی اپنی اصل پوزیشن پر کیسے واپس آسکتی ہے، بلاشبہہ یہ سانحہ مسلمانوں کے لیے بڑا روح فرسا اور سخت جاں گسل ہے کیوں کہ یونیورسٹی ان کی کئی نسلوں کا سرمایہ اور بڑی عزیز اور قیمتی متاع ہے مگر اندیشہ ہے کہ طیش واشتعال اور سیاسی رخ دینے سے معاملہ اور الجھ جائے گا، دوراندیش اور ہوش مند لوگ دستوری اور آئینی دائروں میں رہ کر ہی اس کا حل نکالیں۔

مسلم یونیورسٹی ہندوستان کی عظمت اور اس کے سیکولرزم کا نشان ہے، خوشی ہے کہ اس سے یوپی اے حکومت اور خاص طور پر فروغ انسانی وسائل کے وزیر جناب ارجن سنگھ پوری دلچسپی لے رہے ہیں، انھوں نے کہا ہے کہ کورٹ کی رولنگ مرکزی حکومت کی نظر میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، کورٹ نے اپنے اختیار کے مطابق اپنا فیصلہ سنایا ہے، اب ہم فیصلہ کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے، اس سلسلہ میں مستقبل کا لائحہ عمل طے کرنے سے پہلے ان کی وزارت عدالتی فیصلے کا بہ غور مطالعہ کرے گی، ان کی نظر میں اس مسئلے کا حل یقینا موجود ہے...... حکومت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار بحال کرنے کے لیے سپریم کورٹ سے رجوع کرے گی اور اگر معاملہ عدالت کے ذریعہ فیصل نہیں ہو پاتا تو حکومت آئین میں ترمیم کا بل پیش کرے گی، حیدرآباد میں ہونے والے کانگریس کے سہ روزہ اجلاس کی سیاسی قرارداد میں کہا گیا ہے کہ پارٹی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو قایم رکھنے کے اپنے عہد پر قایم ہے اور اس بات کو یقینی بنانے کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے جائیں گے، وائس چانسلر مسٹر نسیم احمد بھی پر عزم ہیں اور مسئلے کو حل کرنے کے لیے فکرمند ہیں، اس مسئلے میں تمام مسلمان بھی متحد ہیں، اس لیے اللہ پر اعتماد کرکے باہمی اتحاد سے اگر مخلصانہ جدوجہد کی جائے تو انشاءاللہ کامیابی ہوگی۔

حال ہی میں وزیراعظم من موہن سنگھ کے حکم سے مسلمانوں کی سماجی واقتصادی صورت حال

کا پتا چلانے کے لیے ملک کی صرف چھ ریاستوں کی جو رپورٹ شایع ہوئی ہے، اس کے تعلیمی جائزے میں کہا گیا ہے کہ شہروں میں ۵۴ء۶ فی صد مسلمان اور گاؤں میں ۶۰ء۲ فیصد اسکولوں میں نہیں گئے، دیہی علاقوں میں صرف ۸ء۰ فی صد مسلمان گریجویٹ ہیں، شہروں میں ۴۰ فی صد مسلمان جدید تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان میں صرف ۳ء۱ فی صد گریجویٹ اور ۱ء۲ فی صد پوسٹ گریجویٹ ہیں، مسلمانوں کی یہ تعلیمی پس ماندگی ان ہی کے لیے نہیں ملک کے لیے بھی نہایت شرم ناک ہے اور اس کا بھی اقتضا یہ ہے کہ ان کی اس عظیم دانش گاہ کو تحفظ ملے، اس کا تاریخی اور اقلیتی کردار بحال کیا جائے اور اس کی داخلہ پالیسی میں مسلمانوں کو ۵۰ فی صد بلکہ اس سے بھی زیادہ ریزرویشن دیا جائے، بہ قول مولانا شبلی ؎

ہمیں یک حرف از یونیورسٹی مدعا باشد کہ ایں سررشتہ تعلیم ما در دست ما باشد

(معارف فروری ۲۰۰۶ء)

ممبئی بم دھماکے

ممبئی میں دھماکے ۱۱ر جولائی کو ہوئے، دوسرے دن وہاں ٹھیک ٹھاک رہا، روزمرہ کی سرگرمیاں شروع ہوگئیں، لوگ اپنے کاموں میں لگ گئے لیکن جب شک کی سوئی مسلمانوں کی طرف پھیر دی گئی تو فضا مسموم ہونے لگی اور مضحکہ خیز اور غیر ذمہ دارانہ قیاس آرائیاں اور بیان بازیاں ہونے لگیں حالاں کہ ابھی تک متعین طور پر کسی گروہ یا تنظیم کا نام سامنے نہیں آیا اور نہ کسی کی شناخت ہوسکی ہے، جس کو چاہا اذیتیں دینی شروع کردیں، اگر اس طرح کی حرکتوں میں واقعی مسلمان ملوث بھی ہوں گے تو ان کا کوئی ایک گروہ یا چند افراد ہوں گے مگر سارے مسلمانوں کو موردِ الزام قرار دے کر انہیں ہراساں کیا جاتا ہے اور ان کے خلاف نفرت کی فضا پیدا کی جاتی ہے، کسی کو یہ خیال نہیں ہوتا کہ واقعے کا دوسرا رخ بھی ہوسکتا ہے، ہندو انتہا پسند بھی تو مسلمانوں کو بدنام کرنے کے لیے یہ سب کچھ کرسکتے ہیں، بعض اخباروں سے معلوم ہوا کہ دو کابینی وزیروں نے وزیر اعظم کی توجہ اس کی جانب مبذول کرائی تو ان کو ناگوار ہوا، کیوں کہ یہ طے کرلیا گیا ہے کہ مسلمان ہی یہ حرکتیں کرتے ہیں اور اسی لحاظ سے کارروائیاں ہونے لگتی ہیں، کیا ایسے سخت اقدامات کے لیے محض قیاسات اور مفروضات کافی ہیں اور آزادانہ اور غیر جانب دارانہ تحقیقات ضروری نہیں ہیں، جب تشدد اور دہشت گری معمول بنتی

جارہی ہے تو حکومت پولیس اور خفیہ ایجنسیاں کیوں چوکنا نہیں رہتیں، آخران کی ناکامی، غفلت اور کوتاہی کی سزا مسلمان چاہے قصوروار نہ ہوں اور بے خطا ہوں کب تک بھگتیں گے۔

ممبئی بم دھماکوں میں محض شک وشبہہ کی بنا پر مسلمانوں کے ساتھ حکومت جو کارروائیاں کررہی ہے ان سے بعض جگہ جارح ہندو قوم پرست تخریبی کارروائیاں کررہے ہیں، سورت کی ایک مسجد میں وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کے کارکنوں نے توڑ پھوڑ کی، مائیکروفون توڑا گیا اور موذن کو مارا پیٹا گیا، ان کا کہنا تھا کہ ممبئی ٹرین میں ان کے کئی آدمی مارے گئے، تری پورہ کے ڈی جی کا بیان ہے کہ تبلیغی جماعت کے ۴۰ لوگوں سے جو ممبرا کے تھے مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے شبہے میں بہت تفصیل سے پوچھا گیا، یہ لوگ بے قصور ہیں اور ان کے خلاف کہیں کوئی مجرمانہ کیس درج نہیں ہے، مدھیہ پردیش میں ایس آئی ایم کے نام پر اندھادھند گرفتاریاں ہونے لگیں، معلوم ہوتا ہے کہ مہاراشٹرا میں تو فساد کرانے کا منصوبہ ہی تھا، غالباً بھیونڈی کا تشدد اور مینا تائی کے مجسمے کی بے حرمتی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور گجرات کے وزیر اعلیٰ گجرات کی کہانی مہاراشٹرا میں دہرانے کے لیے ممبئی پہنچ گئے تھے، ممبئی کے اکثر مسلمان شک کے دائرے میں آگئے، خصوصاً اہل حدیث اور تبلیغ جیسی بے ضرر جماعتیں اور انصاری لاحقے کے لوگ، سب سے شرم ناک واقعہ ممبئی ایرپورٹ پر ریحان احمد اور ان کی فیملی کا ہے جو ممبئی دھماکے میں ہلاک ہونے والے اپنے بڑے بھائی اعجاز احمد کی تجہیز وتدفین میں شریک ہونے کے لیے روس سے آئے تھے، ان سے پندرہ گھنٹے تک ایک ہی طرح کے سوالات کیے گئے جن میں ایک یہ تھا کہ داڑھی کیوں رکھتے ہو، طویل تفتیش کے درمیان انہیں ان کی بیوی اور خوردسال بچے اور بچی کو کھانے پینے کا کوئی موقع نہیں دیا، اس سے ان کی بیوی بہت دہل گئیں اور بول پڑیں کہ ''اپنی زندگی میں اتنی ذلت اور بے بسی محسوس نہیں کی تھی''۔

(معارف اگست ۲۰۰۶ء)

مالے گاؤں بم دھماکے

ابھی ممبئی کی لوکل ٹرینوں کے بم دھماکوں میں تفتیش اور گرفتاریوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ۸ر ستمبر کو مالے گاؤں میں بھی بم دھماکے ہوگئے، یہ دھماکے جس مسجد کے پاس ہوئے ہیں وہیں وہ قبرستان بھی تھا جس میں چند ماہ پہلے زبردستی پولیس چوکی کی تعمیر کو لے کر مسلمانوں سے پولیس کا ٹکراؤ

ہو چکا تھا، ایسے حساس اور پہلے سے متنازع مقام پر شب برات کے موقع پر اور جمعہ کے دن پولیس کا موجود نہ ہونا اس کے رویے کو بھی مشتبہ بناتا اور بم دھماکوں کی منصوبہ بندی اور منظم سازش کو بھی ظاہر کرتا ہے، مقامی لوگوں نے پولیس سپرنٹنڈنٹ راج وردھن کو آگاہ کر دیا تھا، کہ گنیش مورتی وسرجن اور شب برات کے علاوہ بلدیاتی انتخاب بھی قریب ہے، مقامی لوگ پولیس سپرنٹنڈنٹ کو حادثے کا ذمہ دار قرار دے رہے ہیں، جب ان کو جانچ کرنے والی کمیٹی کی سربراہی سپرد کی گئی تو لوگوں نے کہا کہ راج وردھن سے ایماندارانہ جانچ کی امید نہیں کی جا سکتی، پولیس پر مقامی لوگوں کی بے اعتمادی کا حال یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو فسادات کے دوران پولیس کے رول اور جانب دارانہ رویے کا علم ہے اور جنھوں نے ہندوستان کی پیشانی پر بدنما داغ گجرات کے فرقہ وارانہ فساد میں پولیس کا رول دیکھا ہے، ان کے لیے مالے گاؤں بم سانحہ پولیس کی مسلم دشمنی کی ایک اور ایسی ہی مثال ہے، ہر سال قبرستان میں ۲۴ گھنٹے پولیس کا تحفظ رہتا تھا، لیکن اس بار پولیس تحفظ کا کوئی انتظام نہیں تھا، ہر مرتبہ جمعہ کی نماز سے پہلے ہی اور نماز کے بعد تک رہنے والا پولیس انتظام بھی نہیں تھا، یہ ایسے حقایق ہیں جو پولیس کو کٹھرے میں کھڑا کرنے کے لیے کافی ہیں، ان کو ڈائرکٹر جنرل پولیس مسٹر پسریچہ کی لیپاپوتی محو اور زائل نہیں کر سکتی۔

یہ عام دستور ہو گیا ہے کہ بم دھماکے اور تشدد کی ہر کارروائی میں فوراً مسلمانوں یا ملک و بیرونِ ملک کی بعض انتہا پسند مسلم تنظیموں کے نام لیے جاتے ہیں اور میڈیا میں اس کی تشہیر بہت زور وشور سے اس قدر بار بار کی جاتی ہے کہ جھوٹ سچ ہو جاتا ہے، گرفتار ہونے والے سے حراست میں پولیس زبردستی جس طرح کا چاہتی ہے بیان دلاتی ہے اور بعض بعض کا انکاؤنٹر بھی کر دیتی ہے، لیکن مالے گاؤں کے بم دھماکوں کی نوعیت بدلی ہوئی ہے، اس میں ہلاک اور زخمی ہونے والے سب کے سب مسلمان تھے، اس لیے فوراً مسلمانوں کا نام لینے اور بم دھماکوں میں انہیں ذمہ دار قرار دینے میں توقف اور تکلف سے کام لیا گیا اور پولیس اور میڈیا دونوں چپ سادھے رہے، اس عرصے میں وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دل کا نام ذمہ دار لوگوں کی زبانوں پر آنے لگا کیوں کہ اس سے قبل ان کے کارکنوں نے ناندیڑ اور پربھنی میں بھی اسی طریقے کے بم دھماکے کیے تھے، مگر پولیس کی توجہ ادھر نہیں ہوئی، وہ تو مسلمانوں ہی کو اس میں بھی ملوث کرنے کے لیے من گڑھت افسانہ تراشنے یا دور کی کوڑی لانے میں مصروف رہی۔

روزنامہ ہندو کے بعض کالم نگاروں نے اپریل میں بجرنگ دل کے سرگرم کارکنوں کے

دھما کو اشیا بناتے وقت ہلاک ہوجانے اور ناندیڑ میں ان کے گھر سے بم ملنے کا ذکر کیا ہے، ان کے مطابق اپریل ۲۰۰۳ء میں پورنا، جالنا میں ہوئے دھماکے میں بھی ان ہی کا ہاتھ تھا، مہاراشٹرا پولیس کے لیے ناندیڑ دھماکے باعث پریشانی تھے، حالاں کہ اس میں بجرنگ دل کے ملوث ہونے کا یقین تھا، نامہ نگاروں کے خیال میں پولیس کی تشویش کے باوجود مہاراشٹرا کی کانگریس حکومت بجرنگ دل کے خلاف کارروائی کرنے سے اس لیے باز رہی کہ اس سے شیوسینا کو سیاسی فائدہ حاصل ہوجائے گا، بجرنگ دل کے خلاف کانگریس اور نیشنلسٹ کانگریس کی متحدہ حکومت کے کارروائی کرنے سے مجرمانہ گریز کے بارے میں نامہ نگاروں کا خیال ہے کہ سیاست کھیل ہی ایسا ہوتا ہے جس میں کمزور حکومتوں کو کسی کارروائی سے قبل یہ اندیشہ کھائے جاتا ہے کہ کہیں حکومت مفلوج نہ ہوجائے، کانگریس کو یہ یقین بھی ہے کہ ہندو مخالف سمجھا جانے والا کوئی اقدام ہندوتوا کی طاقتوں کو نئی زندگی دے گا۔

اس فسانے میں جو اصل بات تھی یعنی پولیس کا مجرمانہ اور غفلت و بے پروائی پر مبنی رویہ وہ کہیں سے زیر بحث ہی نہیں آنے پایا ہے، بجرنگ دل اور وشو ہندو پریشد کا نام آنے پر بھی وہ چپ سادھے دھیان گیان میں مصروف رہی، جس کے بعد اس پر یہ انکشاف ہوا کہ حسب معمول مسلمان ہی اس واقعے میں بھی ملوث ہیں اور اس کی ذہانت نے ممبئی ٹرین دھماکوں سے اس کی مماثلت تلاش کرکے اسے ایک اور نیا رخ دے دیا، جس کا اعلان ڈائرکٹر جنرل پولیس نے بڑے فخر سے کیا ہے، پولیس کے مطابق ممبئی میں ۱۱؍ جولائی ۲۰۰۶ء کو ہونے والے اور مالےگاؤں کے یہ تازہ بم دھماکے ایک ہی نوعیت کی دو کڑیاں ہیں، اس لیے اب پولیس کی ساری توجہ مسلم نوجوانوں کے ارد گرد مرکوز رہے گی اور وہی نشانے بنائے جائیں گے، مالےگاؤں کے دھماکے شب برات کے موقع پر ہوئے اور ممبئی بم دھماکوں نیز اورنگ آباد اور مالےگاؤں میں آرڈی ایکس و ہتھیاروں کی ضبطی معاملے میں گرفتار سارے مسلمان نوجوان ایک دوسرے مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، لہٰذا پولیس کے نزدیک مالیگاؤں بم دھماکے مسلمانوں کے باہم مسلکی اختلافات کا نتیجہ ہیں، یہ سطریں زیر تحریر تھیں کہ ممبئی پولیس نے ممبئی ٹرین دھماکوں کے لیے آئی ایس آئی کو ذمہ دار قرار دیا ہے جس کی پاکستان نے تردید کی ہے۔

پولیس مہاراشٹرا اور گجرات میں مسلمانوں کا عرصہ حیات تنگ کیے ہوئے ہے، اس سے مسلمانوں کا اعتماد ان ریاستی حکومتوں اور ان کی پولیس پر سے ختم ہوگیا، ممبئی میں پولیس ادارے

اے ٹی ایس نے مسلمانوں پر جو مظالم ڈھائے ہیں اس نے گوانتانا موبے میں ہونے والے مظالم کی یاد تازہ کردی ہے، مہاراشٹرا سماج وادی کے صدر اور ممبر پارلیمنٹ مسٹر ابوعاصم اعظمی کے گھر پر کئی ممبران پارلیمنٹ کی موجودگی میں ممبئی کی پولیس کی زیادتیوں کا شکار مسلمانوں نے جو روداد سنائی ہے، اس سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، ایسے گھناؤنے اور انسانیت سوز مظالم کے بعد مسلمان کیسے پولیس اور انتظامیہ پر اعتماد کریں، مسز سونیا گاندھی اور منموہن سنگھ جو اُپدیش دیتے ہیں، اس کا کوئی اثر نہ پولیس اور انتظامیہ پر دکھائی دیتا ہے اور نہ مہاراشٹرا کے وزیر اعلیٰ پر۔ یو پی اے حکومت نے برسراقتدار آنے کے بعد کیا کیا رنگ جمایا تھا، آج ہم حیران ہیں کہ ایک ہی آدمی اور ایک ہی پارٹی کی کتنی تصویریں ہوگئی ہیں۔ (معارف اکتوبر ۲۰۰۶ء)

سچر کمیٹی

وزیر اعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ نے غالباً پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی اور سماجی حالت سے متعلق قابل اعتبار اعداد و شمار حکومت کے پاس موجود نہیں ہیں، اس لیے انہوں نے دہلی ہائی کورٹ کے سابق جسٹس راجندر سچر کی سربراہی میں ایک سات رکنی کمیٹی تشکیل دی، یہ بڑا لائقِ تحسین اقدام تھا، جسٹس راجندر سچر اور ان کے رفقا قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے پوری دیانت داری، قابلیت اور بڑی محنت و جاں فشانی سے یہ رپورٹ تیار کی، کئی ریاستوں اور ان کے بڑے شہروں کا دورہ کیا، جھگی جھونپڑیوں میں بھی گئے اور امکان بھر صحیح اعداد و شمار جمع کئے اور بڑی گہرائی سے واقعات کے تمام گوشوں اور پہلوؤں پر نظر ڈالی اور صحیح معلومات فراہم کرنے اور حقایق کو سامنے لانے میں کوئی کور کسر نہیں چھوڑی، اس سے پہلے کی کمیٹیوں اور کمیشنوں کو توسیع پر توسیع دی جاتی رہی ہے، پھر بھی ان کی رپورٹ مکمل نہیں ہوئی تھی لیکن سچر کمیٹی کو رپورٹ تیار کرنے کا کام گزشتہ مارچ میں سپرد کیا گیا تھا اور اس کی میعاد میں صرف ایک بار توسیع ہوئی اور اس نے دوسری میعاد کے اندر ہی اپنی مکمل اور جامع رپورٹ وزیر اعظم کے حوالے کردی، اس لحاظ سے بھی کمیٹی قابل تعریف ہے۔

رپورٹ وصول کرتے ہوئے وزیر اعظم نے اعلان کیا کہ یہ پارلیمنٹ میں بحث کے لیے پیش کی جائے گی اور اس پر اتفاق رائے حاصل کرکے مسلم کمیونٹی کا جامع پروگرام تیار کیا جائے گا، خدا کرے ایسا ہی ہو ورنہ عموماً کمیشن اور کمیٹیوں کی رپورٹ سرد خانوں میں ڈال دی جاتی رہی ہے، لیکن

وزیراعظم سچر کمیٹی کے بارے میں جس طرح اظہارخیال فرماتے رہے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی حکومت مسلمانوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے واقعی فکرمند ہے، اپنوں اور غیروں کی پیدا کردہ مشکلات اور بیوروکریسی ان کی راہ کا سنگ گراں ہیں، سب سے بڑھ کر مسلمانوں کا انتشار اور عدم صلاحیت ہے، جس سے وہ جیتی ہوئی بازی بھی ہار جاتے ہیں، پارلیمنٹ میں اس کی مخالفت کے لیے بی جے پی پہلے سے تیار بیٹھی ہے، رپورٹ کے مندرجات اخباروں میں قارئین کی نظروں سے گزر چکے ہوں گے اور دراصل یہ مسلمانوں کی ہر قسم کی پس ماندگی اور دلتوں سے بھی بدتر حالت کی ایک دستاویز ہے، اس میں سب سے برا حال مغربی بنگال کے مسلمانوں کا بتایا گیا ہے جہاں تین دہائیوں سے بایاں محاذ کی حکومت ہے، سچر کمیٹی کے اعدادوشمار بتاتے ہیں کہ اگر کسی میدان میں مسلمان آگے ہیں تو وہ جیل خانے ہیں، ۳۰ فیصدی سے زیادہ عام ریاستوں میں اور دہلی و ممبئی جیسے بڑے شہروں میں ۳۵ اور ۴۰ فیصدی مسلمان جیلوں میں ہیں، گویا اپنی آبادی سے دوگنا مسلمان جیلوں میں ہیں، ماہرین کے خیال میں اس کے لیے عدلیہ اور پولیس کا متعصّبانہ رویہ ذمہ دار ہے۔

(معارف دسمبر ۲۰۰۶ء)

سچر کمیٹی رپورٹ

سچر کمیٹی کی رپورٹ نے ہندوستان کے مسلمانوں کے تعلیمی، معاشی اور سیاسی زوال وانحطاط کے حدانتہا کو پہنچ جانے پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے، اب اس پر مباحثہ و انتظار ہو رہا ہے کہ حکومت مسلمانوں کے ادبار و فلاکت کو دور کرنے کا واقعی کچھ سامان کرے گی یا ان کے دوسرے معاملات کی طرح یہ معاملہ بھی چند دنوں تک بحث و گفتگو کا موضوع رہ کر نقش و نگار طاق نسیاں ہو جائے گا، ہم یہ مانتے ہیں کہ اس بدترین حالت تک ان کو پہنچانے میں زیادہ دخل ریاستی اور مرکزی حکومتوں کے تعصب، دوہرے معیار، جانب دارانہ اور غیر منصفانہ رویے کو ہے، لیکن یہ امر بھی قابل غور ہے کہ خود مسلمان بھی اپنی پس ماندگی کے لیے کس حد تک ذمہ دار اور قصوروار ہیں جن کی بنا پر وہ من حیث القوم تعلیم سے محروم، معیشت میں تباہ اور سیاست میں کنارے پر آ گئے ہیں، جن لوگوں کو تعلیم، معیشت، ملازمت، تجارت، سیاست، قیادت، زراعت، فلاحت اور صنعت و حرفت میں آگے بڑھنے کے مواقع میسر تھے، انھوں نے نہ ان مواقع سے خود فائدے اٹھائے اور نہ اپنے ہم قوموں کو ان سے فائدے

اٹھانے کے وسائل و ذرائع مہیا کئے اور اندیشہ ہے کہ سچر کمیٹی کی یہ دولت بھی اگر کچھ مواقع ہاتھ آئے تو یہ اسے بھی گنوا دیں گے، افسوس اور سخت افسوس ہے کہ مسلمانوں کے طبقۂ اشراف اور اولو بقیہ نے ساٹھ برس کا زمانہ سیاسی بازی گروں کے تملق، خوشامد اور انہیں خوش کرنے میں گزار کر اپنا قومی زیاں کیا، خوئے غلامی کو اپنا شیوہ بنا کر پوری قوم کو غلامانہ ذہنیت کا عادی اور کاسہ گدائی لینے پر مجبور کر دیا۔

سیاسی، اقتصادی اور تعلیمی حیثیت سے قطع نظر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مسلمانوں میں یہ سخت دینی، روحانی اور اخلاقی بحران کیوں ہے؟ ان کی مذہبی زندگی کا سارا نظام درہم برہم کیوں ہے؟ اپنے دین سے ان کا تعلق اس قدر کمزور کیوں ہے؟ دین سے ان کی نفرت و بیزاری کیوں بڑھ گئی ہے؟ جو اخلاقی خوبیاں اور اوصاف و محامد ان کا طغرائے امتیاز تھا، وہ ان میں معدوم کیوں ہو گیا ہے، کون سے معائب و مفاسد ہیں جو ان میں نہیں ہیں، اور کون سے فواحش و منکرات ہیں جن میں وہ ملوث نہیں ہیں، جرائم اور بدکاریاں ان کی گھٹی میں داخل ہو گئی ہیں، جن لعنتوں اور بدعنوانیوں نے ملک کی چولیں ہلا دی ہیں کیا وہی مسلمانوں کو بھی کھوکھلا نہیں کر رہی ہیں، حکومت کے جن شعبوں میں عموماً صرف مسلمانوں کا عمل دخل ہے جیسے اوقاف، اقلیتی فلاح و بہبود کے محکمے، مدرسہ بورڈ، فروغ اردو کونسل، اردو اکیڈمیاں وغیرہ، جن وزارتوں اور شعبوں میں اکادکا مسلمان ہیں، کیا وہ بدعنوانیوں اور لوٹ کھسوٹ سے پاک ہیں، یہ سب ادارے سرکاری ہیں، لیکن مسلمانوں کے جو ادارے ہیں، یہاں تک کہ دینی مدارس و مکاتب، کیا ان کی حالت بہتر ہے؟ کیا مسلمانوں کے اس روحانی و اخلاقی بحران کی ذمہ دار بھی حکومتیں ہیں؟ مسلمان تو خیر امت ہیں، ان کے خیر و برکت کے نور سے ان کے اپنے اداروں کو تو جگمگانا، صاف ستھرا اور بدعنوانیوں سے پاک ہونا چاہئے تھا، مگر جب وہ اپنی اس حیثیت کو بھول گئے تو ان کا معاشی و تعلیمی بحران اور سیاسی استحصال تو درکنار وہ اپنے ایمان و عمل اور اخلاقی محاسن سے بھی عاری ہو گئے۔ (معارف جنوری ۲۰۰۷ء)

ہندوستان میں تشخص کا مسئلہ

ہندوستان جیسے ملکوں میں مسلم اقلیت کے تشخص کا مسئلہ بہت اہم ہوتا ہے، مسلمان اس کے لیے عموماً حکومت کو موردِ الزام قرار دیتے ہیں اور اپنے کو کسی طرح کا ذمہ دار نہیں سمجھتے، حالاں کہ ان کے قومی و ملی تشخص کے ختم ہونے اور ان کی شناخت ان کے اپنے رویے ہی کا زیادہ دخل ہے،

کیونکہ وہ خود ہی اپنی تہذیب وروایات سے دستبردار ہوتے جاتے ہیں، اور اسلام کے احکام وہدایات پر عمل نہیں کرتے جو ان کے تشخص اور پہچان کی ضامن ہوتی ہیں، مخالف اسلام اعمال وکردار کے مرتکب ہوکر اسلام کی ایسی قبیح اور بدنما تصویر پیش کرتے ہیں جس کا ان کی اصل پہچان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اسلام انہیں جن اعلی اوصاف وخصوصیات کا حامل بنانا چاہتا ہے ان سے وہ کورے دکھائی دیتے ہیں، فساد اور بگاڑ کے جن جراثیم کا نام ونشان بھی ان کی زندگی میں نہیں ہونا چاہئے تھا، جن کو مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا، وہ ایک ایک کرکے ان میں پیدا ہوگئے ہیں اور ان کے اسلامی وصف و امتیاز کو غارت کررہے ہیں، جو چیزیں ان کے ملی وجود اور اسلامی تشخص کے لیے سم قاتل تھیں وہی ان میں پھل پھول رہی ہیں اور جن اعمال کا شائبہ بھی ان کی زندگی میں نہیں ہونا چاہئے تھا، وہ ان میں اس طرح رچ بس گئے ہیں کہ ان کی اپنی پہچان اور شناخت معدوم ہوگئی ہے، اس میں سارا عمل دخل ان کا اپنا ہے، اس کے لیے کسی کو ذمہ دار اور قصوروار نہیں کہا جاسکتا۔

ایک طرف اگر مسلمانوں نے اپنی ساری خصوصیات وامتیازات کو گنوا کر اپنی دینی پہچان اور ملی وقومی شناخت ختم کردی ہے تو دوسری طرف انہوں نے اپنے اندر وہ ساری خرابیاں اور عیوب پیدا کرلیے ہیں جو دوسری قوموں میں پائے جاتے ہیں، اس لیے ان میں اور دوسری قوموں میں کوئی فرق وامتیاز نہیں رہ گیا ہے، مسلمانوں کی سب سے بڑی پہچان ان کا عقیدۂ توحید تھا، وہ خدا پرست تھے، سچائی اور حق پسندی ان کی امتیازی شان تھی، عدل وانصاف پر قایم رہنا، ظلم وتشدد، قتل وخوں ریزی، معصیت اور بدکاری، جھوٹ اور فریب سے بچنا ان کا شعار تھا، عفو ودرگزر، عدم انتقام، رواداری اور بے تعصبی ان کا شیوہ تھا، لیکن اب ان سب سے وہ ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور توحید کی جگہ کفر و شرک کی خباثتوں میں پڑ گئے ہیں، غیر موحد اور خدا بیزار قوموں کے طریقے ان کی زندگی کا جزءلاینفک ہوگئے ہیں، ملحدانہ خیالات وتصورات ان کے ذہن ودماغ پر چھائے ہوئے ہیں، غلط افکار واعمال، باطل رجحانات ونظریات اور جاہلی رسوم وعادات ان کی پہچان ہوگئی ہے، انہوں نے اپنی معاشرتی زندگی میں توہم پرست قوموں کے سارے خرافات اور ان کی قبیح رسم ورواج داخل کرلیے ہیں جن سے اسلام نے انہیں نجات دلائی تھی، غرض اسلامی اوصاف وکمالات سے مسلمان بالکل عاری اور دوسروں کے رنگ میں پوری طرح رنگ چکے ہیں، جن کا نہ انہیں کوئی غم ہے اور نہ یہ احساس کہ یہ سب

کیا دھرا خود ان ہی کا ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ ملک کے حالات بگڑ گئے ہیں، ایسے ایمان سوز اور اسلام کش ماحول میں ایمان و اسلام کی سلامتی کے لیے گونا گوں خطرات پیدا ہو گئے ہیں، یہ حالات قومی و ملی تشخص اور مسلمانوں کی شناخت کو باقی رکھنے کے لیے بھی بہت ناساز گار ہیں، مگر ایسے ناموافق حالات میں اپنے گھروں اور ماحول کو جاہلیت کی خو بو سے محفوظ رکھنا اور توحید و ایمان کے نور سے فضا کو جگمگا دینا مسلمانوں کی شان رہی ہے، ایسے نازک دور میں بھی انہوں نے اپنی آنے والی نسلوں کے ایمان و اسلام کی حفاظت و سلامتی اور ان کے تشخص و امتیاز کی بقا کا سامان و انتظام کیا ہے، پس ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی جس شناخت اور پہچان کو گنوا بیٹھے ہیں، ان سے اپنے کو آراستہ کریں اور اپنی آیندہ نسلوں میں بھی اس کی بقا و تحفظ کا سامان کر جائیں، اس وقت بھی مسلمانوں کے بہت گھرانوں کی پرانی نسل کے لوگ تو اسلامی تہذیب و روایات پر قائم اور اپنی ملی و تہذیبی شناخت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں، لیکن ان کی نئی نسلیں اسلام و ایمان پر قائم اور استوار نہیں ہیں، وہ اسلامی طرز زندگی کو چھوڑ کر غیر قوموں کی ثقافت اور کلچر اختیار کرتی جارہی ہیں، یہ صورت حال کسی طرح بھی خوش آیند نہیں ہے، ہر شخص کی فطری طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ جن خوبیوں اور خصوصیات سے آراستہ ہے، اس کی اولاد اور اعزہ بھی ان سے آراستہ ہوں مگر یہ عجیب طرفہ تماشا ہے کہ ہمارے بزرگ اپنے خردوں اور عزیزوں کی اسلامی تہذیب و روایات سے بعد اور بے گانگی پر ذرا بھی نہیں کڑھتے۔

(معارف جنوری ۲۰۰۸ء)

اشتیاق احمد ظلی

پہلی جنگ آزادی کی تقریبات اور مسلمانوں کی طرف سے حکومت ہند کی بے توجہی

۲۰۰۷ء میں پہلی جنگ آزادی کے ۱۵۰ سال پورے ہوئے جدید ہندوستان کی تاریخ میں اس واقعہ کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر حکومت ہند نے اس کے شایان شان یادگاری تقریبات منانے کا فیصلہ کیا، یہ سلسلہ ۲۰۰۶ء کے اواخر سے شروع ہوا اور ہنوز جاری ہے، اس مناسبت سے دوسری تقریبات کے علاوہ ملک کے طول وعرض میں سیمنار اور مجالس مذاکرہ منعقد کی گئیں اور اس کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جارہی ہیں۔ ملک کو استعماری تسلط سے آزاد کرانے کے لیے مسلمانوں نے عدیم المثال قربانیاں پیش کیں لیکن اس سلسلہ میں جو لٹریچر سامنے آرہا ہے اس میں اس حقیقت کا بھرپور انعکاس نہیں پایا جاتا اور اس جدو جہد میں مسلمانوں نے جو غیر معمولی کردار ادا کیا اس کی دھندلی سی تصویر بھی ابھر کر سامنے نہیں آئی، دکھ کی بات یہ ہے کہ مسلمان خود بھی آگے بڑھ کے سامنے نہیں آئے اور ان کے آباء واجداد نے عزیمت اور قربانی کی جو داستان اپنے خون سے رقم کی تھی اس کو دنیا کے سامنے لانے کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی، مئی کے پہلے ہفتہ میں اردو کونسل کے تعاون سے رحمانی فاؤنڈیشن مونگیر میں اس موضوع پر ایک سیمنار منعقد کر رہی ہے، امید ہے کہ اس میں اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر خاطر خواہ توجہ دی جائے گی۔

جب یہ کشمکش اپنے نقطۂ عروج پر تھی، ۳؍جون ۱۸۵۷ء کو مجاہدین آزادی نے اعظم گڑھ کی جیل کے دروازے توڑ کر قیدیوں کو آزاد کرالیا، اسی دن ہندوستانی مسلمانوں کے معلم اول مولانا نعمانی کی ولادت ہوئی، چنانچہ ۲۰۰۷ء ہی میں اس خاکدان ارضی میں ان کے ورود کے بھی ۱۵۰ سال پورے ہوئے، مسلمانان برصغیر کی نشاۃ ثانیہ میں ان کا جو غیر معمولی کردار رہا ہے اس کے پیش نظر حق تو یہ تھا کہ یہ سال ان کے جشن ولادت کے طور پر منایا جاتا، اس مناسبت سے ان کی یاد تازہ کی

جاتی ، ان کی خدمات کا ذکر کیا جاتا ، ان کے شروع کیے ہوئے کاموں کو آگے بڑھانے کے لیے منصوبہ بندی ہوتی ، ان مقاصد کے حصول کے لیے جو ان کو عزیز تھے، ایک نئے عزم اور حوصلہ کے ساتھ کوشش کی جاتی اور ان کے مشن کے ساتھ تجدید عہد کیا جاتا لیکن بدقسمتی سے اس سلسلہ میں کچھ زیادہ نہیں ہوسکا، اور وقت کا کارواں آگے بڑھ گیا، پروفیسر قمر رئیس صاحب نے اردو اکادمی دہلی کی طرف سے اور پروفیسر اختر الواسع صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اس مناسبت سیمینار کا اہتمام کیا، اطلاعات کے مطابق دونوں سیمینار بھرپور اور کامیاب رہے، امید ہے کہ جب ان میں پیش کیے جانے والے مقالات شائع ہوں گے تو شبلی شناسی کے موضوع پر نئی جہات سامنے آئیں گی اور مولانا کے فکر و فن کی تفہیم کے نئے امکانات روشن ہو گے۔

مولانا کے علمی اور فکری اکتسابات اور خدمات سے قدردانان معارف بہ خوبی واقف ہیں، اس لیے اس کی تفصیل تحصیل حاصل کے مترادف ہوگی، اس سے قطع نظر مولانا کا ایک بڑا کارنامہ افراد سازی اور ادارہ سازی کے میدان میں ظاہر ہوا، انہوں نے متعدد اداروں کی تاسیس، تعمیر اور ترقی میں حصہ لیا، دارالمصنّفین تو تمام تر ان کے تخیل کا نتیجہ ہے، اس دور کے مخصوص حالات میں اسلام، تاریخ اسلام اور اسلامی علوم، تہذیب و ثقافت کے بارے میں جس طرح کے تحقیقی اور علمی لٹریچر کی ضرورت تھی، اس کی فراہمی کی صورت ناپید تھی، یہ کام جتنا اہم تھا اتنا ہی دشوار بھی تھا، ملک کے طول و عرض میں کوئی ایسا ادارہ موجود نہیں تھا جہاں باصلاحیت افراد کو تحقیق و تصنیف اور اس کے صبر آزما تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی تربیت دی جا سکے اور ان کے اندر علمی ذوق اور قرطاس و قلم کے وسیلہ سے اپنے نتائج تحقیق کو موثر اور دل نشین انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ پیدا کیا جا سکے، جہاں کہیں مصنّفین موجود تھے تو انہیں یکسوئی سے کام کرنے کے مواقع میسر نہیں تھے، چنانچہ دارالمصنّفین کی تاسیس ایک تاریخ ساز واقعہ تھا اور اس کی کوئی مثال مسلمانان برصغیر کی تاریخ میں نہیں ملتی، غیر حکومتی سطح پر اس عہد میں اس نوعیت کے کسی کام کی مثال برصغیر سے باہر بھی ملنی مشکل ہے۔

دارالمصنّفین اپنے مقاصد میں سرگرم

گذشتہ تقریباً ایک صدی کے عرصہ میں دارالمصنّفین نے علم و تحقیق کے میدان میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ محتاج تعارف نہیں اور اہل علم و دانش ان کی نوعیت اور اہمیت سے آگاہ

ہیں، اپنی تاسیس سے آج تک اس نے اپنے وسیع الاطراف لٹریچر کے ذریعہ نئی نسلوں کی رہنمائی اور تربیت اور ان کو فکر غذا بہم پہنچانے کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ اب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں، یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ جن مقاصد کے حصول کے لیے دارالمصنّفین قائم کیا گیا تھا ان کی تکمیل میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہا ہے، اس کے باوجود ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے اور اس کے بہت سے منصوبے تشنۂ تکمیل ہیں، مزید برآں جن چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا وہ نہ صرف یہ کہ اب بھی موجود ہیں بلکہ اور شدت اختیار کر گئے ہیں، مغرب کی اسلام دشمنی نئی انتہاؤں کو چھو رہی ہے، خود اپنے وطن عزیز میں نئے مسائل اور چیلنجز کا سامنا ہے اور پوری سنجیدگی سے ان کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، موجودہ زمانے میں ہندتو اور اس قسم کی دوسری اسلام دشمن طاقتوں کی الزام تراشیوں کا مدلل اور مسکت جواب فراہم کرنا بھی دارالمصنّفین کی ذمہ داریوں میں ویسے ہی شامل ہے جیسے مستشرقین کی افترا پردازیوں کا جواب، نیا زمانہ بے شمار نئے مسائل لے کر آیا ہے اور ایک زندہ قوم ان سے صرف نظر نہیں کر سکتی، یہ اور بہت سے دوسرے کام ہیں جو دارالمصنّفین کی ذمہ داریوں میں شامل ہیں، مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ حوصلہ و وسائل کی کمی کو اس راہ میں حائل نہیں ہونے دیا جائے گا۔

دارالمصنّفین کو وہ فارغ البالی کبھی میسر نہیں آئی، جس کی اس قسم کے اداروں کو ضرورت ہوتی ہے، کتنے منصوبے محض وسائل کی کمی کی وجہ سے روبہ عمل نہیں لائے جا سکے، ان تمام مشکلات اور مسائل کے باوجود یہاں کے محققین و مصنّفین نے تحقیق و تصنیف کے میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جو وسائل سے مالا مال بڑے بڑے ادارے نہیں کر سکے، ادھر گذشتہ کچھ برسوں میں گوناگوں اسباب کے باعث مسائل کی سنگینی میں غیر معمولی حد تک اضافہ ہوگیا ہے اور حالات ناقابل برداشت حد تک دشوار اور سخت ہو گئے ہیں، دارالمصنّفین کا زیادہ تر دار و مدار کتابوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی پر رہا ہے، پاکستان اور ہندوستان میں بڑے پیمانے پر مطبوعات دارالمصنّفین کے مسروقہ ایڈیشنوں کی اشاعت سے ادارہ کی آمدنی پر نہایت ناخوش گوار اثر پڑا ہے، ابتدا میں دارالمصنّفین کی کتابوں نے طباعت کا ایک نیا معیار قائم کیا تھا، پھر نہ صرف یہ کہ یہ ادارہ وقت کا ساتھ نہ دے سکا اور اپنے آپ کو طباعت کے میدان میں رونما ہونے والی تیز رفتار تبدیلیوں سے ہم آہنگ

نہیں کرسکا، بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ وہ خود اپنے قائم کردہ معیار کو باقی نہیں رکھ سکا، میرا یقین ہے کہ اس کے بانیوں کا اخلاص اور مقاصد کی عظمت ہی اسے اب تک باقی رکھے ہوئے ہے، مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب مرحوم اور ان کی زیر قیادت دارالمصنّفین کے دوسرے رفقاء اور عملہ نے جس اخلاص، صبر، توکل اور قناعت سے اس ادارہ کی خدمت اور حفاظت کی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے اور یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اللہ انہیں اس کی بہترین جزا دے اور اعلا علیین میں صدیقین و شہدا کے ساتھ انہیں جگہ دے، آمین۔

حالات بلاشبہہ نہایت سنگین ہیں اور اس وقت یہ ادارہ اپنی بقا کی جدو جہد میں مصروف ہے، لیکن بہی خواہان دارالمصنّفین اور قدر شناسانِ شبلی کی معمولی سی توجہ سے اس خزاں رسیدہ گلشن میں پھر سے بہار واپس آسکتی ہے اور اس مریض نیم جاں کی عروق مردہ میں پھر سے زندگی بخش لہو دوڑ سکتا ہے، شبلی و سلیمان کی اس گراں مایہ وراثت کی عظمت رفتہ کی باز یافت اور تعمیر نو کے لیے ایک ہمہ جہت مہم کا آغاز ہو چکا ہے، ہم آپ کو اس مہم میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند

(معارف مئی ۲۰۰۸ء)

فرقہ واریت کا فروغ اور درسیات میں غلط مواد کی شمولیت

وسط مئی میں دہلی میں ایک ورکشاپ کی افتتاحی تقریب میں شرکت کا موقع ملا، یہ ورکشاپ تاریخ کی درسی کتابوں کا جائزہ لینے کے مقصد سے منعقد کیا گیا تھا، ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں یہ ایک ناگزیر عمل ہے جسے مسلسل جاری رہنا چاہیے، اس ملک میں فرقہ واریت کے فروغ اور سماج میں بڑے پیمانے پر اس کے اثرات بد کے نفوذ کے لیے بڑی حد تک تاریخ کی درسیات میں غلط، نفرت انگیز اور قابل اعتراض مواد ذمہ دار ہے، واقعہ یہ ہے فرقہ واریت کی ترویج میں جتنا مواد تاریخ کی غلط تعبیر کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے اتنا کہیں اور سے نہیں، ماضی کے مطالعہ کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس سے حال کو سمجھنے میں مدد ملے اور اس سے حاصل ہونے والی بصیرت کی روشنی میں ماضی میں کی جانے والی غلطیوں سے بچتے ہوئے ایک بہتر حال کی تعمیر کی جاسکے، ماضی میں انسانیت نے

ان غلطیوں کی بڑی بھاری قیمت ادا کی ہے اور بار بار ان کے اعادہ کی متحمل نہیں ہوسکتی لیکن اگر تاریخ اس لیے پڑھی اور پڑھائی جائے کہ ماضی کی غلطیاں اور تسامحات کو جواب عوامی حافظہ سے محو ہوچکی ہیں، پھر سے تازہ کیا جائے اور باہمی منافرت اور عداوت کو ہوا دینے کے مقصد سے واقعات کو توڑ مروڑ کر اور ان کے سیاق وسباق سے ہٹا کر کسی مخصوص تناظر میں پیش کیا جائے یا ایسے واقعات کی تخلیق کی جائے جو کبھی پیش ہی نہیں آئے تو اس کے عواقب اور نتائج کا اندازہ کرنے کے لیے بہت زیادہ دقت نظر کی ضرورت نہیں ہے، بدقسمتی سے وطن عزیز میں اس وقت بڑے پیمانے پر یہی کام انجام دیا جارہا ہے، اس کے نتیجہ میں ہندوستانی معاشرہ باہمی منافرت، عداوت اور عدم اعتماد کے آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے، انگریز سامراج نے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کے اصول کے تحت غلط تاریخ کی ترویج کے ذریعہ اس ملک میں بسنے والی دو بڑی قوموں کے درمیان نفرت اور عداوت کا بیج بونے کا کام اس لیے کیا تھا کہ ان کے درمیان اتفاق واتحاد کے امکانات کو ختم کردیا جائے اور اس طرح اس ملک میں سامراجیت کی بقا اور دوام کی راہ ہموار کی جائے، اس خطہ ارض سے سامراجیت کو رخصت ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے لیکن اس لعنت سے نجات حاصل کرنے کے بجائے فرقہ پرست طاقتوں نے سامراجیت کی اس میراث کو سینے سے لگا رکھا ہے اور اس کی اس طرح آبیاری کررہی ہیں کہ اب وہ ایک تناور درخت بن چکا ہے، اس کی شاخیں ہر سمت پھیل چکی ہیں اور اس کے زہریلے اثرات پوری فضا کو مسموم کررہے ہیں، اس تناظر میں ہمیں ان لوگوں کا شکرگزار ہونا چاہیے جو امت کی طرف سے یہ فرض کفایہ ادا کررہے ہیں، یہ ورکشاپ جماعت اسلامی ہند کے شعبہ تعلیم اور ہیومن ویلفیئر ٹرسٹ کے تعاون سے ۱۶ رتا ۲۰ رمئی منعقد کیا گیا۔

سول سروسز میں مسلمان امیدواروں کی بہتر کارکردگی

اس سال سول سروسز میں ۳۷ مسلمان امیدوار کامیاب ہوئے، گذشتہ سال ان امتحانات میں صرف ۱۷ مسلمان امیدوار کامیاب ہوسکے تھے، اس طرح بہ ظاہر اس سال مسلمان امیدواروں نے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے باوجود سول سروسز میں مسلمانوں کی نمایندگی کا مجموعی اوسط 6.3 سے قدرے کم ہی ہے، سرکاری اعداد وشمار کے مطابق اس ملک میں مسلمانوں کی آبادی چودہ فیصد ہے، چنانچہ اعلا سرکاری ملازمتوں میں ان کی نمایندگی غیر معمولی حد تک کم ہے، البتہ اس سال اس

محاذ پر ایک خوش آیند اور حوصلہ افزا پیش قدمی یہ ہوئی ہے کہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار مدرسہ سسٹم میں تعلیم یافتہ ایک امیدوار نے کامیابی حاصل کی ہے، وسیم الرحمان جن کی پوزیشن ۴۳۷ کامیاب ہونے والے امیدواروں میں ۴۰۴ ہے دارالعلوم، دیوبند سے فارغ التحصیل ہیں، اس سے مدارس کے فارغین کے لیے نئے امکانات روشن ہوئے ہیں، توقع ہے کہ وسیم الرحمان کی کامیابی ایک قوی محرک ثابت ہوگی اور مدارس کے طلبہ ایک نئے عزم اور حوصلہ کے ساتھ ان امتحانات میں شریک ہوں گے اور ملکی انتظامیہ میں ملت کو اس کا جائز حق دلانے میں اہم کردار ادا کریں گے۔

(معارف جون ۲۰۰۸ء)

فرضی گرفتاری اور اعظم گڑھ کے مسلمان

مسلمان نوجوانوں کے خلاف ملک کے طول وعرض میں بِلا جواز اور منصوبہ بند مہم گذشتہ کئی برسوں سے جاری ہے۔ جہاں کہیں بھی تشدد کا کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تحقیق و تفتیش کے کسی ادنیٰ تکلف کے بغیر اسے مسلمانوں کی کسی فرضی یا واقعی جماعت سے منسوب کر دیا جاتا ہے اور گرفتاری، ایذا رسانی اور تعذیب کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کا نشانہ بالعموم اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھی ملازمتوں میں برسرکار نوجوان ہوتے ہیں۔ واقعہ کے چند گھنٹہ کے اندر اس سے متعلق اتنی تفصیلی معلومات فراہم کر دی جاتی ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پولس کے پاس اس سلسلہ میں مکمل معلومات پہلے سے موجود تھیں اور انتظار صرف واقعہ کے ظہور پذیر ہونے کا تھا۔ اگر پولس کو سب کچھ معلوم رہتا ہے تو وہ ان حادثات کو روک کیوں نہیں پاتی۔ اور اگر اس کے پاس اتنے پختہ ثبوت موجود ہوتے ہیں تو عدالت میں اپنا موقف ثابت کرنے میں ناکام کیوں رہتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ میڈیا اور عام لوگ جو دوسرے معاملات میں پولس کے بیانات کو بالعموم نہایت شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس فرضی داستان کے ایک ایک حرف پر ایمان لاتے ہیں اور اس سے معمولی اختلاف بھی حب الوطنی کے خلاف تصور کرتے ہیں۔

۱۹ ستمبر کو بٹلہ ہاؤس میں جو کچھ ہوا اور اس کے نتیجہ میں اعظم گڑھ جس طرح پورے ملک کی منفی توجہ کا مرکز بنا اور وہاں کے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا وہ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہی نہیں بلکہ اس کا نقطہ عروج ہے۔ فرقہ پرست طاقتوں کی نگاہیں ایک عرصہ سے اعظم گڑھ پر مرکوز تھیں۔

برسوں سے میڈیا کے ذریعہ اس کی ایک خاص قسم کی شبیہ بنائی جارہی تھی۔ یوپی کو گجرات بنانے کے منصوبہ میں اعظم گڑھ سے شروعات کی بات بھی فضا میں گونجتی رہی ہے۔ چنانچہ اعظم گڑھ کے مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہورہا ہے وہ کسی وقتی ابال کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا حصہ ہے۔ آتنک گڑھ اور نرسری آف ٹیررزم جیسے گھناونے الفاظ سے اس کا چہرہ مسخ کیا جارہا ہے۔ اس ضمن میں ملک کے لیے اس خطہ کی خدمات کی طویل اور روشن تاریخ کو یکسر فراموش کردیا گیا۔ ۱۸۵۷ء سے برٹش سامراج کے ملک سے رخصت ہوجانے تک جنگ آزادی میں اعظم گڑھ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ یہ جنگ اس دیار کے مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کرلڑی تھی۔ مولانا شبلی کی اصل جولانگاہ، علم و تحقیق کا میدان تھا، اس کے باوجود ملکی سیاست اور جنگ آزادی میں انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے نظریاتی سطح پر اوران کے تلامذہ اور دارالمصنّفین نے عملی طور پر اس میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ دارالمصنفین نے ابتداء ہی سے اس دیار میں تحریک آزادی کے مرکز کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ تحریک آزادی کے تمام سرکردہ لیڈر مشرقی یوپی کے دورے کے موقع پر یہاں ضرور آتے اور اس کے مہمان خانہ میں قیام کرتے۔ گاندھی جی بھی یہاں آچکے ہیں۔ پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو کو اس سے خاص انسیت تھی دونوں ہی اس کے لائف ممبر تھے اور ہمیشہ یہیں قیام کرتے تھے۔ اس علاقہ میں نان کوآپریشن کی غیر معمولی کامیابی میں دارالمصنّفین کا بڑا حصہ تھا۔ دارالمصنّفین نے اسلامیات اور اسلامی تاریخ کے علاوہ ہندوستان کے عہد وسطی کی تاریخ پر بڑا گراں قدر لٹریچر فراہم کیا ہے۔ اہل نظر جانتے ہیں کہ یہ لٹریچر مسلم دور حکومت کی مشترکہ میراث پر زور دیتا ہے جس سے دونوں قومیتوں کے درمیان مفاہمت اور یگانگت کے جذبات فروغ پائیں۔ مدرسۃ الاصلاح نے آزادی اور تقسیم ملک سے پہلے کے ہیجان انگیز دور میں جس پامردی سے تحریک آزادی کا ساتھ دیا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ یہ شبلی کی وراثت تھی جسے ان کے تلامذہ اور متوسلین نے حرز جان بنائے رکھا۔

اعظم گڑھ ایک گنجان آبادی والا علاقہ ہے۔ مقامی طور پر دستیاب وسائل سے اتنی بڑی آبادی کی کفالت ممکن نہیں۔ یہاں نہ پہلے کوئی انڈسٹری تھی اور نہ اب ہے۔ پورے ضلع میں اعلیٰ تکنیکی تعلیم کا کوئی ادارہ نہیں۔ ان سب کے باوجود یہاں کے مسلمانوں نے اعلیٰ تعلیم کے حصول میں غیر معمولی

حوصلہ اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اپنے قوت بازو سے حاصل کی ہوئی خوش حالی سے بھی کسی حد تک آشنا ہیں۔ اپنے مذہبی تشخص کا بھی احساس ہے۔ اس احساس اور کسی قدر خوش حالی کے باعث یہاں صاف ستھرے مدارس بھی قائم ہیں اور کشادہ اور پر رونق مساجد بھی۔ اپنے تہذیبی ورثہ سے بھی یکسر نا آشنا نہیں ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ یہاں کے مسلمانوں کی خوش حالی اور اعلیٰ تعلیم کے حصول میں اتنی دلچسپی انہیں پسند نہیں۔ وہ اس صورت حال کو بدل دینا چاہتے ہیں۔ وہ یہاں کے لوگوں کے دلوں میں عدم تحفظ کا ایسا احساس پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو حصول تعلیم کے لیے علاقہ سے باہر بھیجنا بند کر دیں۔ وہ اس راز سے واقف ہیں کہ اگر حصول علم سے ان کی توجہ ہٹا دی جائے تو باقی کام پھر آسان ہو جائے گا۔ لیکن یہ یقین ہے کہ اعظم گڑھ کے حوصلہ مند لوگ فرقہ پرستوں کے ان ناپاک عزائم کو پورا نہیں ہونے دیں گے اور ایک نئے عزم کے ساتھ حصول علم کی منزل مراد کی طرف اپنا سفر جاری رکھیں گے۔

یہ یاد دلانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ علمی اور معاشی میدان میں اعظم گڑھ کے مسلمانوں نے جو بھی کامیابی حاصل کی ہے وہ کئی نسلوں کی کوشش اور محنت کا ثمرہ ہے۔ یہ علاقہ شیراز ہند کی جغرافیائی حدود میں شامل تھا چنانچہ علم کی روایت یہاں کے لیے نئی نہیں۔ جدید تعلیم کے حصول کے لیے سرسید کی آواز پر لبیک کہنے والوں میں یہاں کے لوگ پیش پیش تھے۔ چنانچہ ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم میں پہلے پہل داخلہ لینے والے چار طالب علموں میں سے دو کا تعلق اعظم گڑھ سے تھا۔ پھر شبلی اور ان کے تلامذہ نے یہاں علم و دانش کے چراغ روشن کیے۔ نیشنل اسکول بنایا جو اب ایک خوبصورت اور عظیم الشان پوسٹ گریجویٹ کالج کا قالب اختیار کر چکا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح قائم کیا جس کا فیض ایک صدی سے جاری ہے۔ چراغ سے چراغ جلا۔ مدارس اور مکاتب کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ چاروں طرف علم کی روشنی پھیلتی چلی گئی۔ لیکن یہ سب چند دنوں میں حاصل نہیں ہو گیا۔ اس کے لیے یہاں کے مسلمانوں نے بڑی قربانی دی ہے۔ نسلیں گذر گئیں جب یہاں کے لوگوں نے ایک بہتر مستقبل کی تلاش میں دور دراز کے ممالک کا قصد کرنا شروع کیا۔ انڈونیشیا، برما، ملیشیا اور مشرق وسطی کے ممالک کی خاک نوردی کی۔ محنت مزدوری کی، دشت و بیابان میں خون پسینہ ایک کیا، انڈسٹری میں ملازمت کی، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تدریسی ذمہ داریاں سنبھالیں،

کاروباری اور تجارتی ادارے قائم کیے، کتنی ہی جوانیوں اور بڑھاپوں کی بھینٹ چڑھائی، تب کہیں نسلوں کی کوہ کنی کے بعد خوش حالی کی جوئے شیر کی ایک ہلکی سی دھار یہاں تک لانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ایک آزاد ملک کے آزاد شہری کی حیثیت سے انہیں اپنی محنت کے اس ثمر سے مستفید ہونے کا حق یقیناً حاصل ہونا چاہیے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ ان وسائل کو مثبت اور تعمیری کاموں میں استعمال کیا جائے۔ موجودہ صورت حال میں اس خطہ میں اعلیٰ تعلیمی اور فنی اداروں کا قیام ایک بنیادی ضرورت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

موجودہ صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ایک موثر حکمت عملی وضع کی جائے۔ یہ ایک طویل اور صبر آزما جنگ ہے جسے اس کے منطقی نتیجہ تک پہنچانے کے لیے بڑے تحمل، بیدار مغزی اور سیاسی بصیرت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک ملی مسئلہ ہے اور اسے اسی سطح پر حل کیا جانا ہے۔ شدت پسندی سے نمٹنے کے نام پر بے شمار معصوم نوجوانوں کی زندگیاں برباد اور ان گنت خانوادے تباہ ہو چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں ماخوذ نوجوانوں کی بے گناہی عدالتوں میں چلنے والے مقدمات سے فراہم ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اب یہ سلسلہ رکنا چاہیے اس باب میں مزید تاخیر کے اثرات تباہ کن اور دوررس ہوں گے۔ اس سلسلہ میں بعض امور فوری توجہ کے مستحق ہیں اور بعض کے لیے طویل مدتی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ پورے معاملہ کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کا مسئلہ فوری توجہ کا مستحق ہے۔ اس سلسلہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرف سے اپنے ماخوذ طلبہ کے مقدمات کی پیروی کا فیصلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے، وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن کو ان کے اس جراتمندانہ اقدام کے لیے یاد رکھا جائے گا۔ اس واضح سچائی کی تائید میں بہت سے ممتاز قانونی ماہرین، صحافی، سیاسی قائدین اور حساس اور باشعور افراد کھل کر سامنے آ رہے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستانی معاشرہ کا ضمیر اور ہندوستانی جمہوریت کی آبرو ہیں۔ ان سب کے تعاون سے بہتر نتائج کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ خود اعظم گڑھ کے مسلمانوں نے بالعموم اور سنجر پور کے باشندوں نے جو براہ راست اس طوفان کی زد میں ہیں، بالخصوص جس بے مثال عزیمت، ہمت، حوصلہ اور تحمل کا مظاہرہ کیا ہے وہ لائق تعریف بھی ہے اور باعث فخر بھی۔ انشاءاللہ اس کے نہایت دوررس نتائج برآمد ہوں گے۔

اس سلسلہ میں دوسرا فوری توجہ کا مسئلہ یہ ہے کہ نہ صرف اس واقعہ کی بلکہ گذشتہ چند سالوں

میں ہونے والے اس طرح کے تمام واقعات کی سپریم کورٹ کے کسی برسرکار جج بلکہ ججوں کے ایک پینل سے تحقیقات کرائی جائے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ انصاف کے تقاضے پورے ہوں گے بلکہ اس سے پوری فضا صاف ہونے میں مدد ملے گی۔ یہ بات ملک کے وسیع تر مفاد میں ہے کہ ان گھناؤنے جرائم میں ملوث مجرموں کو بے نقاب کیا جائے اور انہیں قرار واقعی سزا دی جائے۔ اس کے بغیر معصوم زندگیاں تباہ ہوتی رہیں گی اور مجرموں کو اپنے منصوبوں کو انجام دینے کی کھلی چھوٹ حاصل رہے گی۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے سماج کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے انصاف پسند شہریوں کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل کیا جائے۔ ملک کے باشندوں کی غالب اکثریت انصاف پسند، صلح جو، سیکولر اور تکثیری معاشرہ میں یقین رکھتی ہے۔ اسی طرح میڈیا کے منفی رویہ کے باوجود صحافیوں سے گفت وشنید اور تعاون کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ عصر حاضر میں ذرائع ابلاغ کو جو غیر معمولی اہمیت اور سماج میں اسے جو نفوذ حاصل ہو چکا ہے اس کے پیش نظر یہ ضروری ہے۔ آج نہیں تو کل ان میں سے کچھ لوگ ضرور حق وصداقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔

طویل مدتی کاموں میں سب سے اہم کام سیاسی سطح سے متعلق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مسئلہ کی جڑیں سیاست میں پیوست ہیں اور اس کا مستقل اور پائدار حل سیاست ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ ملک کے دستور نے اقلیتوں کو جو حقوق تفویض کیے ہیں ان میں سے بہت سے حقوق آزادی کے چھ دہوں کے بعد بھی ان کی دسترس سے باہر ہیں۔ البتہ ووٹ کا حق ان کو حاصل ہے۔ اس کے دانشمندانہ استعمال سے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک مشترکہ پلیٹ فارم کی ضرورت ہے۔ اب صرف ان پارٹیوں سے تعاون کیا جائے جو ملک میں پھیلی ہوئی اس مسموم فضا کو بدلنے کے عزم کا اظہار کریں اور اس کا عملی ثبوت بھی فراہم کریں۔ اور اسے اپنے انتخابی منشور میں نمایاں طور پر جگہ دیں۔ ہمیں جتنی ان کی ضرورت ہے اس سے زیادہ ان کو ہماری ضرورت ہے اور شاید اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان میدان سیاست میں دوسروں کا سہارا ڈھونڈنے کے بجائے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کریں۔ ملک کے سیاسی عمل میں بھرپور اور منصوبہ بند حصہ داری کے ذریعہ ہی ان پیچیدہ مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ہماری صفوں میں مکمل اتحاد اور ایک قابل اعتماد مرکزی قیادت کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ملکی سیاست

میں کسی اہم تبدیلی کی توقع عبث ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اس چیلنج کا موثر جواب دینے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں اوراس کے لیے تیار بھی ہیں۔(معارف اکتوبر ۲۰۰۸ء)

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت

ہندوستان میں مسلمانوں نے جوحکومت قائم کی تھی وہ اگرچہ اسلامی حکومت نہیں تھی، تاہم اس کی متعدد خصوصیات اس کے اندر موجود تھیں جن کے اس ملک کے باشندوں کی زندگی پر بڑے خوش گوار اثرات مرتب ہوئے۔انسانی اخوت اور مساوات کا تصور، قانون کی بالادستی اورسب کے لیے انصاف کی فراہمی اورعوام کی فلاح وبہبود کے لیے حکمرانوں کی کوششیں اس کے چند نمایاں پہلو تھے۔ان کے زیرسایہ مذہبی رواداری کا ایسا اعلیٰ معیار قائم ہوا جس کا اس سے پہلے تصور بھی ممکن نہیں تھا۔اس کے باوجود اسلام کو برصغیر میں وہ کامیابی نہیں ملی جو اسے دوسرے ممالک میں ملتی رہی تھی۔ اپنے طویل دوراقتدار میں مسلمان اقلیت میں تھے اوراب بھی ہندوستان میں اقلیت میں ہیں۔اگر ملک کی تقسیم نہ ہوئی ہوتی تو بھی اقلیت ہی میں رہتے۔یہ جہاں اس بات کی ایک ناقابل تردید دلیل ہے کہ اپنے طویل دوراقتدار میں مسلمانوں نے تبدیلی مذہب کے لیے طاقت کا استعمال نہیں کیا وہیں اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ یہ ملت اسلامیہ کی ایک بڑی ناکامی کی مظہر ہے۔امت پر عائد دعوت کے ابدی فریضہ کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ ہم ان اسباب وعلل کا پتہ لگائیں جو اس صورت حال کے لیے ذمہ دار رہے ہیں اوران کے تدارک کی سبیل کریں۔اس تناظر میں یہ سوال بڑی اہمیت اختیار کرجاتا ہے کہ اتنی طویل ہمسایگی کے باوجود ہم برادران وطن کو اپنے مذہب کی بنیادی تعلیمات سے کس حدتک واقف کراسکے ہیں نیز یہ کہ ہم ان کے مذہب اورمعتقدات سے کس حدتک واقف ہوسکے ہیں۔ہمیں اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اورموعظہ حسنہ کے ذریعہ بلانے کا حکم دیا گیا ہے۔یہ فریضہ اس وقت تک بخوبی انجام نہیں دیا جاسکتا جب تک مخاطب کے بنیادی اعتقادات اورنظریات سے واقفیت نہ ہو۔یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس سرزمین میں اپنے طویل قیام کے باوجود ہم برادران وطن کے مذہب اور بنیادی اعتقادات سے بڑی حدتک ناواقف ہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ بعض ادارے اورافراد اس میدان میں سرگرم ہیں لیکن کام کی وسعت،نوعیت اور اہمیت کو دیکھتے ہوئے تمام ترقدروقیمت کے باوجود یہ یکسر ناکافی ہیں۔اس سلسلے میں سب سے اہم کام

ایک ہزار سال پہلے مشہور اسلامی محقق ابوریحان البیرونی (۹۷۳-۱۰۴۸) نے انجام دیا۔البیرونی سلطان محمود کی فتوحات کے جلو میں ہندوستان آیا جب یہاں کے باشندوں کے دل و دماغ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت وعداوت کے شدید ترین جذبات پائے جاتے تھے۔اس کے باوجود اس نے برہمن اسکالرز سے جو غیر برہمن ہندوؤں کو بھی علم کا اہل نہیں سمجھتے تھے،سنسکرت سیکھی اور براہ راست ان کے مذہب،فلسفہ اور دوسرے علوم کا اتنی ژرف نگاہی سے مطالعہ کیا اور اپنی تحقیقات کے نتائج کو اتنے علمی اور معروضی انداز میں پیش کیا جس کا تصور آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی مشکل ہے۔مسلم دور حکومت میں اس طرح کی کئی اور قابل قدر کوششیں ہوئیں لیکن واقعہ ہے کوئی بھی البیرونی کی ہمسری کا دعویٰ نہ کرسکا لیکن آج ہم میں سے کتنے لوگ البیرونی کے نام اور کام سے واقف بھی ہیں۔

اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ یہ امر ہے کہ ہمارے بارے میں اہل وطن کی معلومات اس سے بھی کم ہیں جتنی ہماری ان کے بارے میں۔ماضی میں جو لوگ ہمارے اسلاف کے ربط میں آتے تھے وہ ان کے معاملات اور اخلاق سے متاثر ہوتے تھے۔ہمارے اندر وہ اخلاق اور اوصاف باقی نہیں رہے۔ساتھ ہی خیر امت ہونے اور اس کے نتیجہ میں ہونے والی ذمہ داریوں کا احساس بھی جاتا رہا،نتیجہ یہ ہے کہ اس ملک کے باشندوں کی غالب اکثریت مسلمانوں کے بارے میں ابتدائی معلومات سے بھی عاری ہے اور ان کے بارے میں حد درجہ منفی اور دوراز کار خیالات رکھتی ہے۔یہ صورت حال عوام تک محدود نہیں اور نہ حاشیہ کے انتہا پسند طبقوں تک بلکہ اس کا دائرہ روشن خیال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقوں تک محیط ہے۔اس کی ایک تکلیف دہ مثال گذشتہ دنوں اس وقت سامنے آئی جب مدھیہ پردیش کے ایک مسلم طالب علم کی عرضی سپریم کورٹ میں زیر سماعت تھی کہ نرملا کانونٹ ہائر سکنڈری اسکول میں تعلیم کے دوران اسے داڑھی رکھنے کی اجازت ہونی چاہیے جس کی اسکول کی انتظامیہ کی طرف سے ممانعت کردی گئی تھی۔اس معاملہ کی سماعت کرنے والی بنچ کی سربراہی جسٹس آر۔وی۔رویندرن کررہے تھے۔دوسرے جج جسٹس مارکنڈے کاٹجو تھے۔عدالت نے طالب علم کو اسکول کے قوانین کی پابندی کی ہدایت کی۔دوران سماعت جسٹس کاٹجو نے داڑھی اور برقعے کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ حد درجہ تشویش ناک ہیں۔اب جب کہ انہوں نے اپنے ان خیالات کے سلسلہ میں افسوس کا اظہار کردیا ہے ان کے بارے میں کچھ زیادہ کہنا سننا مناسب نہیں

ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ یہ اظہار افسوس اردو کے بعض اخبارات تک محدود رہا ہے اور ملک کے پڑھے لکھے لوگوں کی بڑی اکثریت اس سے بے خبر ہے چنانچہ اس سے جو نقصان ہو چکا ہے اس کی تلافی نہیں ہو سکی۔ مزید براں اس مسئلہ کا یہ پہلو اب بھی توجہ طلب ہے کہ عدالت عظمیٰ کے ایک فاضل جج کی طرف سے دوران سماعت ان خیالات کا اظہار کیا گیا۔ جسٹس کاٹجو ایک امتیازی حیثیت کے حامل جج ہیں اور اپنی روشن خیالی اور لبرل نظریات کے لیے معروف ہیں۔ ان کی علمی دلچسپیوں کی فہرست بہت طویل ہے جس میں تاریخ اور اردو شامل ہیں۔ وہ اپنے مطالعہ اور غور و فکر کے نتائج کو قرطاس و قلم کے ذریعہ پیش کرنے میں دلچسپی بھی رکھتے ہیں اور اس کا سلیقہ بھی۔ ان کی تحریریں سنجیدہ، متوازن اور فکر انگیز ہوتی ہیں۔ ان کی روشن خیالی اور لبرل طرز فکر کا انعکاس ان کے فیصلوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ بعض اہم مسائل میں انہوں نے اپنی بالکل نئی راہ نکالی ہے۔ عدلیہ کی فعالیت اور توہین عدالت کے سلسلہ میں ان کے فیصلے اور خیالات ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ذاتی لیاقت اور صلاحیت کے علاوہ وہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس کا قانون اور سیاست سے گہرا تعلق رہا ہے۔ ایسا لائق اور فاضل جج اگر داڑھی اور برقع جیسے اسلامی شعائر کو طالبان کی علامت قرار دے اور ان کے لیے ہندوستان کے جمہوری ڈھانچہ میں کوئی گنجائش نہ پائے تو اسے کیا کہا جائے۔ جہاں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فاضل جج کے منصب کا تقاضا تھا کہ انہیں اس سلسلہ میں صحیح معلومات حاصل ہونی چاہیے تھیں۔ وہیں ہمیں اپنی اس کوتاہی کا اعتراف بھی کرنا چاہیے کہ ہم اپنے دین کی اساسی تعلیمات سے بھی ملک کے اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ طبقہ کو متعارف نہیں کرا سکے ہیں۔

(معارف اپریل ۲۰۰۹ء)

تعلیم کے میدان میں کیرالا کے مسلمانوں کی پیش رفت

سچر کمیٹی کی رپورٹ کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کا مسئلہ بحث و نظر کی حدود سے نکل کر حقیقت واقعہ کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ جو قوم صدیوں کاروانِ علم و فضل کی قافلہ سالاری کے منصب پر فائز رہی اب اس کی حیثیت گرد کارواں کی بھی نہیں رہ گئی۔ اس پس منظر میں کیرالا کے مسلم تعلیمی محاذ سے آنے والی خبر کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ اچھی خبروں کے کال کے اس زمانہ میں ایسی خوش آئند اور حوصلہ بخش خبریں کم ہی سننے کو ملتی ہیں۔ اس سال کیرالا کے میڈیکل انٹرنس ٹسٹ

میں ایک ہزار سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے طلبہ میں مسلمان طلبہ کا تناسب ۵۲ فیصد سے زیادہ رہا۔اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ پہلی سو پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ میں ان کا تناسب ۴۲ فیصد رہا جب کہ پہلے پانچ سو طلبہ میں یہ تناسب ۶۲ فیصد رہا۔اس سے پہلے انجینئر نگ انٹرنس کے نتائج بھی بہت حوصلہ افزا رہے تھے۔ابھی کچھ ہی دنوں پہلے تک صورت حال یہ تھی کہ ابتدائی تعلیم کی سطح تک تو کیرالا کے مسلمانوں کا حصہ بڑی حد تک صوبہ میں ان کی تعداد کے مطابق تھا لیکن اعلیٰ تعلیم کے میدان میں یہ تناسب ۲۷ فیصد سے گھٹ کر صرف ۱۰ فیصد رہ جاتا تھا۔اس پس منظر میں یہ ایک بڑی کامیابی ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کسی اتفاقی صورت حال کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ دراصل کیرالا کے مسلم معاشرہ میں تعلیم کی طرف بڑھتے اور مستحکم ہوتے رجحان کی غماز ہے۔

یہ کامیابی دراصل ایک طویل جدوجہد کا ثمرہ ہے۔ملک کے دوسرے خطوں کے مقابلہ میں کیرالا میں شرح خواندگی کا اوسط بہت بلند ہے۔ابتدائی تعلیم کی سطح تک مسلمان بھی اس میں برابر کے شریک رہے ہیں۔لیکن اعلیٰ تعلیم کے میدان میں وہ دوسروں سے واضح طور پر پیچھے تھے۔تعلیم اور سماجی بہبود کے میدان میں کام کرنے والی تنظیموں کی انتھک اور منصوبہ بند کوششوں کے نتیجہ میں اس خطہ میں تعلیمی اداروں کا ایک جال سا بچھ گیا۔چنانچہ وہاں کے طلبہ کو اب حصول تعلیم کے لیے دور دراز کے علاقوں کا سفر کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور یہ ممکن ہو گیا کہ وہ اپنے گھروں کے آس پاس کے اداروں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکیں،ساتھ ہی کوچنگ اور ضروری رہنمائی کا اہتمام کیا گیا،نتائج سب کے سامنے ہیں۔ابھی زیادہ دن نہیں گذرے جب کیرالا کے مسلم طلبہ کی ایک بڑی تعداد سائنس،انجینئر نگ اور میڈیسن کے علاوہ آرٹس اور سوشل سائنسز میں بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ کا رخ کیا کرتی تھی۔چنانچہ اُن دنوں مسلم یونی ورسٹی میں کیرالا کے طلبہ کی ایک قابل لحاظ تعداد پائی جاتی تھی۔لیکن جیسے جیسے وہاں اعلیٰ تعلیم کے حکومتی اور خود مسلمانوں کے اپنے ادارے قائم ہوتے گئے یہ صورت حال بدلتی گئی۔اب علی گڑھ میں کیرالا کے طلبہ خال خال ہی نظر آتے ہیں۔اس سے واضح طور پر یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ کسی بھی خطہ میں تعلیم کے فروغ اور اس کی توسیع کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہاں مقامی طور پر اعلیٰ تعلیم کے ادارے قائم کیے جائیں۔دور دراز کے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے صرف وہ تھوڑے سے لوگ فیض یاب ہو سکتے ہیں۔جنہیں اس کے لیے درکار ضروری وسائل حاصل

ہوں۔ایسی صورت میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کا مسئلہ ایک عمومی تحریک کی صورت اختیار نہیں کرسکتا۔ جب تک حصول تعلیم کا معاملہ ایک مہم اور تحریک کی صورت اختیار نہیں کرتا اس وقت تک قوم کی تقدیر نہیں بدل سکتی۔

بدقسمتی سے شمالی ہندوستان میں صورت حال اس سے یکسر مختلف ہے۔جس خطہ میں ۱۸۵۷ء کے سانحہ کے بعد مسلمانوں کے درمیان تعلیم کے فروغ کے لیے سب سے پہلے کوششیں ہوئیں اور جہاں اس سلسلہ کی سب سے زیادہ فعال اور طاقت ور تحریک برپا ہوئی وہاں جدید ہندوستان میں مسلمانوں کے درمیان تعلیم کی توسیع واشاعت کے لیے اس طرح منصوبہ بند کوشش نہیں ہوسکی جیسی کیرالا اور دوسری جنوبی ریاستوں میں ہوئی۔اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ملی اداروں کا فقدان ہے۔طلبہ کی کوچنگ اور انہیں ضروری رہنمائی فراہم کرنے کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے طلبہ اب بھی دور دراز کا سفر کرنے پر مجبور ہیں۔جو طلبہ اس کی استطاعت نہیں رکھتے وہ تعلیم ہی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ان تمام منفی عوامل کے باوجود گذشتہ چند برسوں میں مسلمان طلبہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے رجحان میں واضح طور پر اضافہ ہوا ہے۔طلبہ کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد اعلیٰ تعلیم کے مراکز کا رخ کررہی ہے اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکل رہا ہے کہ اعلیٰ تعلیم سے آراستہ نوجوانوں کی روز افزوں تعداد اپنی صلاحیت اور لیاقت کی بنیاد پر انڈسٹری میں اچھی ملازمتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہورہی ہے۔فرقہ پرست طاقتوں کے لیے یہ صورت حال قابل قبول نہیں ہے۔ چنانچہ فرضی الزامات کے تحت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور زیر تعلیم نوجوانوں کی گرفتاری، انکاؤنٹر اور قید و بند کا سلسلہ دراصل اسی رجحان کو روکنے کے لیے ایک منصوبہ بند سازش کا حصہ ہے۔اس سازش کو ناکام بنانے کی مہم میں حصہ لینا ہر حساس اور ذی شعور شہری کا فرض ہے۔سچر کمیٹی رپورٹ سے مسلم معاشرہ کی جو شبیہ ابھر کر سامنے آئی ہے اسے مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر تعلیم کے فروغ ہی کے ذریعہ بدلا جاسکتا ہے۔ (معارف اگست ۲۰۰۹ء)

جسونت سنگھ کی کتاب اور تقسیم ملک کا مسئلہ

جسونت سنگھ کی کتاب Jinnah: India Partition Independence شائع ہونے سے پہلے تیز و تند مباحثہ کی موضوع بن چکی تھی۔ ۱۷ راگست کو اس کی اشاعت کے بعد اس میں

مزید تیزی آ گئی اور ہنوز اس کے رکنے یا دھیمے پڑنے کے آثار نظر نہیں آرہے ہیں۔اس مباحثہ میں جس طرح کی تلخی اور تندی شامل ہوگئی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ حیرت انگیز اس لیے کہ اس میں جو باتیں کہی گئی ہیں وہ یکسر نئی نہیں ہیں۔مولانا آزاد کے علاوہ متعدد محققین یہ باتیں پہلے بھی کہہ چکے ہیں جن میں عائشہ جلال کی کتاب Jinnah: The Sole Spokesman, The Muslim League and the Demand for Pakistan نے خاص طور سے علمی حلقوں میں بہت شہرت حاصل کی تھی۔لیکن یہ تحقیقات اتنے وسیع پیمانے پر بحث کی موضوع نہیں بن سکیں۔ساتھ ہی یہ بھی ایک امر واقعہ ہے کہ سرحد کے دونوں پار سرکاری سطح پر جو تاریخ لکھی، پڑھی اور پڑھائی جارہی ہے ان میں ان تحقیقات کا کوئی انعکاس نہیں پایا جاتا۔ بہرحال یہ بات واضح ہے کہ اس گرمی محفل کی باعث ان تحقیقات کی ندرت نہیں ہے۔غالباً اس کا اصل سبب مصنف کا ذاتی پس منظر ہے۔اس پس منظر کے کسی شخص سے اس طرح کی کتاب کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔مصنف بھارتیہ جنتا پارٹی کے موسسین میں شامل رہے ہیں۔اس پارٹی کا سیاسی فلسفہ اتنا معروف ہے کہ اس کے بارے میں کچھ کہنا تحصیل حاصل کے مترادف ہوگا۔تقسیم ملک اور اس سے جڑے ہوئے مسائل میں اس کا اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے۔اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں کے سلسلہ میں ان کا ایک سوچا سمجھا موقف ہے۔ اس تکثیری معاشرہ والے ملک میں وہ جس قسم کا سیاسی نظام قائم کرنا چاہتی ہے اس کا وہ بانگ دہل اظہار واعلان کرتی رہتی ہے۔اپنی تمام تر روشن خیالی کے باوجود جسونت سنگھ اس کی تاسیس سے لے کر اس کتاب کی تصنیف کے ناقابل معافی جرم میں اس سے نکالے جانے تک نہ صرف یہ کہ اس میں شامل رہے ہیں بلکہ اس کی صف اول کے قائدین میں شمار ہوتے رہے ہیں، پارٹی کی جس میٹنگ میں ان کے اخراج کا فیصلہ کیا گیا اس میں شرکت کے لیے وہ شملہ پہنچ چکے تھے۔پارٹی سے نکالے جانے کے بعد انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ان سے صاف ظاہر ہے کہ ان کو اس انتہائی اقدام کی توقع نہیں تھی اور اس سے ان کو شدید صدمہ پہنچا۔ظاہر ہے کہ یہ تعلق ان کو بہت عزیز تھا۔ایسے پس منظر سے تعلق رکھنی والی شخصیت کے قلم سے ایک ایسی کتاب کی تصنیف پارٹی کے لیے شدید صدمہ اور دوسروں کے لیے حیرت کی باعث ہے۔ظاہر ہے کہ کتاب سے غیر معمولی دل چسپی میں مصنف کے ذاتی پس منظر کا بڑا حصہ ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جسونت سنگھ آر ایس ایس کے راستے سے بی۔جے۔پی میں نہیں آئے۔ان کی ٹریننگ کسی شاکھا کے بجائے ہندوستانی فوج میں ہوئی ہے جہاں وہ ایک افسر کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔وہ لبرل خیالات کے حامل رہے ہیں۔البتہ ان کے لبرل نظریات پارٹی کی پالیسیوں پر کس حد تک اثر انداز ہوئے اس کا کوئی اشاریہ دستیاب نہیں ہے۔بی۔جے۔پی پر آر ایس ایس کی مکمل گرفت کے باوجود آخر تک وہ پارٹی کے ایک وفادار سپاہی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ انہوں نے پارٹی کو نہیں چھوڑا پارٹی نے ان کو چھوڑ دیا۔اخراج سے کچھ ہی دنوں پہلے وہ پارٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیرمین منتخب ہوئے۔اٹل بہاری باجپئی کے عہد حکومت میں وزارت دفاع اور وزارت خزانہ جیسے کلیدی عہدوں پر فائز رہے اور بظاہر بغیر کسی خاص ذہنی خلش کے پارٹی کی پالیسیوں کی تنفیذ میں مصروف رہے۔ ۲۰۰۲ء کے گجرات سانحہ کے بعد لال کرشن اڈوانی کی مخالفت کے باعث اٹل بہاری واجپئی نریندر مودی کو وزیر اعلی کی حیثیت سے برطرف کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے اور اس کے نتیجہ میں وزارتِ عظمی سے مستعفی ہونا چاہتے تھے تو انہیں استعفا واپس لینے پر آمادہ کرنے کا کام جسونت سنگھ نے کیا۔اگر اٹل بہاری واجپئی گجرات میں مسلمانوں کے قتل عام کے ردعمل میں وزارت عظمی سے مستعفی ہو گئے ہوتے تو یہ ایک تاریخ ساز واقعہ ہوتا۔ ملک کی تاریخ میں اسے ایک یادگار واقعہ کی حیثیت حاصل ہوجاتی۔ ہندوستان کے سیاسی منظرنامے اور خود بی۔جے۔پی پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوتے۔نریندر مودی کا وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے باقی رہنا ممکن نہ ہوتا اور سہراب الدین شیخ اور عشرت جہاں جیسے بے شمار لوگ خون کے اس دریا سے گذرنے سے بچ جاتے۔اس لیے موجودہ صورت حال پر بہت زیادہ اظہار مسرت و شادمانی شاید بہت سمجھداری کی بات نہیں۔

اس کتاب کی تصنیف کے پیچھے جو بھی عوامل رہے ہوں یہ ضرور ہے کہ اس سے تقسیم ملک اور اس کی ذمہ داری کا مسئلہ ایک بار پھر پوری قوت اور شدت سے بحث ونظر کا موضوع بن گیا ہے۔ پرانے زخم کے ٹانکے پھر کھل گئے ہیں لیکن تکلیف کی شدت کے ساتھ ساتھ اس کے علاج کے امکانات بھی بڑھ گئے ہیں۔ظاہر ہے جب تک صحیح تشخیص نہیں ہوجاتی مرض کو وقتی طور پر دبایا تو جاسکتا ہے لیکن اس کا حتمی علاج نہیں کیا جاسکتا۔صورت حال یہ ہے کہ اس سانحہ پر ۶۲ سال کی طویل مدت

گذر چکی ہے لیکن آج بھی برصغیر کی آبادی کا بڑا حصہ اس کی صحیح تفصیلات سے ناواقف ہے۔ ایک ایسا واقعہ جس کے نتائج اتنے ہولناک اور تباہ کن تھے اس کے اسباب وعوامل اور اس میں اساسی کردار ادا کرنے والوں کے بارے میں آج بھی ایک بڑی اکثریت یکسر ناواقفیت کی شکار ہے۔ تعلیم گاہوں میں تقسیم ملک کی ایک ایسی تاریخ پڑھائی جاتی ہے جو حقیقت واقعہ کی عکاسی نہیں کرتی۔ تاریخ کا بنیادی فائدہ یہ ہے کہ اس کی رہنمائی میں ان غلطیوں سے بچا جاسکے جو ماضی میں انسانیت کے لیے تباہی کا باعث بن چکی ہیں۔ ایک زیرک انسان دوسروں کی غلطیوں سے سبق حاصل کرتا ہے۔ لیکن اس کے لیے جہاں دیدہ، بینا اور عبرت پذیر قلب کی ضرورت ہے وہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ماضی کی تصویر کشی صحیح اور سچی ہو۔ مورخ کی ذمہ داری ہے کہ ماضی میں پیش آنے والے حادثات اور واقعات کو ان کی صحیح صورت میں اگلی نسلوں کے لیے محفوظ کردے۔ اس میں اس کی اپنی پسند و ناپسند، مذہبی معتقدات، قومی اور ملکی مصالح اور مفادات اور تحفظات اور تعصّبات کا دخل نہ ہو۔ بشری امکان کی حد تک مورخ کو معروضیت اور صداقت کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ جدو جہد آزادی اور تقسیم ملک کی دستیاب تاریخ میں ان خصوصیات کا کس حد تک خیال رکھا گیا ہے اس کا پتہ لگانے کے لیے کسی غیر معمولی ژرف نگاہی کی ضرورت نہیں۔ اس کے نتیجہ میں دونوں ملکوں کے تعلقات میں مستقل کشیدگی اور بے اعتمادی کی فضا پائی جاتی ہے۔ خود ملک کے اندر آبادی کے مختلف اجزاء کے درمیان شک وشبہہ اور منافرت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ مسلمانوں نے اس جرم بے گناہی کی جو سزا بھگتی ہے اور بھگت رہے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ اس لحاظ سے جسونت سنگھ قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اس بحث کو پھر چھیڑ دیا ہے اور تاریخ کے اس فراموش کردہ باب کو پھر سے کھول دیا ہے۔ بحث کی لے اتنی تیز ہے کہ کسی ذی شعور انسان کے لیے اس سے صرف نظر ممکن نہیں۔ ان کی بات کا وزن اس لیے بھی زیادہ محسوس کیا جارہا ہے کہ ان کی حیثیت شہد شاھد من اہلہا کی ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ اب یہ مسئلہ حتمی طور پر حل کرلیا جائے اور صحیح صورت حال دنیا کے سامنے آجائے۔ مقدمہ کی سماعت کے بغیر جن کو اس ناکردہ جرم کی پاداش میں سزا دی جاچکی تھی اب اسے واپس لے لیا جائے۔ جب تک شکوک وشبہات کے یہ جالے دل ودماغ سے صاف نہیں ہوں گے یگانگت اور باہمی مفاہمت کی وہ فضا قائم نہیں ہوگی جو مغربی سامراجیت کے غلبہ سے پہلے اس ملک کا

نشانِ امتیاز تھا۔حق وانصاف کا تقاضا ہے کہ اس بحث کو اس کے منطقی نتیجہ تک پہنچایا جائے۔اگر ایسا ہوجائے تو یہ یقیناً جسونت سنگھ کا ایک کارنامہ ہوگا جس کے لیے ان کو یاد رکھا جائے گا۔

(معارف ستمبر ۲۰۰۹ء)

ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ صورت حال

گجرات کے قتل عام کے بعد جو تنظیمیں فرقہ واریت کا مقابلہ کرنے اور معاشرہ میں اس کے اثرات بد کے نفوذ کو روکنے کے مقصد سے قائم کی گئیں،ان میں ایک نمایاں نام انہد (Anhad) کا ہے۔اس تنظیم کا پورا نام Act Now for Harmony and Democracy ہے۔ابتدا ہی سے یہ تنظیم بڑی قابل قدر خدمات انجام دیتی رہی ہے۔گزشتہ دنوں بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر کی عدالتی تفتیش کے لیے دہلی ہائی کورٹ میں اس تنظیم نے مقدمہ دائر کیا تھا جو نیشنل ہیومن رائٹس کمیشن (NHRC) کی غیر ذمہ دارانہ رپورٹ کی بنیاد پر خارج ہوگیا۔انہد نے ہائی کورٹ کے اس فیصلہ کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا ہے اور امید کی جانی چاہیے کہ اس کے مثبت نتائج برآمد ہوں گے۔اسی تنظیم نے ۳ر سے ۵/اکتوبر تک دہلی میں ہندوستان میں مسلمانوں کی موجودہ صورت حال پر ایک سہ روزہ کانفرنس کا اہتمام کیا۔اس کانفرنس کا موضوع تھا ''آج کے ہندوستان میں مسلمان ہونے کے کیا معنیٰ ہیں؟''(What it means to be a Muslim in India today)اس سیمینار میں زیر بحث موضوع سے دلچسپی رکھنے والے دانشوروں اور اس میدان میں کام کرنے والوں کے علاوہ بڑی تعداد میں ان لوگوں نے بھی شرکت کی جو خود اس سنگین صورت حال سے دوچار ہیں اور جرم بے گناہی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ان کی سرگزشت ناقابل بیان حد تک دردناک اور اس سلسلہ میں حکومتی اور غیر حکومتی اداروں کے انتہائی غیر منصفانہ اور ظالمانہ طرز عمل کی غماز ہے۔اس کے علاوہ یہ بات نہایت واضح طور پر ابھر کر سامنے آئی کہ ملک کے طول وعرض میں مسلمان خوف وہراس،مایوسی اور عدم تحفظ کے شدید احساس میں مبتلا ہیں۔ان کے ساتھ عملاً دوسرے درجہ کے شہری کا سلوک روا رکھا جارہا ہے۔انہیں ہمیشہ یہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ نہ جانے کب انہیں یا ان کے متعلقین میں سے کسی کو دہشت گردی کے الزام میں پکڑ لیا جائے اور تفتیش کے نام پر ان کو طویل مدت تک قید وبند اور تعذیب وایذارسانی کا نشانہ بنایا جائے۔اس کے نتیجہ میں کتنے خاندان اجڑ گئے،کتنے ہنستے بستے

گھر ویران ہو گئے، امید اور حوصلہ سے سرشار کتنے باصلاحیت نوجوانوں کے کیرئیر برباد ہو گئے۔اس کا حساب کون دے گا۔ کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں۔فطری طور پر حکومت، عدلیہ، سیاسی پارٹیوں اور دوسرے اداروں سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھتا جا رہا ہے۔ مسلمان اس ملک کی تعمیر و ترقی میں دوسروں کی طرح اپنا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں لیکن انہیں اس کے مواقع نصیب نہیں۔ چنانچہ یہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ دراصل یہ ان اقدار کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے جو دستور کے بنیادی نکات کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو جمہوریت، سیکولرازم اور قانون کی حکمرانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس موقع پر کئی اہم تجاویز بھی پاس کی گئیں جن میں دہشت گردی سے متعلق تمام مقدمات کی جانچ کے لیے سپریم کورٹ کے کسی چیف جسٹس کی سربراہی میں ایک ہائی پاور جوڈیشیل کمیشن قائم کرنے کا مطالبہ بھی شامل ہے۔ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ مرکزی حکومت فرقہ وارانہ فسادات سے متعلق قانون بنانے کا اپنا دیرینہ مطالبہ پورا کرے۔اس طرح کی کئی اور اہم تجاویز بھی اس موقع پر منظور کی گئیں۔

اردو تصنیفات و مقالات میں حوالہ کا مسئلہ اور معارف میں اس کے اہتمام کی درخواست

مولانا شبلی نے اردو مصنّفین میں سب سے پہلے اپنی تحریروں میں جدید انداز میں حوالوں کا اہتمام کیا۔ان سے پہلے اس کی کوئی باقاعدہ روایت نہیں تھی اور عموماً سرسری انداز میں حوالوں کا ذکر کر دیا جاتا تھا۔مولانا کے انتقال پر اب ایک صدی پوری ہونے والی ہے۔ گزشتہ ایک صدی کے دوران علم و تحقیق کے میدان میں غیر معمولی پیش رفت ہوئی ہے۔اردو میں بھی تحقیق کے اعلیٰ ترین معیار پر پورے اترنے والے لٹریچر کی کمی نہیں۔ان سب کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب بھی اردو زبان میں لکھنے والے بہت سے لائق اور فاضل مصنفین اپنی تصنیفات بالخصوص مقالات میں حوالوں کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور ان کا اہتمام ضروری نہیں خیال کرتے۔ حالانکہ علم و تحقیق کے میدان میں حوالہ کا معاملہ شخصی ترجیحات اور ذاتی پسند و ناپسند کے زمرہ میں شامل نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک اہم علمی ضرورت کی ہے جس کی ہر صورت میں تکمیل ہونی چاہیے۔ بحث و تحقیق کے دوران جن امور سے تعرض کیا جاتا ہے ان کے استناد کے لیے حوالہ کی ضرورت اور اہمیت

مسلم ہے۔اس کے بغیر قاری کے لیے یہ معلوم کرنا ممکن نہیں کہ جو بات کسی مصنف یا ماخذ کے تعلق سے کہی جارہی ہے وہ واقعی اس مصنف نے اسی طرح کہی ہے اور اس ماخذ میں اسی طرح پائی جاتی ہے یا نہیں۔بعض مصنّفین حوالوں کا اہتمام کرنے کے بجائے آخر میں کتابیات کی ایک فہرست فراہم کردیتے ہیں۔اس سے حوالہ کی بنیادی ضرورت پوری نہیں ہوتی۔یہ صحیح ہے کہ حوالوں کے عام مروّج طریقہ کے علاوہ اہل علم کے درمیان ایک اور طریقہ بھی رائج ہے جس کا اردو میں کچھ زیادہ چلن نہیں ہے۔اس کے باوجود وہ ایک تسلیم شدہ طریقہ ہے اور حوالوں کی ناگزیر ضرورت کی تکمیل کے لیے یہ طریقہ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔اس طریقہ میں آخر میں مکمل حوالہ دینے کے بجائے متن میں بریکٹ میں مختصر حوالہ دے دیا جاتا ہے اور آخر میں مقالہ میں استعمال کیے جانے والے ماخذ کی مکمل کتابیات فراہم کردی جاتی ہے۔اس سے واضح ہے کہ محققین کے درمیان حوالہ کے طریقہ اور انداز کے بارے میں تو ضرور اختلاف ہے لیکن حوالہ کی ضرورت اور اہمیت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔متن میں مختصر حوالہ دینے کے بجائے آخر میں صرف کتابیات کی فراہمی چنداں مفید نہیں اور حوالہ کی بنیادی ضرورت اس سے پوری نہیں ہوتی۔ظاہر ہے ہر قاری کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی ایک حوالہ کی تلاش کے لیے کتابیات میں مذکور تمام کتابوں کا مطالعہ کرے۔اس سے یہ تو ضرور معلوم ہوجاتا ہے کہ مقالہ لکھنے کے لیے مصنف کے پیش نظر کون سے مآخذ رہے ہیں لیکن یہ معلوم کرنے کی کوئی صورت نہیں کہ کون سی بات کس ماخذ اور کہاں سے لی گئی ہے جب کہ اصل ضرورت آخرالذکر امر کی ہے۔اس لیے معارف کے فاضل مقالہ نگار علما اور محققین سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ معارف کے لیے مقالہ لکھتے وقت ضروری حوالوں کا اہتمام فرمائیں۔آئندہ ہم ایسے مقالوں کو شامل اشاعت کرنے سے معذور ہوں گے جن میں ضروری حوالوں کا اہتمام نہیں کیا گیا ہو۔جس علمی روایت کی طرح علامہ شبلی نے سو سال پہلے ڈالی تھی کم از کم معارف میں اس کی پابندی تو ہونی چاہیے۔

(معارف اکتوبر ۲۰۰۹ء)

بابری مسجد اور عدالت کا فیصلہ

مسئلہ، ایودھیا میں واقع ایک قطع آراضی پر ایک خوبصورت تاریخی مسجد کا تھا، جو سولھویں صدی کے تیسرے دہے میں مغل حکمراں ظہیرالدین محمد بابر کے عہد حکومت میں تعمیر ہوئی تھی اور اسی

نسبت سے بابری مسجد کے نام سے موسوم تھی۔ پانچ سو سال تک مسلمانوں نے اس میں نماز ادا کی۔ اس کی فضا نالہ نیم شبی اور دعاء سحر گاہی سے معمور و پرنور رہی۔ پھر ایک شب کچھ شرپسندوں نے کچھ مورتیاں لاکر وہاں رکھ دیں اور دعویٰ کیا گیا کہ جس جگہ بابری مسجد کی عمارت ہے ٹھیک وہی جگہ رام للاّ کی جائے پیدائش ہے۔ یہ اس وقت ہوا جب ملک میں آزادی کا سورج طلوع ہو چکا تھا اور جمہوری حکومت قائم ہو چکی تھی۔ انصاف کا تقاضا تھا کہ غیر قانونی طور پر رکھی گئی ان مورتیوں کو وہاں سے اٹھا دیا جاتا اور مسجد مسلمانوں کو واگذار کردی جاتی۔ جنھوں نے اس شب بھی وہاں نماز عشاء ادا کی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جو کچھ ہوا وہ اب تاریخ کا حصہ ہے۔ گذشتہ ساٹھ برسوں کے دوران یکے بعد دیگرے مسلسل ایسے فیصلے کئے جاتے رہے جو سچائی اور انصاف سے بعید تھے اور جو کسی بھی ملک و حکومت کے لیے قابل فخر نہیں ہو سکتے۔ الٰہ آباد ہائی کورٹ سے توقع تھی کہ بالآخر وہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرے گی اور دیر ہی سے سہی حق دار کو حق واپس مل جائے گا۔ یہ توقع کچھ بے جا بھی نہیں تھی۔ ایک تو اس لیے کہ عدالت عالیہ کا کام ہی مکمل اور بے آمیز انصاف فراہم کرنا اور ان لوگوں کی دادرسی کرنا ہے جن کو کسی وجہ سے نچلی عدالتوں سے انصاف نہ مل سکا ہو۔ دوسرے اس لیے بھی کہ جس معاملہ میں عدالت کو فیصلہ دینا تھا اس کا تعلق حق ملکیت سے تھا اور تاریخ، ثبوت اور دلائل واضح طور پر مسجد کے حق میں تھے۔ لیکن ساٹھ سال کے طویل انتظار کے بعد عدالت عالیہ نے جو فیصلہ دیا اس نے نہ صرف مسلمانوں کو مایوس کیا بلکہ غیر مسلم ماہرین قانون، مورخین، ماہرین آثار قدیمہ اور ذی شعور افراد کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔ اس معنی میں اس فیصلہ نے ایک نئی تاریخ رقم کی ہے کہ اس میں مستحکم دلائل کے مقابلہ میں ایک دیومالائی شخصیت کے لیے کچھ لوگوں کی عقیدت (آستھا) کو فیصلہ کی بنیاد بنایا گیا ہے۔ عدالت عالیہ نے ایک خالص قانونی مسئلہ میں جو حق ملکیت سے متعلق تھا، ہندوؤں کے ایک طبقہ کے ایک ایسے عقیدہ کے مطابق فیصلہ کیا جس کی تصدیق نہ قانون کے ذریعہ ممکن ہے اور نہ تاریخ کے ذریعہ۔ فاضل ججوں نے اگرچہ اپنے الگ الگ فیصلوں میں کئی امور میں ایک دوسرے سے اختلاف بھی کیا ہے لیکن ایک معاملہ میں ان کے درمیان حیرت انگیز حد تک اتفاق و اتحاد نظر آیا۔ وہ متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہونچے کہ جس جگہ مسجد کا مرکزی گنبد واقع تھا ٹھیک اسی جگہ رام للاّ کی جائے پیدائش ہے، اس سے زیادہ حیرت انگیز وہ دلیل ہے جس کی بنیاد پر یہ فیصلہ دیا گیا۔ یہ دلیل

دراصل انہی لوگوں کی فراہم کردہ ہے جنھوں نے خالص سیاسی اغراض و مقاصد کے لیے جنم بھومی کی تحریک چلائی اور بابری مسجد کو دن کی روشنی میں مسمار کردیا۔اس کے بعد ملک کے طول و عرض میں جو کچھ ہوا وہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں ایک سیاہ باب کی حیثیت رکھتا ہے۔مسلمانوں کے سر سے ایک جوئے خون گذر گئی۔اس ہمہ گیر تباہی کے دردناک اثرات اور آثار اب تک باقی ہیں اور یہ زخم اب تک ویسے ہی ہرا ہے۔مجرموں کو اتنے سنگین جرم کی نہ کوئی سزا دی گئی اور نہ ان سے کوئی باز پرس کی گئی اور اب ان کی اس دلیل کو تسلیم کرکے نہ صرف یہ کہ قانون پر عقیدہ کی بالادستی تسلیم کرلی گئی بلکہ ایک طرح سے ان کو اس گھناؤنے جرم کے لیے سند جواز عطا کردی گئی اور انعام میں متنازع زمین کا دو تہائی حصہ بھی بخش دیا گیا۔غالباً اسی وجہ سے اس فیصلہ میں کہیں اور کسی انداز میں بھی بابری مسجد کی شہادت اور اس میں ملوث افراد کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

اس فیصلہ میں محکم تاریخی حقائق ، پختہ ثبوتوں اور مضبوط دلائل کو جس طرح نظر انداز کیا گیا ہے اس کی تفصیل نہ تو یہاں ممکن ہے اور نہ شاید اس کی ضرورت ہے۔البتہ اس کے بعض پہلو ایسے ہیں جو مستقبل میں دستور کی بالادستی اور قانون کی حکمرانی کے لیے بڑے خطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر دستوری اساسات اور قانونی دفعات کے بجائے عدالتیں معتقدات کی بنیاد پر فیصلے دینے لگیں تو اس کے نتائج اور عواقب کا اندازہ لگانے کے لیے کسی خاص ژرف نگاہی کی ضرورت نہیں ہے۔ اقلیتوں سے تعلق رکھنے والی تاریخی عمارتیں،عبادت گاہیں اور دوسرے مذہبی مقامات خاص طور سے اس کی زد میں رہیں گے۔جب تک سپریم کورٹ کی طرف سے اسے کالعدم نہیں کردیا جاتا یا اس پر روک نہیں لگادی جاتی اس کو قانون کی حیثیت حاصل رہے گی اور عدالتیں اس نظیر کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کے لیے آزاد ہوں گی۔چنانچہ اس فیصلہ سے اس طرح کے عناصر کو مزید ایسی مہم جوئیوں کے لیے ترغیب اور حوصلہ ملے گا اور ملک کی فرقہ وارانہ صورت حال پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

عدالت نے ایک سوال یہ بھی قائم کیا تھا کہ جس جگہ بابری مسجد تعمیر کی گئی کیا وہاں پہلے کوئی مندر تھا جسے ڈھاکر مسجد تعمیر کی گئی۔اس کے لیے کوئی تاریخی ثبوت دستیاب نہیں تھا۔اس لیے عدالت نے محکمہ آثارِ قدیمہ کو حکم دیا کہ متنازع جگہ پر کھدائی کرکے پتہ لگایا جائے کہ کیا وہاں پہلے کوئی مندر موجود تھا۔اس وقت مرکز میں بی۔جے۔پی کی حکومت تھی۔چنانچہ یہ بات چنداں باعث تعجب نہیں

کہ محکمہ آثارِقدیمہ نے زیرزمین ایک بڑے مندر کے آثار دریافت کر لیے۔اس وقت بھی بہت سے مورخین اور ماہرین آثارِقدیمہ نے اسے یکسر مسترد کر دیا تھا۔اس کے برعکس ان کی رائے میں وہاں پائے جانے والے آثار دراصل کسی مسلم آبادی کا پتہ دے رہے تھے۔ یہ نقطہ نظر پوری قوت سے عدالت کے سامنے پیش بھی کر دیا گیا تھا۔اس کے باوجود عدالت نے اکثریتی رائے سے محکمہ آثارِقدیمہ کے نقطہ نظر سے اتفاق کیا اور بغیر کسی علمی بنیاد کے مورخین اور ماہرین آثارِقدیمہ کی رائے کو نظرانداز کر دیا۔حالاں کہ یہ کسی طرح بھی ثابت نہیں کیا جا سکا کہ اگر وہاں کبھی کوئی مندر موجود بھی تھا تو اسے بابری مسجد کی تعمیر کے لیے مسمار کیا گیا۔ہندوستان جیسے قدیم ملک میں مختلف عوامل کے زیر اثر آبادیاں قائم ہوتی اور اجڑتی رہی ہیں اور اجڑی ہوئی بستیوں کی جگہ نئی بستیاں آباد ہوتی رہی ہیں۔اگر عدالتیں زیرزمین موجود آثار کی بنیاد پر فیصلے صادر کرنے لگیں تو بات کہاں جا کر رکے گی۔ ماضی میں جو کچھ ہو چکا اسے کوئی پسند کرے یا ناپسند، نہ تو اسے بدلا جا سکتا ہے اور نہ اسے اپنی پسند کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے درست کیا جا سکتا ہے۔ان سے صرف عبرت حاصل کی جا سکتی ہے تا کہ ان غلطیوں سے بچا جا سکے جو پہلی نسلوں کی تباہی کی باعث ہوئیں۔موجودہ سیاسی تقاضوں اور ضرورتوں کی تکمیل کے لیے ماضی کو بدلنے کی کوشش خطرات سے پر ہے اور اس سے احتراز ضروری ہے۔

(معارف اکتوبر ۲۰۱۰ء)

انجمن اسلام ممبئی کی تعلیمی خدمات

تعلیم اور سماجی خدمت سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے انجمن اسلام محتاج تعارف نہیں۔یہ انجمن ۱۸۷۴ میں بمبئی ہائی کورٹ کے پہلے مسلم جج اور انڈین نیشنل کانگریس کے تیسرے صدر بدرالدین طیب جی کی قیادت میں قائم کی گئی تھی۔مہاراشٹرا کے علاقہ میں تعلیم کی ترویج میں اس ادارہ کی عظیم الشان خدمات سے اہل نظر بخوبی واقف ہیں۔اس کی زیرنگرانی کام کرنے والے اداروں میں ایک اعلیٰ درجہ کا انجینئرنگ کالج ،طبیہ کالج اور درجنوں دوسرے تعلیمی ادارے شامل ہیں اور تقریباً ایک لاکھ طلبہ ان میں زیرتعلیم ہیں۔ان تدریسی اداروں کے علاوہ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور کریمی لائبریری بھی انجمن کے زیرانتظام چلنے والے اداروں میں شامل ہیں۔اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اپنی علمی، تحقیقی، ادبی اور تہذیبی خدمات کے لیے علمی حلقوں میں قدرواحترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

کریمی لائبریری ۱۸۹۸ میں قائم کی گئی تھی ۔ یہاں منتخب کتابوں کا بڑا قیمتی ذخیرہ موجود ہے ۔ ایک مدت کے بعد انجمن کے موجودہ صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی صاحب اور سکریٹری معین الحق چودھری صاحب کی دلچسپی اور معروف ادیب اور شاعر جناب شمیم طارق کی کوششوں سے اسے ایک نئی زندگی ملی ہے اور وہ ممبئی میں علمی سرگرمیوں کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئی ہے ۔ گذشتہ جنوری میں دارالمصنّفین کا وفد ممبئی گیا تھا تو اکیڈمی کے تعارف کے سلسلہ میں پہلا پروگرام کریمی لائبریری میں ہوا تھا اور آخری پروگرام بھی اسی جگہ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا ۔ کریمی لائبریری کی روز افزوں علمی سرگرمیوں کے ایک حصہ کے طور پر گذشتہ دنوں اس کے زیر اہتمام مہاراشٹرا کی سطح پر 'مقابلہ دینیات' کا کامیاب پروگرام منعقد کیا گیا ۔ اس موقع پر کامیاب ہونے والے طلبہ کو نقد انعامات کے علاوہ متعلقہ اسکولوں کو شیلڈس تفویض کی گئیں ۔ یہ شیلڈس سرسید احمد خاں ، بدرالدین طیب جی ، علامہ شبلی نعمانی اور حاجی عبدالرزاق کالسیکر کے نام پر قائم کی گئی ہیں ۔ عام دستور کے برخلاف جیتنے والے اسکولوں سے شیلڈس واپس نہیں لی جائیں گی ۔ اس کے علاوہ تمام شرکاء کو سرٹیفکیٹ اور مولانا عبدالسلام ندوی کی کتاب ''مشرقی کتب خانے'' تحفہ میں پیش کی گئی ۔ پروگرام کی غیر معمولی کامیابی کے پیش نظر اگلے سال سے اسے ملک گیر پیمانے پر منعقد کرنے کا منصوبہ ہے ۔ انشاءاللہ اس کے دوررس اثرات مرتب ہوں گے ۔ اس کامیاب اور مفید پروگرام کے انعقاد کے لیے ہم کریمی لائبریری کے ذمہ داروں اور کامیاب ہونے والے طلبہ کو مبارک باد پیش کرتے ہیں ۔ (معارف اکتوبر ۲۰۱۱ء)

مسلم پرسنل لا بورڈ

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم ہے ۔ ابتدا ہی سے اسے اسلامیان ہند کی متحدہ آواز کی حیثیت حاصل رہی ہے ۔ گذشتہ صدی میں آٹھویں دہے کے ابتدائی دنوں سے حکومت اور عدلیہ کی سطح پر ایسے فیصلے کیے جارہے ہیں جن کی زد براہ راست مسلم پرسنل لا پر پڑتی تھی اور اس کے نتیجہ میں وہ مقاصد بری طرح متاثر اور مجروح ہورہے تھے جن کی ضمانت شریعت اپلی کیشن ایکٹ میں دی گئی تھی ۔ ایک سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت مسلسل ایسے اقدامات کیے جارہے تھے جن سے ملک میں یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کی راہ ہموار ہو ۔ مسلمانوں کے ذہنی اور ملی تشخص کی حفاظت اور بقا کے لیے اس صورت حال کے مضمرات باعث تشویش ہی نہیں نہایت

خطرناک تھے۔ملی قیادت نے صورت حال کی سنگینی اور اس خطرہ کے سد باب کے لیے فوری اقدام کی ناگزیر ضرورت کو شدت سے محسوس کیا اور اس کے نتیجہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا۔ابتداءً اس کا دائرہ کار پرسنل لا سے متعلق معاملات تک محدود تھا۔لیکن بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ اس کے میدان کار میں وسعت آتی چلی گئی۔مرکزی حکومت کی سطح پر مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی نہ ہونے کے باعث ایسے امور کا ایک سلسلہ ہے جن کی زد مسلمانوں کے اسلامی اور ملی تشخص پر پڑتی ہے۔گذشتہ دنوں میں قانون حق تعلیم، ڈائرکٹ ٹیکسز کوڈ بل، وقف جیسے مسائل سامنے آئے ہیں جن کے مضمرات مسلم اداروں، مدارس اور مساجد کے لیے نہایت خطرناک ہیں۔ بورڈ کے مطالبات کی معقولیت کو تسلیم کرنے کے باوجود ابھی ضروری ترمیمات کے ذریعہ ان کمیوں اور خامیوں کو دور نہیں کیا گیا ہے۔بورڈ کو صورت حال کی سنگینی کا پورا احساس ہے۔چنانچہ ۲۰۱۱ء میں ان مقاصد کے حصول کے لیے جس مہم کا آغاز کیا گیا تھا وہ اب بھی جاری ہے۔

اس پس منظر میں ۲۰۔۲۲ر اپریل کو ممبئی میں منعقد ہونے والا بورڈ کا بائیسواں آل انڈیا اجلاس خصوصی اہمیت کا حامل تھا۔بہت سے لوگوں کو اب بھی یہ بات یاد ہوگی کہ ۱۹۷۲ء کا تاریخی اجلاس جس سے بورڈ کی تاسیس کی راہ ہموار ہوئی تھی ممبئی ہی میں منعقد ہوا تھا۔ممبئی کے مسلمانوں کی ملی مسائل سے وابستگی کی ایک طویل تاریخ ہے،حسب توقع یہ اجلاس پوری طرح کامیاب رہا۔ممبئی کے مسلمانوں نے پورے جوش اور جذبہ سے اس میں حصہ لیا اور ہندوستان میں مسلمانوں کے آئینی حقوق کے حصول کی جدوجہد میں ایک روشن باب کا اضافہ کیا۔عمومی اجلاس کے لیے آزاد میدان کا انتخاب کیا گیا تھا لیکن وہ اپنی تمام تر وسعت کے باوجود مسلمانان ممبئی کے امنڈتے ہوئے سیلاب کے سامنے تنگ دامانی کا شکوہ کرتا نظر آیا۔اس اجلاس میں ملت کو درپیش مسائل سے متعلق نہایت اہم تجاویز پاس کی گئیں۔ان تجاویز کو بروئے کار لانے کے مقصد سے ''آئینی حقوق بچاؤ'' مہم کو جاری رکھنے اور اس میں مزید تیزی لانے کا فیصلہ کیا گیا۔عموماً دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ حکومتیں دلیل کی زبان ذرا مشکل سے سمجھتی ہیں لیکن طاقت کی زبان ان کی سمجھ میں زیادہ آسانی سے آجاتی ہے۔ان دونوں کا مناسب امتزاج ہی دراصل کامیابی کی کلید ہے۔بورڈ کے مطالبات کی معقولیت تو اظہر من الشمّس ہے اور گفتگو کی میز پر حکومت بھی اسے تسلیم کرتی ہے۔ممبئی کے مسلمان حکومت کو یہ پیغام بھیجنے میں

کامیاب رہے ہیں کہ ان مطالبات کے پیچھے ہندوستانی مسلمانوں کی متحدہ طاقت بھی ہے۔امید کی جانی چاہیے کہ حکومت ان مطالبات کی معقولیت تسلیم کرتے ہوئے ''قانون حق تعلیم''ڈائرکٹ ٹیکسز کوڈ بل،نکاح رجسٹریشن وغیرہ جیسے امور میں بورڈ کی تجاویز کی روشنی میں ضروری ترمیمات کرے گی اوراس طرح ان مسائل کے حل کی مناسب راہ نکل آئے گی۔بورڈ نے بجا طور پر یوپی کے جواں سال چیف منسٹر جناب اکھلیش یادو کی ستائش کی ہے جنہوں نے زرعی اراضی کے قانون میں بورڈ کے مطالبہ کے مطابق ترمیم کا وعدہ کیا ہے تاکہ وراثت میں لڑکیوں کو بھی ان کا حصہ مل سکے جس کی شریعت کے مطابق وہ حقدار ہیں۔یہ ایک بڑی کامیابی ہوگی جو مسلم پرسنل لا بورڈ کی کوششوں کے نتیجہ میں حاصل ہوگی۔ہمیں یقین ہے کہ مخلص، بیدار اور فعال قیادت کی رہنمائی میں بورڈ اپنے دوسرے مطالبات کو تسلیم کرانے میں کامیاب ہوگا۔(معارف مئی ۲۰۱۲ء)

آسام کے مسلمان

آسام میں خاک وخون کا کھیل اس سے پہلے بھی کئی بار کھیلا جاچکا ہے۔ ۱۹۸۳ میں نلّی میں تین ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔اس کے بعد بھی مسلم آبادیوں پر شرپسندوں کے حملے جاری رہے۔بانس باڑی پر اسی قسم کے ایک حملے میں سو سے زیادہ مسلمان قتل کردیے گئے تھے۔بوڈو ٹیرٹوریل کونسل (BTC) اور بوڈو ٹیری ٹوریل اٹانمس ڈسٹرکٹس (BTAD) کی تشکیل کے بعد جیسا کہ اندیشہ تھا اس مہم میں مزید تیزی آگئی ہے۔ BTAD جن اضلاع پر مشتمل ہے ان میں سے کئی اضلاع میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔اس کے باوجود انتظامی اور سیاسی اختیارات بوڈو قبائلیوں کے ہاتھ میں ہیں۔اب منصوبہ بند طور پر یہ کوشش کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کو وہاں سے بے دخل کرکے ان کی زمینوں اور املاک پر قبضہ کرلیا جائے۔اس مقصد کے حصول کے لیے شرپسندوں نے اس علاقہ میں گذشتہ ایک دہے میں مسلم آبادی میں غیرمعمولی اضافہ کا ہوّا کھڑا کیا۔کہا جارہا ہے کہ اس دوران مسلمان بڑی تعداد میں غیرقانونی طور پر بنگلہ دیش سے نقل مکانی کرکے اس علاقہ میں آباد ہوگئے ہیں۔اس جھوٹے پروپگنڈہ میں بوڈو شرپسندوں کو میڈیا اور آسام اور ملک کی فسطائی طاقتوں کا مکمل تعاون حاصل ہے۔اس طرح اس علاقہ کی مسلم آبادی کے ایک بڑے حصے کو ملک بدر کرنے کا منصوبہ بنایا جارہا ہے۔حکومت کی نااہلی

اور بے حسی کی وجہ سے اصلاح احوال کے امکانات معدوم ہوتے جارہے ہیں اور یہ علاقہ بارود کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو چکا ہے۔کوکراجھار اور آس پاس کے اضلاع میں جاری تشدد کی موجودہ لہر اسی منصوبہ کا حصہ ہے۔اب تک ۷۷ قیمتی انسانی جانیں اس کی نذر ہو چکی ہیں اور سینکڑوں بستیاں راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکی ہیں۔چار لاکھ افراد ریلیف کیمپوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو چکے ہیں۔

آسام سے مسلمانوں کا پہلا رابطہ ۱۲۰۶ء میں اس وقت ہوا جب ملک عزالدین محمد بختیار خلجی نے اس راستہ سے تبت پر فوج کشی کی۔بختیار خلجی غیر معمولی صلاحیت کا فوجی قائد تھا۔تیرہویں صدی کے ابتدائی برسوں میں بہار اور بنگال کی فتح کا سہرا اسی کے سر ہے۔یہ مہم ناکام رہی البتہ اس کے نتیجہ میں اس خطہ میں بنگال کے مسلم حکمرانوں کی دلچسپی بڑھ گئی اور وہ وقتاً فوقتاً اس علاقہ کو اپنے زیرنگین لانے کی کوششیں کرتے رہے۔اس خطہ کی مخصوص جغرافیائی صورت حال کی وجہ سے یہ کوششیں کبھی کامیاب ہوتیں اور کبھی ناکام۔آسام کے حکمران بنگال کے مسلم حکمرانوں کے باج گزار بھی رہے اور کبھی کبھی ان جنگوں میں مسلمان آسامیوں کے ہاتھوں قید بھی ہوجاتے۔آسام میں مسلم آبادی کے بنیاد گذار یہی مسلمان قیدی ہیں۔ان قیدیوں کے ساتھ آسام کے حکمرانوں نے اچھا سلوک کیا۔انہوں نے مقامی خواتین سے شادیاں کیں اور اس طرح ان کی آنے والی نسلیں عام آسامیوں کے انداز میں پروان چڑھتی رہیں اور امتداد زمانہ کے ساتھ یہ لوگ مقامی رنگ میں رچتے بستے چلے گئے۔اسی زمانہ میں اس علاقہ میں مبلغین اور صوفیہ کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ابتداءً اس کا سبب بھی یہی چھوٹی موٹی مسلم آبادیاں تھیں۔مقامی حکمراں صوفیہ کے ساتھ عزت اور احترام کا معاملہ کرتے تھے اور ان کی خانقاہوں اور مزارات کو عطیات دیتے تھے۔ان کی آمد سے ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ وہاں کی مسلم آبادیاں ان کی تعلیمات اور رہنمائی میں اپنا مذہبی تشخص باقی رکھنے میں کامیاب رہیں ورنہ اندیشہ تھا کہ وہ مقامی تہذیب میں اس طرح ضم ہوجاتیں کہ ان کا اپنا کوئی تشخص باقی نہ رہتا۔مزید براں ان کے زیراثر کچھ مقامی باشندے بھی اسلام قبول کرتے رہے اور اس طرح آسام کی مسلم آبادی میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔چونکہ صوفیہ کو حکمرانوں کے علاوہ عوامی سطح پر بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور تبلیغ و اشاعت اسلام کا کام پوری طرح پرامن تھا اس لیے اس کی وجہ سے آسامی معاشرہ میں کوئی کشمکش نہیں پائی جاتی تھی اور مسلمان مقامی باشندوں کے ساتھ امن و آشتی

سے زندگی گذارتے تھے۔

اس خطہ پر تسلط حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہاں کی زمین چائے کی کاشت کے لیے بہت موزوں تھی۔ساتھ ہی گنے کی کاشت کے امکانات بھی روشن تھے۔ لیکن ان امکانات کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہاں مزدوروں کی کمیابی تھی۔اس دشواری پر قابو پانے کے لیے انگریز آبادکاروں نے علاقہ کے باہر سے مزدوروں کی درآمد کا منصوبہ بنایا۔فطری طور پر ان مزدوروں کی بڑی تعداد پڑوسی علاقے مشرقی بنگال سے آئی جو اب بنگلہ دیش ہے۔ان کی غالب اکثریت مسلمان تھی۔ پڑوسی علاقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے وہ یہاں کی زراعت کی ضروریات سے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ واقف تھے اور وہ آسامی مزدوروں کے مقابلہ میں سستے بھی تھے۔مزید اراضی کو زیر کاشت لانے کے مقصد سے جنگلوں کی صفائی کے لیے مزدوروں کی مانگ بڑھتی گئی۔چنانچہ پورے برطانوی دور میں مشرقی بنگال سے مسلمان آسام آتے رہے اور بڑی تعداد میں وہاں سے نقل مکانی کر کے آسام میں آباد ہوتے رہے۔آنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو مشرقی بنگال کی گنجان آبادی کے مقابلہ میں آسام میں زیادہ روشن مستقبل کی امید کر سکتے تھے اور یہاں نسبتاً زیادہ آسانی سے زمین کے حصول کے امکانات سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔مشرقی بنگال سے اس طرح نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں خاص طور سے اس کا تذکرہ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اس مردم شماری کے سپرانٹنڈنٹ کے مطابق گذشتہ پچیس سال کے عرصہ میں یہ آسام میں ظہور پذیر ہونے والا سب سے اہم واقعہ تھا جس کے آسامی معاشرہ پر دوررس اثرات مرتب ہوں گے اور وہاں آبادی کا تناسب ہمیشہ کے لیے بدل جائے گا۔اس کے باوجود اس دور میں بھی مقامی آبادی کے ساتھ کسی کشمکش اور تصادم کا سراغ نہیں ملتا۔

اس تفصیل سے یہ بات ابھر کر سامنے آجاتی ہے کہ آسام میں آباد بنگالی مسلمانوں کی غالب اکثریت ان تارکین وطن کی اولاد ہیں جو برطانوی عہد میں مشرقی بنگال سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہو گئے تھے۔ان کی نسلیں یہیں پروان چڑھیں۔ ماضی قریب میں اگر اس طرح کی نقل مکانی ہوئی بھی ہو تو وہ یکسر نا قابل لحاظ ہے۔یہ الزام کہ گذشتہ دس سال کے عرصہ میں غیر قانونی طور پر

نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے یکسر بے بنیاد ہے اور اس کے حق میں کوئی شہادت دستیاب نہیں ہے۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ گذشتہ دس برسوں میں نہ صرف یہ کہ اس علاقہ کی مسلم آبادی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہے بلکہ پچھلے چند برسوں میں اس میں واضح کمی آئی ہے۔ اگرچہ مذہبی بنیاد پر ۲۰۱۱ کی مردم شماری کے اعداد و شمار ہنوز دستیاب نہیں ہیں لیکن غیر حتمی نتائج کے مطابق ۲۰۰۱ اور ۲۰۱۱ کے درمیان کوکراجھار میں مسلم آبادی میں اضافہ کی شرح صرف ۵.۱۹ فیصد رہی۔ جبکہ اسی عرصہ میں آسام میں بحیثیت مجموعی آبادی میں اضافہ کی شرح ۱۶.۱۹ فیصد رہی۔ اس طرح گذشتہ دس سال کے عرصہ میں کوکراجھار کے علاقہ میں مسلم آبادی میں غیر معمولی اضافہ کے بجائے ۹ فی صد کی غیر معمولی کمی درج ہوئی ہے۔ مسلم شرح آبادی میں اس گراوٹ کی صرف ایک ہی معقول توجیہ کی جاسکتی ہے اور وہ یہ کہ ۲۰۰۳ء میں BTAD کی تشکیل کے بعد اس کے زیر اثر وہاں ظہور پذیر ہونے والی مخصوص صورت حال کی وجہ سے کوکراجھار سے دوسرے نسبتاً زیادہ محفوظ علاقوں کی طرف آبادی کی منتقلی کا عمل شروع ہوچکا ہے۔ ظاہر ہے وہاں سے نقل مکانی کرنے والے بوڈو نہیں ہوسکتے جن کو وہاں اقتدار حاصل ہے اور جو علاقہ کو غیر بوڈو عناصر سے پاک کرنے کی مہم چلا رہے ہیں۔ حتمی طور پر یہ مسلمان ہی ہوسکتے ہیں جو بدلے ہوئے حالات میں اب وہاں اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ کر دوسری نسبتاً محفوظ جگہوں کی طرف منتقل ہورہے ہیں۔ ان حقائق کے بعد یہ کہنے کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا کہ گذشتہ ایک دہے میں مسلمان بڑی تعداد میں غیر قانونی طور پر بنگلہ دیش سے آکر یہاں بس گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی حیثیت ایک منصوبہ بند جھوٹے پروپگنڈہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ (معارف اگست ۲۰۱۲ء)

ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے مسائل

وطنِ عزیز میں اس وقت ملت اسلامیہ جن گوناگوں مسائل سے دوچار ہے ان میں سنگینی کے لحاظ سے بے گناہ مسلمان نوجوانوں کی قید و بند کا مسئلہ سرِ فہرست ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان بے شمار نوجوانوں کی رہائی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہورہی ہے جو کسی چارج شیٹ اور ثبوت کے بغیر جیلوں میں بند ہیں بلکہ معصوم اور بے قصور نوجوانوں کی گرفتاری کا سلسلہ بغیر روک ٹوک کے اسی طرح جاری ہے۔ یہ صورت حال ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے لیے ”بلاء عظیم“ کی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔

جب بھی دہشت گردی کا کوئی نیا واقعہ پیش آتا ہے سیکورٹی ایجنسیاں بلا کسی تحقیق و تفتیش اسے کسی مسلم جماعت کے سر منڈھ دیتی ہیں۔ ان میں سے بعض کا وجود صرف ان کے دماغ کے نہاں خانوں میں ہے۔ اس سلسلہ میں وہ کسی چھان بین کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتیں۔ مختلف دہشت گردانہ واقعات میں ہندو انتہا پسند تنظیموں کے ملوث ہونے کے روز افزوں شواہد اور ثبوت کے یکسر فقدان کی وجہ سے عدالتوں کے ذریعہ قید و بند کی آزمائش میں مبتلا مسلمانوں کو بے قصور قرار دیے جانے کے واقعات کے ایک تسلسل کے باوجود سیکورٹی ایجنسیاں ہنوز اپنے انداز فکر کو بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ ذہنی رویہ حالات و شواہد کے حقیقت پسندانہ تجزیہ پر مبنی نہیں ہے بلکہ ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کا حصہ ہے جس کی جڑیں تعصب اور فرقہ پرستی کی دلدل میں پیوست ہیں۔ اس کی تازہ مثال حیدرآباد کا دھماکہ ہے۔ جس وقت عدالتیں مطیع الرحمن صدیقی اور DRDO کے سائنٹسٹ اعجاز مرزا کو بے قصور پانے کے بعد ان کی رہائی کے احکام صادر کر رہی تھیں، سیکورٹی ایجنسیاں مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ میں مصروف تھیں اور پرنٹ اور الکٹرانک میڈیا ان نام نہاد ملزمین کے خلاف ملک گیر پیمانہ پر ایک ہسٹریائی کیفیت پیدا کرنے میں لگا ہوا تھا۔ مکہ مسجد اور اس طرح کے دوسرے واقعات سے کسی نے کوئی سبق نہیں لیا۔ یہ بھی کوئی اتفاقی بات نہیں ہے کہ سیکورٹی ایجنسیاں اس سلسلہ میں ان مسلمان نوجوانوں سے تعرض نہیں کرتیں جو اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ مہارت سے بے بہرہ ہیں۔ عام طور پر وہ ان مسلمان نوجوانوں سے بھی تعرض نہیں کرتیں جو چھوٹے موٹے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے ذہن و دماغ میں مستقبل کے ہندوستان کا جو نقشہ ہے اس میں انہوں نے مسلمانوں کو یہی مقام دے رکھا ہے۔ دوکانوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے، ریڑھی لگانے والے، مکینک اور اس طرح کی دوسری خدمات انجام دینے والے مسلمانوں کے سلسلہ میں وہ کوئی خاص زحمت محسوس نہیں کرتیں۔ یہ بات تو وہ بھی جانتی ہیں کہ اس ملک سے مسلمانوں کے وجود کو یکسر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ وہ مسلمان نوجوان جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنی لیاقت اور صلاحیت کے بل بوتے پر اہم سرکاری شعبوں اور نجی اداروں میں نفوذ حاصل کر لیتے ہیں یا اس کا حوصلہ رکھتے ہیں وہ خود بخود ان کی توجہ کے مستحق بن جاتے ہیں۔ گذشتہ کئی برسوں سے جس طرح ہونہار، حوصلہ منداور اعلیٰ تعلیم اور لیاقت و صلاحیت سے بہرہ ور نوجوانوں کی بلا جواز گرفتاری اور تعذیب اور بغیر کسی ثبوت

اور چارج شیٹ طویل مدت تک ان کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بند رکھنے کا سلسلہ جاری ہے اس کی تفصیل لا حاصل ہے۔ یہی نہیں بلکہ کئی مرتبہ ان بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا جیسا کہ بٹلہ ہاؤس، عشرت جہاں انکاؤنٹر اور دوسرے متعدد واقعات سے واضح ہے:

بہت دنوں سے ہے یہ مشغلہ سیاست کا
کہ جب جوان ہوں بچے تو قتل ہو جائیں

اس سلسلہ میں انصاف کے ابتدائی تقاضوں کو بھی جس طرح نظر انداز کیا جاتا رہا ہے وہ ایک جمہوری ملک کے لیے باعثِ شرم ہے۔ اس کے نتیجہ میں کتنے ابھرتے ہوئے، عزم و حوصلہ سے سرشار، بہترین تعلیم اور صلاحیت سے آراستہ نوجوانوں کا کیریر، جن سے ایک بہتر مستقبل کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں، تباہ ہو گیا اور کتنے خاندانوں کی امیدوں کے چراغ بجھ گئے اور وہ مایوسی اور نامرادی کی تاریکیوں میں ڈوب گئے، اس کا بھلا کون حساب کر سکتا ہے۔ اب یہ مسئلہ ناقابل برداشت حدود میں داخل ہو چکا ہے اور اس سلسلہ میں ملی سطح پر ٹھوس اور فوری اقدام کی ضرورت ناگزیر ہو چکی ہے۔ اس محاذ پر کئی تنظیمیں پہلے سے سرگرم عمل ہیں اور نہایت قابل قدر خدمات انجام دے رہی ہیں۔ اس نسبت سے کئی کامیاب کنونشن بھی منعقد کیے جا چکے ہیں۔ جناب محمد ادیب ممبر راجیہ سبھا کی کوششوں سے یہ جدوجہد اب ایک فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہو رہی ہے۔ ۲۷ فروری کو پارلیمنٹ میں وقفہ سوالات کے دوران سیکولر پارٹیوں کی طرف سے دہشت گردی کے الزام میں گرفتار بے قصور مسلمان نوجوانوں کی رہائی کے لیے زبردست احتجاج کیا گیا۔ اس کے نتیجہ میں حکومت نے یقین دہانی کرائی کہ اس نوع کے معاملات کا ازسر نو جائزہ لیا جائے گا۔ اسپیکر نے بھی اس موضوع پر مباحثہ کے لیے درخواست دینے کی ہدایت کی۔ اس سے امید کی ایک نئی کرن ظاہر ہوئی ہے۔ لیکن یہ ایک طویل اور صبر آزما جنگ ہے جسے پوری منصوبہ بندی اور ہوش مندی سے لڑنے کی ضرورت ہے۔ اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ملت کے حسّاس اور دردمند حضرات اس سلسلہ میں عاید ہونے والی ذمہ داریوں کو پوری طرح محسوس کریں اور اس محاذ پر سرگرم افراد اور تنظیموں کے ہاتھ مضبوط کریں۔ کل کے ہندوستان میں مسلمانوں کی باعزت اور آبرومندانہ حصہ داری کو یقینی بنانے کے لیے اس جنگ کو جیتنا ضروری ہے۔ (معارف مارچ ۲۰۱۳ء)

شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج

جون علامہ شبلی کی پیدائش کا مہینہ ہے۔اسی مہینہ میں اس نادرہ روزگار نے اس عالم آب و گِل میں آنکھیں کھولیں اور ایک مختصر سی فرصت حیات میں ''ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پر شور رکھا''۔وہ خود فرماتے ہیں:

سالہا گوشِ جہاں زمزمہ زا خواہد بود زیں نواہا کہ دریں گنبد گردوں زدہ ام

ان کی خدمات اور اکتسابات کا دائرہ بہت وسیع اور متنوع ہے۔اس کا ایک بہت روشن پہلو مختلف علمی اور تعلیمی اداروں کی منصوبہ بندی اور ان کی تاسیس و تعمیر ہے۔انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کی علمی اور تعلیمی ضروریات اور ان کے مقتضیات کا صحیح طور پر ادراک کیا اور ان کی تکمیل کے لیے مختلف نوعیت کے اداروں کا خاکہ بنایا، ان کی منصوبہ بندی کی اور کمزور صحت اور گوناگوں مسائل اور مشکلات کے باوجود ان کی صورت گری میں بڑی جدوجہد اور جانفشانی کی۔انہوں نے جو ادارے قائم کیے نیز وہ ادارے جو ان کی توجہ اور کوشش سے علمی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام بنانے میں کامیاب ہوئے ان میں زمانی لحاظ سے تقدم اور اولیت کا شرف نیشنل اسکول، اعظم گڑھ، کو حاصل ہے جو اب شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج کا خوبصورت قالب اختیار کر چکا ہے اور علاقہ کے تعلیمی اداروں کے درمیان ایک امتیازی مقام کا حامل ہے۔واقعہ یہ ہے کہ اس کالج نے خطہ میں تعلیم کی توسیع و ترویج میں بڑا گراں قدر کردار ادا کیا ہے۔اس ادارہ کی تاسیس بھی اسی ماہ جون میں ہوئی۔ابھی علامہ شبلی کو علی گڑھ آئے بہ مشکل چار مہینہ کا عرصہ گذرا تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کی ضرورت کو اس شدت سے محسوس کیا کہ اس کے لیے فوری طور پر عملی قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو گئے اور ۲۰/جون ۱۸۸۳ء کو نیشنل اسکول کی بنیاد ڈال دی۔اس طرح اس اسکول کا قیام علی گڑھ تحریک کی برکات میں شامل ہے۔اس سلسلہ میں اہم بات یہ ہے کہ یہ اسکول مدرسۃ العلوم کے قیام کے صرف ۸ سال بعد قائم ہو گیا تھا۔اس طرح مدرسۃ العلوم کے بعد علی گڑھ تحریک کے زیر اثر قائم ہونے والا غالباً یہ پہلا اسکول تھا اور یہ ایک بڑا فخر ہے جو اس ادارہ کو حاصل ہے۔بعد میں اس تحریک کے زیر اثر ملک کے طول و عرض میں بے شمار تعلیمی ادارے قائم ہوئے لیکن اولیت کی فضیلت شہر اعظم گڑھ میں

علامہ شبلی کے ہاتھوں قائم ہونے والے اس اسکول ہی کو حاصل ہے۔ طبقہ علماء کے ایک فرد کا اُن مخصوص حالات میں جب جدید تعلیم کا حصول کفر سے کم تصور نہیں کیا جاتا تھا، اس کی ضرورت اور اہمیت کا اتنا شدید احساس جہاں ان کی روشن خیالی کا پتہ دیتا ہے وہیں ملت اور اس کے مسائل کے تئیں ان کی گہری فکرمندی اور دل سوزی کا بھی غماز ہے۔ اس کے علاوہ اس وقت جب کہ ۱۸۵۷ کے زخم ابھی رس رہے تھے اور کانگریس کی تاسیس میں ابھی دو سال کا عرصہ باقی تھا، کسی ادارے کے ساتھ لفظ نیشنل کا استعمال بڑی جرأت کا کام تھا۔ اس ادارہ کی سکریٹری شپ کی ذمہ داری انہوں نے خود سنبھالی، خاندانی جائداد سے اس کے لیے زمین فراہم کی، اعزہ اور احباب کو ممبر بنایا اور اس کی تعمیر کے لیے ان سے چندے لیے اور پوری زندگی اس کی ترقی کے لیے فکرمند اور کوشاں رہے۔ اس اسکول کے لیے ان کی فکرمندی کا اندازہ احباب اور اعزہ کے نام ان کے خطوط سے لگایا جاسکتا ہے۔ اسکول کی تاسیس کے علاوہ تعلیم کی توسیع کے لیے ان کی فکرمندی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ''موازنہ قومی'' کے نام سے ایک مجلس قائم کی۔ اس کی طرف سے ہر سال تعلیمی ترقی کی روداد مرتب ہوتی اور اطلاع عام کے لیے لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھی۔

اس اسکول نے محض ایک استاد اور تین طالب علموں سے کام شروع کیا۔ علامہ کی ذاتی توجہ اور دلچسپی کی وجہ سے اس کے حالات بہتر ہوتے گئے۔ چنانچہ یہ اسکول اپنی تاسیس کے چار سال بعد مڈل اسکول ہوگیا اور ۱۸۹۵ میں ہائی اسکول تک ترقی کر گیا۔ اس کے بعد کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اسکول ترقی کے بجائے تنزل کا شکار ہوگیا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء تک کے خاصے طویل عرصے میں علامہ شبلی ندوہ کی تعمیر و ترقی میں اس حد تک مصروف و منہمک رہے کہ انہیں اسکول کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں ملی اور اس اسکول کو جس سے ان کو بڑی محبت تھی بھول سے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسکول کے حالات شدید ابتری کا شکار ہوگئے اور وہ ہائی اسکول کی سطح سے گر کر پھر مڈل اسکول ہوگیا۔ ۱۹۱۳ میں ندوہ سے سبک دوشی کے بعد انہوں نے اس اسکول کی طرف پھر توجہ کی۔ اس کام میں ان کے دست و بازو ان کے چھوٹے بھائی محمد اسحاق صاحب، بیرسٹر الہ آباد ہائی کورٹ تھے۔ ان کے مشورے اور تعاون سے انہوں نے اسکول کی ترقی اور خطہ میں تعلیم کی ترویج کے لیے کئی منصوبے بنائے۔ ۱۹۱۴ میں الہ آباد ہائی کورٹ میں گرمیوں کی تعطیل کے دوران علاقہ میں تعلیم کی توسیع کے

لیے ایک بڑا منصوبہ تیار ہو چکا تھا۔اس میں اعظم گڑھ میں ایک تعلیمی کانفرنس اور علاقہ کے تعلیم یافتہ اور صاحب حیثیت افراد سے وسیع پیمانے پر رابطہ کا پروگرام شامل تھا۔لیکن اس سے پہلے ہی اسحاق صاحب کا انتقال ہو گیا اور چند مہینہ بعد ہی خود علامہ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔البتہ انتقال سے پہلے اسحاق صاحب نے ادارہ کی دیکھ ریکھ کے لیے ایجوکیشنل سوسائٹی کی بنیاد ڈال دی تھی ۔احباب واعزہ نے ان بزرگوں کی اس یادگار کی تعمیر وترقی میں دلچسپی لی ۔ ۱۹۴۰ میں اسے انٹر کالج کا درجہ ملا۔کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے حبیب شبلی مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی صدر یار جنگ کا انتخاب کیا گیا۔علامہ شبلی سے تعلق خاص کی وجہ سے وہ ابتدا ہی سے دارالمصنّفین کی مجلس انتظامیہ کے رکن رکین تھے ۔ایک پر وقار تقریب میں ان کے ہاتھوں کالج کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔کالج کی تعمیر میں علامہ کے شاگرد اور دارالمصنّفین کے منیجر مولانا مسعود علی ندوی نے کلیدی کردار ادا کیا۔ پوری عمارت ان کی کوشش سے اور ان کی نگرانی میں پایہ تکمیل کو پہنچی ۔استاد کے ہاتھوں قائم کیے جانے والے اس ادارہ سے ان کو بڑا تعلق خاطر تھا۔اس عمارت کی تعمیر ان کی انتھک محنت کا ثمرہ ہے اور اس میں ان کے حسن ذوق کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ کالج کی تعمیر وترقی کے سلسلہ میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ۱۹۴۶ کے ہنگامہ خیز دنوں میں اسے ڈگری کالج کا درجہ ملا۔ اس کا کریڈٹ بنیادی طور پر بشیر احمد صدیقی صاحب کو جاتا ہے جو اس وقت پرنسپل تھے۔ ۱۹۷۰ میں کالج کے فعال اور نامور پرنسپل مرزا شوکت سلطان صاحب کی مساعی جمیلہ سے اسے پوسٹ گریجویٹ کالج کا مرتبہ حاصل ہوا۔

اس مہینہ میں اس ادارہ کی تاسیس پر ۱۳۰ سال پورے ہو رہے ہیں۔اس طویل مدت میں ملک میں ہر نوع اور معیار کے ہزاروں تعلیمی ادارے اور سینکڑوں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں ۔آزادی کے بعد ملک نے تعلیم کے میدان میں بڑی ترقی کی ہے۔حکومت ہند تعلیم کے فروغ پر غیر معمولی وسائل صرف کر رہی ہے۔سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں ترقی کی رفتار خاص طور سے بہت تیز ہے ۔اسی تناسب سے ان موضوعات پر اعلی اور تخصیصی تعلیم کے میدان میں کام کرنے والے اداروں کے لیے ترقی کے مواقع اور امکانات بھی بہت زیادہ ہیں۔ چنانچہ جو ادارے ابھی چند دہوں بلکہ چند برسوں پہلے قائم ہوئے وہ آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں اور ان کی ترقی کی رفتار کو دیکھ کر

یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ ستاروں سے آگے کے جہانوں کی جستجو میں سرگرداں ہیں۔ پورے ملک میں تعلیم کے میدان میں غیر معمولی سرگرمی نظر آرہی ہے۔ بدقسمتی سے علامہ شبلی کا قائم کیا ہوا یہ قدیم ادارہ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں دستیاب ان مواقع اور امکانات سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ جو آگے نہیں بڑھتا وہ پیچھے ہٹتا ہے۔ کوئی شخص یا ادارہ طویل مدت تک ایک ہی جگہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔ یہ قانون قدرت ہے۔ علامہ شبلی سے محبت، ان کی یاد سے وفاداری اور ان کے تعلیمی مشن سے وابستگی کا تقاضا ہے کہ ان کی اس یادگار کی ہمہ جہت ترقی اور اسے ایکسیلنس کا مرکز بنانے کے لیے کسی بھی امکانی کوشش سے دریغ نہ کیا جائے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے مسائل نہایت پیچیدہ اور گوناگوں ہیں، لیکن شاید اس امر میں بہت زیادہ اختلاف رائے کی گنجائش نہیں ہے کہ ان میں سب سے بڑا مسئلہ ہماری نئی نسلوں کو معیاری تعلیم فراہم کرنے کا ہے۔ اگر نومبر ۱۹۱۴ء تک اس ادارہ کی ترقی کے محاذ پر کوئی نمایاں کامیابی حاصل کرلی جاتی ہے اور یہ کالج ایک اعلیٰ درجہ کے تعلیمی مرکز کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آتا ہے تو نہ صرف یہ کہ علامہ کے تعلیمی مشن کی تکمیل کی جہت میں یہ ایک بڑا اقدم ہوگا بلکہ سویں برسی کے موقع پر علم اور تعلیم کے اس شیدائی کے لیے قوم کی طرف سے شایان شان خراج عقیدت بھی۔ وقت بہت تیزی سے گذر رہا ہے۔ اس لیے اس محاذ پر فوری، موثر اور فیصلہ کن اقدام کی ضروری ہوگیا ہے۔

(معارف جون ۲۰۱۳ء)

مغربی یوپی میں فرقہ وارانہ فسادات

مغربی یوپی کے وہ علاقے جو گذشتہ دنوں یک طرفہ فرقہ وارانہ فسادات کی آگ میں جل کے خاکستر ہو چکے ہیں وہاں اور ان کے آس پاس متعدد ایسی بستیاں آباد ہیں جو ہندوستانی مسلمانوں کی دینی، علمی اور تہذیبی تاریخ میں بڑی اہمیت کی حامل رہی ہیں۔ اسی نواح میں نانوتہ، تھانہ بھون، شاملی، کیرانہ، کاندھلہ، کلیر اور گنگوہ کی بستیاں ہیں۔ یہاں سے کیسے کیسے علماء، فضلاء اور صلحاء اٹھے۔ دین اور علوم دین کی حفاظت، توسیع اور اشاعت کے میدان میں ان بزرگوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے وہ اس لائق ہیں کہ انہیں آب زر سے لکھا جائے۔ قریب ہی مظاہر العلوم اور دارالعلوم کے تاریخ ساز ادارے ہیں۔ کون سوچ سکتا تھا کہ یہ زمین ایک دن مسلمانوں کے لیے تنگ ہوجائے گی۔ خاص طور سے اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس خطہ سے مسلمانوں کا تعلق بہت پرانا ہے اور وہ یہاں

صدیوں سے برادران وطن کے ساتھ مل جل کے امن و آشتی کے ساتھ رہتے آئے ہیں۔ دونوں نے کندھے سے کندھا ملا کر برٹش سامراج کا مقابلہ کیا اور اس راہ میں بڑی قربانیاں دیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس خطہ کے علماء اور مشائخ کا کردار بڑا تابناک رہا ہے۔ اس کے علاوہ مدتوں ساتھ رہنے بسنے کی وجہ سے آپسی تعلقات میں ایک خاص طرح کی یگانگت پیدا ہوگئی تھی اور ایک دوسرے کے لیے دونوں کا وجود ناگزیر سا ہو گیا تھا۔ سیاسی معاملات میں بھی عام طور پر جاٹوں کا اتحاد مسلمانوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس علاقہ کے بہت سے مسلمان اور جاٹ ایک ہی نسلی سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اب اس کی حیثیت ایک بھولی بسری یاد سے زیادہ نہیں رہ گئی۔ اس سے پہلے بھی اس باہمی یگانگت اور ہم آہنگی کو پارہ پارہ کرنے کی کوششیں ہوئیں لیکن کامیاب نہیں ہوسکیں۔ تقسیم ملک کے ہیجان انگیز دور میں بھی یہ علاقہ بڑی حد تک پرسکون ہی رہا۔ البتہ ۱۹۴۸ء میں اس علاقہ کو فرقہ وارانہ منافرت کی آگ میں جھونک دینے اور یہاں سے مسلمانوں کی نسلی تطہیر کی ایک خوفناک اور منصوبہ بند کوشش آر ایس ایس کے سربراہ گرو گولوالکر کی ذاتی نگرانی میں کی گئی جو چند دیانتدار افسروں کی فرض شناسی کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکی۔ مکمل ثبوت اور پختہ شواہد کے باوجود اس وقت کی کانگریس حکومت نے مجرمین کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ ایسے سنگین معاملات میں بھی مجرمانہ جانبداری اور چشم پوشی کی روایت نئی نہیں ہے۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل یوپی کے پہلے ہوم سکریٹری راجیشور دیال نے اپنی کتاب A Life of Our Times میں محفوظ کردی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آر ایس ایس کبھی بھی اس منصوبہ سے دست بردار نہیں ہوئی اور بالآخر وہ اس علاقہ میں آگ اور خون کا کھیل کھیلنے میں کامیاب ہوگئی جو اس کا سب سے زیادہ پسندیدہ کھیل ہے۔ اپنے ناپاک مقاصد میں ان کو یہ کامیابی اس وقت ملی جب گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی کا وسیع تجربہ رکھنے والے نریندر مودی بی۔ جے۔ پی میں مرکزی کردار کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے اور ان کے سزا یافتہ دست راست امت شاہ کو یوپی کا چارج دیا گیا۔ یوپی میں گجرات ماڈل کے نفاذ کے لیے مغربی یوپی کا انتخاب کیا گیا اور وہاں وہ سب کیا گیا جو گجرات میں کیا گیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ فرقہ وارانہ فساد نہیں تھا بلکہ جاٹوں کا مسلمانوں کے خلاف یک طرفہ تشدد تھا، ایسا تشدد جو تمام حدوں کو پار کر گیا۔ سوشل میڈیا نے اس آگ کو چاروں طرف پھیلا دیا۔ دفعہ ۱۴۴ کے باوجود ایک کے بعد ایک مہا پنچایت کا انعقاد ہوتا رہا

اور بڑی تعداد میں لوگ اس میں شرکت کرتے ہیں۔ یہ جاننے کے لیے کہ حالات کیا رخ اختیار کرنے والے ہیں کسی غیر معمولی بصیرت کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے باوجود پولیس اور انتظامیہ خاموش تماشائی بنی رہی اور لکھنؤ اور دہلی میں مکمل خاموشی چھائی رہی۔ کتنی بستیاں، کتنی املاک اور کتنے مکانات راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کردیے گئے۔ مقتولین کی تعداد کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ کتنے ہی لوگوں کو ان کے مکانات میں زندہ جلا دیا گیا یا قتل کرکے آگ میں پھینک دیا گیا۔ ایک بڑی تعداد کو گھربار چھوڑنے پر مجبور کردیا گیا اوران کی اکثریت اب اپنے گھروں کو لوٹنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ خواتین کے ساتھ جو کچھ کیا گیا وہ حد بیان سے باہر ہے۔ دہلی آبروریزی کے واقعہ کے بعد جو عوامی غم وغصہ اور خواتین تنظیموں کی بھاگ دوڑ نظر آئی تھی اس کا کہیں نام ونشان بھی نہیں۔

بی۔جی۔پی کی سیاست مسلمانوں کے خلاف نفرت اور عداوت کی اساس پر قائم ہے۔ البتہ سماج وادی پارٹی کا طرز عمل ناقابل فہم ہے۔ مظفرنگر میں جو کچھ ہوا وہ اچانک نہیں تھا۔ یہ بآسانی محسوس کیا جاسکتا تھا کہ حالات جس رخ پر جارہے ہیں بالآخر اس کا انجام کیا ہوگا۔ اس کے باوجود بھی حکومت خاموش رہی اور مغربی یوپی کے مسلمانوں کے سر سے قیامت گذر گئی۔ صوبہ میں وقوع پذیر ہونے والے مسلسل فسادات اور اب مظفرنگر میں رونما ہونے والے تشدد کی وجہ سے سماج وادی پارٹی پر مسلمانوں کا اعتماد بری طرح مجروح ہوا ہے۔ اگر اس کو بحال کرنے کے لیے فوری اور موثر اقدامات نہ کیے گئے تو اس کی تلافی ناممکن ہوجائے گی اور صوبہ کی سیاست پر اس کے دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔ کانگریس کی طرف سے ان فسادات کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا۔ پارٹی کے تمام بڑے لیڈروں نے وہاں کا دورہ کیا لیکن اس سنگین مسئلہ کے مستقل اور پائدار حل کے لیے کچھ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ انسداد فرقہ پسندی مسودہ قانون جس سے کافی حد تک اس صورت حال کا تدارک کیا جاسکتا ہے اور جس کا وعدہ مدت سے کیا جارہا ہے اس کے بارے میں مکمل خاموشی ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ یہ بل بغیر کسی تاخیر کے پاس کیا جائے۔ (معارف اکتوبر ۲۰۱۳ء)

وقف ترمیمی ایکٹ

چند مہینہ پہلے مسلم پرسنل لا بورڈ کی کوشش اور جناب رحمن خاں، وزیر اقلیتی امور، حکومت ہند، کی دلچسپی سے وقف ترمیمی ایکٹ پاس ہوا جو یقینا ایک بڑی کامیابی تھی۔ مسلم پرسنل لا بورڈ نے

اس کے لیے طویل جد و جہد کی تھی۔صدر جمہوریہ کی دستخط کے بعد اسے قانون کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔اس قانون کو اوقاف کی حفاظت کے سلسلہ میں حکومت ہند کا ایک مثبت اور اہم قدم سمجھا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ جتنا پرانا ہے اس کے حل کی کوششیں بھی اتنی ہی قدیم ہیں۔اس سلسلہ میں ابتدائی کوشش ایک صدی پہلے شروع ہو چکی تھی۔مغل حکومت کے زوال کے بعد اوقاف کی جو ناگفتہ بہ حالت تھی وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں تھی۔بعض مسلم تنظیموں نے اس سلسلہ میں دلچسپی لی لیکن وہ اس کے صبر آزما تقاضوں کو پورا نہ کر سکے چنانچہ اس سلسلہ میں کوئی خاص پیش رفت نہ ہو سکی۔علامہ شبلی کو اس مسئلہ کی صحیح صورت حال اور اہمیت کا پورا ادراک تھا اور اصلاح احوال کے لیے عملی اقدام کی ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے تھے۔وقف علی الاولاد کی مہم کے دوران ان کو اوقاف کے جو حالات معلوم ہوئے اس سے اس مسئلہ کی پوری صورت حال ان کے سامنے آگئی اور اس سلسلہ میں کچھ کرنے کی ناگزیر ضرورت کا احساس پختہ ہوتا گیا۔خاص طور سے اس لیے کہ اتنے بڑے ملی سرمایہ کے باوجود مسلمان اپنے ملی اور قومی کاموں کے لیے پائی پائی کے محتاج تھے اور قومی کام کرنے والوں کو ہر کام کے لیے قوم کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا پڑتا تھا۔اس سلسلہ میں کوئی عملی اقدام کرنے سے پہلے گورنمنٹ دو امور کے سلسلہ میں مسلمانوں سے تسلی بخش جواب چاہتی تھی، اول یہ کہ یہ ثابت کیا جائے کہ یہ پوری قوم کا مطالبہ ہے اور کسی خاص طبقہ یا فرقہ تک محدود نہیں ہے۔دوسرے یہ کہ یہ ثابت کیا جائے کہ اوقاف کی آمدنی صحیح مصرف میں صرف نہیں کی جاتی۔اس سے پہلے جن تنظیموں نے اس سلسلہ میں دلچسپی لی تھی وہ ان مطالبات کو پورا نہ کر سکے تھے۔جنوری ۱۹۱۴ء میں علامہ شبلی نے یہ تحریک شروع کی اور اس سلسلہ میں ایک مراسلہ شائع کیا۔قومی اور ملی کاموں کے سلسلہ میں ان کا یہی طریقِ کار تھا۔یہ مراسلہ مقالات شبلی حصہ ہشتم میں محفوظ ہے۔مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بھی ''حیات شبلی'' میں اس کا خلاصہ دے دیا ہے۔اپنے مخصوص انداز میں علامہ شبلی نے اس مراسلہ میں مختلف دفعات کے تحت کام کا پورا نقشہ پیش کر دیا تھا اور وہ خطوط کار متعین کر دیے تھے جن پر کام ہونا تھا، اس سے گورنمنٹ کے مطالبات بھی پورے ہو جاتے۔شاید اسی وجہ سے اس کے اگلے ہی مہینہ گورنمنٹ نے اوقاف کے متعلق ایک یادداشت شائع کی اور اسی مہینہ میں اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے ایک کانفرنس منعقد کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔۱۶؍فروری ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی مولانا شروانی کو لکھتے ہیں: ''آپ نے دیکھا

اِدھر اوقاف اسلامی کی تحریک شروع ہوئی اُدھر گورنمنٹ نے یادداشت شائع کی اور ایک کانفرنس اسی مہینہ میں بٹھانے والی ہے۔ خیر میرا کام تو اس کے پیچھے جان لڑادینا ہے ع آگے نصیب ہے جسے پروردگار دے"۔ ان کا کام کرنے کا انداز یہی تھا اور وہ ہر ملی کام کے لیے جان لڑادینے کے لیے تیار رہتے تھے اور ہر کام کو نہایت منظم انداز میں کرتے تھے لیکن اجل نے ان کو مہلت نہ دی کہ وہ اس کام کو اس کے منطقی انجام تک پہنچا سکیں۔ ۱۹۱۴ء سے ۲۰۱۳ء ایک صدی کا طویل فاصلہ ہے۔ اس طویل عرصہ میں اوقاف کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً بعض اقدامات ہوتے رہے لیکن وہ علامہ کی توقعات اور مسلمانوں کے مطالبات سے بہت کم تھے۔ اب ایک صدی بعد جب یہ وقت سعید آیا اور یہ مطالبہ پورا ہوا تو اس بطل جلیل کی یاد آنا ایک فطری امر ہے جس نے اس کی ابتداء کی اور الفضل للمتقدم کے بموجب ہماری احسان مندی کا مستحق ہے۔ ملت کے کتنے اور کیسے کیسے کام تھے جو اس شکستہ پا، دائم المرض اور عدیم الفرصت ہستی نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھے تھے۔ آج مختلف ملی تنظیمیں جو خدمات انجام دے رہی ہیں ان میں سے کتنوں کا سرا ملک وملت کے اس محسن سے کسی نہ کسی صورت میں جاملتا ہے۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

(معارف مئی ۲۰۱۴ء)

علی گڑھ گزٹ۔ مشکلات کی زد میں

ایک انگریزی اخبار کا اجراء ہندوستانی مسلمانوں کا ایک بہت پرانا خواب رہا ہے۔ اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے کئی کوششیں ہوئیں لیکن بارآور نہیں ہوسکیں۔ ضرورت کے شدید احساس کے باوجود اتنے وسائل فراہم نہیں کیے جاسکے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک انگریزی ترجمان جاری کیا جاسکتا جو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ان کے مسائل کو معروضیت اور جرأت سے پیش کرسکتا، آزادی کے نصف صدی بعد ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں صاحب نے اپنی ذاتی کوشش اور وسائل سے اس خلا کو پر کرنے کی ایک کامیاب کوشش کی۔ جنوری ۲۰۰۰ء میں پندرہ روزہ ملی گزٹ کا اجراء ایک تاریخ ساز واقعہ تھا۔ اگرچہ یہ اخبار پندرہ روزہ تھا لیکن اس نے بڑی حد تک اس کمی کی تلافی کردی جو ملک میں مسلمانوں کے کسی انگریزی ترجمان کی عدم موجودگی کی وجہ سے پائی جاتی تھی۔ یہ اخبار اپنی زندگی

کے ابتدائی ایام ہی میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ایک اہم مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔اس نے نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے ایک بے باک ترجمان کی حیثیت اختیار کرلی بلکہ عالمی سطح پر اسلام اور مسلمانوں کی صورت حال سے واقفیت کا ایک اہم ذریعہ بھی بن گیا۔عالم اسلام میں کیا ہورہا ہے اور دنیا اسلام اور مسلمانوں کی نسبت سے کیا سوچ رہی ہے اور کیا کررہی ہے اس کی تفصیل بھی اس کے صفحات میں مل جاتی تھی۔فلسطین اور اسرائیل کے سلسلہ میں جو مواد ملی گزٹ فراہم کرتا رہا ہے اس کا کہیں ایک جگہ ملنا مشکل ہے۔اپنی ان گوناگوں خدمات کی وجہ سے اسے ایسا اعتبار اور استناد حاصل ہوا جو کم ہی اخباروں کو ملتا ہے۔ان سب باتوں کے باوجود وہ خود کفیل ہونے میں کامیاب نہیں ہوسکا اور نہ اسے کبھی اتنے وسائل میسر آئے کہ وہ اچھے صحافیوں کی خدمات حاصل کرسکتا۔اس کی چودہ سالہ زندگی مسلسل قربانی کی ایک ایسی داستان ہے جو بڑی تابناک بھی ہے اور بڑی دلخراش بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی وسائل سے اس طرح کے اخبار کا اتنے دنوں تک نکالتے رہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔اتنی طویل اور اعصاب شکن جدوجہد کے بعد بدقسمتی سے اب وہ مرحلہ آگیا ہے کہ اگر بروقت مدد نہیں پہنچتی ہے تو اکتوبر سے اخبار کی اشاعت بند ہوجائے گی اور انگریزی صحافت میں مسلمانوں کی کوئی موثر نمائندگی نہیں رہ جائے گی جب کہ موجودہ صورت حال میں اس کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔یہ ایک بڑا نقصان ہوگا جس کے دوررس اثرات مرتب ہوں گے۔چنانچہ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے کہ یہ اخبار نہ صرف جاری رہے بلکہ اس کو وہ وسائل فراہم ہوں جو اس کو پوری طرح خود کفیل بنانے میں معاون ہوں اور وہ نہ صرف یہ کہ اپنا سفر جاری رکھ سکے بلکہ نئی بلندیوں کو سر کرسکے۔ (معارف ستمبر ۲۰۱۴ء)

معارف پریس ریڈر پر

ایک زمانہ تھا جب صاحب ذوق پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ''فراغتے وکتابے وگوشہ چمنے'' سے بڑی کسی اور نعمت کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔لیکن اب وقت بدل چکا ہے۔انقلاب زمانہ نے ذوق مطالعہ کو بری طرح متاثر بلکہ مجروح کیا ہے۔اب نہ تو کتاب بینی کا وہ شوق باقی رہا اور نہ اس کے لیے فرصت، جو لوگ اب بھی کتاب بینی سے دلچسپی رکھتے ہیں اور زندگی کے مسلسل بڑھتے ہوئے مطالبات اور تقاضوں کے درمیان اس کے لیے بھی کچھ وقت نکال لیتے ہیں،ان کی ایک معتدبہ تعداد

کے لیے کتابوں کا حاصل کرنا، ان کا ذخیرہ کرنا اور فرصت کے لمحات میں مطالعہ کے لیے کتاب کو ساتھ رکھنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ آج کا مصروف انسان چاہتا ہے کہ وہ جب اور جہاں چاہے اس کی پسند کی کتاب اور رسالہ اس کی دسترس میں ہو۔ سائنس کی ترقی نے اسے ممکن بھی بنا دیا ہے۔ اب ایسے آلات بازار میں دستیاب ہیں جن کی مدد سے آدمی اپنی پسند کی بے شمار کتابیں ایک چھوٹے سے آلہ میں اپنے ساتھ رکھ سکتا ہے اور جہاں اور جب چاہے اپنے ذوق مطالعہ کی تسکین کا سامان کرسکتا ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا لٹریچر معاشرہ کے اس طبقہ تک بھی پہنچے، جس کے لیے چھپی ہوئی کتاب کو ساتھ رکھنا مشکل ہوتا جارہا ہے، تو ہم کو بھی اپنا لٹریچر اسی انداز میں پیش کرنے کا اہتمام کرنا ہوگا۔ اسی ضرورت کے احساس کے زیر اثر گذشتہ چند برسوں سے دارالمصنّفین نے یہ کوشش کی ہے کہ دستیاب وسائل کی حد تک ان ذرائع کا استعمال کیا جائے اور ان کے وسیلہ سے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ اسی ضرورت کے احساس کے تحت کئی سال پہلے معارف کو آن لائن فراہم کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ نیز اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے اکیڈمی اور اس کی سرگرمیوں کے سلسلہ میں ضروری معلومات برابر ویب سائٹ پر مہیا کی جاتی ہیں۔ اس جہت میں اکیڈمی نے گذشتہ دنوں ایک اور اہم قدم اٹھایا ہے۔ اب اکیڈمی کا PressReader سے معاہدہ ہوگیا ہے اور آیندہ انشاءاللہ معارف پریس ریڈر کے پلیٹ فارم پر دستیاب ہوگا۔ پریس ریڈر کا مرکزی آفس کینیڈا میں ہے اور جدید ذرائع کے وسیلہ سے دنیا بھر میں رسائل و مجلّات اور دوسری مطبوعات کو فراہم کرانا اس کا اختصاص ہے، ۱۱۰ ملکوں کے چار ہزار ناشرین اپنی مطبوعات کو شائقین تک پہنچانے کے لیے اس کے پلیٹ فارم کا استعمال کرتے ہیں۔ اس وقت پندرہ ہزار لائبریریوں اور پانچ ہزار دوسرے اداروں کو پریس ریڈر کے ذریعہ رسائل، مجلّات اور دوسرا مطبوعہ مواد فراہم کیا جارہا ہے۔ اس پلیٹ فارم سے رسائل و مجلّات کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ اسے کمپیوٹر ٹیبلیٹ، ایپل، بلیک بیری اور انڈرائڈ جیسے آلات کے ذریعہ پڑھا جاسکے۔ وہ اس سلسلہ میں کئی اور سہولیات فراہم کرتے ہیں۔ ہماری معلومات کی حد تک معارف پریس ریڈر کے پلیٹ فارم پر آنے والا پہلا اردو مجلہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کے وسیلہ سے معارف کی پہنچ میں قابل لحاظ اضافہ ہوگا اور ہم دنیا کے مختلف گوشوں میں رہنے والے اُس اردو داں طبقہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوں گے جو اس پلیٹ فارم کے

حلقہ اثر میں ہے۔(معارف مارچ ۲۰۱۵ء)

ہاشم پورہ سانحہ اور عدالتی فیصلہ

چند دنوں پہلے بعض اخبارات میں کچھ تصویریں شائع ہوئی تھیں۔ یہ تصویریں میرٹھ کے ہاشم پورہ محلہ کے نہتے اور مظلوم مسلمانوں کی تھیں۔ان کے ہاتھ سر کے اوپر اٹھے ہوئے ہیں اور پی۔ اے۔ سی کے سپاہی سنگین کی نوک پر انہیں کہیں لے جاتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ ان مظلوم مسلمانوں کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ان کو کہاں اور کس مقصد سے لے جایا جارہا ہے۔انہوں نے تو شاید یہی سمجھا ہوگا کہ انہیں بغیر کسی قصور کے جیل میں ڈال دیا جائے گا جہاں انہیں اذیتیں پہنچائی جائیں گی اور نہ جانے وہاں سے کب رہائی نصیب ہوگی۔ چند گھنٹوں بعد یہ خوں چکاں داستان سنانے کے لیے ان میں سے صرف چند باقی بچے تھے۔تاریخ تھی ۲۲/مئی ۱۹۸۷ء۔ اس حادثہ پر ۲۸ سال کی طویل مدت گذر چکی ہے۔اس دوران مرکز اور یو پی میں مختلف سیاسی پارٹیاں برسراقتدار رہیں لیکن اس جرم کے ملزمین نہ تو ملازمت سے معطل ہوئے اور نہ ان کے خلاف کوئی کارروائی ہوئی۔ واقعہ کے بیس سال بعد ۲۰۰۷ء میں R.T.I. کے تحت جو معلومات حاصل ہوئی ان سے پتہ چلا کہ تمام ملزمین نہ صرف ملازمت میں تھے بلکہ اتنی مدت کے گذر جانے کے بعد ان میں سے کسی کی Annual Confidential Report میں اس کا کوئی ذکر تک نہیں تھا۔ انصاف کے تقاضوں کو زیادہ بہتر طور پر پورا کرنے کے مقصد سے ۲۰۰۲ء میں سپریم کورٹ کے حکم پر مقدمہ کو غازی آباد سے تیس ہزاری کورٹ، دہلی منتقل کردیا گیا۔۲۱/مارچ کو ۲۸ سال کے طویل اور جانکاہ انتظار کے بعد اس مقدمہ کا فیصلہ آیا اور عدالت نے ناکافی ثبوت کی بنا پر ملزمین کو رہا کردیا۔ واقعہ یہ ہے کہ ثبوتوں کا ایک انبار تھا، عینی شاہد تھے، منھ بولتی تصویریں تھیں لیکن انہیں کافی نہیں سمجھا گیا۔بیالیس جیتی جاگتی جانوں کو گولیوں سے بھون ڈالنے والے ہنسی خوشی اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ ۴۲ انسان نہایت بے رحمی اور بے دردی سے قتل کردیے گئے لیکن ان کا قاتل کوئی نہیں۔ گذشتہ دنوں گجرات سے دہلی تک عدالتی فیصلوں میں ایک نیا رجحان سامنے آیا ہے۔مختلف الزامات میں جو لوگ ماخوذ تھے وہ بھی ایک تسلسل سے قانون کی گرفت سے آزاد ہوتے جارہے ہیں۔ یہ پوری صورت حال ملت کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ پوری سنجیدگی اور دل سوزی سے اس صورت حال سے نمٹنے کے

لیے منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔(معارف اپریل ۲۰۱۵ء)

آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کا جشن طلائی

۳۱/اگست کو دہلی میں ایک یادگار تقریب کا اہتمام کیا گیا۔مسلمانان ہند کی سب سے بڑی مشاورتی اور وفاقی تنظیم آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت نے اس دن اپنے جشن طلائی کا انعقاد کیا۔ملک و ملت کے فعّال عناصر کی بھرپور شرکت نے اسے ایک تاریخی اور یادگار تقریب بنا دیا۔اس پروقار تقریب کے مہمان خصوصی نائب صدر جمہوریہ جناب حامد انصاری صاحب تھے اور انہوں نے ہی کلیدی خطبہ بھی پیش کیا۔ملک کی آزادی اور تقسیم کے بعد مسلمان جن سنگین حالات اور مسائل سے دوچار تھے ان سے موثر طور پر عہدہ برآ ہونے اور ملک میں ایک باوقار اور باعزت مقام حاصل کرنے کے مقصد سے ملی قیادت نے مختلف اوقات میں جو اقدامات کیے ہیں ان میں سب سے اہم اور سب سے زیادہ دوررس نتائج کا حامل اقدام مجلس مشاورت کا قیام تھا۔ملک کے مختلف حصوں میں رونما ہونے والے تباہ کن فرقہ وارانہ فسادات،مسلمانوں کے خلاف تیزی سے بڑھتے ہوئے نفرت اور تعصب کے حوصلہ شکن رجحانات اور تقسیم ملک کے لیے غلط اور یکسر بیجا طور پر مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہرانے کے نتیجہ میں ملت جس شدید نفسیاتی دباؤ کا شکار تھی اس سے اسے باہر نکالنے،حالات کا پورے اعتماد کے ساتھ مقابلہ کرنے اور ایک بہتر مستقبل کی تعمیر و تشکیل کے لیے اس کے اندر عزم و حوصلہ پیدا کرنے کا اساسی فریضہ انجام دیا۔مشاورت کی بیدار مغز قیادت کو حالات کا پورا ادراک تھا اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جس تدبر اور حکمت عملی کی ضرورت تھی اس سے بھی وہ پوری طرح بہرہ ور بھی تھی۔ان کوششوں اور اقدامات کے نتیجہ میں ملت کے اندر خوداعتمادی اور ایک نیا عزم و حوصلہ بیدار ہوا اور اس کے نتائج سب کے سامنے ہیں۔اللہ کا شکر ہے کہ گوناگوں اور نہایت سنگین مسائل کے باوجود ہمارا آج کل سے بہتر ہے اور آنے والا کل انشاءاللہ آج سے بہتر ہوگا۔بلاشبہ آج کو کل سے بہتر بنانے میں مجلس مشاورت کا کردار بہت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ایسا تو نہیں ہے کہ مجلس کو ہمیشہ کامیابیاں ہی ملیں،جہاں اس نے بڑی کامیابیاں حاصل کیں وہیں اسے کئی معاملات میں ناکامی کا منہ بھی دیکھنا پڑا۔اس کی تاریخ میں کئی نشیب و فراز بھی آئے اور بڑے دل شکن حالات کا سامنا بھی کرنا پڑا۔حالات کے دباؤ میں وہ دولخت بھی ہوئی اور ایک مدت تک اس کے دونوں دھڑ

الگ الگ کام کرتے رہے لیکن اس کی موجودہ قیادت قابل ستائش ہے کہ یہ تلخ داستان اب تاریخ کا حصہ ہے۔ مجلس کے قیام کے وقت ملت کو جو مسائل درپیش تھے وہ اب بھی نہ صرف موجود ہیں بلکہ ان میں بہت کچھ اضافہ ہو چکا ہے۔ ان کی سنگینی کے باوجود اگر بیدار مغزی سے کام لیا جائے تو ان سے عہدہ برآ ہونا ممکن ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جس طریق کار کی ضرورت ہے اس کی تفصیل جناب نائب صدر کے خطبہ میں موجود ہے۔ ہم کو یقین ہے کہ مشاورت کی فعّال اور بیدار مغز قیادت نئے چیلنجز سے عہدہ برآ ہونے اور مشکلات و مسائل پر قابو پانے کے لیے مؤثر لائحہ عمل تیار کرنے اور اس کو روبہ عمل لانے میں کامیاب ہوگی اور اس کی رہنمائی میں ملت ایک نئے اعتماد اور عزم وحوصلہ کے ساتھ ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنا سفر جاری رکھے گی۔

(معارف اکتوبر ۲۰۱۵)

موجودہ حکومت کی عدم برداشت کی پالیسی اور دانشور طبقہ

ملک کے موجودہ حالات ہر باشعور اور حسّاس شہری کے لیے گہری تشویش کے باعث ہیں۔ موجودہ حکومت کے اقتدار میں آنے کے بعد ہی سے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی شدید دباؤ میں ہے۔ حکمراں طبقہ کی طرف سے جس طرح کا طرز عمل اختیار کیا جا رہا ہے اور اس کے نتیجہ میں ایک تسلسل سے جس طرح کے واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں اسے عدم رواداری اور عدم تحمل جیسے الفاظ سے تعبیر کرنے سے صورت حال کی صحیح عکاسی نہیں ہوتی۔ بات اب اس سے بہت آگے جا چکی ہے۔ جب صدر جمہوریہ بار بار اس سلسلہ میں اپنی فکر مندی کے اظہار پر مجبور ہو جائیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ نریندر ڈھابولکر، گووند پانسرے، پروفیسر کل برگی اور محمد اخلاق سے دلت بچوں کے زندہ جلا دیے جانے تک جارحیت اور تشدد کا ایک سلسلہ ہے جو دراز ہوتا چلا جا رہا ہے اور اس کے تاریک سایے ملک کے طول وعرض میں پھیلتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں ایک ایسی فضا بن رہی ہے جس میں اقلیتیں اور کمزور طبقات اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے ہیں۔ ایک ایسا ماحول بنانے کی کوشش ہو رہی ہے جس میں ایک مخصوص نقطہ نظر کو مکمل بالادستی حاصل ہو جائے اور آزادی خیال، آزادی اظہار اور اختلاف رائے کی گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ اس وسیع وعریض ملک میں رہنے بسنے والے تمام لوگ اسی انداز پر سوچیں جس طرح وہ چاہتے ہیں، زندگی اسی طرح گذاریں جس

طرح وہ پسند کرتے ہیں، لباس وہی پہنیں جس کی وہ اجازت دیں اور کھانا وہی کھائیں جو وہ تجویز کریں۔ غرض کہ پورے ملک کو وہ اپنے من پسند رنگ میں رنگ دینا چاہتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فسطائی طاقتیں بہت عجلت میں ہیں۔ ان کو اندیشہ ہے کہ یہ موقع شاید دوبارہ ہاتھ نہ آئے۔ یوں تو یہ لوگ بڑے سیانے ہیں لیکن ان کو اس ملک کی تاریخ اور تہذیبی اقدار کا ادراک نہیں جس میں اس طرح کے طرز عمل کی گنجائش نہیں۔ (معارف نومبر ۲۰۱۵)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار

علی گڑھ تحریک اور اس کے زیر اثر مدرسۃ العلوم کی تاسیس جس نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا عظیم اور جمیل قالب اختیار کیا ایک عہد ساز واقعہ تھا۔ اس نے نہ صرف عہد جدید میں برصغیر کے مسلمانوں کے علمی، فکری اور تہذیبی رجحانات اور رویوں کی تشکیل و تعمیر میں کلیدی کردار ادا کیا ہے بلکہ بحیثیت مجموعی اس خطہ کی تاریخ کا رخ متعین کرنے کے سلسلہ میں بھی اس کا کردار بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر برصغیر کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ۱۸۵۷ کے ناکام انقلاب کے بعد اس ملک میں ملت اسلامیہ جس دردناک صورت حال سے دوچار تھی اب اس کا صحیح ادراک بھی ممکن نہیں ہے۔ کسی بھی قوم کی زندگی میں حکومت کی رفعت سے محکومی کی ذلت کا سفر بڑا جاں گسل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں جو نہایت پیچیدہ نفسیاتی مسائل جنم لیتے ہیں ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بڑی بصیرت، جرأت اور حوصلہ مندی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ صفات پسپائی اور شکست خوردگی کے اعصاب شکن ماحول میں بہت کمیاب ہوتی ہیں۔ ان مسائل سے موثر طور پر عہدہ برآ ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ حالات کا بے لاگ تجزیہ کیا جائے اور نہایت باریک بینی سے علمی اور عقلی سطح پر ان اسباب و علل کا پتہ لگایا جائے جو اس صورت حال کے لیے ذمہ دار ہیں۔ ایک مغلوب و مفتوح قوم اپنی تاریخ کے اس نازک مرحلہ میں جس ذہنی اور جذباتی کیفیت سے دوچار ہوتی ہے اس کے پیش نظر یہ کام اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہوتا ہے۔ فاتح قوم اگر انتقام کے جنون میں مبتلا ہو جیسا کہ انگریز تھے، تو حالات کی سنگینی میں بدرجہا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسے روح فرسا حالات میں کسی بڑے کام کا حوصلہ کرنا تو الگ رہا زندگی خود ایک بوجھ بن جاتی ہے اور زندہ رہنے کی خواہش بھی دم توڑ دیتی ہے۔ ایسے ماحول میں کسی ایسے ادارہ کے تخیل کے لیے بھی غیر معمولی بصیرت،

جرأت اور حوصلہ مندی کی ضرورت ہوتی ہے جو قوم کی مردہ رگوں میں حیات بخش خون دوڑانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ سر سید نے ظلم و جبر کے تپتے ہوئے صحرا میں نہ صرف عالم تخیل میں ایک نخلستان کا خواب دیکھا بلکہ ان کے نا قابل تسخیر حوصلہ اور غیر متزلزل عزم نے ان حالات میں بظاہر اس ناممکن خواب کی تعبیر کا کارنامہ بھی انجام دیا اور اس طرح انجام دیا کہ وہ خود ایک مثال بن گیا۔ جامع مسجد، اسٹریچی ہال اور وکٹوریہ گیٹ کو دیکھ کر کون یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی لٹی پٹی قوم کے ہاتھوں تعمیر ہوئے ہیں۔ یہ غیر معمولی کوشش دراصل ماضی کی کھوئی ہوئی عظمت کی بازیافت کی خواہش کی غماز بھی تھی، حال کی تاریکی سے ایک روشن مستقبل کی طرف سفر کے عزم کا ایک استعارہ بھی اور آیندہ کے امکانات کی سمت میں ایک اشارہ بھی۔ جب سیاسی اقتدار ہاتھ سے جاتا رہا تو سر سید نے علم و دانش کی ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یہ صرف ایک تعلیم گاہ نہیں تھی جہاں سرکاری ملازمتوں کے لیے درکار اسناد فراہم کی جاتی تھیں بلکہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کی کئی تہذیبی اور نفسیاتی ضرورتوں کی تکمیل بھی ہوتی تھی۔ سر سید کو ان بنیادی ضرورتوں کا ادراک بھی تھا اور ان کی تکمیل کے لیے کیا وسائل اختیار کیے جائیں اس کا شعور بھی۔ ادارہ کی حسین اور پر شکوہ عمارتوں کی تعمیر اسی شعوری کوشش کا ایک حصہ تھا۔ کسی خالص تعلیمی ادارہ کو قومی زندگی میں وہ مقام و مرتبہ نہیں مل سکتا جو برصغیر کے مسلمانوں کے ملی شعور میں علی گڑھ کو حاصل ہے۔ اپنے مخصوص تاریخی کردار کی وجہ سے یہ ادارہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ کے ملی تشخص کی ایک علامت بن چکا ہے اور اس کی شبیہ ان کے لاشعور کی پہنائیوں میں مرتسم ہے۔ کوئی اور ادارہ ملی امیدوں، آرزوؤں اور عقیدت و محبت کا ایسا مرکز نہ بن سکا جیسا سر سید کا یہ ادارہ۔

جس وجہ سے اور جتنا یہ ادارہ مسلمانوں کو عزیز ہے اسی وجہ سے اور اتنا ہی وہ ان لوگوں کی آنکھوں میں کھٹکتا رہا ہے جن کے لیے ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود ہی نا قابل برداشت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے تعلق سے جو مسائل ان کی توجہ کے خاص مرکز رہے ہیں ان میں مسلم پرسنل لا کے ساتھ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کا مسئلہ بھی شروع ہی سے شامل رہا ہے۔ ان کے اپنے تجزیہ کے مطابق ہندوستان میں مسلمانوں کے ملی تشخص کی جو علامات ہیں ان میں سے ایک نمایاں علامت مسلم یونیورسٹی ہے۔ اسی وجہ سے یہ مسئلہ بار بار اٹھتا رہا ہے۔ البتہ موجودہ حالات کے مخصوص تناظر میں اس بار اس کی سنگینی میں بہت اضافہ ہو گیا ہے اور یہ ادارہ کے لیے زندگی اور موت کا

مسئلہ بن چکا ہے۔حکومت وقت نے اس سلسلہ میں عدالت عظمیٰ میں جوموقف اختیار کیا ہے اس سے اس کے عزائم کھل کر سامنے آگئے ہیں ۔ پہلے بھی اس سلسلہ میں کوئی خاص ابہام نہیں تھا۔اس مسئلہ کے سلسلہ میں انتہاپسند،فرقہ پرست تنظیموں کا موقف واضح ہے اورانہوں نے اسے کبھی بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی۔البتہ ایک مدھم سی امید ضرور تھی کہ عدالت عظمیٰ میں یو۔پی۔اے حکومت نے جو موقف اختیار کیا تھا شاید سب کا ساتھ سب کا وکاس کا نعرہ لگانے والے اس پر قائم رہیں خاص طور سے اس لیے کہ وہ کسی خاص پارٹی کا نہیں بلکہ حکومت کا موقف تھا اور عام طور پر حکومتی پالیسیوں میں ایک تسلسل ہوتا ہے اور برسر اقتدار پارٹیوں کی تبدیلی سے ان پر اثر نہیں پڑتا۔لیکن یہ امید نقش برآب ثابت ہوئی ۔ یہ ظاہر ہے کہ ملک کے اندر کوئی بھی بڑا ادارہ پارلیمنٹ کی منظوری کے بغیر قائم نہیں ہوسکتا۔اگر حکومت کی یہ دلیل تسلیم کرلی جائے کہ جوادارے پارلیمنٹ کی منظوری سے قائم ہوں گےان کی شناخت اقلیتی ادارہ کی حیثیت سے نہیں ہوسکتی تو پھر دستور نے اقلیتوں کو اپنے ادارے قائم کرنے اوران کو چلانے کا جوحق دیا ہے وہ یکسر بے معنی ہوکر رہ جاتا ہے۔ایم۔اے۔او کالج کیسے قائم ہوااوراس نے یونیورسٹی کا درجہ کیسے حاصل کیا یہ عہد عتیق کی کوئی اساطیری داستان نہیں ہے جس کے لیے اثریات کے ماہرین کی شہادت درکار ہو۔اس داستان عزیمت کا ایک ایک حرف محفوظ ہے اور دیدہ بینا اس دانش گاہ کے چپے چپے پر اسے دیکھ اور پڑھ سکتی ہے۔ یہ قافلہ شوق جہاں جہاں سے گذرا ہے اس کے نقش پا اب بھی روشن ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کی لڑائی اس وقت بنیادی طور پر ایک قانونی لڑائی ہے جو ملک کی اعلیٰ ترین عدالت میں لڑی جائے گی۔اس ملک کی یہ خوش قسمتی ہے کہ یہاں عدلیہ آزاد ہے اور انصاف کے تقاضوں کی پاسداری کرتی ہے ۔ اس لیے ہمیں یقین ہے کہ اس معاملہ میں بھی انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا جائے گا۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مقدمہ کو پوری مضبوطی اور مکمل تیاری کے ساتھ لڑا جائے۔اطمینان کی بات یہ ہے کہ یونیورسٹی انتظامیہ نے اس سلسلہ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے۔اس کے باوجود یہ سب کی ذمہ داری ہے کہ ان کوششوں کو تقویت پہنچانے کے لیے ہر وہ کوشش کی جائے جو حد امکان میں ہو اور ہر قیمت پر اس متاع گراں بہا کی حفاظت کو یقینی بنایا جائے۔ ۱۹۶۵ سے ۱۹۸۱ تک ہندوستانی مسلمانوں نے مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے تحفظ

اور بحالی کے لیے جو بے مثال جدوجہد کی وہ ہماری ملی زندگی کا ایک نہایت روشن باب ہے اور اس کی ولولہ انگیز یادیں ابھی تک دل و دماغ میں تازہ ہیں۔ اس کے پیش نظر یہ بات شک وشبہہ سے بالاتر ہے کہ ہندوستان کی ملت اسلامیہ ایک بار پھر اپنے اس عزیز ادارہ کے تحفظ میں کامیاب ہوگی اور اس سے ان دوسرے اداروں کی حفاظت کی راہ بھی ہموار ہوگی جن کا اقلیتی کردار خطرہ میں ہے۔

(معارف فروری ۲۰۱۶)

معارف کے سو سال

سفر یوروپ کے دوران مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جہاز پر امریکہ سے شائع ہونے والا ایک ہفت روزہ انگریزی رسالہ ''دی سٹرڈے ایوننگ پوسٹ'' دیکھا۔ فروری ۱۹۲۰ء میں اس کی عمر ۹۳ سال تھی۔ اسے عجائب عالم میں شمار کیا گیا۔ جنوری ۱۹۲۱ء میں جب انہوں نے اس واقعہ کا ذکر شذرات میں کیا ''معارف'' ابھی اپنی عمر کے چھٹے سال میں تھا۔ اس وقت انہوں نے لکھا تھا ''ہم سست اور غیر مستقل ہندوستانیوں کے لیے ایک اردو رسالہ کی اتنی عمر بھی غنیمت ہے''۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ جو پودا انہوں نے لگایا تھا اور اپنے خون جگر سے جس کی آبیاری کی تھی کارکنان قضاوقدر کی طرف سے یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اسے سو سال کی عمر پانے والے پہلے اردو رسالہ ہونے کا امتیاز اور اعزاز حاصل ہوگا۔ اگر امریکہ سے شائع ہونے والا ایک رسالہ سو سال کی عمر کو پہنچ جائے تو یہ کوئی ایسی تعجب کی بات نہیں۔ اس کے سامنے نہ تو وسائل کی کمی کا مسئلہ ہوتا ہے اور نہ سرپرستی کا فقدان۔ البتہ اردو رسائل کو عموماً جس صورت حال کا سامنا ہوتا ہے اور خاص طور سے دارالمصنّفین گذشتہ پوری صدی جن مسائل اور حالات سے دوچار رہا اور آزادی کے بعد اردو کو جن انقلابات اور آزمائشوں سے گذرنا پڑا، ان کو دیکھتے ہوئے ''معارف'' کا سو سال کی عمر کو پہنچ جانا اور اس شان سے پہنچ جانا یقیناً ایک ایسا واقعہ ہے جسے عجائب عالم ہی میں نہیں بلکہ اعجب العجائب واقعات میں شمار کیا جانا چاہیے۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کے بے پایاں فضل وکرم کی وجہ سے ممکن ہوا ورنہ ظاہری حالات اور اسباب کو دیکھتے ہوئے تو اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس عظیم الشان اور غیر معمولی کامیابی کے لیے ہم بارگاہ رب العزت میں سجدہ شکر بجالاتے ہیں۔

اس نادر تاریخی اور یادگار موقع پر ہم ''معارف'' کے بانی مدیر اور جانشینِ شبلی مولانا سید

سلیمان ندوی کو دل کی گہرائیوں سے خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے علامہ شبلی کے دوسرے کئی ناتمام منصوبوں کی طرح نہ صرف یہ کہ انہی کے متعین کردہ خطوط کار کے مطابق ''معارف'' کے اجراء کا اہتمام کیا بلکہ ایک طویل مدت تک اس کی تعمیر و ترقی کے لیے اپنی بہترین توانائیاں صرف کیں اور اس کا وہ انداز اور معیار مقرر کیا جو اردو جرائد کی دنیا میں اس کا نشانِ امتیاز قرار پایا۔ علم و تحقیق کی دنیا میں اس کو جو غیر معمولی قبول عام حاصل ہوا وہ بلاشبہہ اس کے مدیر اول کی دین تھی۔ ان کے اپنے عہد میں اور ان کے بعد کے تمام مستقل اور وقتی مدیران گرامی کو بھی ہم احترام اور ممنونیت کے جذبات کے ساتھ یاد کرتے ہیں جن کے اخلاص اور عزم و حوصلہ نے نہایت نامساعد حالات میں بھی مدیر اول کے قائم کیے ہوئے بلند معیار کو قائم رکھنے کا فریضہ انجام دیا اور علم و تحقیق کی اس شمع فروزاں کی لَو کو مدھم نہیں ہونے دیا۔ ہم اس موقع پر ''معارف'' کے ان بے شمار قلمی معاونین کو بھی ممنونیت کے ساتھ یاد کرتے ہیں جن کے علمی تعاون نے پوری ایک صدی تک اس مجلہ کو کاروانِ علم و تحقیق کے قافلہ سالار کے منصب پر فائز رکھا۔ اس موقع پر ہم ''معارف'' کے خریداروں اور سرپرستوں کو بھی یاد کرتے ہیں جو اگرچہ تعداد میں کم رہے لیکن ان کی علم پروری اور ادب نوازی نے سو سال پر محیط اس طویل عرصے میں ''معارف'' کے پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ ہم بارگاہ رب العزت میں دست بہ دعا ہیں کہ علم و دانش کے اس سراج منیر کی ضیا پاشیاں اگلے بے شمار برسوں تک ایسے ہی قائم رہیں اور وہ اسی طرح علم و ادب کی خدمت انجام دیتا رہے اور آیندہ بہت سی نسلوں کو علم و تحقیق سے روشناس بھی کراتا رہے اور قلم پکڑنے کا سلیقہ اور ہنر بھی سکھاتا رہے جیسا کہ وہ ماضی میں کرتا رہا ہے۔

جیسا کہ آپ کو علم ہے جون کے اس شمارے پر معارف کی عمر کے سو سال مکمل ہوتے ہیں۔ بلاشبہہ اردو صحافت کی تاریخ میں اس کی حیثیت ایک سنگ میل کی ہے۔ یہ دارالمصنّفین کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک صدی پہلے اس کے لیے جو مقاصد اور اہداف مقرر کیے گئے تھے اور جو انداز اور معیار متعین کیا گیا تھا حالات و اوضاع میں غیر معمولی تغیر و تبدل کے باوجود بڑی حد تک اب تک ان کی پاسداری کی جاتی رہی ہے۔ ابتداء میں جو قالب اس کے لیے منتخب کیا گیا تھا زمانہ کی بے شمار گردشوں اور لیل و نہار کی بے حساب کروٹوں کے باوجود اس کی یہی وضع اب بھی باقی ہے۔ چنانچہ اس کے پہلے اور موجودہ شمارہ میں دیکھنے والوں کو کوئی

بہت نمایاں فرق نہیں محسوس ہوگا اور آنکھوں کو اجنبیت کا چنداں احساس نہیں ہوگا۔ نہایت برق رفتاری سے بدلتی ہوئی اس دنیا میں جس کے زمین و آسمان سب یکسر بدل چکے ہیں ایک رسالہ سے ایسی وضع داری کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے بے خبر اور نئے زمانے کی ضرورتوں سے غافل رہا ہے۔ قارئین اس بات سے واقف ہیں کہ دستیاب وسائل کی حد تک اسے نئی ضرورتوں اور نئے تقاضوں سے ہم آہنگ رکھنے کی مسلسل کوشش کی جاتی رہی ہے۔

دارالمصنّفین نے ابتدا ہی سے خاموش خدمت کو اپنا شعار بنایا۔ اس نے نہایت عظیم الشان کارناموں اور غیر معمولی کامیابیوں کا بھی نہ تو کبھی ڈھنڈورہ پیٹا اور نہ ہی ان کی تشہیر کی طرف کوئی توجہ دی۔ کسی اور ادارے میں ایسا غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہوتا اور ایسی عدیم النظیر کامیابی حاصل ہوئی ہوتی تو اس کا کیسا کچھ جشن نہ منایا جاتا اور کس کس طرح اس کی تشہیر نہ ہوتی۔ لیکن دارالمصنّفین میں ایسا کچھ نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود ہمیں اس نادر تاریخی لمحہ کی اہمیت کا ادراک بھی ہے اور باوقار علمی انداز میں اسے یادگار بنانے کی ضرورت کا احساس بھی۔ اسی کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا گیا کہ جون کا شمارہ جس پر اس کی سو سال کی عمر مکمل ہوتی ہے، خاص نمبر کی صورت میں شائع کیا جائے اور اس کے ذریعہ قارئین کے سامنے اس کے تابناک ماضی اور اس کی مہتم بالشان خدمات کی ایک جھلک پیش کی جاسکے۔ اس کی ایک صورت یہ تھی کہ اس کے مشتملات کا ایک انتخاب تیار کیا جائے لیکن کم و بیش ایک لاکھ صفحات اور ہزاروں مقالات اور تحریروں میں سے چند سو صفحات کا انتخاب گو ناممکن نہیں لیکن سخت دشوار عمل تھا۔ چونکہ ''معارف'' کے منتخب مقالات کے متعدد مجموعوں کی اشاعت کا منصوبہ پہلے ہی سے پیش نظر ہے اس لیے خیال ہوا کہ معارف کے صفحات میں مستقل عناوین کے تحت شائع ہونے والی تحریروں کا ایک انتخاب مرتب کیا جائے۔ لیکن مستقل عناوین کی فہرست سے اگر ''وفیات'' کو الگ بھی کردیا جائے جس کا بڑا حصہ شائع ہوچکا ہے، تو بھی شذرات، باب التقریظ والانتقاد، تلخیص و تبصرہ، باب الاستفسار، آثار علمیہ و تاریخیہ اور اخبار علمیہ کے تحت شائع ہونے والی تحریروں کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ ان کے ایک انتخاب کی اشاعت کے لیے متعدد جلدوں کی ضرورت ہوگی۔ بالآخر نگاہ انتخاب شذرات پر آکر ٹھہر گئی اور طے کیا گیا کہ مختلف موضوعات اور مسائل پر گذشتہ ایک صدی کے

دوران لکھے گئے منتخب شذرات کو خاص نمبر کے طور پر شائع کیا جائے۔اس نقطہ نظر سے شذرات کا ایک محتاط انتخاب تیار کیا گیا تو اندازہ ہوا کہ وہ بھی اتنا زیادہ ہے کہ خاص نمبر ان کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ بالآخر یہ طے کیا گیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے تعلق سے جو شذرات لکھے گئے ہیں ان کا ایک انتخاب تیار کیا جائے۔اس کے وسیلہ سے گذشتہ ایک صدی کے دوران ہندوستانی مسلمانوں پر جو کچھ گذری اس کی ایک تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔اس وقت ہندوستانی مسلمان جن نازک حالات سے دوچار ہیں اس کے پیش نظر اس کی افادیت بہت بڑھ جاتی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ اس انتخاب کی حیثیت ایک تاریخی دستاویز کی ہوگی۔

یہ فیصلہ کر لینے کے بعد انتخاب کا عمل از سر نو شروع ہوا۔انتخاب کی ضرورت اس لیے پڑی کہ اس موضوع پر بھی شذرات کے تحت لکھی گئی تمام تحریروں کا احاطہ ممکن نہیں تھا۔دامانِ نگہ تنگ وگل حسنِ تو بسیار، والی بات تھی۔ چنانچہ خواہش کے باوجود اس موضوع پر لکھی گئی بہت سی تحریریں اس انتخاب میں جگہ نہ پاسکیں۔خیال یہ تھا کہ یہ خاص نمبر تین سے چار سو صفحات پر مشتمل ہوگا لیکن بہت کچھ کاٹ چھانٹ کے باوجود صفحات کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تجاوز کرگئی۔دشواری یہ تھی کہ یہ خاص نمبر صرف جون کے شمارہ کی جگہ پر تھا اور ایک عام شمارہ کے لیے جو وقت دستیاب ہوتا ہے اسی میں اس کو تیار کرنا تھا۔یہ بھی نہایت ضروری تھا کہ یہ خاص نمبر جون کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے شائع ہوجائے ورنہ ''معارف'' کی ہر مہینہ میں وقت کی پابندی کے ساتھ شائع ہونے کی سو سال کی طویل روایت صدی کے آخری شمارہ پر ٹوٹ جاتی اور یہ ایک بہت بڑا المیہ ہوتا۔اس دوران بعض ایسے عوائق پیش آئے جن کی وجہ سے وقت کے اندر اس کام کی تکمیل تقریباً ناممکن سی ہوگئی۔اس مشکل صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایک صورت تو یہ تھی کہ خاص نمبر کو جون اور جولائی کے مشترکہ شمارے کے طور پر شائع کیا جائے۔اس میں دشواری یہ تھی کہ جون پر نہ صرف یہ کہ جلد مکمل ہورہی تھی بلکہ صدی بھی۔پہلی صدی کے آخری اور دوسری صدی کے پہلے شماروں کو یکجا کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ حددرجہ مجبوری میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ خاص نمبر کو دو حصوں میں منقسم کردیا جائے۔پہلا حصہ جون میں شائع ہو اور دوسرا جولائی میں۔حصہ اول پہلے چالیس سال کے انتخاب پر مشتمل ہو اور دوسرا اگلے ساٹھ کے انتخاب پر۔یہ غیر منطقی تقسیم بھی حالات کے شدید دباؤ کے تحت کرنی پڑی۔جن اسباب کی

وجہ سے ایسا کرنا پڑا ان کی وضاحت کا یہاں موقع نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین ہماری مجبوریوں کو محسوس کریں گے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمام تر دشواریوں اور مشکلات کے باوجود ہم پہلا حصہ جون کے اختتام سے پہلے شائع کرنے میں کامیاب ہوئے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے شذرات کا ایک نہایت بلند معیار قائم کیا تھا۔ ان کے شذرات علم و تحقیق اور زبان و بیان کے بڑے دلآویز شہ پارے ہوتے تھے اور بجا طور پر شذرات الذہب کہلانے کے مستحق تھے۔ ان کا معتدبہ حصہ علمی اور تحقیقی معلومات پر مشتمل ہوتا تھا۔ ساتھ ہی ان میں عالم اسلام اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کا بھرپور انعکاس بھی پایا جاتا تھا۔ اس خوانِ پر نعمت سے صرف اس حصہ کو اس انتخاب میں جگہ دی گئی ہے جو ہندوستانی مسلمانوں سے متعلق ہے۔ حق تو یہ تھا کہ اس حصہ کو بہ تمام و کمال شائقین کی خدمت میں پیش کردیا جاتا اس لیے کہ

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا ست

لیکن جگہ کی تنگ دامانی نے اس کی اجازت نہیں دی۔ بڑی حد تک یہی معاملہ ان کے جانشینوں کے شذرات کے ساتھ بھی ہے۔ یہ انتخاب پیش خدمت ہے۔ یہ ہندوستانی مسلمانوں کی امیدوں، آرزوؤں اور حوصلہ مندیوں کی جلوہ گاہ بھی ہے اور ان کی مشکلات اور مسائل کی ایک دل گداز داستان بھی۔ گذشتہ سو سال کے دوران ہندوستان کی امت مسلمہ جن مسائل سے گذری ہے اور پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے انہوں نے جو کوششیں کی ہیں اس کی داستان اس مختصر سے انتخاب میں پھیلی ہوئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مدیرانِ معارف نے ملی مسائل پر لکھتے ہوئے اپنا دل نکال کے رکھ دیا ہے اور اگر ان کی زبان سے یہ کہا جائے کہ

من قاش فروشِ دلِ صد پارہ خویشم

تو بیجا نہ ہوگا۔

آپ دیکھیں گے کہ ان میں ایک معتدبہ حصہ اردو اور مسلم یونیورسٹی سے متعلق ہے۔ اگرچہ ان دونوں اہم موضوعات پر بھی تمام تحریروں کو اس انتخاب میں جگہ نہیں مل سکی ہے۔ سید صاحب اردو کو ہندوستانی کے نام سے موسوم کرنے کے حق میں تھے، اور چاہتے تھے کہ یہی مشترکہ زبان

ہندوستان کی سرکاری زبان قرار پائے۔ مسلم یونیورسٹی کے بارے میں آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد نقطہ نظر میں کسی قدر فرق محسوس ہوگا۔ آزادی سے پہلے بھی وہ "ہماری مسلم یونیورسٹی" تھی لیکن چونکہ وہ تحریک آزادی کی اس طرح حصہ نہیں تھی جس طرح دارالمصنّفین تھا اس لیے کہیں کہیں انداز بیان ناقدانہ ہوجاتا ہے۔ جامعہ ملیہ جو تحریک آزادی کے سلسلہ میں انہی نظریات وخیالات پر کاربند تھی، جن پر دارالمصنّفین یقین رکھتا تھا اس لیے اس کا ذکر ہمیشہ استحسان سے کیا گیا ہے۔ آزادی کے بعد تو مسلم یونیورسٹی اسلامیان ہند کی سب سے قیمتی متاع قرار پائی اور اس موضوع پر تمام تحریروں میں یہ ایک قدر مشترک ہے۔ اس قیمتی تاریخی مواد سے استفادہ کو آسان بنانے کے مقصد سے منتخب تحریروں کے لیے عنوانات مقرر کیے گئے ہیں۔ (معارف جون ۲۰۱۶)

مولانا عمیر الصدیق ندوی دریابادی

جنرل الکشن اور مسلمان

صاحب معارف مولانا سید سلیمان ندویؒ نے نوے سال پہلے بعض دنوں کے لیے لکھا تھا کہ یہ ہماری قومی مجلسوں کے ''لگن'' کے دن تھے، گزشتہ ایک دو مہینوں کے لیے یہی بات پھر کہی جاسکتی ہے، الکشن کے زمانہ کو یوں بھی عید جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے، پارلیمنٹ کے انتخاب کی تاریخیں طے ہوئیں تو ملک کی قیادت اور قوم کی سیادت کے خواہش مندوں کے لیے جیسے ''لگن'' کے دن آ گئے، ملک کی فکر، قوم کے درد، مصائب کے ماتم اور مسائل کے حل کی زنبیل لیے ہر قسم کے راہ بر اور چارہ گر، گوشے گوشے سے اس طرح بے تابانہ نکلے کہ مِنۡ كُلِّ حَدَبٍ يَّنۡسِلُوۡنَ کی تعبیر، مجسم تصویر ہو کر سامنے آ گئی، مسائل سیاست سے ہم زیادہ واقف نہیں لیکن یہ گلہ عام طور سے سننے میں آیا کہ نصف صدی میں یہ پہلا الکشن ہے جس میں کسی سنجیدہ مسئلہ اور موضوع کا فقدان ہے، حالاں کہ ملک مصائب اور مشکلات سے آزاد تو کیا، پہلے سے کہیں زیادہ گرفتار بلا و ابتلا رہا، ملک کی دو تہائی آبادی کاشت کاروں اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں میں تلاش معاش میں مشغول دست کاروں اور محنت و مشقت کے ہر بار کو شانوں پر اٹھائے مزدوروں پر مشتمل ہے، مذہب اور ذات پات سے کہیں زیادہ ان کی شناخت، محنت کش کی ہے، سرمایہ دارانہ نظام کی نئی عالمی معاشی یلغار سے ملک کی یہ اکثریت مفلس سے مفلس تر ہوتی جارہی ہے، کساد بازاری اور سودی نظام کی زد سے کوئی طبقہ محفوظ نہیں، قرض، سود، رشوت کی بہتات نے محنت اور فرض سے کوتاہی اور خود غرضی اور ذاتی حصول منفعت کے دروا کر دیے، بے کاری، بے روزگاری نے تعصب و تشدد جیسے معاشی و معاشرتی رذائل کو ہوا دے کر عوام کی زندگی کو جینے کے لائق نہیں رکھا، یہ مسائل راہنماؤں اور ان کی جماعتوں کی توجہ کے مستحق تھے لیکن خود فریبی اور خود احتسابی سے بے نیازی اس کی توفیق کب دیتی ہے؟ بہر حال سروں کے گننے کا ریاضیاتی عمل پورا ہوا، کچھ نے اطمینان کا سانس لیا کہ فسطائی اور فرقہ پرست ذہنیتیں خوار ہوئیں،

باقی حلیف وحریف یہ اقرار کر کے رہ گئے کہ شکست وفتح تو قسمت سے ہے، ہاں دل ناتواں نے مقابلہ تو خوب کیا۔

یہ تو عام بات تھی، خصوص تو ملت اسلامیہ کو حاصل ہے جس کو عرصے سے غم جہاں سے زیادہ غم جاناں میں مبتلا کیا جاتا رہا ہے، ادہر دہشت گردی کے عنوان سے اس ملت کو ناکردہ گناہوں کی پاداش میں سزا کے قابل سمجھا گیا اور انتخاب اس کے ان نوجوانوں اور نوخیزوں کا کیا گیا جو تعلیم اور روزگار میں ترقی کی راہوں پر گام زن تھے، ان میں کچھ تو کشتگان دہلی وحیدر آباد ہوئے اور کچھ پس دیوار زنداں، محبوس ومقہور ہوئے، اس ظلم اور ناانصافی اور صریحاً زیادتی پر احتجاج اور غم کا اظہار ہوا اور بجا ہوا لیکن ظلم اور ناانصافی کے خلاف یہ آئینی اور قانونی جنگ، الکشن کے میدان میں آگئی جہاں ہر زیادتی کے لیے گنتی کے جواز کو سند کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، جلد بازی میں اتحاد اور اجتماعیت کے نام سے جس انتشار، بے اجتماعی اور بداعتمادی کے مناظر سامنے آئے ان سے دل اور خون ہوا، اس کی تفصیل کیا بیان کی جائے، شوروغل، ہجوم واژدحام اور جوش وخروش کے نظارے تھے، زبان، الفاظ، دلائل، مطالب، مقاصد کسی کی کمی نہ تھی، بہ قول مولانا سید سلیمان ندوی ؒ ''جوش وخروش تھا لیکن اس دریا کا جس کی تہہ میں گہر نہیں'' کیسی عجیب بات ہے، ایک صدی ہونے کو آئی، نسلوں پر نسلیں آئی گئیں لیکن ہمارے حالات نامساعد ہی رہے اور ہماری سرشت بھی جوں کی توں رہی، کبھی صاحب معارف نے کہا تھا کہ ''مسجد کان پور کے خونیں قطروں کو دیکھ کر ہم نے کیا کیا جزع وفزع نہ کی لیکن پھر کر جو دیکھتے ہیں تو ان دردمند لبوں پر جن کی گریہ وزاری کبھی تھمنے والی نہ تھی، اس قیامت کا تبسم نظر آتا ہے کہ شاید یہ ہونٹ کبھی آہ وفغاں سے آشنا ہی نہ تھے'' آج بھی کیا حالات اس سے غیر ہیں، جوش وجذبہ کی تیزی وتندی میں محسوس ہوتا ہے کہ ہوش وحکمت کی متاع کہیں گم ہو کر رہ گئی ہے، جماعتی اور اجتماعی فرق کا لحاظ آخر کب ہوگا، عامۃ الناس کے جذبات کو ہوا دینے کی جگہ کیا ان کو صحیح سمت دینا حکمت و دانش اور دیانت کے خلاف ہے، دوسری قوموں کی اتباع میں کیا ہمارے مسائل کا حل صرف جلسوں، جلوسوں اور نعروں میں ہے یا اس کے لیے صبر ومتانت واستقلال کے ساتھ مسلسل اور منصوبہ بند کوششوں کی ضرورت ہے، ناکامی اپنے اسباب کی جانب متوجہ کرتی ہے، معارف نے بہت پہلے بڑی دردمندی اور وضاحت سے کہا تھا اور آج ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ ''ہماری ناکامی کا اصل سبب یہ

ہے کہ ہم آندھی کی طرح آتے ہیں اور بجلی کی طرح گزر جاتے ہیں، ہم دم میں جل جانے والے اور جلا دینے والے کوہ آتش فشاں ہیں لیکن ہمیشہ سلگنے والے اور جلتے رہنے والے آتش کدہ نہیں، ایک لمحہ کے آنے والے اور گزر جانے والے طوفان آب ہیں، ہم سیلاب کے مانند پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں لیکن کوہ کن کی طرح ایک ایک پتھر جدا کرکے راستہ صاف نہیں کر سکتے، ہم بجلی کی طرح ایک آن میں خرمن کو جلا کر خاک سیاہ کر سکتے ہیں لیکن چیونٹی کی طرح ایک ایک دانہ نہیں ڈھو سکتے، ہم ایک مسجد کی مدافعت میں اپنا خون پانی کی طرح بہا سکتے ہیں لیکن ایک منہدم مسجد کو دوبارہ بنانے کے لیے مسلسل کوشش جاری نہیں رکھ سکتے'' جوش بیان، آزادی قول اور نعرۂ حق یقیناً مستحسن ہیں لیکن دنیا کی تاریخ قول سے نہیں عمل سے بنی ہے، ہمارا عمل کیا اور کیسا ہے اس کا فیصلہ صرف خود احتسابی ہی کر سکتی ہے۔

ملک کے لیے اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے حالات یقیناً سخت، ناسازگار اور نامساعد ہیں لیکن جس قوم کو ایمان اور عمل صالح کی شاہ کلید حاصل ہو، جس کے لیے عزت وسربلندی کا تمغہ مالک عرش کی بارگاہ سے عطا کیا جا چکا ہو، جس کے لیے زمین میں خالق کائنات کی نیابت کا منصب اور خوف کو امن سے بدلنے کا وعدہ الٰہی ہو، اس کے لیے خوف و ہراس کی ضرورت ہی نہیں، ضرورت ہے تو صرف مثال اور نمونہ بننے کی اور عملاً یہ نمونہ دنیا کے سب سے بہترین انسان کی شکل میں پیش بھی کر دیا گیا ہے، ایمان اور عمل صالح کا یہ آمیزہ ہماری بلکہ پوری انسانیت کی صلاح وفلاح کا ضامن تنہا نسخہ ہے، اس کے بغیر کوئی خیر امت کے مبارک لقب کا مستحق نہیں، ورنہ امتحان ہوتے رہیں گے، انتخاب ہوتے رہیں گے، انقلاب آتے رہیں گے اور ہماری موجودہ روش، ہر قدم، دوریٔ منزل کو نمایاں کرتی جائے گی۔

سول سروسز اور مسلمان

یاس کے عالم میں یہ خبر مسرت کو پاس لائی کہ اس سال سول سروس امتحان میں کامیاب ہو کر آئی اے ایس بننے کا کارنامہ اکتیس مسلمان نوجوانوں نے کر دکھایا، آزاد ہندوستان میں یہ غالباً پہلی بار ہوا اور اس وقت ہوا جب سچر کمیٹی ہماری تعلیمی حالت کا نوحہ کر چکی تھی، یہ مثال ہے گو چھوٹی اور محدود سی ہے لیکن شکایتوں، فریادوں اور تقاضوں کے ماحول میں اس کی اہمیت کہیں زیادہ ہے کہ سخت

محنت، مسلسل جدو جہد اور مقصد کو پانے کی لگن بہرحال کامیابی کی منزل سے ہمکنار کرتی ہے، کامیاب نوجوانوں میں ایک سرفراز نے اچھا پیغام دیا کہ ہم محنت و تعلیم سے خود کو اس منزل پر پہنچا دیں کہ نوکری کو تلاش نہ کریں بلکہ نوکری خود ہم کو تلاش کرے، بڑوں کی عزت، مسلسل آگے بڑھنے کا جذبہ اور وقت کی قدر کا احساس بھی سرفراز احمد نے یاد دلایا، ہم سرفراز جیسے نوجوانوں کو تحفہ تبریک پیش کرتے ہیں، یہ یقین تو ہمیشہ سے ہے کہ

ع ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

(معارف مئی ۲۰۰۹ء)

دینی تعلیمی کونسل اور اس کی خدمات

شمسی تقویم کے لحاظ سے معارف کا یہ شمارہ سال نو کا پہلا شمارہ ہے، ایک بار صاحب معارف حضرت سید سلیمان ندویؒ نے ایسے موقع پر لکھا تھا کہ ''نئے سال کے آغاز میں چاہیے تھا کہ کوئی نیا مضمون شروع ہوتا لیکن مجبوراً ہم کو ایک پرانے مضمون کی بحث چھیڑنا پڑی'' قدیم و جدید کا فلسفہ بھی عجیب ہے، ان اضافی نسبتوں کو حقیقی سمجھنا اس سے بھی عجیب تر ہے، خوب کہا گیا کہ ہر قدیم اپنے اگلے کے لحاظ سے جدید اور ہر جدید آئندہ کے لحاظ سے قدیم ہے، ہمارے فلسفی شاعر نے تو اس قصہ قدیم و جدید کے متعلق فیصلہ کر دیا کہ یہ تو دلیل کم نظری ہے، بہرحال اس تمہید کا مقصد ہندوستان کی آزادی کے معاً بعد مسلمانوں کو درپیش مسائل میں ایک نہایت اہم مسئلہ کی یاد تازہ کرنا ہے، ساٹھ سال سے کچھ زیادہ ہی مدت ہوئی، ہندوستان آزاد ہوا، ملک کا آئین جمہوری ہوا، ہر مذہب و ملت، ہر علاقہ اور ہر تہذیب و زبان کو یکساں حقوق ملنے کا وعدہ ہی نہیں ترقی و فروغ کا دعویٰ بھی کیا گیا لیکن کیا خبر تھی کہ آزادی کا مفہوم ''من مانی'' لیا جائے گا اور جس کی ایک کریہہ شکل، نئے حکمرانوں کے ذریعہ نظام تعلیم کے باب میں مسلمانوں کے تعلق سے سامنے آئی، ابتدائی تعلیم جبری ہوئی، جبر ان معنوں میں کہ اردو عملاً تعلیم سے خارج کی گئی، ہندی کی تعلیم اس کی مخصوص ثقافت کے ساتھ لازم کی گئی اور اس ابتدائی تعلیم کی زیادہ تر کتابیں محض اکثریت کے مذہب اور تہذیب کی اس طرح ترجمان بنادی گئیں کہ سب سے بڑی اقلیت کے بچے اس نظام تعلیم کے ذریعہ اپنی تہذیب و روایات سے بیگانہ بن جائیں، صدی کی چھٹی دہائی میں دینی تعلیم سے محرومی کی اس داستان کو دیکھنے اور پڑھنے والے جانتے ہیں کہ نئ

نسل کے اسلامی تشخص کے تحفظ و بقا کے لیے یہ کیسا نازک وقت تھا، ایسے میں اللہ تعالیٰ کی مشیت و مصلحت نے ایک مجاہد آزادی ہی نہیں، حقیقتاً مردمجاہد کو کارتجدید کے لیے منتخب کیا، قاضی عدیل عباسی مرحوم کی نظر تھی یا شب تاریک میں چیتے کی آنکھ جیسا چراغ تھا جو منزل مقصود کا سراغ آسان کردے، انہوں نے حکومت کے نظام تعلیم سے براہ راست متصادم ہونے کی بجائے، پرائمری سطح پر ایک متوازی اسلامی تعلیم کی تدبیر کی اور آزاد مدارس و مکاتب کے لیے عام مسلمانوں کے معمولی لیکن مستقل تعاون سے خود کفالت کی راہ بھی دکھائی۔

دسمبر ۵۹ء میں یوپی کے ضلع بستی میں ایک انفرادی فکر اور تجویز، دینی تعلیمی کونسل کی تشکیل میں بدل گئی اور اس کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا منظور نعمانیؒ، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، مولانا ابواللیث اصلاحیؒ کے تعاون واشتراک سے اور خود قاضی صاحب اور ان کے رفقا مولانا محمود الحسنؒ، ظفر احمد صدیقیؒ کے انہماک سے اس تحریک نے جو نتائج و ثمرات مرتب کیے وہ آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا اہم حصہ ہیں، ۶۰ء کے بعد ملک اور خصوصاً یوپی میں مدارس کے فروغ میں دینی تعلیمی کونسل کے ان مکاتب کے فعال کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا بھی ہے کہ جب کبھی ہندوستانی مسلمانوں کی ذہنی و فکری و تعلیمی تاریخ بلکہ ان کی ملی تاریخ، دیانت داری سے لکھی جائے گی تو اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکے گا کہ دینی تعلیمی کونسل نے کیا فکر دی، کیا لٹریچر تیار کیا اور کس طرح ہندوستانی مسلمانوں کے دینی مقدمہ کو مضبوط دلائل سے ثابت کیا، اس وقت کے صاحب معارف مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ نے اس تحریک کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے ان ہی صفحات میں لکھا تھا کہ ''اس کی اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ بار بار اس کی جانب توجہ دلائی جائے''۔

دیکھتے دیکھتے دینی تعلیمی کونسل سے پچاس سال پورے کر لیے، اب وہ بزرگ نہیں جنہوں نے اس شجرۂ طیبہ کو پروان چڑھتے دیکھا لیکن جس دردوسوز و آرزومندی کی دولت انہوں نے میراث کے طور پر عطا کی، شکر ہے کہ ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی اور ان کے رفقا کی جرأت اندیشہ اور لذت کردار کے باعث یہ ضائع نہیں ہوئی، چنانچہ ابھی دسمبر میں گورکھپور میں اس تحریک نے مولانا سید محمد رابع ندوی اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی کی سرپرستی میں اس پچاسویں سال کو مزید حرکت و توانائی کے لیے

ایک مفید کانفرنس کی شکل میں بدل دیا، صحیح ہے کہ اب بھی منظر نامہ نہیں بدلا ہے، سرکاری اسکولوں کی جگہ نرسری، مانٹیسری انگلش میڈیم اسکولوں کی شکل میں مذہب اور تہذیب وروایات کے خلاف وہی تعلیم اور وہی تربیت و تلقین ہے، آج بھی مسلمان بچوں کی بڑی تعداد کلمۂ شہادت کے تلفظ سے ناآشنا ہے اور آج بھی ہمارے بچے اردو لکھاوٹ سے دور ہیں اور آج بھی وہی کوششیں منظم ہیں کہ ملک کی ساری تہذیبیں اور مذہبی عقائد ایک مخصوص عقیدہ وروایت میں ضم ہو جائیں اور طاق حرم میں جو شمع روشن ہے اس کو گل کر کے انسانیت کو تاریکیوں میں گم کر دیا جائے، آج بھی وہی ضرورت ہے کہ ہم کو اپنی تہذیبی انفرادیت اور عقائد کے تحفظ سے رہنا اور جینا ہے، آج بھی تہہ محراب تقدیر کو رونا نہیں ہے، اس لیے دینی تعلیمی کونسل کو زندہ ہی رہنا چاہیے اور اس کے لیے ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی اور ان کے رفقا کا ہر ممکن تعاون کیا جائے کہ ان کی شکل میں وہ جنون آج بھی باقی ہے جو تقدیر کے چاک کو سی سکتا ہے۔ (معارف جنوری ۲۰۱۱ء)

مسلم پرسنل لا بورڈ

مسائل اور مصائب، قوموں کی زندگی کا بہر حال حصہ ہیں، سنجیدگی، استقلال، سلامت روی اور صبر کے ساتھ ہی ان سے نبرد آزما ہوا جا سکتا ہے، ہندوستانی مسلمانوں کی گذشتہ ایک صدی اور بالخصوص ملک کی آزادی کے بعد کی تاریخ میں جن جماعتوں میں ان صلاحیتوں کا کچھ نہ کچھ ظہور ہوا ان میں بجا طور پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا نام لیا جا سکتا ہے، وقتی اشتعال اور سیمابی وسیلابی جوش کی جگہ، ہوش و استقلال اور مسائل کے حل کے لیے متانت و وقار گویا اس بورڈ کا شعار ہے، اس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں، لیکن ادھر کچھ مسائل حکومت وقت کی نافہمی اور حقیقتوں سے لاعلمی کی وجہ سے سامنے آئے، ان کی سنگینی سے خود قوم بھی دوسرے ہنگامہ ہائے شور وشر کی وجہ سے غالباً ناواقف ہی ہے لیکن مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی قیادت میں بورڈ کے ہوش مندوں کی نظر ان مسائل پر بروقت پڑی جیسے ملک میں مفت لازمی تعلیم کا قانون، RTE کے نام سے اس قانون کو بنانے والوں کی نظر میں یہ مفید ہی نہیں انقلابی قانون ہے، بظاہر اس کی افادیت سے یوں انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تعلیم کے حصول اور بچوں کو بنیادی طور پر خواندہ بنانے کے لیے ہے لیکن اس خوش کن مبتدا کی خبر اتنی ہی وحشت ناک ہے یعنی تجلی سے زیادہ یہ برق دینی مدارس کے نظام پر گر کر ان کو خاکستر بنا دے گی،

اس قانون سے مدارس کی شکل کیا ان کا وجود ہی نہیں رہ پائے گا اور خود یہ قانون، دستور ہند کی اس دفعہ کو مہمل کردے گا جس کی رو سے اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے بنانے اور اپنا نصاب چلانے کا حق دیا گیا ہے، اب ان ہی اسکولوں میں لازمی تعلیم ہوگی جن کو حکومت کھولے گی یا بڑے تجارتی گھرانے، اس کا واضح مطلب ہے کہ چھ سال سے چودہ سال کے بچوں کے لیے حکومت کی شرائط ہی قابل عمل ہوں گی، یعنی اب مدارس کے چلانے کی کوئی گنجائش ہی نہیں، یہ تو ایک پہلو ہے ورنہ اس قانون میں دوسری دفعات ایسی ہیں جو نصاب اور ذریعہ تعلیم کے سلسلے میں مسلمانوں کے لیے سم قاتل اور بعض دفعات مسلمانوں کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی مضحکہ خیز ہیں جیسے معیار تعلیم کہ لازمی تعلیم کے اس دور میں بچوں کو کسی بورڈ کا امتحان پاس کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی وغیرہ۔اسی طرح وقف کے قانون میں ترمیم کے لیے ایک بل پیش کیا گیا ہے جس کی ایک اہم شق یہ ہے کہ جو وقف، رجسٹرڈ نہیں ہوں گے ان کو عدالت میں اپنے دفاع یا چارہ جوئی کا حق نہیں ہوگا، اس سلسلہ میں یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا کہ اگر سو دو سو سال پرانی مسجد ہے اور وہ وقف بورڈ میں درج نہیں تو عدالت کی نظر میں کوئی قانونی حیثیت نہیں اس کو اگر توڑ ڈالا جائے تو یہ ایک عام اجتماعی عمارت کا توڑنا ہوگا، اللہ کے گھر کو نہیں، مسلم پرسنل لا بورڈ رجسٹریشن کی ضرورت کو تسلیم کرتا ہے مگر اس کا مطالبہ ہے کہ غیر رجسٹرڈ وقف عدالتی چارہ جوئی سے محروم نہ ہوں، اسی طرح حکومت کی جانب سے انکم ٹیکس ایکٹ کو منسوخ کرکے ڈائریکٹ ٹیکسز کوڈ کے نفاذ کی تیاری ہے، انکم ٹیکس کے قانون کی رو سے مذہبی ٹرسٹ مذہبی ادارے اور عبادت گاہیں ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں لیکن نئے قانون کے تحت یہ تمام مذہبی ادارے انکم ٹیکس ادا کرنے کے لیے مجبور ہوں گے، اس قانون کی زد پر گو ہر مذہبی ادارہ ہے لیکن تشخص اور شناخت بلکہ اپنے مذہبی وجود کے تحفظ اور بقا کے لیے جس قوم کے لیے ہر قدم اور ہر لمحہ قیامت خیز ہے، وہ مسلمان ہی ہیں، ایسے میں اس قانون کا اصل ہدف کون ہے؟ اس کا جواب آسان بھی ہے اور ظاہر بھی۔ شکر ہے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ نے ان قوانین کے انجام بد پر نظر کی اور بڑے سلیقے سے اپنے خدشات اور مطالبات کا اظہار ایوان حکومت میں کر بھی دیا، بورڈ کے جنرل سکریٹری مولانا محمد ولی رحمانی اور جناب عبدالرحیم قریشی نے یہ ذمہ داری بھی لی کہ خود مسلمانوں کو ان قوانین کے مالہ وماعلیہ سے باخبر کرائیں، بیدار ہونے اور خبردار رہنے کا یہی عمل مطلوب ہے، انتخابی سیاست سے بورڈ کے اجتماعی شعور کا تعلق نہیں ہے لیکن انتخابات کے

ماحول میں جہاں مطالبات اور حقوق موقع کے منتظر رہتے ہیں، وہیں سیاسی جماعتوں کو ان کے فرائض اور دستور کے تحفظ کی اہمیت یاد دلانا بھی ضروری ہے، شطرنج کی بساط ضرور بچھے، کھیل بھی ہو لیکن مات دینے سے زیادہ مات کھانے کا احساس بھی ضروری ہے اور یہ کام تماش بین اگر کرتے ہیں تو اس کو اور کوئی نام دینے کی ضرورت نہیں۔(معارف جنوری ۲۰۱۲ء)

پارلیمانی انتخاب کے نتائج

ملک میں عام پارلیمانی انتخاب کے شور وغل کے بعد جب نتیجہ سامنے آیا تو اندیشوں کے عین مطابق وہی ظہور میں آیا جس کا خدشہ تھا، کانگریس اور اس کی حلیف پارٹیوں کا محاذ یو، پی، اے آزادی کے بعد پارلیمانی تاریخ کی سب سے بڑی شکست سے دو چار ہوا اور بی جے پی کی فتح کی لہر میں اس کی دوسری حلیف پارٹیوں کو بھی ساحل مراد مل گیا، شکست وفتح کی حقیقت کبھی مقدر سے منسوب کی جاتی تھی اور عروج وزوال کے تماش بین یہ داد دے کر راضی برضا ہو جاتے تھے کہ ع مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا، مگر اس الکشن کے نتائج کچھ اور ہی تھے، ہوسکتا ہے کہ یہ ہمارا تاثر ہو لیکن واقعہ کچھ ایسا ہی ہے کہ

تھا دیدہ حیران ہر اک زخم بدن میں انگشت تاسف تھی زباں، سب کے دہن میں

اب نتائج کے ظہور اور نئی مودی حکومت کے عروج پر فن سیاست کے ماہروں کی نظر ہے، گذشتہ حکومت کی ناکامیاں کیا تھیں؟ قیادت کا فقدان تھا یا ہمت وحوصلہ کی کمی تھی؟ یا پھر یو پی اے حکومت سے جو بن پڑا تھا، اس کی شرح نامکمل رہ گئی؟ یا یہ کام آنے کی وہ گھڑی تھی جہاں دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آ گیا تھا؟ یا پھر یہ ایک مخصوص نظریہ اور فکر کی مسلسل توسیع سے صرف نظر کرنا تھا، ایک ایسا نظریہ جس کی تاریخ ہی فرقہ وارانہ منافرت، صدیوں سے ملک میں موجود مذہبی رواداری سے عداوت اور ہزاروں سال پہلے کے مبہم اور مشکوک مذہبی جذبات کے احیاء پر مشتمل ہے، کیا اس نظریہ کی خطرناکی یا زہرناکی کا بروقت ادراک نہیں کیا گیا؟ یا پھر یہ سرمایہ داروں کے حصول مال وزر کی ہوس تھی جس نے منفی سیاسی عناصر کو اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے بانگ دہل استعمال کیا؟ یہ بانگ دہل کیا ذرائع ابلاغ وترسیل کی صورت تو نہیں، جنھوں نے اس قدر شور وغوغا برپا کیا اور تشہیر کا بازار ایسا گرم کیا کہ بصارتوں اور سماعتوں کے ساتھ فہم وبصیرت پر بھی پردے پڑ گئے اور آنے والے خطرات

نگاہوں سے اوجھل ہوگئے؟ ملک کے آئین و دستور اور اس کے نظام پر مرتب ہونے والے اثرات کا احساس بھی نہیں رہا؟ معاشیات واقتصادیات میں ترقی کے نعروں میں کیا زراعت اور صنعت وحرفت کی، فریاد واقعی صدائے بے اثر ہوگئی؟ یہ اور ان جیسے سوالوں کی طویل قطار ہے جو سیاست کے نباضوں کے سامنے ہے۔ اب رموز مملکت کے خسرواں ہی اس کی پردہ دری کریں۔ ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ دیکھتے سب کچھ ہیں سوجھتا کچھ بھی نہیں۔ اب کون کہے کہ فرقہ پرستوں اور جارحیت پسندوں کی یہ فتح اتفاقی نہیں، انہوں نے اپنے ارادوں کو واقعہ ہے کہ کبھی مخفی بھی نہیں رکھا، سیکولر طاقتوں کو بڑے شاطرانہ انداز میں وہ مسلسل کمزور کرنے کے منصوبہ پر عمل پیرا رہیں، کانگریس پارٹی اپنی تمام کمزوریوں اور نقائص کے باوجود فرقہ پرست طاقتوں کی نظر میں ان کے عزائم کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی، اسی لیے ان طاقتوں کے سرخیل نے پوری قوت اس اظہار میں صرف کی کہ اس ملک کو کانگریس کے وجود سے صاف کردیا جائے۔ بات صاف تھی کہ سیکولرزم کے دوسرے چھوٹے بڑے دعوے داروں کے پاس کوئی تاریخ تھی نہ کوئی واضح لائحہ عمل، ان کی طاقت کو ان ہی کے ہتھیار کے ذریعہ مٹانا کہیں آسان تھا، یہ فکر جزوی طور پر ہی سہی لیکن بڑے موثر انداز میں کامیاب بھی ہوئی، جہاں یہ علاقائی سیکولر جماعتیں بچ بھی گئی ہیں وہاں یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ آیندہ یہ یوں ہی محفوظ رہ سکیں گی، یہ سب اپنی جگہ لیکن ماتم تو اس قوم کا ہے جس کی اس سادگی کا رونا آج سے نہیں، صدیوں سے ہے کہ لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔

سب سے بڑی تلوار تو وہ شعور ہے جو خطرات وخدشات کا رخ بھانپ سکے، یہ قومی شعور جذبات کی نمی اور عقیدت کی گرمی سے نہیں پنپتا، یہ صرف حقیقت کو حقیقت کی روشنی میں دیکھتا ہے اور یہی ادراک ایک ایسی قیادت کو وجود بخشتا ہے جو اتحاد و وحدت کے اصل مفاہیم سے آشنا ہو، کیسی عجیب بات ہے کہ ہماری زبانیں اتحاد کے لفظ کا ورد اس وقت کرتی ہیں جب الکشن یا الکشن جیسے کسی تماشے کی نوبت آتی ہے، اس وقت اتحاد کی آوازیں اتنے گوشوں سے ابھرتی ہیں کہ دیکھنے اور سننے والے عالم حیرت میں اتحاد کے ہر حرف کو انتشار میں تبدیل ہوتے دیکھتے رہ جاتے ہیں، اردو اخباروں کے مصور اشتہاروں میں جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ فلاں کو ووٹ مت دو اور ساری توجہ فلاں کی شکست پر مرکوز کرو تو اس منفی طرز فکر پر تعجب ہوتا ہے اور ذہن کو یہ سوال کرنے کا یارا ہوتا ہے کہ اسی

بات کو مثبت طریقہ سے بھی تو کہا جاسکتا تھا کہ بہتر سے بہتر کو نظر انتخاب میں لایا جائے، اپنے سے کہیں زیادہ افرادی قوت والے طبقہ کو اس منفی طریق سے دور کرنے میں کیا دانائی ہے؟ افسوس تو یہ ہے کہ فراست کی نعمت سے بہرہ یاب قوم کا یہ انداز ایک روایت بن چکا ہے، کم از کم ہندوستان کی ایک صدی کی تاریخ تو یہی کہتی ہے کہ گردش لیل ونہار خواہ کتنے ہی تغیرات کا سبب بنے، ہم اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں آج بھی پس وپیش میں ہیں کہ ع ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

(معارف جون ۲۰۱۴ء)

تصانیف شبلی صدی

۱۔ سیرۃ النبی جلد اول و دوم علامہ شبلی نعمانی
قیمت =/۲۰۰۰ روپے

۲۔ شبلی کی آپ بیتی ڈاکٹر خالد ندیم
قیمت =/۳۲۵ روپے

۳۔ دارالمصنّفین کے سوسال کلیم صفات اصلاحی
قیمت =/۳۵۰ روپے

۴۔ شذرات شبلی (ماہنامہ الندوہ کے اداریوں کا مجموعہ)
مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی قیمت =/۲۲۰ روپے

۵۔ الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی، علامہ شبلی
تحقیق و ترتیب ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی
قیمت =/۳۵۰ روپے

۶۔ مولانا شبلی لائف اینڈ ورکس
ڈاکٹر جاوید علی خاں قیمت =/۲۳۰ روپے

۷۔ حیات شبلی مولانا سید سلیمان ندوی
قیمت =/۶۰۰ روپے

۸۔ متاع رفتگاں، مولانا شاہ معین الدین ندوی
مرتبہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی قیمت =/۲۰۰ روپے

۹۔ رسائل شبلی علامہ شبلی نعمانی
قیمت =/۳۰۰ روپے

۱۰۔ یہود اور قرآن مجید، مولانا ضیاء الدین اصلاحی
مرتبہ اشتیاق احمد ظلی قیمت =/۱۵۰ روپے

۱۱۔ مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں (مجموعۂ مقالات)
مرتبہ اشتیاق احمد ظلی قیمت =/۲۵۰ روپے

۱۲۔ اردو ترجمہ مکاتیب شبلی مع حواشی و تعلیقات
ڈاکٹر خالد ندیم قیمت =/۱۱۰ روپے

۱۳۔ شبلی شناسی کے اولین نقوش
مرتبہ ظفر احمد صدیقی قیمت =/۶۰۰ روپے

۱۴۔ الفاروق (ہندی ترجمہ) عبداللہ دانش
قیمت =/۴۵۰ روپے

۱۵۔ شبلی ایک دبستان آفتاب احمد صدیقی
قیمت =/۲۵۰ روپے

۱۶۔ حیات سعدی، مولانا الطاف حسین حالی
تحشیہ و تعلیقات سید محمد اسد علی خورشید
قیمت =/۴۰۰ روپے

۱۷۔ تاریخ بدء الاسلام، علامہ شبلی
مرتبہ ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی قیمت =/۳۵۰ روپے

۱۸۔ مطالعات شبلی (مقالات سمینار)
مرتبہ اشتیاق احمد ظلی قیمت =/۵۵۰ روپے

۱۹۔ مراسلات شبلی ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
قیمت =/۱۵۰ روپے

ISSN 0974 - 7346 MA'ARIF (URDU) PRINT

JULY 2016 Vol - 198 (1)

RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/016

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

(Office Mobile) 09170060782

یہی (معارف) ایک ایسا رسالہ ہے جس کے پڑھنے سے حرارت ایمانی میں ترقی ہوتی ہے۔ (علامہ اقبال)

معارف کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔ صرف یہی ایک پرچہ ہے اور تو ہر طرف سناٹا ہے۔ بحمداللہ مولانا شبلی مرحوم کی تمنائیں رائیگاں نہ گئیں اور صرف آپ کی بدولت ایک ایسی جگہ بن گئی جو خدمت علم وتصنیف کے لیے وقف ہے۔

(مولانا ابوالکلام آزاد)

میں معارف کو دنیا کا سب سے بلند پایہ علمی رسالہ سمجھتا ہوں۔ وہ ہمارے تاریخ حال کا مستقبل میں ایک وثیقہ، ایک ماخذ ہوگا۔ وہ مرجع انام ہے اور لوگ اب بھی، آیندہ بھی اس سے استناد کریں گے۔ (ڈاکٹر حمیداللہ، پیرس)